



میں نے اپنی آپ جیسا لگتا تھا

سنگرزِ نشت

جولائی 2014

نور محمد
موسمِ شہر



PDFBOOKSFREE.PK

پھر وہی غلطی، ایک سبق آموز کج میانی
رضیہ: آزادی کے ایک سوالے کا احوال و زیست
تاریکی کا آسیب، ایک بہت بڑے مصنف کا سوانح
اور بھی بہت سے چپے واقعات، سچے قصے، سچے میاں



شاعر جاویدیاں

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل مختصر مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

تذکرہ خاص 51

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

رواد خونچکان 60

رہنما

ڈاکٹر ساجد امجد

ایک معمولی سے نوجوان نے
کاغذ پر لکھی تاریخ کے سوال

تاریخ نامہ 74

تاریکی کا آسیب

شکیل صدیقی

اس نے تاریک کو خوف میں
بت لاکر نہ کفن پالیا تھا

نغم و صدائے 75

خانماں بہاد

سید احتشام

فلسطین کے غفلتوں کی
زندگی کا ایک بھولا ہوا باب

انتقام کشاں 97

جنگ و محبت

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ وہاں خون و جنگ کے پسند
مقابل تھے اور اناہل سرگراہ تھا

جہاز بیسی 109

فلمی الفیصلہ

علی سفیان افغانی

منہ لہو کی گنگناہی کہانیاں
منہ لہو کی باتیں یادیں

چرم کشا 121

ایک فانی لہت

ابن کبیر

اس نے باپ کے قتل کا استقامت
لینے کے لیے لڑا اور انتقام لیا

سفر کشاں 125

الوداع

حسن رضا فی

نی آئی اسے کے ایک
ریشہ اثر وافر کی خود نوشت

تغریب خاص 141

سیل نمبر 14

اسجد رئیس

وہ ایک ایسا قاتل تھا جسے قاتلوں
کی طرح تعاد بھی یاد تھی

ترکی نمی نم

علی سفیان افغانی

وہ سفر نامہ ہے جسے شوقیہوں کے لیے
قلندہ پیرائے میں ایک دلچسپ کہانی

جولائی

منظور احام

عیسوی مہینوں کے ایک نام
مہینے کا تذکرہ خاص

بیت بازی

قارئین

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

پہلی سچ بیانی 194

علمی آزمائش

ادرا

ذہن قارئین کے ذوق جستجو کی
تکسین کے لیے مفرد و انعامی سلسلہ

دوسری سچ بیانی 213

سراب

کاشف زین

بلند حوصلوں اور بے مثل دلوں
کے گندمی تہلکہ خیز داستان

تیسری سچ بیانی 227

پھر وہی غلطی

اہل

ماہی غلطی کا شکار ہوا کیا اور
بسی کو برکت سے بچایا

چوتھی سچ بیانی 233

جس

شاہد صدیقی

اگرچہ شاعر کو بگڑنے سے بچایا نہ
گیا تو ہر کوئی ذہنی لوگوں کو بگڑے گا

پنجمی سچ بیانی 239

درو

صدرالین امین بھٹانی

یہ اپنا اپنا طرف ہے ساس
نہیں ہر ایک کی رہائی کو ہونے...

ششمی سچ بیانی 249

بدلہ

محمد ندیم اینڈ ویکٹ

ایک ناکامی کا نتیجہ تھا جو
آپ کو پہنچے جب تک کہ نہ

ساتویں سچ بیانی 265

بھیڑ یا

ندیم

اس زمانہ میں بھیڑ
نے بھی کامیاب ہوا تھا

آٹھویں سچ بیانی 277

وارث

زینہ

لوگ بیتی کی یہ شاعر کے
لے کر طس پہاڑ کو پہنچے ہیں

نویں سچ بیانی 281

کالا علم

دانیہ صدیقی

لوگ اپنے منہ کی خطیر
اس دور میں کیے کیے

اس کا نام ہو رہے ہیں

تاوان

عاطف شاہین

مغرب میں ذہنی بگڑی کس
حکومت کی ہے کہ...

نہیں انکل نہیں

شبناز احمد

مغرب میں ذہنی بگڑی کس
حکومت کی ہے کہ...

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث تو آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تسلیم کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق ہر جرم سے محفوظ رکھیں۔

ادارہ سرگزشت میں شائع ہونے والے ہر جرم کے غلاف پر قلمی و لکھنؤ میں ادارہ سرگزشت کے لئے اس کے کسی بھی
کی اشاعت کی کسی طرح کے سبیل سے پہلے ہر مہارت کے لئے ضروری ہے۔ ادارہ سرگزشت کا کوئی مہارت ہر قلم کار کے لئے
تقریباً اشاعت کیسے کی بنیاد پر شائع ہونے کے لئے ہے۔ ادارہ اس معاملے میں کسی طرح سے ہارت ہوگا۔

شہر خیال



ہزارا تاج محل کا تیسرا "سمرات" رسول صاحب کے خیالات پر ہے۔ موجودہ واقعات پر مبنی تیسرا تہہ۔ جو صاحب میں حضرت حسن مکی کا تعارف ہوا۔ ایک سفر میں کسی شخصیت کا نقشہ کھینچ دینا اور حالات زندگی بیان کرنا یہ خاصہ صرف سرگزشت کو حاصل ہے۔ شاید جگہ جگہ اول ہی جگہ پر ہے اور تیسرا بھی شاید تھا۔ میرا خیال ہے سب سے طویل خط تھا۔ اعجاز حسین سجاد بڑے خوش نظر آئے، جناب آج کل کیا مصروفیت ہے؟ سدرہ بانو تاحیری کراچی سے شریف لائیں اور علم و خوشی پر ماتم کر رہی ہیں۔ حیرت سے بدلاؤ پڑی جیسے خوشی سب کچھ ہو رہا ہے۔ اسکول کے بارے میں آپ کے خیالات درست ہیں۔ یہ علم روشنی میں رہے اور زور و شور سے جاری ہے۔ ڈاکٹر قاضی بھی اسی دکھ میں مبتلا ہیں۔ آپ نے دور حاضر کے مسلمان سائنس دانوں کا سلسلہ شروع کرنے کا کیا تو بہت انتظار رہے گا۔ اور حواس شاہ کی دریا خان سے شریف آوری، بڑی گہری نظر رکھتے ہیں آپ الف لیلہ پر، رانا شاہ صاحب کی زیر تعلیم اور درجہ تعلیم والے بچے نے بہت لطف دیا۔ جناب کہیں آپ کا اشارہ موجودہ کوئی دوسری کی جانب تو نہیں؟ امی الدین صاحب کی سرگزشت والا رسالہ سب تلاش کریں گے دیکھتے ہیں کب تک ملے گا۔ احمد خان قادیانی، شفیق حوزین سے، عبدالغفور خان ساغر بھی حاضر تھے۔ علم عالم سرگزشت کی سالانہ ڈاک سے قلم کار

الغالب ہے۔ شاید عظیم صاحب اچھے ہی سرگزشت کے چند ایک شمارے چاہتے ہوں تو میرے پاس ہیں۔ میں اپنا رابطہ بیوروں کا ادارے سے پرچہ تھا کر کیا کوئی سلسلہ شروع نہیں کیا جاسکتا کہ پرانے شمارے قارئین کی فراہمی پر ادارہ دوبارہ شائع کرے۔ (میری تحقیق کا سلسلہ کچھ چاہئے گا) شفیق حوزین جابج تیسرے کے ساتھ آئے۔ رہتی کائنات کا ڈراما تو آج کے اخبار میں تھا کہ ان کے خوش مزاجی پر دوسرا لاکھ آکر دیکھیں۔ بڑی حیرت ہوئی کہ اس عامی شخص اور سورت کے فنکار کی اتنی جھلک ہو سکتی ہے۔ سہر حال پسندانی لکھی۔ چراغ ادب۔ کافی یاد کرنے کی کوشش کی لیکن یاد آتا کہ ان کے حوالے سے کوئی مضمون (پرانے ادبی پرے دیکھ لیں، بہت بکھر چکے ہیں) ساتھ صاحب کا شمارہ ان سے متعارف کرایا۔ جوش شیخ آبادی والے تھے نے تو کافی پسلیاں پانچیں کہ حقیقت ہے کہ فائنٹ شمارے کی سب سے بہترین تحریر آزاد صاحب کی تھی۔ گو یا ہمد حاضر جس شمارہ میں تھا ہے کہ انسان کی ترقی کا یہ دور ہے تو یہ اس کی لفظی ہے اس کے علاوہ مختلف ملکوں میں قارئین کے اندر ایسی ایک خواہش دیکھ لی جاتی ہے کہ انسان دیکھ رہا ہے۔ تعلیم و علم و ہجر کے خلاف سینہ پر ہونے والوں کی داستان۔ اللہ تعالیٰ ہر جاہل اور جاہل کے سامنے شہید ہی انسانوں کو پیدا کرتا ہے۔ رائل رولینڈ جیسے بڑی جہتیں جو نے خداؤں کی خدائی خاک میں ملا دیتے ہیں۔ ترقی کا سفر ہمارے مخصوص رنگ میں جاری ہے۔ جرم و فساد اور کھلم کھلا رعب یعنی صاحب کی ایک اداس کردینے والی نگاہ ہے۔ کیا جہاں مذہبی افکار کی شہرت اتنی بڑی ترقی دے کر اپنا نشان چھل گیا۔ جسے اس کو سراہے جانے اس کو سورت کے کھاتے اتار دیا گیا۔ انتہائی عجیب اعتقاد مذہبی تھی۔ فحشی الف لیلہ میں سلیم رضا کو یاد کرتے ہوئے دکھائی دے۔ انتہائی خوبصورت آواز کے مالک سلیم رضا کی اس مردہ حالت میں دیکھا ہے۔ جو یہ تعریفی کا لکھا ہو گیت و آہی جس خواہش کرتی ہے ساتھ ساتھ ان کے گاہ شاہی ہی کوئی کا کچھ خوشنیت سمجھ کا ذکر بھی خوب ہوا۔ واقعی اتنی طرز کے خوبصورت انسان تھے۔ ایک انسانیت تو زور و سورت۔ حدیث، عقل احمد صاحب کا تذکرہ بھی رہا۔ چنانچہ بانی کا ذکر پہلے ہی کیا بارہو چکا ہے۔ سرگزشت جنوں ان کی صاحبزادی کی فلم یعنی ترقی کی فلم دیکھی مر اٹھا واقعی بہت شاندار فلم تھی۔ مذہب کے حوالے سے بات آئی تو چنانچہ بانی نے پہلے مسلمان کیا پھر اس شخص سے شادی کی۔ الوداع میں حسن رزاقی صاحب کو کہتے سے فارغ کرنے کے طریقے پر بہت ہنسی آئی۔ سراب میں کل کے دشمن اب ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ علی آراہن 101 کا جواب بھی دیا تھا لیکن چونکہ خط شامل اشاعت نہ ہوا اس لیے جواب نہ آ سکا۔ اور اب کی بار کافی آسان سوال ہے۔ کچھ مباحثوں میں حضرت اشرف العلوی کا ہستی میں کرنا اچھا تھا۔ ان دو کھاسودا اشرف کو بھی نے اچھا جواب دیا۔ دیکھئے مجھے کوئی فیصلہ کرنا سب سے بڑی ہے جو ترقی ہے۔ ناقابل حوائی، ایک عجیب اور حیرت انگیز کہانی ہے۔ یقیناً جس آداب و محرم مالک حواس انسان کی دعوت پر دینے والی تحریر موجود تہذیب و تہذیب سے متاثر ہے۔ یہ ایک ملانچ ہے۔ خدا کا ایک انتہائی بد بخت شخص کی کہانی تھی، سوچ کر بھی

لڑنے چاہتے۔ اعتراضات کتاب، ایک ایسی کہانی جو ہر اس انسان کے لیے عبرت کا سبق لے ہوئے جس پر اس قسم کی سوچ رکھتے ہیں، ایسے لوگ اور سب اس میں موجود ہوتے ہیں۔ خدا کا حکم ہے اسے بروقت محفل ملے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ایسے طرز و عمل سے دور رکھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ (آمین)۔ انور اعجاز صاحب، روایت نیکس قاصد، بشری افضل صاحبہ غیر حاضر تھیں۔ جلد حاضر ہو جائیں گے۔ ایک اور درخواست سرگزشت پر کوئی تحریر کیجئے۔

جیلو تعمیر احمد نسیم کراچی سے لکھتے ہیں "میں نے دو بار شہر خیال میں قلم اٹھا کر اس کے مگر انھوں نے ساتھ کچھ نہ رہا ہے کہ دونوں بار نہ تیرا کوئی خط شائع ہوا دوسرے لئے انھوں میں ہر نام آیا۔ آپ ہیڈ صرف پرانے لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں شہر خیال میں پرانے لوگوں کی یادداشت قائم ہے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ کیا آپ کو گیت کرشن پرانے نام نظر نہیں آتے؟ (۱۲) انصاف یہ ہے کہ ہمارے دور میں آپ کا ڈائجسٹ ضرور پڑھتا ہوں پر وقت کی کمی کے باعث کچھ لکھیں پاتا۔ جون کا شمار 28 تاریخ کو ہی کیا تھا۔ اس بار شہر خیال میں مصداقہ کی گئی ہے شاید جگہ جگہ برعکس تھے۔ اور شاید صاحب نے کراچی کے پرانے دنوں کی یاد میں تائید پر ہم ٹھہری آہم کر رہے۔ پانچویں کتب شہر کا مگر سے ذمہ دہکا سدرہ بانو تاحیری کا اخبار خیال بہت اچھا لگا۔ ڈاکٹر قاضی حسین صاحب آپ جو سستا اخبار ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ یہ بھی درست ہو سکے گا، ایک تو پہلے ہی ہم لوگ تعلیم کی کمی کی وجہ سے مار کھاتے ہوئے ہیں، اور دوسری طرف یہ حال کہ اسکول کو تیار ہوا دیا جا رہا ہے۔ سب کچھ دیکھتے کے باوجود حکومت وقت عملی اقدامات کے بعد بھی کچھ نہیں کر رہی تو پھر مگر سے احتجاج کرنے والوں کی اہمیت کہاں رہ جائی۔ کچھ بیانیہ شائع کرنے کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے اگر اس میں اور اضافہ کر دیا جائے تو اور اچھی بات ہے۔ یہی کچھ جتنی سورت و حیات نے تو واقعی دیکھ کر دیا۔ کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں رہتے ہیں۔ اعتراضات گاہ کی بہت اچھی دی ہوئی بروقت یہ کرنے کی نصیحت کر رہی ہے۔ کیونکہ ہم جان بوجھ کے ایسا کرتے ہیں۔ خطا نہیں کاہے جتنی سے انتھار ہے۔ ہائی ٹی الف لیلہ، دو کون تھے بڑی ہی دایم بکلیاں اور خاص جودر سحر نام کی تحریر جن بہت پرند آئی۔ آخر میں تمام دوستوں کو سلام۔"

منہ محمد عارف قریشی رنجبر مارکٹ، مگر سے لکھتے ہیں "سرگزشت کے خطا فر کے لیے ایک کج بانی "خدا ہی ملانہ وصال نعم" ارسال ہے۔ یہ ایک ایسی خاتون کی کہانی ہے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے قادیانی گرو کا کچھ میں پھیرا رہ چکی تھی۔ انھوں نے مجھ پر جس انداز میں احتجاج کیا کہ اس کا تلفظ تھا کہ ان کے سر پر جو کچھ عام تو ضرور کیا جائے لیکن اس کے نام اور مقام بدل دیے جائیں، سو میں نے انہیں کیا ہے۔ میں نے یہ کہانی ان کی ذاتی بیان کی ہے، شاید اس سے کوئی سبق حاصل کر سکے۔ (آپ کی تحریر پر ہنسنے کے لیے پورا کے حوالے کر دی ہے، فیصلہ ہی کریں گے)"

منہ اعجاز حسین سجاد رولینڈ سے "قبل از وقت یہ ہے کہ آہ اور حیران کرنے کا سلسلہ جاری ہے اب یہ ادب کا قلم رہا ہے۔ محفل میں دستوں کی شمولیت خوشی کا باعث ہے اور قارئین اب محفل کرنا بہت گئے ہیں اور معلومات کا چارہ بھی جاری ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس کا لہو دھت واپس لے جائے کہ کہانی کے کرداروں پر حقیقت سے بحث ہو سکے اور اپنا نقطہ نظر کچھ طور پر بیان کیا جاسکے۔ (آدمی سنے سے زیادہ کہیں نہیں) تو کی گئی اور ہم میں بھی دلچسپی ہے ابھی آجائے ہیں لیکن کہیں کیسے موضوع کھنگھڑے کر دیتی ہے۔ ہو کہ، انظر ادبی واقعات پر محفل ہے، شہر کچھ ہے بس کر کے لکھا گیا ہے اس کا اثر دیکھ رہے ہیں۔ "سراب" لکھ کر مجھے کاہانہ بہت ہو رہا ہے۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے قارئین میں شمولیت کے لگاؤ سے شہر ان چاہا ہے اور آئے والے دنوں میں ہم ایسی ہی امید رکھتے ہیں۔ کچھ بیان میں "نوت با حیات" ان کے واقعات اور سنے واقعات لے لے ہوئے ہے۔ استاد، میں لوگوں کو قیوف دینے کے لیے انھوں کی ہیں بلکہ جب تک یہ باہم عام ہوں گی تب تک ان واقعات ہو چکی ہوں گی۔ یہی جب تک الٹی ہوئی ہو، جو دیکھ دینے والوں کا روزگار چن رہا ہے۔ گاندھی سوچ، میں کسی حد تک تصور ہوں گے پاس مسائل لے کر جانے والوں کا ہونا ہے لیکن جو کی مصیبت میں دیکھ کر اس کا ذہن ہاتھ سے لیتی ہوئی کلمات سا کہ پہلے سے پریشان حال کی قوت لپٹا ہے پتہ چلے کریتے ہیں جہاں سے دوسرا راستہ نہیں آتا ہم آستانے کی روشنی کی راہی ہے۔ ان دو کھاسودا میں اشرف کی زیادتی ہے لیکن آج کل اولاد کی خواہشیں والدین کے کس کا سورا نہیں ہے لیکن جو کرنا چاہتے ہیں انہیں کیا حق ہے؟ اشرف کو سورت کر دینے والی بات مجھے اچھی نہیں کہ اب گھر کی بات گھر میں رہ جاتی تو پھر قادیانی بھی حقیقت ہے کہ قادیانی ہمیشہ سورت اس لئے دی گئی ہیں یہاں اس روایت کی لٹی ہوئی ہے۔ ناقابل حوائی، یہ نہ کہ ذہن ناؤف ہو گیا ہے۔ کوئی فیصلہ کرنے والے دینے سے قاصر ہے۔ ہمارے قبیلہ میں میلہ ہا سکول شہ کے موقع پر یہ مگر کی بار دیکھا لیکن سب کچھ کا صدمہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ جان لیجئے ہارنے کے طریقہ دیکھتے ہیں جو سنا تھا۔ اب تو سب پڑھ کر دل کا تپ رہا ہے۔ گناہات یہ ہے کہ اپنے لوگوں کے قریب نہیں ہانا چاہتے کیونکہ ان سے دیکھ کر خود کو دیکھ کر ان کی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ہم محرم، انار سے جذبات کو سمجھتے اور احساسات کو بچانے کی اچھی کوشش ہے لیکن ہمارے مذہب میں اب وہ دور ہے کہ کسی کی اپنی جاہ پر بڑی ہے کہ خود غرضی سے نہیں لیتی اب تک کچھ دور کر دیا ہے۔ جمہوریت میں سے وقت بچے کے دل دور رہا ہے اب ہم نے عوامی دنیا کو تیار کیا ہے۔ یہاں تک کہ کسی کو سنا کر خود غرض رہنے اور کھانے والا دوست آج خلاف معمول غامض کیل ہے۔ بس زور اس وقت سے جب یہ سادگی کی بات نہیں ہمارے میں نہیں کی۔ انعام ہو، یہ ہم ہزار کی ہنگامہ دہی ہے۔ شعل اور روانی نے یہی جگہ اکڑا دی کی تیرا اور ہے توجہ محفل کا اس تک نہ رہا۔"

ایک عام سا بچہ حالات کو اپنے لیے سازگار کرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اس نے سستی مسلسل کے ذریعہ وہ مقام حاصل کیا کہ لوگ اس کی پرستش کرنے پر مجبور ہوئے۔ آج بھی لوگ اسے پوجتے ہیں کیونکہ اس نے ملک و ملت کے وقار کو پوری دنیا میں بلند سے بلند کیا۔ اس نے اقیانوں کے نشے میں پڑی رہنے والی قوم کو جگایا۔ ترقی کے لیے ایک سمٹ سنجھائی، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوم جسے حقیر ترین سمجھا جاتا تھا وہ سب سے آگے نکل گئی۔ اس کی ترقی سے یورپ و امریکا کے صنعت کار تک خوفزدہ ہیں

اس رہنما کی داستان زیت جس نے سوئی ہوئی قوم کو جگایا

ایسا نہیں تھا کہ قاتلوں نے مگر دیکھ لیا ہو پس اتنا ہوا تھا کہ نظر رسوئے کا بیج نہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ وہ پیدا ہوا تو جڑی بوٹیوں سے نکالے ہوئے رس سے اس کے ہونٹوں کو تر کر دیا گیا۔ خوشی کے نہیں ہوتی یہاں بھی خوشی نے ڈیرے ڈالے تھے لیکن اس خوشی میں یہ احساس بھی شامل تھا کہ یہ بچہ اب وہ شان و شوکت نہیں دیکھ سکے گا جو بھی اس گمراہے کی پہچان ہوا کرتی تھی۔ یہ گمراہا چین کے شرقی ساحلی علاقے کے صوبے چینگ سو کی آن کاؤنٹی کے نواہوں میں سے تھا جو اب رادار و ملاکت کا ڈھار ہو چکا تھا۔ یہی جو تھا اب وہ نہیں تھا۔ ماں کے لیے فقیر اور نواب دونوں برابر ہوتے ہیں۔ یہ بچہ تو فقیر نواب تھا۔ وہ مجلس پیدا ہوا تھا لیکن گمراہا تو نوابوں کا تھا۔ ماں نے اچھے وقتوں کے چند بیش قیمت کپڑوں کو کات کر اس کے لیے سے کپڑے بنالے تھے جو اسے پہنا دیے گئے تاکہ آنے والوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اسے معمولی کپڑے پہنائے گئے ہیں۔ اس کے باپ نے اس کے لیے نام کا پہلے ہی انتخاب

کر لیا تھا۔ چوان لائی جسے سب بچارے چوکے نام سے پکارنے لگے تھے۔ اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ بچہ مستقبل میں چین کا وزیر اعظم بنے گا۔ کئی دن بعد اس کے باپ نے ایک پرانی ڈائری میں اس کی تاریخ پیدائش 5 مارچ 1898ء درج کی۔ چو کی پیدائش کی خوشی چند روز برقرار رہی پھر سب کچھ پہلے کی طرح چلنے لگا۔ اس کے والد ادائی سے ایک اسرے تھے۔ ان کی آمدنی سے گھر کے مصارف پورے نہیں ہوتے تھے۔ خوش رہنے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا اور پھر وہی گھر کی مالی اہمیتیں۔

یہ بھی قیامت تھا مگر اس خاندان کو ایک بڑے حادثے کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اس روز چو کے والد گھر آئے تو سخت گھبرائے ہوئے تھے بلکہ اگر کوئی غور سے دیکھتا تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔

”چوانی کان کی طبیعت بہت خراب ہے بس یوں کچھ کر دو آخری سانس لے رہا ہے۔“ انہوں نے اپنے بھائی کے حلقے بتایا۔



”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو وہ صرف بیس سال کا ہوا ہے۔“

”موت کسی کی مرضی نہیں دیتی۔ اس تم جلدی چلو اسے دیکھنا ہے تو دیکھ لو۔“

چوہے کے والد کے چار بھائی تھے۔ چوہائی کا نام سب سے چھوٹا تھا۔ شادی کو صرف ایک سال ہوا تھا۔ کوئی اولاد بھی نہیں تھی کہ زندگی اس کا ساتھ چوہے کو دے سکتا ہوگی۔

چوہی کے والد جلدی جلدی تیار ہوئی۔ وہ وہاں پہنچی تو چوہے کا چچا زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کی بیوہ اس کے سر ہانے بیٹھی رو رہی تھی۔ خاندان جمع تھا۔ کسی کی کچھ بات نہیں آ رہی تھی۔

چوہے کا چچا یہ کیا ہو گیا۔ یہ موت ہی ایسی تھی۔ 21 سال کی بیوہ کو اب تھوڑی عمر تھی۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ چوہے کو دھڑکنے لگا تھا کہ اندر سے میں چوہے کا گنگ (چوہاں لائی کے والد) کی آواز سنائی دی۔

”تم چوہائی کا نام کی بیوہ کی حالت دیکھ رہی ہو؟“

”بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ اس کی یہ حالت نہ ہوگی تو کیا ہوگی۔“ چوہی کا لہجہ تھا۔

”اسے اس حالت سے باہر لانا اب ہماری ذمہ داری ہے۔“

”ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے شوہر کا بدل تو کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”اس کا علاج اب بھی ہے کہ اس کا دھیان بنایا جائے۔ اگر کوئی بچہ گھر میں ہوتا تو وہ بھل جاتی مگر اب تو وہ بالکل اکیلا ہے۔“

”ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس کی اولاد ہوتی تو وہ بھل جاتی۔“

”ایک بات کہوں؟“ انہوں نے بیوی کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”کسیے میں سن رہی ہوں۔“

”اگر ہم اپنے چوہاں لائی کو اس کی گود میں ڈال دیں تو کیا وہ بھل نہیں جائے گی؟“

”وہ تو بھل جائے گی لیکن میرا کیا ہوگا۔ چوہی ایک ہی سال کا تو ہے۔“

”وہ تم سے الگ نہیں ہوگا۔ وہ صرف اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ تم بھی اس کے پاس ہی تو رہو گی۔“

”کچھ بھی ہو میں اپنے بچے کی دیکھ بھال خود کروں گی۔“

”تم یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ یہ ایک ننگی ہے جو تم کرو گی۔“

”کچھ بھی ہو جائے میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔“

اس کے بعد دونوں میاں بیوی میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ چوہے کا گنگ کو معلوم تھا کہ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے جو وہ منوانا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی بیوی تیار نہیں ہوئی تو یہ ایک فطری بات ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔

چوہی کا چپ ہو گئی تھی سوئی نہیں تھی۔ اس کا ذہن اس پیش کش پر براہ کرم کر رہا تھا۔ وہ رات بھر کو نہیں سو سکتی تھی اور بچر نہ جانے کب اسے نیند آگئی۔

صبح ہوئی اور دونوں ہاتھ کے لیے پیٹھے تو دونوں ہی چپ تھے جیسے ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہوں۔ چوہی کا من خود ہی خود کی دیر بعد شوہر کی طرف دیکھ لگتی تھی اور پھر اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”آپ نے رات کو جو کچھ کہا تھا۔“

”ہاں کہا تھا لیکن پھر سوچا کہ میرا فیصلہ ٹھیک نہیں۔ کسی کو خوش رکھنے کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔“

”آپ کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ ہمیں اپنا بچہ چوہائی کا نام کے سپرد کر دینا چاہیے۔ شاید اس طرح اس بے چاری کا کچھ دکھ دور ہو۔“ چوہے کا گنگ اسے خوش ہونے کا ہاتھ سے اٹھ گئے۔

”مجھے یقین تھا کہ تم جب سوچو گی تو اس نتیجے پر ضرور پہنچو گی۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم یہ فریضہ ادا کرنے جا رہے ہیں۔“

چوہے کا گنگ دیکھ رہے تھے کہ ان کی بیوی نے یہ فیصلہ کر لیا ہے لیکن پھر بے حلال کی پرچھائیاں بھی ہیں۔ اس بے چاری کو دکھ تو ہو رہا ہوگا۔ انہوں نے سوچا۔

”فکرت کرو۔ میں بہت جلد تمہارے گھر کو بچوں سے مجر دوں گا پھر دیکھنا تمہیں چوہی یاد بھی نہیں آئے گی۔“

چوہے کا گنگ کی بیوی اس مذاق پر ہنسے بغیر نہ نکلی۔

دونوں جلدی جلدی تیار ہوئے اور چوہائی کا نام کی بیوہ کے پاس پہنچ گئے۔ اس کی عمر ابھی صرف ایکس سال تھی اور اس پر یہ حادثہ ٹوٹ پڑا تھا۔ ابھی اسے کچھ معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ دونوں کس خاص مقصد کے تحت آئے ہیں۔ وہ تو کچھ سمجھ رہی تھی کہ ان کی آمد معمول کی آمد ہے۔ وہ چوہے کو گود میں لے کر بیٹھ گئی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

اسے دیکھ کر سرگراں رہا تھا۔

”یہ کبھا شروع ہو چکے کہ سرگراں ہے جا رہا ہے۔“

”ابھی ایک سال کا ہے لیکن تم سے مانوس ہو گیا ہے۔“ چوہے کا گنگ نے کہا۔

”اسے تو میرے پاس چھوڑ دوں۔ ٹھیک کر دوں گی اسے۔“ اس نے چوہے کا گنگ پر ہنسی بھرتے ہوئے کہا۔

”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ آج سے تم بھی اس کی ماں ہو۔ اسے اپنے ہی پاس رکھو۔“

”اگر نہیں، میں تو بھائی کر رہی تھی۔ جس کی اولاد ہوتی ہے اسی کے پاس اچھی لگتی ہے۔“

”کیا یہ تمہاری اولاد نہیں ہے؟ تم اس کی دیکھ بھال کرو۔ تربیت کرو۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اس کی اچھی تربیت کرو گی۔ یہ اب تمہارے ہی ساتھ رہے گا۔ تمہارا دل بھلا رہے گا۔“

”میں نے تو ایک بات یونہی کہہ دی تھی۔“

”لیکن ہم بہت سوچ کچھ کر رہے ہیں بلکہ ہم تو آئے ہی اس مقصد سے تھے۔ آج سے چوہے کا بچہ بن جائے۔“

ان دونوں نے جب بہت ضد کی تو وہ اسے گود لینے پر تیار ہو گئی۔

”میں اس کی پرورش اسی طرح کروں گی جس طرح اپنی اولاد کی کرتی۔ اگر فراموشی بھی کوئی ہو تو بے شک آپ اسے میرے پاس سے لے جائے گا۔“

”ہمیں پوری امید ہے کہ تم ہم سے ابھی اس کی پرورش کرو گی۔“

وہ دونوں وہاں سے اٹھے تو چوہے کا گنگ بہت خوش تھا البتہ چوہی کا دل بے چارے کے چہرے پر ہلال کی لکیریں اب بھی موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر چوہے نے کچھ نہ کچھ سوچا کہ اس کے چہرے پر ابھرا تھا۔

”تم ادا اس کیوں ہوتی ہو؟“ چوہے کا گنگ نے کہا۔

”تمہارا بیٹا تو خوش قسمت ہے۔ سب بچوں کی ایک ماں ہوتی ہے اس کی دودھ مائیں ہیں۔ خوب خیرے اٹھوائے گا۔“

چوہی کا دل سرگراں بغیر نہ رہا۔

چوہاں لائی اپنے مرحوم چچا کے گھر میں ملنے لگا۔ اس کی چچا جس کی گود میں وہ پرورش پڑا تھا نہایت سلیقہ مند اور نرم طبیعت کی خاتون تھی۔ اسے کلاسیک تحریروں اور رومانوی داستانوں پر پورا مہمور حاصل تھا۔ اسے شاعری سے بھی شغف تھا۔ کلاسیک شاعری کے دلچسپ ان اسے تقریباً حفظ تھے۔ وہ نئے نئے چوک

داستانوں کے اقتباسات سنایا کرتی تھی۔ انھیں سننا بہت پسند تھا۔ انھیں کوٹھیا پر چکے چکے دل میں اتار رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چار سال کی عمر میں اسے مقبول و معروف شاعر کی نظمیں زبان زد ہونے لگیں۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی جو سب کو حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ اس عمر کے بچے عام طور پر آسان اور بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں یاد کر لیتے ہیں لیکن اسے کلاسیک شاعری کی نظمیں یاد رہیں۔

چوہے کا گنگ اپنے بچے کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر خوشی سے بھرے نہیں سارے تھے۔ انہوں نے مہم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے بچے کو عالم بنا دیں گے۔ اب اس کی تربیت انہی خطوط پر ہونے لگی۔ اسے مطالعے کی طرف زیادہ راغب کیا جانے لگا چنانچہ نو سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے چین کے رئیس تر قذیم اور تھوڈل ہول اس کے مطالعے میں آچکے تھے۔ کلاسیک تحریروں پر عمل پیرا حاصل کر لیا۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس نے جو کچھ سنا یاد کر لیا۔ کسی ناول کا ذکر ہوتا تو وہ اس کے اقتباسات زبان سے لگتا۔ کسی نظم کا حوالہ دیا جاتا تو وہ پوری نظم سناتا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑا اہل علم بڑا عالم بنے گا۔

اس کی صلاحیتیں اپنی جگہ لیکن اس کے حالات مسلسل بے گناہت پرستے ہوئے تھے۔ اس کے والد کی آمدنی گھر کے حالات پرستے کرنے کے لیے کافی ثابت ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ گھر میں دھندلی دھندلی آمدنی کی یادگار چتریں کم ہونے لگیں۔ چوہے کا گنگ ان اشیاء کو فروخت کر کے یا گود میں رکھ کر اخراجات پورے کر رہے تھے۔ عورت نے پوری طرح چنگاڑ لے لیے تھے۔ یہ چیزیں بھی کب تک ساتھ دیتیں۔ گھر خالی ہو گیا، اب قرض کی نوبت آگئی۔ قرض ادا کہاں سے ہوتا۔ قرض خواہوں نے گھر کے پچھلے کونے شروں کو دیے۔ مزید رشتے داروں نے منہ پھیر لیا۔ وہ گھر جو بھی مہمانوں سے بھرا رہتا تھا مفلس کی جیب کی طرح خالی ہو گیا۔

دس سالہ چوہاں لائی تبدیلی کے ان مناظر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور ان گنت تجربات سے گزر رہا تھا۔ اسے تجربہ ہو رہا تھا کہ بڑے وقت میں کوئی کسی کا سہارا نہیں بنتا۔ صرف اپنی محنت سے جو کسی کو اس بھنور سے نکال سکتی ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ ہم اسے مفلس کیوں ہیں۔ اس کا جواب اس نے یہ تلاش کیا کہ دولت کی تلاش ہم نے اس کے والد کو مفلس کر دیا۔ اس کے دادا کے زمانے تک گھر میں

دولت کی ریل پٹ پر تھی۔ سماجی نا انصافیوں نے یہ دولت جمیں لی۔ سرمایہ دار اپنی تجویزیاں بھر رہے ہیں اور عام آدمی غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ مزدور کو اس کی اجرت اتنی نہیں مل رہی ہے کہ وہ سید بونچی کی زندگی گزار سکے۔ چند خاندان ہیں جو چین کی دولت پر قابض ہو گئے ہیں۔ جب تک ان سے نجات حاصل نہیں کی جائے گی یہ نظام بونچا چتا رہے گا اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عوام اقتدار پر قبضہ نہیں کر لیتے۔ اس وقت وہ اتنی سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

اس کے سوچنے سے کیا ہوا تھا۔ حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ قرض خواہ قاضیوں کے بعد محکموں پر آئے تھے۔ اس دولت نے اس کی ماں کو بیمار ڈال دیا۔ گھر میں کھانے کے لالے بچے ہوئے تھے، علاقہ ہوتا تو ابھی خدا کہاں سے نصیب ہوئی۔ موت کا داؤ چل گیا۔ اس کی ماں دیکھتے ہی دیکھتے چل بسی۔ وہ ماں کے سر ہانے بیڑہ کر دینے سے زیادہ اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا کہ اس کی ماں کیوں مر گئی؟ علاقے کے لیے پیسے کیوں نہیں تھے؟ وہی دولت کی لفظ تقسیم اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ، جواب اسے مل گیا تھا، لیکن سرمایہ داروں سے کیسے لڑا جاسکتا تھا۔ اقتدار کے ایوانوں میں درازیں کیسے ڈالی جاسکتی ہیں۔ وہ ابھی اچھا چھوٹا تھا کہ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ ایک فطرت تھی جو اس کے دل میں پلک رہی تھی۔

اس فطرت میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب اس کی دوسری ماں نے بھی محض چند بیٹوں کے وقفے سے دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

اب وہ دھوپ میں کھڑا تھا، نیچے پاؤں نیچے سر۔ صبر کیا بھی ہو لیکن نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گلستان مل ہی جاتا ہے۔ اس کے پاؤں جلتے دیکھ کر اس کے تپا کواں پر دم آ گیا۔ وہ شمال مشرقی چین کے شہر تیان یانگ میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے نیچے کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنی محرومیوں اور غم کو ساتھ لیے اس شہر کی طرف چل دیا۔ اس کے تپا کو اس سے زیادہ اس کی تعلیم کی فکر تھی۔ انہوں نے اسے تیان یانگ کے ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا۔ ”چن“ کی دوسری ماں چینی کر چکی تھیں اسے بڑھانے میں نہایت جاں سوزی سے کام لیا تھا۔ وہ کلینک ادب سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ قدیم شعرا کی نظمیں اسے زبان یا د تھیں۔

محرکتہ الآراء دولتیہ میں اس کے ذریعہ مطالعہ رہتے تھے۔ اپنی عمر سے آگے کا علم لے کر وہ اسکول پہنچا تو سب سے نمایاں نظر آنے لگا۔ اس کی قابلیت سے اس کے اساتذہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

وہ جن دنوں اسکول پہنچا، اسکول کے یوم تائیس منانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اس سلسلے میں مضمون نویسی کا ایک مقابلہ بھی منعقد ہوا تھا۔ اس کے اساتذہ نے اسے بھی اس مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ اس نے یہ دعوت بخوشی قبول کی اور ایک مضمون ”یوم تائیس“ کے موقع پر چند تاثرات ”لکھا۔

اس مضمون کو اول قرار دیا گیا اور بے حد سراہا گیا کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس کا اسلوب تحریر نہایت خوبصورت تھا بلکہ حب الوطنی کے جذبات نے اسے نہایت وقیع بنادیا تھا۔ اس کا یہ مضمون اتنا شاندار تھا کہ اسے چین کے طلبہ کی بہترین تحریروں کے دو مختلف مجموعوں میں شامل کیا گیا جو تیان یانگ کے ایک اشاعت گھر نے شائع کیا تھا۔

وہ اپنے خاندان پر گزرنے والی آفتاؤں سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ گھر سے جن جذبات کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا ان میں برادر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے بچوں کے برخلاف وہ اس عمر میں وطن کے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا اگر نظام ہمیں رہا تو دوسرے خاندانوں کا بھی وہی حال ہوگا جو اس کے خاندان کا ہوا ہے۔ اپنی اس سوچ کا اظہار وہ بار بار کرتا رہتا تھا۔

ایک روز کلاس پوری تھی کہ اساتذہ نے سوال کیا۔ ”تم تعلیم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو؟“ اساتذہ کا یہ سوال تمام بچوں سے تھا اور سچے باری باری جواب دے رہے تھے۔

ایک نے کہا ”میں اس لیے تعلیم حاصل کر رہا ہوں کہ اپنے خاندان کے وقار میں اضافہ کر سکوں۔“ دوسرا بولا ”تعلیم کا مقصد ہے معاشرے میں زندگی کے بہتر طور پر تھے سیکنا اور میں تعلیم حاصل کر کے اپنی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

ایک طالب علم نے بالکل الٹا جواب دیا ”میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تعلیم حاصل کر کے اپنے بوڑھے والد کو خوش کروں۔“ اساتذہ کسی کے جواب سے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ پھر اس نے ”چن“ کی طرف دیکھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

”اب تمہاری باری ہے، تم بتاؤ تمہارے نزدیک تعلیم کا کیا مقصد ہے۔ تم تعلیم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو؟“ چین کو خواب غفلت سے جگانے اور اسے مضبوط بنانے کے لیے۔“ چن کا یہ جواب اتنا شاندار تھا کہ اساتذہ اس کی تحریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

”شاہاڑا تمہارے خیالات نہایت قیمتی ہیں۔ کلاس کے بعد مجھ سے ملنا۔ میں تمہیں کچھ کتابیں دوں گا، ان کتابوں کے مطالعے کے بعد تمہارے شعور میں بڑھاپا اضافہ ہوگا۔“

اچھی کتابوں کا وہ بیٹہ شائق رہا تھا۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان کا نام مسٹر کاؤ تھا۔ ان دنوں جنوبی چین کے سیاست دان ڈاکٹر سن یٹ سین کے جمہوریت پسندانہ تصورات شمالی چین میں بھی عام ہو رہے تھے لیکن سخت پابندیاں تھیں۔ انقلابی لٹریچر کا مطالعہ کرنا ”اسے اپنے پاس رکھنا اس کی اشاعت قانونی جرم تھا۔ سزا اتنی سخت تھی کہ مجرم کو سزا قلم کر دیا جاتا تھا۔ مسٹر کاؤ اسے چپا کر ختم کر کلاس روم میں بھی لٹھیا پندانہ باغیانہ تصورات کی تعلیم دیتے تھے۔

”مسٹر کاؤ نے ”چن“ کو باغیانہ لٹریچر پڑھنے کے لیے دیا۔ جب وہ یہ لٹریچر پڑھ چکا اور مسٹر کاؤ سے اس پر بحث کی تو وہ اس طالب علم کی معلومات پر حیران رہ گئے۔ انہیں بتانا یا کامیاب نہ کیا تھا۔ وہ اسے مجروسے کے لائق سمجھ کر سیاسی پمفلٹ لا کر دینے لگے اور بحث کے دوران اسے سمجھانے لگے ”بادشاہت کی جگہ ایک جمہوری حکومت کا قیام کیوں ضروری ہے۔“ ان کی باتیں ”چن“ کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتی چلی گئیں۔ انقلابی نصب العین اس کے شعور میں پختہ ہوتا چلا گیا۔

”مسٹر کاؤ کی تربیت نے اسے سیاسی طور پر نہایت پختہ بنا دیا۔ اسے ان سوالوں کا جواب مل گیا جو وہ خود سے کیا کرتا تھا۔ وہ اس نتیجے پر تو پہنچ چکا تھا کہ دولت کی لفظ تقسیم تمام غریبوں کی جڑ ہے۔ لیکن اسے جڑ سے کس طرح اکھاڑا جائے، یہ سوال اپنی جگہ تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ شہنشاہت کا تختہ الٹ دینا ہی اس کا علاج ہے۔ مارکس کے لٹریچر نے اسے بہت کچھ سکھایا۔ ڈاکٹر سن یٹ سین کے خیالات سے وہ پوری طرح متفق ہو گیا۔ اس کا کل کیونزم ہے۔ اس نے سوچا اور وہ کیونزم پہنچ لٹریچر کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔

اب وہ ایسے لڑکوں کی تلاش میں رہتا تھا جو انقلابی شعور رکھتے تھے۔ ایسے لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو اس کے ایسے ہی ہم جماعت دوست نے اسے چینیوں کے چند دن اپنے گھر میں رہنے کی دعوت دی۔ وہ لڑکا شہر کے مطافات میں رہتا تھا اور ایسے علاقے چو کے پسندیدہ تھے۔ اس نے ہائی بھر لی۔

وہ اس کے گھر پہنچا اور اس کے دادا سے ملا تو اسے اور بھی خوش ہوئی۔ وہ بوڑھے آدمی تھے لیکن گہرا انقلابی شعور رکھتے تھے اور نو جوان کی طرح حوصلہ مند تھے۔ انہیں بھی چو سے مل کر خوشی ہوئی اور کیونزم کے بارے میں اس کی معلومات دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

یہ مطافاتی علاقہ تھا۔ چینیوں اور میڈانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ روز گیس نہ کہیں گھومتا ہوتا تھا۔ ایک روز اس کے دوست کے دادا نے کھانے کی میز پر اعلان کیا۔ ”کل میں چھپیں اس میدان میں لے کر چلوں گا جہاں چلیاں اور روس کے درمیان جنگ لڑی گئی تھی۔ جنگ دوسروں کی تھی اور سر زمین چین کی تھی کیونکہ اس جنگ کا مقصد ہی یہ تھا کہ چین کے شمالی مشرقی صوبوں پر تسلط قائم کیا جائے۔“

”حکومت کیا کر رہی تھی؟“ ”جنگ کی تجویز حکومت نے غیر ملکی حملہ آوروں کے ہاتھوں اپنے ملک کی پامالی روکنے کے لیے ایک اٹلی تک نہیں اٹھائی بلکہ اپنی غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اتنی رعایت چاہی کہ بعض حدود کی نشان دہی کر دی کہ جنگ کا دائرہ اس سے آگے نہ بڑھے۔ انہیں عوام کی تعلق پر وا نہیں تھی کہ جنگ کی وجہ سے ان مظلوموں پر کیا گزند پڑی ہے۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی تھی۔“

”یہ ذلت صرف اس لیے اٹھائی پڑی کہ حکومت کمزور تھی۔ اگر چین مضبوط ہوتا تو غیروں کی کیا مجال تھی کہ چین کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے۔“

اس معمولی سے واقفے نے چو کے دل میں نہایت غیر معمولی جذبات پیدا کر دیے۔ اس نے قہر کر لیا کہ وہ چین کو کمزوری اور بدعنوانی کے غمور سے نکالے گا۔ قدرت اسے ایسے مواقع عطا کرتی جا رہی تھی کہ جو اس کی تربیت میں معاون ثابت ہو رہے تھے۔

جب وہ 1913ء میں چہرہ سال کا ہوا تو اس نے شن یانگ کے پرائمری اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور مل اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شن یانگ سے تھیان

چلا گیا۔ یہاں آکر اس نے دیکھا کہ سیاسی جوش و خروش عروج پر تھا۔ بیداری کی ایک لہر تھی جو ہر طرف دوڑتی نظر آ رہی تھی۔ چوکی ان نوجوانوں سے دور نہ رہ سکا اور بہت جلد قوم پرستی کے اس نئے دھارے میں شامل ہو گیا۔

تعلیم کی طرف سے وہ بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اس نے تعلیمی ادارے میں آنے کے بعد بھی وہ مستعدی سے تعلیم حاصل کرنے لگا تھا لیکن نصابی کتب پڑھنے کے بعد بتنا موقع ملتا وہ اسے ضائع نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس خالی وقت میں وہ سوشلسٹ لٹریچر پڑھتا۔ اکثر سن پت سین کی زیر نگرانی شائع ہونے والے رسالوں میں جوش کردہ نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں بھی اس کے زیر مطالعہ تھیں۔ غیر ملکی تراجم بھی اسے دستیاب ہوتے رہتے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے دنیا بھر میں شائع ہونے والے ترقی پسند ادب سے متعارف ہونے لگا۔

اب وہ اپنے نظریات میں اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ کوئی عملی قدم اٹھانے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم ”برائے احترام صحت و خوش حالی عوام“ کی بنیاد ڈالی اور صحت کا احترام کے نام سے ایک پبلشنگ بھی جاری کیا۔

اب وہ ایک لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ تنظیم ایک ایسا متحرک اور فعال مرکز بن گئی جہاں سماجی طلبہ ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں مستعار لینے کے لیے آتے تھے۔ ان نوجوانوں نے چھوٹے چھوٹے اجتماعات بھی منعقد کرنے شروع کر دیے جن میں چو اور اس کے سماجی سامراجی طاقتوں کی طرف سے چین کو گلے گلے کرنے کی سازشوں کو بے نقاب کرتے تھے۔

یہ خطرناک راہ تھی جس پر وہ بے پکری سے چل رہا تھا۔ نان کھائی کا شارجین کے بہترین اسکولوں میں ہوتا تھا۔ اس لیے طالب علموں کو صحت بھی زیادہ کروائی جاتی تھی۔ ان چھٹی طلبہ میں چوانن لائی نے بہت جلد اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ غیر مذہبی سرگرمیوں میں بھی جوش پیش تھا۔ وہ اسکول کے مقررہ دنوں کی نیم کا امتحان ترقی مقرر تھا۔ وہ بہترین مقرر ثابت ہوا اور اس کی کوششوں سے اس کا اسکول مسلسل دو سال تک دوسرے اسکولوں پر سبقت لیتا رہا۔ اپنی دیگر سرگرمیوں کے باوجود جب وہ چار سال بعد 1917ء میں قاریغ تحصیل ہوا تو چوری گلاس میں اس کے

سب سے زیادہ نمبر تھے۔

یہاں سے قاریغ ہونے کے بعد اسے اپنے لیے کسی راہ کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ملازمت تلاش کرنا یا کالج میں تعلیم جاری رکھنا۔ اس کے حالات تو ایسے تھے کہ ملازمت تلاش کرنی چاہیے تھی لیکن اس نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اب سوال یہ تھا کہ چین میں یا کسی دوسرے ملک میں؟ دوسرے ملک میں تو کس ملک میں؟ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جاپان میں تعلیم حاصل کرنا بہتر رہے گا۔ اب رقم کا انتظام کرنا تھا۔ اس نے اپنے بعض دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیا اور ایک خاطر خواہ رقم جمع کر لی۔

اس کا خیال تھا کہ جاپان میں اسے اپنے سوالوں کا جواب ضرور مل جائے گا۔ وہ چین کو چھانے اور اسے سرے سے قیصر کرنے کے لیے تھے راستے تلاش کرنا چاہتا تھا اور ایسے علوم حاصل کرنے کا خواہش تھا جو وطن واپس آنے کے بعد اس کے لیے کارآمد ثابت ہوں۔

وہ انہی خیالوں میں غلطایں جاپان پہنچ گیا لیکن یہاں پہنچ کر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جگہ تعلیم چھڑ چکی تھی اور جاپان اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چین کی حدود میں اپنے مقبوضات میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ اس نے جاپان پہنچنے ہی جاپانی زبان سیکھنی شروع کر دی اور بہت جلد اس کی قواعد پر عبور حاصل کر کے اخبارات کے مطالعے پر قادر ہو گیا۔

اب وہ کالج میں داخلے کی تیاری کے لیے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

اسی دوران انقلاب روس کا واقعہ پیش آیا اور مزدوروں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کی توجہ اپنی کتابوں سے زیادہ اس طرف مبذول ہو گئی۔ وہ امتحان کی تیاری کی بجائے دنیا کے پہلے سوشلسٹ ملک میں ہونے والے واقعات کے بارے میں تمام دستیاب تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا۔

حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ اسے عملی میدان میں بھی کودنا پڑ گیا۔ جاپان میں متحد چینی طلبہ تک بے خبر چینی گروہان چینی ڈو کی حکومت، جاپان کے ہاتھوں چین کی خود مختاری کا سودا کر رہی ہے۔ یہ سننا تھا کہ چینی طلبہ بھڑک اٹھے۔ انہوں نے جاپان کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں اور مظاہروں کا انعقاد ہونے لگا۔ چوانن لائی ان مظاہروں میں جوش پیش تھا۔ اپنی شعلہ بار تقریروں سے

چینی طلبہ کا لیڈر مگر رہا تھا۔

چینگ سے تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں۔ جنگی سرداروں کی حکومت عوام کے اس مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ جاپان کے ہاتھوں چین کو فروخت کرنے کا عمل ترک کر دیا جائے۔ کئی جگہ بے عوام پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ چونے متناہب سمجھا کہ وہ چین واپس جائے اور اس جگہ میں اپنا کروا دے۔ اس نے اپنا تعلیمی مستقبل داؤ پر لگا دیا اور وطن کی حفاظت کے لیے عازم وطن ہو گیا۔

اس نے یہاں آکر دیکھا کہ چین کے بارے میں جو کچھ سناتا تھا حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ ہر شخص مضطرب ہے ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ حالات کی تبدیلی وقت کا سب سے بڑا نقصان بن چکی تھی۔

4 مئی 1919ء کو وطن پرست طلبہ نے جنگی سرداروں کو اکھاڑ پیچنے کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک نے چینگ میں نفرت اور تشدد کے شعلے بھڑکا دیے۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھاروں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ایک بڑا احتجاجی جلسوں لگا گیا جس میں طلبہ کے ساتھ ساتھ عوام بھی شامل تھے۔ جلسے میں بھرا ہوا یہ کھیم ایک وزیر کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچا اور اسے نذر ویش کر دیا۔ پولیس نے اس کھیم کو منتشر کر دیا لیکن طلبہ کو یہ یقین ہو گیا کہ طاقت کے ان مظاہروں سے وہ حکومت کو کراکتے ہیں لیکن اس کے لیے حمد ہونے کی ضرورت ہے۔

چینگ کے طلبہ کے اس احتجاج نے قریبی شہر تیان جن کے طلبہ کے لیڈر کو بھی گرا دیا۔ وطن پرستانہ سرگرمیاں منظم کرنے کے لیے ایک طلبہ یونین کا قیام عمل میں آ گیا۔

اس یونین کے پہلے اجلاس ہی میں یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ یونین کے ترجمان کے طور پر ایک اخبار جاری کیا جائے اور اس کے ذریعے جائیداداری کے خلاف جدوجہد کے لیے رائے عامہ ہمار کی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ایڈیٹر کے بتایا جائے۔ یونین کے رہنما ایڈیٹر کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔

ان رہنماؤں کو معلوم ہوا کہ چوانن لائی واپس آ چکا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ اپنی صلاحیتیں منوایا تھا۔ ان رہنماؤں کی نظر اس کی طرف گئی۔ چو تو وطن واپس آنے کے بعد جدوجہد کے لیے بے چین تھا اس نے فوراً یہ فتنے داری قبول کر لی۔

21 جولائی 1919ء کو تیان جن اسٹوڈنٹ کا پہلا شمارہ شائع ہو گیا جس کی پیشانی پر یہ حرف بھجوا دیے تھے۔ ”جمہوریت عوام کی، حکومت عوام کے ذریعے، عوام کے لیے۔“

یہ اخبار پختے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اس میں شامل وطن پرستانہ جذبات پر بھی مضامین اور سادہ زبان نے اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس کی تعداد اشاعت میں بڑا تکلف کی اور اسے دو دن سے شائع کر دیا گیا۔

”مرد اور عورت کے درمیان مساوات قائم کی جائے اور جاگیر دارانہ رسوم کی ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے جن میں وہ بکڑی ہوئی ہیں۔“

ان خیالات کا اظہار ہوتا تھا کہ یہ اخبار عورتوں میں بھی مقبولیت حاصل کر گیا۔ یہ مقبولیت تیان جن سے نکل کر شمالی چین کے دوسرے علاقوں تک پھیل گئی۔ چوانن لائی صرف ایڈیٹر نہیں تھا۔ اس کا قلم ایسے مضامین تخلیق کر رہا تھا جن کا معیار اور دیکھنے والے عوام کو باتوں پر اکسارتے تھے۔ ”جاگیر دارانہ لوگر شاہی کی نظم رانی کے خاتمے کے لیے بھرپور جدوجہد کی جائے۔“

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالبات نے بھی عورتوں کی وطن پرست تنظیم کے نام سے ایک تنظیم قائم کر لی پھر طلبہ کی قوت میں اضافے کے لیے دونوں تنظیمیں ایک دوسرے میں ضم ہو گئیں اور اسے تنظیم بیداری کا نام دیا گیا۔ دونوں جانب سے دس دس اراکین مرکزی تنظیم میں شامل ہوئے۔

انہی دس اراکین میں ایک مسلمان لڑکی تنگ تنگ چھاؤ بھی تھی جس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ یہ تنظیم کی سب سے کم عمر رکن تھی۔ اس لڑکی میں کوئی ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ چوانن لائی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ وہ بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہہ دے دل دے بیٹھا تھا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ ذاتی مفادات کو اولیت دی جاتی۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے رہے لیکن کبھی کسی جانب سے اظہار محبت نہ ہوا۔ دینے والے اچھے دوست بن گئے۔

چوانن لائی کی سفارش پر ایک رسالہ بیداری کے نام سے جاری کیا گیا۔ شاید چوانن لائی کا مقصد یہ بھی ہو کہ اس طرح وہ لڑکی اس کے قریب رہے گی لیکن وائے قسمت کہ اس کا صرف ایک شمارہ شائع ہوا لیکن اسے دونوں میں اسے یہ معلوم ہو گیا کہ تنگ تنگ چھاؤ ایک نہایت متاثر کن مقررہ ہے اور بے حد سیاسی سمجھ بوجھ رکھتی ہے۔

جنوری 1920ء میں اس وقت حالانکہ نازک ہو گئے جب پولیس نے طلبہ تحریک کو کیڑے کی ٹھکانہ بنی۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہونے لگیں۔ گرفتار ہونے والوں میں چوان لائی اورنگ بنگ چھاؤ بھی تھی۔ جو طلبہ گرفتار نہیں ہو سکے تھے انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ گرفتار ہونے والے طلبہ بھی جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ حکومت خوف زدہ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ ہٹلر نے چین کو اپنی لیٹ میں لے لیتے ان کو طلبہ گورنر بنا کر دیا گیا۔

فرانسیسی حکومت نے "مینی فرانسیسی تاون بنگ فز" سے ایک ورک اسٹڈی پروگرام شروع کیا تھا۔ پارٹی نے چوان کو اس پروگرام میں شرکت کی اجازت دے دی۔ وہ تقریباً دو سو طلبہ کے ساتھ بحری جہاز کے ذریعے چین سے فرانس روانہ ہو گیا۔ بنگ بنگ چھاؤ ایک پرائمری اسکول میں منیجر بن گئی۔

وہ فرانس پہنچا تو پانچ سال کا پختہ کاری سیاسی لوجوان تھا جو کی تحریکیں چلانے کے بعد کنڈن بن چکا تھا۔ اس کی فرانس آمد ان مینی لوجوانوں کے لیے نہایت پرکشش ثابت ہوئی جو چین سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ چوان لائی ان سب میں ممتاز تھا کیونکہ اس نے جاپان میں دو بار کمزور اور ذی سوویت ریاست کے بارے میں خاطر خواہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ پکا کمیونسٹ بن چکا تھا۔ فرانس آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مارکسزم کے مطالعے کو جاری رکھے اور چین کے مصائب کا علاج دریافت کرے۔ وہ ان دونوں مقاصد کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مسلسل مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے ماری لٹریچر کے مطالعے کے لیے انوکھا طریقہ دریافت کیا تھا۔ وہ خود کو بیوروکریٹ میں لیٹ کر مطالعہ تک محدود رکھتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتا تھا اس کے عملی نمونے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر بیرون کے مضافاتی علاقے میں رہائش اختیار کی اور فرانسیسی کارخانوں میں ملازمت کی تاکہ مزدوروں کی زندگی کو قریب سے دیکھ سکے، ان کے مسائل سے واقف ہو اور فرانسیسی طرز معاشرت کو جان سکے۔ اس کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہا اور محنت کش طبقے کے مسائل بھی اس کے علم میں آتے رہے۔

ایک روز وہ اپنے ہوٹل میں بیٹا کی کتاب کے صفحے الٹ رہا تھا کہ اس کے نام چین سے ایک خط آیا۔ ایسے خطوط آتے ہی رہتے تھے لیکن اس پوسٹ کارڈ کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکا تھا کیونکہ یہ اس شہر سے آیا تھا جہاں بنگ بنگ چھاؤ

رہتی تھی۔ اس کا اعجاز وہ درست لگا، جب خط پڑھنے سے پہلے اس نے یہ دیکھا کہ خط اس کی دوست بنگ بنگ چھاؤ کی جانب سے ہے۔ آخر وہ مجھے فراموش نہیں کر سکی، اس نے دل ہی دل میں کہا اور خط پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ خط بارش کا پہلا فقرہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد دونوں طرف سے خط و کتاب شروع ہو گئی۔ شروع میں ان خطوط کی نوعیت خالص سیاسی تھی لیکن پھر فطری طور پر ان خطوط کی نوعیت بدل گئی اور یہ خطوط بھی معاملات پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ بے تکلفی کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کا احساس بھی نمایاں ہونے لگا۔ نتیجے میں خطوط کی تعداد بڑھنے لگی۔ وہ تقریباً روز اسے خط لکھنے لگا۔ اسے ہی خط اسے وصول ہونے لگے۔

اب شاید وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ بنگ سے وہ شادی کر لے گا۔ بعض خطوط میں اس نے یہ اشارے کر بھی دیے تھے۔ وہ ابھی فرانس ہی میں تھا کہ چین کے شہر شنگھائی میں مینی کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ماؤزے بنگ اس کے بانی مندوبین میں سے تھے۔

اس سے بھی بڑا اتفاق یہ ہوا کہ اس سے پہلے چوان لائی اور یورپ میں منیجر دوسرے مینی ماری کی اپنی عظیم "کمیونسٹ گروپ" کر چکے تھے۔ اب جبکہ چین میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کمیونسٹ گروپ کے اراکین کو باقاعدہ اراکین کی حیثیت دے دی گئی۔ مینی کمیونسٹ پارٹی کی جیس شایع کو "یورپی جرنل پرائی" کا نام دیا گیا جس کا منتخب منیجر چوان لائی تھا۔

یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ چوان لائی کسی عہدے پر فائز ہو اور اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کوئی جریدہ جاری نہ کرے۔ وہ اخبارات کی اہمیت کا جائل تھا اور ایڈیٹر شپ کا تجربہ بھی رکھتا تھا لہذا اس نے لاجیویز (خونجی) کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ بعد میں اس کا نام "ریڈر" یعنی سرخ شعاع رکھا گیا۔

یہ اخبار یورپ میں منیجر لوجوانوں کے لیے سے اثر آفرین ثابت ہوا۔ چوان لائی کے مضامین اس میں قوت سے شائع ہوتے تھے۔

چین میں کمیونسٹ اور ملن پرست خلیہ طور پر طاقت جمع کر رہے تھے کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ایسے نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے قدرتشہد کا راستہ اختیار کیا ہوگا۔ زبردست رہ کر سرخ فوجیں تیار ہو رہی ہیں۔ ان کی

سرپرستی ڈاکٹر من کین کر رہے تھے۔ آخر 1924ء میں انہوں نے کارکنوں سے اپیل کی کہ چین کو شمال کے جنگی سرداروں کی حکومت سے نجات دلانے کے لیے "کواکگ چوان" سے شامی ہم کار کا آغاز کیا جائے۔

قوم پرست اور کمیونسٹ پارٹی کی فوجیں متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور شمال کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ یہ پہلی انقلابی فوج تھی۔

کمیونسٹ پارٹی نے محسوس کیا کہ جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس کارکن کم پڑ رہے ہیں چنانچہ اس نے یورپ میں مقیم اپنے اراکین کو کوشاںات انجام دینے کے لیے چین واپس بلا لیا۔ چوان لائی پوری پرائی کا سیکریٹری تھا لہذا اسے بھی آنا پڑا۔ وہ ستمبر 1924ء میں کواکگ چوان گیا۔ اسی شہر سے انقلابی فوج نے اپنی ہم کار کا آغاز کیا تھا۔ انہیں مسلسل کامیابیاں مل رہی تھیں۔ انقلابی فوجیں شرق کی سمت پیش قدمی کر رہی تھیں اور ایک کے بعد دوسرا شہر قبضے میں آتا جا رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے چوان لائی کو خلیہ طور پر شنگھائی بھیجے کے احکام دیے۔ اس نے جیس بدلا اور شنگھائی پہنچ گیا۔ یہ شہر اب بھی جنگی سردار چوان تاگ کے قبضے میں تھا۔ چوان لائی کو یہ مشن سونپا گیا تھا کہ وہاں کے مزدوروں کو ایک صحیح بنیاد کے لیے تیار کریں تاکہ اندر سے بنیاد کر کے اس شہر پر بھی قبضہ کیا جاسکے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس سے پہلے دو بنیادیں نام کام ہو چکی تھیں۔ اس تیسری بنیاد کو پرحال میں کامیاب کرنا تھا۔

چوان لائی نے شنگھائی پہنچنے ہی جائزہ لیا شروع کیا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے پہلے دو بنیادیں نام کام ہو گئیں۔ جلد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس کا سبب منظم قیادت کا فقدان تھا۔ پچھلی قیادت نے رابطہ ہم ٹھیک طور پر نہیں بنائی جس کی وجہ سے مزدور متحد نہیں ہو سکے۔ انہیں بروقت کارروائیوں کی اطلاع نہیں مل سکی۔ انہیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔

وہ جیس بدلے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کارکن چوان لائی شنگھائی میں داخل ہو چکا ہے۔ اسے موقع بھی اچھا مل گیا۔ شامی ہم میں حصہ لینے والی فوجیں شنگھائی کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ حکومت کی تمام قوتوں نے ان باغیوں کی طرف تھی۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

جنگی سرداروں چوان تاگ سخت بدحواس تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ باغیوں نے شنگھائی کے چند مضافات پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنے مہمے داروں کو بلا لیا اور ان سے مشورہ کیا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ شامی اندر سے خطر نہیں ہے۔ اپنی تمام فوجی طاقت باغیوں کو شنگھائی میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے استعمال کی جائے۔

جس وقت یہ مشورے ہو رہے تھے مین اسی وقت چوان لائی جس نے فرضی نام کو ان شک رکھا تھا ایک خلیہ مقام پر مزدور یونین کے چند سرگرم رہنماؤں سے مشوروں میں مشغول تھا۔

زیادہ دیر ایک مقام پر ٹھہرنا حفاظتی نقطہ نگاہ سے مناسب نہیں تھا۔ سب نے طے کیا کہ اب چوان لائی کی قیام گاہ پر چلا جائے۔ وہ چوان لائی سمیت کل پانچ افراد تھے۔ وہ سب خاموشی سے بیڑ حیاں اترے لیکن سڑک پر جانے سے پہلے ان میں سے ایک آگے آگیا کہ اگر خطرہ ہو تو اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر سکے۔ وہ کچھ دیر بعد سڑک کا ایک پکڑ لگا کر واپس آگیا پھر سب لوگ سڑک پر کچھ دور گئے اور پھر واپس طرف ایک گلی میں مڑ گئے۔ ایک گلی انہیں دیکھ کر بھونکا اور پھر دم دبا کر ایک طرف بھاگ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک مکان تھا جسے جھاڑیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے اندر لوہے کی بیڑ حیاں تھیں۔ ان سب نے ادھر ادھر دیکھ کر ابھی طرح اطمینان کر لیا اور بیڑ حیاں چڑھ گئے۔ بیڑ حیاں ختم ہوتے ہی دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ ایک رہنما نے دنگ دی، اندر سے آواز آئی۔

"کون؟"
"کوان شک۔" رہنما نے چوان لائی کا فرضی نام لیا۔
دروازہ کھل گیا۔
"سب ٹھیک تو ہے نا؟" چوان لائی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہے۔" چوان لائی نے کہا۔ "ابھی ابھی حکومت کا ایک آدمی میرے پاس سے اٹھ کر گیا ہے۔"
"حکومت کا آدمی یہاں تک آیا اور تم کہتے ہو سب خیریت ہے؟"
"خیریت اس لیے ہے کہ وہ اپنا ہی آدمی ہے۔ حکومت کی خبریں پہنچا تا رہتا ہے۔"

"تو یہ بات ہے، تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ اب بتاؤ کیا خبر لایا تھا؟"

"حالات بہت امید افزا ہیں۔ اگر اس وقت ہم کوئی عملی قدم اٹھا سکیں تو ہمیں کامیابی ہوگی۔ تمام نوٹیسز بروڈی خطرے کے دفاع کے لیے سرگرم ہیں۔ کسی کو یہ احساس ہی نہیں کہ اندر سے بھی بقاوت ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس بے خبری سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

آدھی رات گزر چکی تھی۔ مذاکرات کے کئی دور ہو چکے تھے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ 21 مارچ کو عام ہڑتال کا آغاز کیا جائے گا اور اس کے بعد مسلح قوت کے ذریعے سرکاری دفاتر پر قبضہ کر لیا جائے گا۔

"ساتھیو! اشتعلاتی سات و ستر کنوں میں محترم ہے۔ ہمیں ان پر بیک وقت یلغار کرنی ہے۔ ہراول میں پانچ ہزار مزدور ہوں گے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے مزدوروں کا انتخاب کرنا ہوگا جو تجربہ کار ہوں یعنی چھٹی بتاتوں میں بھی حصہ لے چکے ہوں۔"

ہندوؤں کی تعداد ان کے پاس کم تھی۔ اس کی کوئی پورا کرنے کے لیے چوآن لائی نے ایک تجویز دی جس پر سب نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ چوآن لائی کی ذہانت کی داد دینے بغیر نہ رہ سکے۔

"ہینرول کے خالی کنستروں میں پٹائے ڈال کر متواتر دھماکے کیے جائیں۔ اس سے یہ تاثر ملے گا کہ ہم مشین گنوں سے فائرنگ کر رہے ہیں۔"

کئی دن تک بڑی رازداری سے تیاری کی جاتی رہی اور پھر مقررہ تاریخ کو اپنا ایک مزدوروں نے کام چھوڑ کر ہڑتال کا آغاز کر دیا۔ ہزاروں ہائیوں نے اپنا ٹک ڈھن کو جالیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس آفیشیوں اور دوسرے مضبوط قوتوں کا محاصرہ کر لیا۔ تیس گھنٹے تک بے نیکی سے لڑتے رہے۔

چوآن لائی کی سربراہی میں یہ بقاوت کامیاب ہوئی۔ حکام ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ چھٹائی پر قبضہ ہو گیا۔ یہ ایسی کامیابی تھی جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کامیابی نے چوآن لائی کی قائدانہ صلاحیتوں پر مصرت گردی۔ اب اس کی شہرت پوری دنیا میں پھیل چکی تھی۔

انقلابی بقاوت کے ساتھ اس کا تذکرہ ناگزیر ہو گیا تھا۔

دائیں بازو کا گروہ جیابک کالی فیک کی فوجوں کی ہر اسی میں چوآن لائی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا جو چھٹائی سے دفعتاً غائب ہو گیا تھا۔

ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا وہ جنگ بیک چھاؤ سے نکلیں مل سکتا۔ یہ ایک سال تو جین میں آنے کے بعد کا عرصہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے لگ سے ملے پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس دوران ان کا رابطہ صرف خطوط کے ذریعے تھا۔ ان خطوط کے ذریعے ہی وہ شادی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ فرانس سے جین آنے کے بعد اسے فرائض منصبی انجام دینے میں وہ ایسا مصروف ہوا کہ جنگ سے ملاقات کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ دونوں شادی کرتا چاہتے تھے لیکن قسمت انہیں ایک جگہ جمع ہی نہیں کر رہی تھی۔ اس کا حال تو یہ تھا کہ طوقان سے بھی لڑنے سے ہی بھی بچانی ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس نے جنگ کو کسی جگہ دھکیلا یا اور جب تک وہ پہنچتا تھا تو کوئی ایسا رخ اختیار کر لینے کو چاہتا تھا کہ وہ پڑ جاتا۔ دونوں آگے پیچھے دوڑ رہے تھے لیکن ایک جانیوں پر رہے تھے۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ جنگ کا تبادلہ کو تک چھو گیا۔ وہ جنوب کی طرف سفر کرتی ہوئی پہلے چھٹائی کی اور پھر کو تک کی طرف روانہ ہو گئی جہاں اس کا محبوب چھو موجود تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے پہنچ گئی۔ اس نے اپنی آمد کی خبر اس تک پہنچادی تھی اور یہ امید کر رہی تھی کہ وہ اپنے ماسل پر آئے گا۔ چھو کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی اس سے ملے بلکہ اس سے شادی کرنے کو تک چھو پہنچنے والی ہے۔

کو تک چھو میں سیاسی سرگرمیاں مروٹ پر تھیں۔ باقی فوجیں مختلف شہروں میں سامراجی طاقتوں سے تھرو آ رہی تھیں۔ پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ چوآن لائی کو وائیکٹر کی حیثیت سے ہیڈ کوارٹر میں موجود رہنا ہوتا تھا لیکن پھر بھی کوئی معمولی حیثیت اس سے ملنے نہیں آ رہی تھی کہ وہ نظر انداز کر دیتا۔ اسے اپنی عیوب کو دیکھتے ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ دونوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ جس شہر میں بھی ایک جانی کا موقع ملا وہ شادی کر لیں گے۔ یہ موقع مل گیا۔ جنگ بیک چھاؤ اپنی ملازمت پر آ رہی تھی۔ چوآن لائی وہاں موجود تھا۔

چوآن لائی نے ماسل پر جانے کے لیے وقت نکال لیا تھا لیکن مین وقت پر حالات ایسے ہو گئے کہ اس کے لیے ہیڈ کوارٹر سے نکلتا ممکن نہ رہا۔ اس نے جلدی جلدی جنگ کی ایک تصویر تلاش کی اور اپنے نائب کو طلب کیا۔

"چمن لگ، میں نے تمہیں ایک ذاتی کام سے بلا

ہے بلکہ اگر غور کرو تو یہ بھی پارٹی ہی کا کام ہے۔ میں تمہیں ایک تصویر دے رہا ہوں۔ یہ لڑکی تھیان جین کی پارٹی عظیم سے وابستہ ہے۔ تم یہ تصویر لے کر گووی پر چلے جاؤ۔ یہ لڑکی کشتی سے اتر کر تھیں مجھے تلاش کرنے کی۔ اس تصویر کی مدد سے اگر تم اسے پہچان سکو تو اسے لے کر میرے پاس چلے آنا اور وہاں اس سے میری طرف سے معذرت بھی کر لینا کہ میں اسے لینے نہ آ سکا۔"

چمن لگ نے وہ تصویر لے لی اور گووی پر پہنچ گیا لیکن پارٹی کو شش کے باوجود وہ اس تصویر کی مدد سے جنگ کو پہچان نہ سکا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ تصویر پانچ سال پہلے کی تھی شاید اس لیے بھی وہ اس تک نہ پہنچ سکا کہ گووی پر بھیڑ بہت تھی۔

جنگ یہ امید لے کر آئی تھی کہ چوآن لائی کے استقبال کے لیے گووی پر موجود ہوگا۔ وہ بھیڑ میں اسے وصول نہ کر سکا اور پھر بائیں ہو کر ایک طرف چل دی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے پاس چو کی رہائش گاہ کا پتا موجود ہے۔ اس نے اس پتے کو اپنی طرح و گھنٹن میں کیا اور وہاں پہنچ گئی۔ وہ ایک چھوٹی سی بلڈنگ تھی جس میں چو نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ یہ کمرہ اٹھارہ بتا تھا تاکہ اگر کوئی دوست اس کی غیر موجودگی میں آئے تو وہ اس کی دانہی تک آرام کر لے۔ اس کے کمرے میں تھا ہی کیا جو کوئی پوری کر لیتا۔ جنگ کمرے میں داخل ہوئی اور چو کی بے پروائی پر تعجب کے بغیر نہ رہ سکی۔ کوئی اس طرح بھی کمرہ کھلا چھوڑ کر جاتا ہے؟ یہ ایک کمرہ بھی سلینگ کا نہیں تھا۔ چو کی اوجھر اوجھری ہوئی تھی۔ چو نے بھی کیا چائے بنانے کے کچھ برتن تھے یا کتا نہیں۔ اس نے آتے ہی کمرے کی جھانپ بچھ کی۔ کتا بھی سلینگ سے بھاگ گیا۔ جنگ کی چادر دست کی اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ وہ اندر سے چٹکی لگا نہیں ہوئی تھی۔

چوآن لائی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے نائب کو جنگ نہیں مل سکی تو وہ یہ سمجھا کہ جنگ کو کسی وجہ سے آنے میں تاخیر ہو گئی ہے۔

وہ رات بھر گھر واپس آیا اور کمرے کو اندر سے بند پایا تو وہ کمرے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس کا مطلب ہے جنگ پہنچ گئی ہے۔ اندر اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔" اس نے دنگ دی۔

"باہر کون ہے؟" جنگ نے آواز پہچان لی تھی تو رازہ وہ اندر کھول دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ

رہے تھے جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں پھر جیسے جنگ کو ہوش آ گیا۔

"بیارے چو، اب اندر بھی آ جاؤ یا باہر ہی کھڑے رہو گے۔" چوآن لائی اندر آ گیا اور جنگ کو بے اختیار اپنی ہانہوں میں لے لیا۔

"ہم پورے پانچ سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔" چو نے کہا۔

"اور اس امید پر کہ اب ہمیشہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے۔"

"ابھی ہماری مشقیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ وطن کی آزادی ابھی بہت دور ہے۔ اس کے لیے ہمیں بار بار ایک دوسرے سے جدا ہونا ہوگا۔"

"میں ثابت قدم رہوں گی چو۔" جنگ نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم مجھے لینے گووی پر کیوں نہیں آئے جبکہ میں تمہیں اطلاع دے چکی تھی؟"

"میرا ہیڈ کوارٹر میں رہنا بہت ضروری تھا۔ برطانوی حکام کے خلاف کو تک چو اور بائیک کا جنگ کے مزدوروں کی ہڑتال کی رہنمائی میرے ذمے رکھی گئی ہے۔ میں تمہیں لینے نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ایک نائب کو تمہارے استقبال کے لیے بھیج دیا تھا لیکن وہ تمہیں وصول نہیں سکا۔ شکر ہے میرا ہیڈ کوارٹر تمہارے پاس تھا۔"

"اور یہ کیا ہے پروائی ہے تمہارا کمرہ کھلا ہوا تھا۔ تالا ڈالنے کی زحمت بھی نہیں کرتے ہو۔"

"سوچو، اگر تالا ہوتا تو تمہیں کمرے سے باہر بیٹھ کر راہ واری میں میرا انتظار کرنا ہوتا۔ میری اس عادت نے تمہیں بہت بڑی زحمت سے بچالیا۔" اس نے جنگ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

وہ رات انہوں نے باتوں میں گزار دی۔ دوسرے دن اسے جنگ کو شریک حیات بنانا تھا۔ یہ باتیں اسی شادی کے گروہمردی تھیں۔ چوآن لائی اسے نشیب و فراز بھارہا تھا۔ ان خطرات سے آگاہ کر رہا تھا جین میں وہ گھر ابوا تھا۔ جنگ ان خطرات سے لاعلم نہیں تھی۔ اس نے عہد کیا کہ وہ چوآن لائی کو اس کے فرائض سے نہیں روکے گی اور ہر طرح اس کا ساتھ دے گی۔

دوسرے دن چو نے چند پارٹی ساتھیوں کی موجودگی میں جنگ سے شادی کر لی۔

یہ دور نہایت پُر آشوب تھا۔ انقلابیوں کو کئی شہروں

میں تسلط حاصل ہو گیا تھا لیکن حکومت کی فوجیں ان کا برابر پیچھا کر رہی تھیں۔ شادی کو چند روز ہی گزرے تھے کہ چوہان لائی کو روپوش ہونا پڑا۔ اس نے ہمیں بدلا اور سکی کے ذریعے جیہ چٹا تک گیا اور وہاں سے نان چھپا تک روانہ ہو گیا۔ یہ بات اس کے لیے طمانیت کا باعث تھی کہ نان چھپا تک کے پبلک سیکورٹی بیورو اس کے قریبی دوست چوہان کے جو پانچ سال قبل اس کے ساتھ برلن میں کام کر چکے تھے۔ انہوں نے اسے اپنی ذاتی رہائش گاہ میں ٹھہرایا جہاں کسی ٹائپسٹ یا آدی کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے پیچھے چھپے پارٹی کے دوسرے سرگرم اور مخلص اراکین بھی قفل تھے اور مختلف جگہوں پر روپوش ہو گئے۔ ان کے خفیہ اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ کئی اجلاسوں کے بعد یہ طے کیا گیا کہ رات کے سنانے میں بغاوت کا آغاز کر دیا جائے۔ بغاوت کے لیے وہ پیشہ ورانہ فوجی تیار کھڑے تھے جو سوویت یونین سے واپس آنے کے بعد کیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ پبلک سیکورٹی دستوں کے ساتھ کل کر ان کی تعداد تیس ہزار ہو گئی تھی۔ انہیں حکومتی دستوں کے مقابلے میں عددی برتری حاصل تھی جن کی تعداد دس ہزار تھی۔ انقلابی فوجوں نے کواٹک چو اور صوبہ کواٹک کے دوسرے کئی اہم علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی لیکن اس بغاوت نے مزدوروں اور کسانوں کی سرخ فوج کو جنم دے دیا جو آئندہ کئی صر کے سر کرنے والی تھی۔

یہ آگ کچھ فٹھری پڑی تو چوہان لائی پھر کواٹک چو میں اپنی بیوی سے آٹا ملچیرے چدائی اور ملاپ ان کی زندگی کا معمول بن گئی۔ جب ان کے درمیان جدائی کا مرحلہ آتا تو ہر پارٹیکلپس ہوتا کہ اب وہ دوبارہ بھی نہیں ملیں گے کیونکہ چاک کر فائی یا چھائی کی سزا مقتدر بن چکی تھی۔ یہ جوڑا ان خطرات کا پامردی سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اب اس شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔

شگھائی کے حالات دیگر گرو تھے۔ وہاں کیونسٹوں کا قبضہ تو ہو گیا تھا لیکن چھپا تک کا ٹیک کی فوجیں اس قبضے کو چھڑانے کے لیے سرگرم تھیں۔ چوہان لائی کو ایک مرتبہ پھر شگھائی جانا پڑا۔ ٹیک اس کے ساتھ نہیں جا سکی کیونکہ اس کے ہاں ولادت متوقع تھی۔

سننے میں یہ آ رہا تھا کہ قوم پرست رہنما کیونسٹوں سے معاہدہ شرکت توڑنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دراصل قوم

پرستوں پر مذہبی رہنماؤں کا زیادہ اثر تھا اور کیونسٹ مذہب کے مقابلے میں انسانیت کو اہمیت دیتے تھے۔ یکوڈا میں بیٹھے مذہبی رہنما کے اشارے پر معاہدہ ٹوٹ جاتا تو ایک بڑا خطرہ یہ تھا کہ جنگی سردار کی فوجیں دوبارہ شگھائی پر قابض ہو جائیں گی۔ اس موقع پر چوہان لائی کا وہاں ہونا بہت ضروری تھا۔ اسی لیے اسے شگھائی بھیج دیا گیا۔ ٹیک کو ولادت کے بعد شگھائی روانہ ہونا تھا لیکن پھر ایسا ہوا کہ کواٹک چو کے حالات بگڑنے لگے۔ پارٹی کا حکم ہوا کہ وہ فوری طور پر کواٹک چو چھوڑ دے۔ دو کامریڈ یہ پیغام لے کر اس کے پاس آئے۔ وہ جس حالت میں تھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ سفر کر سکے۔ پارٹی کا حکم چلا نہیں جاسکتا تھا۔ چوہان لائی شگھائی میں اس کا منتظر تھا۔ بچے کی ولادت کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ہجیری کی حالت میں کوئی ایسی دوا کھائی جس سے اس کا مکمل شائع ہو گیا۔

اس کا علاج کرنے والی نرس اور ڈاکٹر کی مدد سے اسے چوری چھپے کواٹک چو سے شگھائی پہنچا دیا گیا۔ یہ سختی بڑی قربانی تھی۔ اس فرار کے عوض اسے اپنے بچے سے محروم ہونا پڑا۔

وہ شگھائی اس حال میں پہنچی کہ اس کی گود اور پیٹ دونوں خالی تھے۔ چوہان لائی اس کی طرف دیکھنے کی بہت نہیں کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

”اگر میں کواٹک چو چھوڑ کر یہاں نہ آ گیا ہوتا تو ہم اپنے بچے سے محروم نہ ہوتے۔“

”اس میں تمہارا کیا قصور؟ قلمی تو میری ہے۔ مجھے اسقاط کے بارے میں پہلے تم سے بات کر لینی چاہیے تھی۔“

”ہاں شاید میں نہیں روک سکتا۔“

اس وقت چوہان لائی کو بھی اعزاز نہیں تھا کہ ٹیک جو کچھ کر بیٹھی ہے اس کے اثرات کہا ہوں گے۔ اسے تو اعزاز کئی سال بعد ہوا جب ٹیک کے کوئی بچہ نہیں ہوا اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی گی۔ وہ دونوں بچوں کے شیدائی تھے لیکن وطن کی آزادی میں سرگرم رہنے کا یہ جذبہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کہ وہ زندگی بھر بچے سے محروم ہے۔

شگھائی کے مزدوروں کو خود اپنے ہی اتحادیوں کی دغا بازی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے جنگی سرداروں کی حکومت پر قبضہ کر لیا لیکن قوم پرستوں نے ان سے معاہدہ توڑ کر ان پر حملے شروع کر دیے، نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے جنگی سردار چھپا تک کا ٹیک سے معاہدہ کر لیا۔ چھپا تک کا ٹیک

ٹیک کی فوجیں داخل ہوئیں تو کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ شگھائی کل گاہ کا منظر پیش کرنے لگا۔ چوہان لائی اور اس کے بچپن کے زہر زہن پلے گئے۔ ٹیک کے لیے یہ ایک سخت مرحلہ تھا۔

روپوشی کی زندگی گزارتے ہوئے اسے تین سال ہو گئے تھے۔ اس دوران اس کے کئی ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ اب اسے اعزاز ہونے لگا تھا کہ دشمنوں کو اس کے ٹھکانے کا علم بھی ہو جائے گا۔ موت اس کے سر پر منڈا رہی تھی کہ وہ زیر زمین کارکنوں کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک سختی کے ذریعے نکلا اور قحبہ وہاں پہنچی گیا۔ کچھ عرصہ وہاں بھی چھپا رہا اور پھر جوتی چین کے صوبے چھپا تک شہر کے دار الحکومت نان چھپ تک روانہ ہو گیا۔ یہاں وہ کر نان چھپا تک بغاوت کی تنظیم اور رہنمائی کرتا رہا۔

قوم پرستوں کے لیے وہ ایک چھللا دامن گیا تھا جو ہر جگہ سے غائب ہو جاتا تھا ہر جگہ نظر آتا تھا۔ پوری حکومتی طاقت اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

نان چھپا تک سے وہ ایک قریبی شہر ڈوئی چن چلا گیا جہاں ماؤزے ٹیک اور دوسرے کیونسٹ رہنماؤں سے مشورے کے بعد ایک اور بڑی ہم کا آغاز کرنا تھا۔

چھپا تک کا ٹیک نے فوجی قوت ماعت کے قلیل مشرقی چین کے صوبوں چھپا تک صوبہ چھپا تک پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ چھپا تک کے بعد اس نے شگھائی اور پھر ملک کے دوسرے صوبوں میں خون ریزی شروع کر دی۔

یہ خاندانی چین کی تاریخ میں دس سال تک عوام کو خون میں نہلاتی رہی۔

یہ نہایت بڑا شوبہ دور تھا۔ یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ جہاں بھی نہیں کوئی کیونسٹ نظر آئے اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم گرفتاری کا نہیں قتل کا تھا لہذا ایک کیونسٹ کو قتل کرنے کے لیے ایک ہزار غیر حلفہ لوگوں کو بھی قتل کرنا پڑا تو فوجی اس سے باز نہ آتے۔

بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جو کیونسٹ نہیں بھی تھے وہ بھی خوف سے لرزہ برداشت ہو گئے۔ کیونسٹ پارٹی کے اراکین روپوش ہو گئے تھے لیکن فلیپ پولیس کے ایجنٹ کیونسٹوں کی ہوسو گھنٹے پھر رہے تھے لہذا انجنس کا شکار بنے رہے تھے۔ اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بہت سے اراکین اپنی جان بچانے کے

لیے ہجرت بن گئے۔ مشرقی چین کے صوبے شان تو تک کی مقامی حکومت نے ان تعدادوں کی مدد سے کیونسٹوں کے خفیہ ٹھکانوں پر متعدد بار حملے کیے اور بے شمار کامریڈ گرفتار کر لیے گئے۔

چوہان لائی کو اپنے دشمنوں سے زیادہ ان دوستوں پر غصہ آ رہا تھا جو روپوش اراکین کی فحری کر رہے تھے۔ وہ غر بھی تھا اور ثابت قدم بھی۔ اس وقت اس نے بھی ثابت کیا کہ وقت آنے پر وہ سنگ دلی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کا ذاتی محافظ ایک غر آدمی تھا اور چین کے روپوش کرانے میں مہارت رکھتا تھا۔ ایک دن وہ دیکھنے کا مظاہرہ کرانے نے یہ فرض سوچا کہ وہ پارٹی کے اندر تعدادوں کو ختم کر دیں۔

وہ خود اس مشن کی نگرانی کرتا رہا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک اس کے محافظوں نے اسے یہ یقین نہیں دلادیا کہ مشن مکمل ہو گیا۔

پارٹی نے 1934ء میں فیصلہ کیا کہ آزادی کے حصول کے لیے لاگ مارچ کیا جائے گا۔ انقلابی فوج کی انفری میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ جنگی سرداروں کے مظالم نے عام لوگوں کو بھی اس سے بدن کر دیا تھا۔ چوہان لائی اس لاگ مارچ کا سب سے سرگرم رہنما ثابت ہو رہا تھا۔ وہ شہروں شہروں محوم کر لاگ مارچ کے لیے راتے عامہ ہوا کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لاگ مارچ کا یہ سفر انتہائی تکلیف دہ ہوگا۔ جنگوں اور پھاڑوں سے گزرنا ہوگا۔ لاگ مارچ کو ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کیا جائے گا لیکن وہ جس بات کا تجویز کر لیتا تھا وہ کر کے رہتا تھا۔ وہ جسمانی خطرات کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کا اظہار اس پر خطر لاگ مارچ کے دوران بھی ہوا۔ لاگ مارچ کے دوران جی آلود ولدی گھاس کے علاقے سے گزرتے ہوئے اس کا محافظ سخت ملل ہو گیا اور طرفہ تھما شایہ کہ اس کے پاس خدا بھی ختم ہو گئی۔ چوہان لائی سے یہ دیکھا نہیں گیا۔ اس نے اپنا آخری رشتہ اپنے محافظ کو دے دیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اب اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں بچا۔ سفر طویل تھا اور اب اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کے بعد کے دنوں میں اس نے جنگی جڑی بوٹیوں پر گزارہ کیا۔ ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ ناقابل علاج بیماریوں جگہ موت کا قہر خیمہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ خود بھی دیکھ رہا تھا کہ ان جڑی بوٹیوں کو کھا کر کئی لوگ موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ چوہان لائی

کا کہنا تھا کہ اس کا محافظہ میل ہے اسے قذافی سخت ضرورت ہے۔

ان جزی بوٹوں نے بالآخر اپنا اثر دکھایا۔ وہ بارہا کڑ بھار میں جٹا ہو گیا۔ اب اس کے لیے پیدل چلنا دشوار تھا۔ سرکردہ رہنماؤں سے لے کر عام پیادہ فوجیوں تک ہر شخص کے لیے یہ ایک ممکن مسافت تھی اور اکثر یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ ان مشکلوں کو بھہر کر انسان کے بس سے باہر ہے۔ چنانچہ لائی کو اسٹرینچر پر لٹا دیا گیا۔ وہ اس تصور سے بے چین تھا کہ اسے اسٹرینچر برداروں نے اٹھا رکھا ہے جبکہ پارٹی کے فوجی کمیشن کے نائب صدر کی حیثیت سے انقلاب کے لیے اس کی زندگی بہت اہمیت رکھتی تھی اور وہ پیدل چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ جن ساتھیوں نے اسے کنوینس پر اٹھا رکھا ہے وہ کس قدر جسامتی مشقت برداشت کر رہے ہوں گے۔ جہاں خود چلنا مشکل ہے وہاں وہ مجھے اٹھا کر چل رہے ہیں۔ اس کے ساتھی اہلند تھے کہ وہ اسٹرینچر پر لیٹا رہے۔

صوبہ چیاگ کی شہر کے ساحلی علاقوں سے جنوب مغرب میں زردی کی سرسبز تھل ایک خاصے طویل فاصلے تک وہ اسٹرینچر پر لیٹا رہا اور بالآخر اپنی قوت دافع کو کام میں لاتے ہوئے وہ صحت یاب ہو گیا۔

سرہانہ داروں اور جاگیرداروں سے جنگ کرتے اور خانہ جنگی کے مظاہر میں جٹا ہوئے کیونٹوں کو کئی سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس تمام دور ایسے کا بیشتر وقت زیر زمین رہ کر گزارا تھا۔ قدم قدم پر خطرے تھے۔ مسلسل تعاقب ہو رہا تھا۔ ہر طرف خطر بھری ہوئے تھے۔ کون سا رہنما کہاں چھپا ہوا ہے یہ معلوم ہوتے ہی اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ لائی خود بھی کئی مرتبہ موت کے منہ میں جانے سے بچا۔ اس کی قسمت ابھی بھی ورد اس کے کیسے کیسے نامور ساتھی اس راہ میں گم کر دیے گئے۔ چنانچہ ان کے صدمے کو اپنے سینے کا حقیقہ بنائے آگے بڑھتا رہا۔ قوم پرست (کومتاگ) کیونٹوں سے الگ ہو کر محکموں سے مل گئے تھے اس لیے یہ کام مزید مشکل ہو گیا تھا۔ آزادی کی منزل قریب آتے آتے دور چلی گئی تھی۔ چنانچہ لائی جیسا کہ ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہا کہ قوم پرستوں اور کیونٹوں میں کسی طرح مصالحت ہو جائے لیکن سازشیں یہ موقع کب دینے والی ہیں بھر یہ اسباب خود پیدا ہو گئے۔

شمال مشرق میں جاپانی جارحین چین کے ایک بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس موقع پر چاہیے تو یہ تھا کہ سب مل کر یہ دونی دشمن کا مقابلہ کرتے لیکن جنگی سردار چیاگ کا کافی فیک نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جاپانیوں سے لڑنے کی بجائے کیونٹوں کے خلاف جنگ جاری رکھی جائے۔ اس کے اس حکم سے اس کی فوج میں بددی جھل رہی تھی۔ کومتاگ کی فوجوں کی کمان چیاگ کا کافی فیک کے دو جنرل لیاگ اور یانگ کر رہے تھے۔ انہوں نے کومتاگ اور خود اپنی فوج کے جذبات چیاگ کا کافی فیک تک پہنچائے۔

”جناپ، ہمیں چاہیے کہ ہم آپس کی خفیاں بھلا کر برونی دشمن کا مقابلہ کریں۔ دشمن کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔“

”کیا چین میرا وطن نہیں؟ لیکن ذرا سوچو، جاپان اگر یہاں آ بھی گیا تو ہمیں چین سے باہر نہیں نکالے گا لیکن اگر کیونٹ اقتدار پر قابض ہو گئے تو وہ ہمیں چین میں نہیں رہنے دیں گے۔ اس لیے ہمارے اولین دشمن وہ ہیں جاپانی نہیں۔“

”ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر کیونٹ اقتدار میں آ بھی گئے تو ہم اقتدار سے باہر ہوں گے لیکن غلامی کا طوق ہمارے گلے میں نہیں ہوگا کیونکہ ان کا تعلق بھی اسی وطن سے ہے جبکہ جاپان قابض ہو گیا تو ہم غلام ہو جائیں گے۔“

”جاپانیوں سے کسی بھی وقت مصالحت ہو سکتی ہے فی الحال تو ہمیں کیونٹوں کو نیست و نابود کرنا ہے۔“

”قوم پرست آپ کی اس پالیسی سے متفق نہیں ہیں۔ یہ لاوا اندر ہی اندر ٹپ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ کر کیونٹوں سے مل جائیں۔“

”میں نے دونوں کے درمیان غلط فہمی کی ایسی علیج حاصل کر دی ہے جسے یہ دونوں بھی نہیں پا سکتے۔ تم بے فکر رہو۔“

یہ دونوں جنرل بار بار اس پالیسی میں تبدیلی کی درخواست کرتے رہے۔ ان کے نزدیک یہ رویت دیوانگی کے مترادف تھا۔

جب یہ جنرل اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اسے گرفتار کر لیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انہوں نے اسے گرفتار کر لیا کہ جاپانی حملہ آوروں کے خلاف لڑنے پر مجبور کیا جائے۔

اس کے انوائے چین میں ایک پھل چاؤی اور پھر اٹھارنے والے جزیوں کی کوششوں سے آجندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے مذاکرات کا آغاز ہوا۔ ان مذاکرات میں حرکت کے لیے کیونٹوں کی نمائندگی کے لیے چوان لائی کے نام کا انتخاب ہوا۔ چوان لائی پہلی فرصت میں شی آن، صوبہ چیاگ کے دارالحکومت روانہ ہو گیا۔

ان مذاکرات کے تین فریق تھے چیاگ کا کافی فیک، دونوں جنرل اور چیاگ کے سب سے بڑے دشمن کیونٹ جن کی نمائندگی چوان لائی کر رہا تھا۔ چوان لائی اب بہت زیادہ متوجہ خیال کیا جانے لگا تھا۔ لوگ اسے ادب سے مخاطب کرتے۔

ان مذاکرات کے نتیجے میں چیاگ کا کافی فیک اپنی پالیسی پر نظر ثانی کے لیے مجبور ہو گیا۔ چوان لائی کے تدبیر نے صرف یہی نہیں کیا کہ دشمن کا مقدمہ شاندار طریقے سے لڑا بلکہ قوم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ کیونٹوں کے ساتھ اشتراک کر لیں جس طرح وہ دونوں پہلے متحد تھے اور جسے چیاگ کا کافی فیک کی سازشوں نے ختم کر دیا تھا۔

دونوں نے مل کر طے کیا کہ وہ جاپانی جارحین کے خلاف متحد ہو کر مزاحمت کریں گے۔ چوان لائی نے اس موقع پر بے پناہ دہائی کا ثبوت دیا۔ چیاگ کا کافی فیک کیونٹوں کا قدیمی دشمن تھا۔ سیکڑوں کئی ہزاروں کیونٹ اس نے قتل کر دیا ہے۔ اب وہ چوان لائی کے سامنے تھا لیکن چوان لائی نے اس سے انتقام لینے کی کوئی شرط عائد نہیں کی۔ یہ چوان لائی کی حکمت عملی تھی کہ یہ یہ دشمن مذاکرات بہ آسانی کامیابی کی منزل سے ہٹتا رہوئے۔ یہ اس کی شاندار حکمت عملی تھی کہ اب کسی کیونٹ کو زیر زمین کام کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

اس کی ان کامیابیوں نے اسے عالمی توجہ کا مرکز بنا دیا۔

اسے یہ اعزاز حاصل ہو گیا کہ کومتاگ حکومت اور کیونٹوں کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دینے لگا۔ ایک دیر اور سفارت کاری کی حیثیت سے ثابت قدم ضرور تھا لیکن کڑہن کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ ایک تنظیم کی حیثیت میں وہ اپنے اوپر بھی اسی قدر توجہ روا رکھتا تھا جتنی کہ اپنے ہاتھوں پر۔

چوان لائی نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ کسی بھی شخص کے خلاف کسی کسی ایسے شخص کے خلاف بھی اپنے دل میں کینہ

نہیں رکھتے تھے جس نے ان کے ساتھ بازیچہ سلوک کیا تھا۔ ان کی یہ خصوصیت بھی اسی قدر نمایاں تھی کہ وہ کسی ایسے شخص کو نہیں بھولتے تھے جس نے سرکاری طور پر یا ذاتی حیثیت میں انقلاب اور ملک کے لیے اچھا کام کیا تھا۔

اپنی منفرد خوبصورتی کی بدولت وہ پارٹی میں اپنی جگہ بناتے آگے بڑھتے رہے۔ 1943ء میں جب ان کی عمر 45 سال تھی وہ زمانہ جنگ کے دارالحکومت چونگ چینگ میں کیونٹ پارٹی کے وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے سات اصول مقرر کیے تھے اور آجندہ دونوں میں وہ ان اصولوں پر عمل کرتے بھی رہے البتہ وہ اس اصول پر عمل نہ کر سکے جس کے مطابق اپنی صحت اور نظریہ توجہ دینے کے پابند تھے۔ وہ عوام کے لیے تو دن رات کام کر سکتے تھے لیکن اپنی صحت کے لیے چند لحاظ بھی نہیں نکال سکتے تھے۔ انہیں ہفتے کے سات دن رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے لیے ورزش کا وقت ہی نہیں نکال پاتے تھے البتہ دوسروں کے لیے ان کے پاس بہت وقت تھا۔ وہ انہیں فیض پہنچانے کے لیے ہر وقت بے چین رہتے تھے۔ ان کے نزدیک پارٹی صرف اسی طرح قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ معلوم کر سکتی ہے کہ عوام کیا سوچ رہے ہیں اور ان کے کون سے مسائل فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ عوام کے وجود کے بغیر وہ پرو جو کو لائیں کھتے تھے۔

وہ اس روز تصویروں کی ایک نمائندگی دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر ایک ایسی پینٹنگ آویزاں تھی جس میں جیبرین ماؤزے ٹگ اور مارشل چوہ کو ایک عوامی پارک میں کھلتے ہوئے دکھایا گیا تھا لیکن ان کے نزدیک یاہن منظر میں ایک بھی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چوان لائی کی نظر اس تصویر پر پڑی تو ان کے ہاتھ پر شکنیں ابھراں گئیں۔

”عوام کہاں ہیں؟“ چوان لائی نے کہا۔ ”تفریح کے لیے آئے والے دوسرے لوگ کہاں ہیں۔ کیا انہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے؟“ اس سرزنش پر منتقم کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

وزیراعظم بننے کے بعد بھی ان کا یہی عالم رہا۔ وہ بے دھڑک عوام کے محلوں میں مٹس جاتے تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے مکمل کر گفتگو کرنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کے ذہن میں اس بات کا ہلکا سا بھی تصور نہیں ہوتا تھا کہ وزیراعظم ہیں۔ وہ بڑی جزی سے پارٹی میں اپنی جگہ بن رہے تھے۔

جین، جاپان جنگ کے دوران (1937) ایک ڈپلومیٹ کی حیثیت سے انہوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ انہیں چینی کمیونسٹ پارٹی میں امور خارجہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بیرونی امور سے متعلق پارٹی کا پہلا دفتر دوہان (وٹمن) کے ایک ہوٹل کے ایک خستہ حال کمرے میں کھولا گیا۔ اس کا عملہ صرف تین چار افراد پر مشتمل تھا۔ یہی دفتر تھا یہی بیڑم تھا۔ دو نوٹے چھوٹے ٹائپ رائٹر اس دفتر کی کل ملکیت تھے۔

اس کمرے میں وہ غیر ملکی مہمانوں سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ یہ غیر ملکی اس کمرے کی حالت دیکھ کر بیٹھا حیران ہوتے ہوں گے اور اس سے بھی زیادہ حیران وہ یہ دیکھ کر ہوتے تھے کہ اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہوا چرائن لائی مستعدی کا مجسمہ ہے۔ ان کا علم وسیع ہے، حالات سے پوری طرح باخبر ہے اور جنگ و سیاسی صورت حال کا نہایت گہرائی سے تجزیہ کرتا ہے۔ ان کی پریس کانفرنسوں میں امریکا، برطانیہ، فرانس اور دوسرے ممالک سے متعلق رکھنے والے صحافی شریک ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صحافی نے ان سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

”شاید آج سے بیس سال بعد ہم اس بات پر غور کریں گے کہ ہمیں چرائن لائی کو جاننے کا شرف حاصل تھا۔“
ہندوستانی صحافی ہاسونے اسے نوٹے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ میں اس بات پر اب بھی غور میں کرتا ہوں۔“

انہوں نے اپنے محلے کو بھی اپنی طرح مستعد بنا دیا تھا۔ ان کے سامنے انہوں نے پانچ اصول بیان کیے تھے جن پر انہیں عمل کرتا تھا۔

- 1۔ اپنی آنکھوں کو مصروف رکھنا یعنی مطالعے میں مصروف رہنا۔ مارکیٹ لڑچک اور ماڈرنے تک کی تحریروں اور پارٹی کی پالیسیوں کا مطالعہ کرنا۔
- 2۔ اپنے کانوں کو مصروف رکھنا یعنی جنگ اور ملک کے بارے میں لوگوں کے خیالات سنتا اور ان کی آراء سے دفتر کو مطلع کرنا۔
- 3۔ اپنی زبان کو مصروف رکھنا یعنی پارٹی کی پالیسیوں اور اصولوں کا پرا کرنا۔
- 4۔ اپنے ہاتھوں کو مصروف رکھنا یعنی دوسروں کی بجائے اپنے آپ پر انحصار کرنا۔
- 5۔ اپنی ناخنوں کو مصروف رکھنا یعنی دوڑ بھاگ کرنا۔

اس بات کا انتظار کیے بغیر کہ کوئی خود آکر ہمارے دروازے پر دستک دے۔

ان کا عملہ ان کی نصیحتوں پر عمل کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ضروری سہولتوں کے فقدان کے باوجود انہوں نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

1938ء میں دوہان پر جاپان کا قبضہ ہو گیا۔ اس قبضے کے بعد دفتر کو ایک اور مقام چھوٹک چینگ تھل کر دیا گیا۔ یہاں ملکہ یوہا دیا گیا اور یہ ملکہ چرائن لائی کے ذریعہ کمرانی کام کرنے لگا۔ یہاں دوہان کے مقابلے میں سبکدوش زیادہ تھے لیکن معاملات روز بروز پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ قوم پرست ایک مرتبہ جاپان کے ساتھ دینے اور کیونشوں پر حملے کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس موقع پر چرائن لائی کی دانش مندی اور بہترین خارجہ پالیسی نے قوم پرستوں کے کان کھڑے کر دیے۔ وہ کچھ رہے تھے کہ جاپانی جارحیت مغربی مفادات پر کڑی ضرب لگا رہی ہے۔ لندن اور واشنگٹن، چین پر اپنا نظریہ قائم رکھنے کے لیے بے قرار ہیں اس لیے وہ کسی بھی طرح اندرونی چپقلش کو یوہا جانے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ آپس کی لڑائی کا فائدہ جاپان کو پہنچتا۔ انہوں نے سفارتی سطح پر ایسی کوششیں شروع کر دیں جن کے ذریعے آخر جاپان اور امریکیوں کو اپنا ہمدرد بنایا جائے۔ ایسی صورت میں قوم پرستوں کو کیونشوں پر حملہ کرنا اور جاپان کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا۔ انہوں نے غیر ملکی اخباری نمائندوں کی پریس کانفرنسیں بلائیں اور ان کے سامنے اپنا نقطہ نظر بیان کیا اور انہیں اپنا دوست بنانے کی پیشکش کی۔ انہوں نے اور ان کے تانہیں نے مسلسل کوششوں کے ذریعے ان پابندیوں کی وجوہات سمجھ کر دیں جس کے تحت کوئنگ (قوم پرست) کے سوا کسی اور سیاسی پارٹی کے لیے سفارتی حلقوں سے رابطہ ممنوع تھا۔ چینگ کائی فیک کی حکومت نے یہ پابندی اس لیے لگائی تھی کہ اس کی برائیوں پر پردہ پڑا رہے۔ چرائن لائی نے اس کی حکومت کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا۔

اب چرائن لائی کو یہ کھانا لگا ہوا تھا کہ چینگ کائی فیک ان کی سفارتی کوششوں پر پانی پھیرنے کے لیے کیونشوں پر ضرور حملہ کرے گا اور کوئنگ تک سے کیونشوں کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرے گا۔ یہ ان کی سیاسی ہمت تھی کہ ان کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ چینگ کائی فیک کی فوج نے صوبہ آن

ہوئی کے جنوب میں اچانک کیونشوں کے دستوں پر حملہ کر دیا۔ کیونشوں کی زیر قیادت نئی چنگی آری کو غیر فعال بنا دیا گیا۔ یہ اس کی طرف سے غداری کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی اسی طرح شگنائی میں کیونشوں کا قتل عام کر چکا تھا۔ اس نے ایک ہی وار میں اتنے سارے دستوں کو غیر فعال بنا کر جاپانی فوج کا وہ مستعد پورا کر دیا جس میں وہ اپنی مسلسل کوششوں کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اگر دوسری جنگ عظیم نہ چھڑتی ہوتی تو جاپان اس غداری سے فائدہ اٹھا کر پورے چین پر قابض ہو گیا ہوتا۔

چین کے اتحادی ممالک کا اضطراب دیکھتے ہوئے کوئنگ نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ نئی چنگی آری نے اچانک کی خلاف ورزی کی تھی اور بغاوت کر دی تھی اس لیے یہ حملہ لازم ہو گیا۔

چرائن لائی اب تک خاموش تھے لیکن اس پروپیگنڈے کے بعد انہوں نے بھی اپنی خبر جاری کر دی اور اصل حقائق سے دنیا کو آگاہ کیا۔

اس وقت تک چینگ کائی فیک کمیونسٹ فوجوں پر قبضہ کن حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑی فوج جمع کر چکا تھا۔ اسے اپنی طاقت پر اتنا جھنڈا تھا کہ اکثر قبضہ کرتے ہوئے کہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر کیونشوں کو ختم و نابود کر دے گا۔ اس کا یہ دعویٰ اس لیے درست معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ان کا سارا ساز و سامان اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ واشنگٹن بھی اسے بے یارے پانے پر ہتھیار فراہم کر رہا تھا لیکن اسے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے تقریباً سات سال انتظار کرنا پڑا اور پھر بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

چینگ کائی فیک کی اس ناکامی کا بڑا سبب چرائن لائی کی شاندار ڈپلومیسی تھی۔ ان کی شخصیت اور بے لاگ متحرک، سادگی اور سیاسی بصیرت دوسروں کو ستارے کیے بغیر نہیں رہتی تھی۔ غیر ملکی صحافی ان کے دوست بن گئے تھے۔ اتحادی ممالک کے سربراہان ان سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہتے تھے۔ انہوں نے چین کا مقدمہ کچھ اس انداز سے لڑا کہ چینگ کائی فیک ہمارا گیا۔

چرائن لائی جہاں امریکا کے فوجی اور سفارتی حلقوں کی بڑی شخصیتوں کے درمیان وقت گزارتے تھے وہیں ان کے عام امریکی ساتھی بھی دوست تھے۔ یہ تعلقات اسے بڑے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کے لیے

امریکی فوجی عیار فراہم کرتی دیتے تھے۔ اس طرح انہیں نوجوان امریکیوں سے مل جل کر بات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کی یہی کوششیں تھیں کہ امریکیوں نے چینگ کائی فیک کے سر سے ہاتھ اٹھالیا۔ ہتھیاروں کی رسد رک گئی اور کمیونسٹ فوج کے سرخ سپاہیوں نے چینگ کائی فوج کا تعاقب شروع کر دیا۔ انہیں ہر لمحے کے میں کامیابی ہو رہی تھی اور فتح قریب نظر آنے لگی۔ یہ فتح آزادی کا سورج طلوع ہونے کی نوید دے رہی تھی۔ بادشاہت سے چھٹکارا اور عوامی جمہوریہ چین کا آغاز۔

یہ جنگ چرائن لائی کی سربراہی میں لڑی جا رہی تھی۔ وہ چیف آف وی جنرل اسٹاف تھے۔ ان کے پاس جب وقت کی قلت ہوئی تو فاران ایئر سیکشن کی کمرانی کا کام بنزل چچان فیک کے سپرد کر دیا گیا لیکن جب فتح قریب نظر آنے لگی وہ اور ماڈرن سے تنگ بیٹنگ کی طرف پیش قدمی کرنے سے قائل اپنے آخری پڑاؤ میں پانی پھونچتے ہوئے انہوں نے پارٹی کے خصوصی ترجمان کے فرائض وہاں سنبھال لیے۔ شخصی فتح سامنے نظر آ رہی تھی۔ اب انہیں آزادی کے بعد کے لیے نئی خارجہ پالیسی وضع کرنی تھی۔ انہوں نے بڑی تعداد میں ایسے افراد کو تربیت دینا شروع کر دیا جو فاران سروں کے کام پر مبور رکھتے ہوں۔ کچھ لوگوں کو خارجہ پالیسیوں کے بارے میں ریسرچ کرنے پر لگا دیا جو قریب الوقرب ملک گیر آزادی کے بعد نافذ کی جانی تھیں۔

کمیونسٹ فوجیں تیزی سے بیلار کرتی ہوئی بیٹنگ میں داخل ہوئیں تو عوام نے کمروں سے نکل کر استقبال کیا۔ یہ ہمدردی کی آخری منزل تھی جسے سرخ سپاہیوں نے ستر کر لیا تھا۔

فتح حاصل کرنا مشکل نہیں ہوتا فتح قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چرائن لائی اور ماڈرنے تنگ کو اب ان غلطو پر سوچا تھا کہ انقلابی امور کس طرح انجام دیے جائیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک حکومت تشکیل دی جائے اور مختلف مہمے تنظیم کیے جائیں۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ قربانیوں کا صلہ بھی اچھا ملے اور حق دار کو اس کا حق پہنچے۔ چرائن لائی خوش قسمت تھے کہ ماڈرنے تنگ نے ان کا نام وزیر اعظم کے لیے منتخب کیا۔

جنرل مین ماڈرنے تنگ کو عوامی جمہوریہ کی آزادی کا اعلان یکم اکتوبر 1949ء کو کچھ دن بچے تھی ان دنوں میں کرنا تھا۔

آزادی کے اعلان سے ایک دن قبل تھیان آن میں چنگ کے جنوبی سرے پر عظیم عوامی ہال اور چنگی انقلاب کے موجودہ میوزیم کے درمیان ایک یادگار نصب کی گئی۔ اس یادگار کا سنگ بنیاد چنگ میں ماؤزے چنگ نے رکھا اور یہ کتبہ نصب کیا۔

زندہ یاد ہے ہیں وہ عوامی جاں باز جنہوں نے گزشتہ تین سالوں کے دوران عوامی جنگ آزادی اور عوامی انقلاب کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

زندہ یاد ہے ہیں وہ عوامی جاں باز جنہوں نے 1840ء سے لے کر اب تک قومی خود بخاری آزادی اور عوامی ہیرو کے لیے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے لڑائی میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

چنگی عوامی سیاسی مشاورتی کانفرنس 30 جنوری 1949ء

اس کتبے کو دیکھنے کے لیے عوام نوے پڑے تھے۔ جن کے پیارے اس جدوجہد میں مارے گئے تھے ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں لیکن چہرے خوشی سے سرشار تھے کہ ان کی قربانیاں رانگال نہیں گئیں۔ آزادی بھی ملی اور ان کے کام کو کسی نے سراہا بھی۔ ان کے احسانات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کتبے پر ثبت ہو گئے۔ ماؤزے چنگ اور چوان لائی نے انہیں فراموش نہیں کیا۔

”یہ کتبہ شاعر کیوں نہ ہو اسے ماؤزے چنگ نے تحریر کیا ہے۔“

”یہ کتبہ یادگار کیوں نہ ہو اس کی خطاطی کا سریل چوان لائی نے کی ہے جو کل ہمارا وزیر اعظم بن جائے گا۔“

”وہ تھیان اس کا حق دار ہے۔“

”ماؤزے چنگ زندہ یاد چوان لائی زندہ یاد۔“

”انقلاب ثقافت، خوش آمدید۔“

دوسرے دن صبح ہی معزز شخصیات تھیان آن میں چنگ پہنچنا شروع ہو گئی تھیں جہاں آزادی کی تقریب کا آغاز ہوا تھا۔

روشرم رکھ دیا گیا۔ مانگیر دون لگا دیا گیا۔ ماؤزے چنگ اور چوان لائی ایک ساتھ چلتے ہوئے روشرم کی طرف آئے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ چوان لائی نے مانگیر دون کے سامنے آکر خطاب کیا تو ماؤزے چنگ ان کے قریب کھڑے تھے۔

یہ تقریب ایک دور کے اختتام اور ایک نئے دور کی

علامت تھی۔

ماؤزے چنگ وہ شخص تھے جو شروع سے آخری تک انقلاب کی قیادت کرتے رہے۔ چوان لائی ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے ان سے زیادہ مشہور تھے لیکن انہیں معلوم تھا کہ یہ عظیم چنگ ماؤزے چنگ کی بہترین حکمت عملی کا نتیجہ ہے اس لیے ہمیشہ ان کا احترام کرتے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ماؤزے چنگ اپنی بنیادی کے سبب منظر نامے سے ہٹنے چلے گئے اور نام اقتدار چوان لائی کے ہاتھ میں رہی البتہ وہ ماؤزے سے شہرے کرتے رہے۔

چوان لائی جانتے تھے کہ اس سے چین میں خارجی امور کی اہمیت کیا ہوگی۔ بیرونی دنیا کو اپنا دوست بنانے میں کتنی محنت کرنی ہوگی۔ وہ سب سے پہلے قارن افریقین میں گئے۔ ان کے پہنچنے ہی سے انہیں گھر لیا۔

”ہمیں جو فرض سونپا گیا تھا ہم اس میں سرخوردہ۔“

کل ہم باقاعدہ طور پر اپنے سفارتی کام کا آغاز کریں گے۔ فی الحال آج ہمیں یہ کرنا ہے کہ چین میں ماؤزے کی تقریر کا متن غیر ملکی سفارت خانوں اور قونصل خانوں کو ارسال کر دو۔“

چوان لائی نے غصے کو دبا دیت کی اور اپنے نام کی ہر ان کے حوالے کی جو سفارت کاروں کے نام بھیجے جانے والے خطوط پر لکھی جاتی تھی۔

وزارت مصلحتی کے ساتھ ساتھ وزارت خارجہ کا قلم دان بھی انہیں دیا گیا تھا۔

انہوں نے اپنے محلے سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہر قوم کو دو اقسام کی جنگیں لڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ الفاظ کی جنگ اور گولہ بازی کی جنگ۔“

جنگ میں تقریری اور تحریری دونوں الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ ڈیپلومی الفاظ کی جنگ کے ذمے میں آتی ہے۔ یہ جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ جو لوگ ڈیپلومی کی حدود میں کام کرتے ہیں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ یہ جنگ لڑتے رہیں گے۔ سچ چنان کے پاس جو پرانے چین سے حلقہ ہے کوئی آزمودہ راہ نہیں ہے اس لیے ہمیں ہر کام سے شروع کرنا ہوگا۔

سرمایہ دار ممالک کی تشدد کرنے کا سوال خارج از امکان ہے۔ سوویت ڈیپلومی کی تحلیلی بھی چین کے لیے مناسب نہیں۔ ہمیں اپنے ملک کے تقاضوں کو دیکھنا ہوگا۔ اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔

چین کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول یہ ہوں گے۔

”اس کی حامی طاقتوں سے دوستی کا رشتہ استوار کرنا۔ موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کی خواہش مند طاقتوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنا اور جنگ باز طاقتوں کو...“

تجربہ کرنا۔ عالمی میدان میں ان کے لیے ایک حصہ کھانڈی انہوں نے ان اصولوں کی خود بھی پاس داری کی اور اپنے محلے کو بھی مجبور کیا۔

اگر چین کے ابتدائی دنوں میں خارجہ پالیسی انہوں نے اپنے ہاتھ میں نہ لی ہوتی تو چین اپنے اندری صحت کردہ کیا ہوتا۔ شاید کوئی اسے تسلیم کرنے کو بھی تیار نہ ہوتا۔ چوان لائی کے بے پناہ مطالعہ، انگریزی پر عبور اور چنگ دار طبیعت نے جلد ہی انہیں سبیل عالمی رہنما بنا دیا۔ انہیں دل میں خوشی برداشت کر لیتے تھے اور بالآخر ان کا حریف متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اپنے لیے ایک مظاہرے ان کی سوانح سے ثابت ہیں۔

ایک مرتبہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیر شولڈ چنگ آئے۔ اس دورے کا مقصد امریکی فضا کے ان افراد کی رہائی تھا جنہیں چین کی فضا کی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

خدا کرات کے بعد چوان لائی، سیکریٹری جنرل کو ان کی کار تک چھوڑنے کے لیے تو ان کی نظر ایک شخص پر پڑی جو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھا ہوا تھا اور سردی سے محظوظ رہا تھا۔ یہ سردی کا موسم تھا اور محلے جگہ پر یہ سردی ناقابل برداشت تھی۔

”یہ کون شخص ہے؟“ انہوں نے اپنے محلے سے پوچھا۔

”یہ شخص مسز ہیر شولڈ کا محافظ ہے۔“

”اسے سردی میں ٹھہرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسے گرم لائی میں کیوں نہیں بٹھایا گیا؟“ چوان لائی نے اپنے ہاتھ میں کوڑا اٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ ایک امریکی ہے اور ہم کسی امریکی سے کوئی سروکار کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یہ تو ہیر شولڈ کو سوچنا تھا کہ وہ کسی امریکی کو چین کی سرزمین پر لے جا رہے ہیں۔“

کوڑی بلی جگ ابھی کچھ عرصہ پہلے ختم ہوئی تھی اس لیے چنیل کا یہ انداز لگ رہا تھا لیکن چوان لائی کا

انداز لگ کر مختلف تھا۔ وہ ایسے مواقع بھی شائع نہیں کرتے تھے۔

”وہ امریکی کسی لیکن ہے تو ہمارا مہمان۔ تم ایک عام امریکی الکار سے خائف کیوں ہو؟“ مزید کہا۔ ”اسے ہمارے اگلے استقبال میں شرکت کی دعوت دو۔“

جب ہیر شولڈ کو استقبال دیا گیا۔ اس استقبال میں وہ امریکی محافظ بھی مدعو تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ تھیو کا نفرنس کے دوران پیش آیا۔ امریکی وفد کا سربراہ سیکریٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر چوان لائی کے بہت خلاف تھا اور چین کو تسلیم کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ لاؤ چن میں اس کا سامنا چوان لائی سے ہوا اور چوان لائی نے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ یہ نہایت عداوت آمیز سلوک تھا اور چوان لائی کو اس پر احتجاج کرنا چاہیے تھا لیکن وہ ہر سرکاری عمل کو اپنی ذات سے بالاتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے کسی جوابی کارروائی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن سے وہ کسی رد عمل کا مظاہرہ نہ کر کے تو ذرا کرات میں چین کی نمائندگی متاثر ہوئی۔ انہیں چین مزید تھانہ کا بی ذات۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کے بعد فوسٹر بیچوا سے چلا گیا اور جنرل بیڈل سمٹھ وفد کی سربراہی کرنے لگا۔

ایک دن چوان لائی لائی میں پہنچے تو بیڈل سمٹھ کو پیشہ دیکھا جو اپنی بیانی میں کافی اذلیل رہا تھا۔ چوان لائی اپنے فطری اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی میز پر بیٹھ اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بیڈل سمٹھ نے بھی ذرا مختلف طریقے سے وہی حرکت دہرائی جو جان فوسٹر کر چکا تھا۔ اس نے ہاتھ ملانے سے زبانی انکار تو نہیں کیا لیکن عمل سے یہی ثابت کیا۔ اس کے ہاتھیں ہاتھ میں لگا رہا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں کافی کی بیانی اٹھائی تاکہ یہ دکھائے کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی نہیں۔ وہ مصافحہ کرنے سے معذور ہے۔

چوان لائی نے اس وقت بھی کسی منتی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہاتھ ملانے بغیر ہی اس کے سامنے بیٹھ گئے اور اس کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ بیڈل سمٹھ کو لاکھالان کی باتوں کا جواب دینا پڑا۔ کچھ رتبہ تک یک طرفہ گفتگو ہوتی رہی اور پھر بیڈل کو بھی شامل ہونا پڑا۔ بیڈل یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ”چین ایک قدیم اور عظیم تہذیب کا گہوارہ ہے۔“

چوان لائی کے حسن اخلاق نے بیڈل سمٹھ کا دل جیت لیا۔ وہ تعلقات بدھانے پر مجبور ہو گیا۔ یہ موقع اسے

43

ماہنامہ معرکہ جیت

جولائی 2014ء

42

ماہنامہ معرکہ جیت

جولائی 2014ء

43

ماہنامہ معرکہ جیت

جولائی 2014ء

42

ماہنامہ معرکہ جیت

جولائی 2014ء

جلد مل گیا۔ کانفرنس کا اختتامی اجلاس ہو رہا تھا۔ چنانچہ لائی لائی میں کسی سے ٹھیکہ نہ تھے کہ بیڈل وہاں پہنچ گیا۔ خود چل کر ان کے پاس آیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”میں آپ کی مدد کرنا سوچا اور کچھ بوجھ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ سے ملاقات کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔“ چنانچہ لائی کی رنگ عرابت پھڑک اٹھی۔

”آپ کو یاد ہے جب ہم چمکی ہارٹے تھے تو میں نے آپ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا لیکن آپ کے دونوں ہاتھ خالی نہیں تھے اور آپ ہاتھ نہیں ملا سکے تھے۔“

بیڈل اس یاد دہانی پر ایک خفیف ہنسی بھری نظر نہ رہا اور بڑی گرم جوشی سے چنانچہ لائی کا بازو دبا کر آگے بڑھ گیا۔

چنانچہ لائی کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیڈل اسٹھ ان کا ہم نوا بن گیا چنانچہ جب کانفرنس میں ہندو چمکی کا مسئلہ زیر بحث آیا تو چنانچہ لائی نے اس کے حل کے لیے ایک تجویز پیش کی۔ بیڈل اسٹھ نے غصے سے جواب دیا کہ یہ تجویز سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور خود انکو وہ دشمنی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس کی اس حمایت پر امریکی وفد میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ تمام ارکان اس بات پر شور مچاتے رہے تھے کہ ان کے سربراہ نے چمکی کی تجویز پر موافقت کا اظہار کیا۔ بیڈل، چنانچہ لائی سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ پہلے تو اس نے اپنے وفد کو سمجھانے کی کوشش کی اور جب وہ نہیں مانے تو اپنی جگہ انٹر اریٹس کو قائم مقام بنا کر خود واپس چلا گیا۔ رابرٹس نے چمکی کی تجویز کو رد کر دیا۔

اس کے باوجود یہ معاہدہ طے پا گیا کہ ہندو چمکی میں باہمی دشمنی کو ختم کرنے کے لیے اس کا سیاسی عمل تلاش کیا جائے گا۔

ڈس کی مخالفت کے باعث امریکا کو یہ نقصان اٹھانا پڑا کہ وہ برسوں تک دیت نام میں ایک لاکھ لاکھ جگ میں الجھا رہا۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت امریکی وفد نے فریقین کے گرفتار شدہ افراد کی واپسی کے بارے میں مجوزہ مذاکرات کا طریقہ طے کرنے کے لیے چمکی وفد سے ملاقات کی۔ اس کے نتیجے میں سفارتی سطح پر چین اور امریکا کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا اور یہ مذاکرات وقفے وقفے سے چند روز تک جاری رہے۔

اس کانفرنس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ برطانوی وزیر خارجہ کو چنانچہ لائی کو قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلسل رابطے کرنے لگا۔ دونوں کے رابطوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت ایک دوسرے کے دار الحکومت میں نائب سفیر کی سطح پر ایک دفتر رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس کانفرنس میں چنانچہ لائی کی کوششوں سے پُر امن بنائے باہمی کے پانچ اصول معرض وجود میں آئے۔ ان پانچ اصولوں کی تفصیل یہ تھی۔ ایک دوسرے کی علاقائی۔ سالمیت کا احترام، باہمی عدم جارحیت، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت، مساوات، باہمی مفاد اور چرچا سے حل پائے جائیں۔

انہی اصولوں کی بنیاد پر افرو ایشیائی کانفرنس انڈونیشیا کے شہر بانڈونگ میں ہوئی۔ چنانچہ لائی کو بھی دعوت دی گئی۔ ان کا اپنی سائنس کا آپریشن ہو چکا تھا۔ وہ ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے لیکن اس کانفرنس کی اہمیت کے پیش نظر انہوں نے ہر قیمت پر شرکت کا فیصلہ کر لیا، انہوں نے اپنے ملے کے ہمراہ چارٹرڈ طیارے پر بس کشمیر میں سفر کرنا تھا۔ یہ خبر عام بھی ہو گئی تھی کہ وزیر اعظم جین اس طیارے میں سفر کریں گے۔

اس طیارے کو بانڈونگ تک میں رکنا تھا۔ انڈونیشیا کے شہر بانڈونگ میں اندھن بھرا چار ہاٹا کہ کونسا رنگ کے بیٹھوں نے اس میں ایک ٹائم بم چھپا دیا۔ اندھن بھرنے کے بعد طیارہ روانہ ہو گیا۔ طیارہ ہوا میں تھا کہ ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ ظاہر ہے کہ کوچنا نہیں تھا۔ ملے کے علاوہ گیارہ افراد ہلاک ہو گئے۔ حسن اتفاق یہ ہوا کہ چنانچہ لائی اس جہاز میں سوار ہی نہیں ہوئے تھے۔ چین وقت پر انہیں روک کر جانا پڑ گیا تھا اور وہ دوسری کسی پر واز سے روانہ ہوئے۔ چین ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔

بانڈونگ کانفرنس میں اس مسئلے پر تاول نہ خیال کیا گیا کہ ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ممالک کو سامراجی طاقتوں کی غارتگری کے خلاف موثر طور پر اپنی اقتصادی اور سیاسی آزادی برقرار رکھنے کے لیے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ یہ کانفرنس ایک پختہ جاری رہی۔ وہ دن رات مصروف رہے۔ سونے کے لیے کسی بھی دن تین بجے سے زیادہ وقت نہیں ملا۔ ان کی یہ کوششیں راکاں نہیں تھیں۔ اس کانفرنس میں جو باتیں طے ہوئیں ان میں ان پانچ

دنیا کے نقشے پر ایک ملک ایسا ہے جو آزاد ہونے کے باوجود غلام ہے۔ اس ملک میں انصاف نہ تھا، یہاں ہے۔ اس ملک میں قانون غریب کو چل دیتا ہے اور سرمایہ دار قانون کو چل دیتا ہے۔ اس ملک کے حکمران ہونی صدوم سے ٹھوٹے ہوئے ہیں۔ اس ملک کی پالیسیوں و فرائض انصاف دیتے ہیں۔ ممالک کے تمام حکمران کو لائبرائیجیٹ ہیں۔ اس ملک میں پانچ سات جزائر چوری کرنے والا تھیل کی ہوا اٹھا رہی ہے اور پانچ سات کروڑ کی چوری کرنے والا ملک کا منڈب شریف شہری بن جاتا ہے۔ اس ملک میں رشت کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس ملک میں شرافت کی زندگی عذاب ہے۔ اس ملک کے حکمران ایک شرارتی طرح ہیں جس سے دوسرے ملکوں کے حکمران کھیلے ہیں۔ اس ملک کے غریب ممالک پر علم انصاف کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس ملک میں حق دار کو حق نہیں ملتا۔ اس ملک میں غریبوں کی جو بیڑیوں کو کھار کر سرمایہ دار کے پیش ملکوں کو کر لیا جاتا ہے۔ اس ملک میں محافظوں نے ہیں۔ اس ملک کی معیشت نے آتی ترقی کی ہے کہ امیر امیر سے امیر تر ہو گیا ہے اور غریب غریب سے غریب تر۔ اس ملک میں خودی دو، خودی دو اور خودی معاف کر دے مل جاتا ہے۔ اس ملک میں سرکاری خزانے میں جمع ہونے والی رقم کا تھاپا نہیں لیا۔ ہر پینے ملا زمین کی جیب میں جانے والا لوٹس ساتھ لے کر ہوتا ہے۔

حاصل تھی۔ وہ دنیا کے سب سے زیادہ دورے کرنے والے وزیر اعظم سمجھے جاتے تھے۔ یہ دورے تقریباً چھ بجے ہوئے۔ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ان دوروں کے نتیجے میں چین میں اضطرری کا چال بچ گیا۔ اس لائق اور چٹنی وزیر اعظم کی کوششوں سے یہ ہوا کہ چین سوئی سے لے جہاز تک بنائے لگا۔ اس کا مال بیرونی منڈیوں تک پہنچا تو چین میں خوش حالی کے جھنڈے نصب ہو گئے۔

1960ء کے بعد یعنی اپنی آزادی کے صرف دس بارہ سال بعد چین اس قابل ہو گیا کہ غریب ممالک کو امداد دے سکے۔ انہوں نے چینی امداد کے آٹھ رہنما اصول پیش کیے۔ تیسری دنیا کے ممالک نے اس تصور کا گرم جوش سے استقبال کیا۔

چین کا ماضی ان کے سامنے تھا۔ وہ بڑی طاقتوں کے اقتدار کا کارروہ چکا تھا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا چینی امداد میں اقتدار کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انہوں نے دو اصول وضع کیے اور ان پر پابندی سے عمل کروایا۔ امداد حاصل کرنے والے ملک کو اس قابل بنانا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اس قابل ہو جائے کہ کما بیرونی مداخلت کے بغیر ترقی کر سکے۔ امدادی منصوبوں پر کام کرنے والے چینی کارکنوں کو اس بات کا پابند کرنا کہ وہ مقامی کارکنوں کی بہبود میں حصہ لیں اور ان کی جیسے حالات میں کام کریں۔

وہ اصول وضع کر کے بھول نہیں گئے بلکہ وہ بڑی

اصولوں کی روح کا فرما تھی جو انہوں نے بیرونی کانفرنس میں پیش کیے تھے۔ ایک ایسا ضابطہ معرض وجود میں آیا جو ایشیا اور افریقہ اور بعد میں لاطینی امریکا کے ممالک کے باہمی تعلقات کا نیا نمونہ بن گیا۔

اس وسیع خطے کے لیے جسے تیسری دنیا کہا جاتا ہے چنانچہ لائی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بانڈونگ کانفرنس کا مابانی سے گزر گئی تھی۔ چنانچہ لائی نے اپنے مقاصد بڑی حد تک حاصل کر لیے تھے۔ اب وہ چین کو دنیا میں حصارف کروانے کے لیے دروں پر اٹھے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے ایشیا اور یورپ کے گیارہ ممالک کے دورے کیے۔ وہ ان دوروں کو دوستی، امن اور علم کی جھنڈے تعبیر کرتے تھے۔

ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اب وہ چین کو ترقی کے باج فروغ پر لے جانے کے لیے چین میں آئل اضطرری کو فروغ دینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ دوسرے ممالک اس اضطرری کے فروغ کے لیے کیا کام کر رہے ہیں۔ ان کا مطالعہ کر کے ان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے لہذا وہ جہاں بھی گئے رابطہ سڑکوں اور حلقہ تھیں کامیاب ہو کر واپس آئے۔

بانڈونگ کانفرنس کے بعد انہوں نے وزارت خارجہ کا عہدہ مارشل چین ای کو سونپ دیا۔ اس وقت تک انہوں نے اس وزارت کی بنیادیں اسی مضبوط کردی تھیں کہ مارشل کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ جہاں بھی گئے چین کے موقف کی انہیں وضاحت نہیں کرنی پڑی تھی تاہم چین کے بیرونی تعلقات کے ضمن میں ان کی شخصیت کو نمایاں حیثیت

سے جائزہ بھی لیتے رہے۔ نہ صرف فائلوں پر جائزہ لیا بلکہ وفا فوٹو اننگوں کا دورہ بھی کیا اور وہاں چھٹی امداد سے ملنے والے منصوبوں کا خصوصیت کے ساتھ معائنہ بھی کیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان پر کس انداز سے عمل کیا جا رہا ہے اور کن مسائل پر حرج و مرجہ درکار ہے۔

وہ جس ملک میں جاتے ان کا عوامی انداز وہاں کے عوام کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ ٹھیکہ دورے کے ملازمین نے تو یہ دیکھا تھا کہ جب کوئی بڑا آدمی دورے پر آتا ہے تو ان ملازمین کو قریب بھی نہیں بٹھلنے دیا جاتا تھا۔ ان بڑے آدمیوں کی گردن اڑتی رہتی تھی۔ اپنے ہم منصبوں کے سوا کسی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس چوآن لائی کا حال یہ تھا کہ وہ دھکی تودھکی پروانچیں کرتے تھے۔ جب رخصت ہونے کا وقت آتا تو وہ خود کار ڈرائیوروں، لیکن کے محلے اور محافظوں کے پاس جا کر ان سے ہاتھ ملاتے ان کا شکریہ ادا کرتے کہ انہوں نے ان کے دورے کو خوش گوار بنایا۔

وہ بھارت کے دورے پر پٹی دہلی پہنچے تو رپورٹر یہ کچھ کر حیران رہ گئے کہ وہ نئی دہلی میں چھٹی سفارت خانے کے اچھوت ملازموں سے ہاتھ ملارہے ہیں اور شفقت و محبت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ رپورٹروں کے لیے یہ بالکل انوکھی بلکہ ناقابل یقین بات تھی۔ بڑا آدمی تو درکنار، بڑی ذات کا ہندو بھی ان اچھوتوں سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔ ان کے پیچھے چاروب گشتی وغیرہ کی وجہ سے انہیں بچھا جاتا ہے اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک رپورٹر سے رہا نہیں گیا اس نے پوچھ لیا۔

”سر، آپ ان لوگوں سے ہاتھ ملارہے ہیں؟“

”کیوں، کیا یہ انسان نہیں؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ بچ ذات ہیں، گندہ کام کرتے ہیں۔ ان کی طرف تو لوگ دیکھتے بھی نہیں۔“

”میں تو ظلم کا نظام ہے۔ میں اسی کے خلاف تو آواز اٹھا رہا ہوں۔ یہ وہ کام کرتے ہیں جو آپ نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ آپ سے اور مجھ سے بڑے لوگ ہیں۔“

رپورٹر اپنا سامنے لے کر وہ گیا۔ یہی وہ خاموش سفارت کاری تھی جو چین کے وزیراعظم ہر ملک میں چاہے کر رہے تھے۔ ان کی سادگی اور عوام دوستی کی خبروں سے اخبارات بھر جاتے تھے۔

وہ اپنے دوروں میں ضروری پروڈکول کا بھی خیال

نہیں رکھتے تھے۔ بے خوفی کا مظاہرہ اکثر ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ خرطوم (سوڈان) پہنچے تو چھتئیں نے یہ تجویز پیش کی کہ وزیراعظم چوآن لائی اور میزبان انٹرپورٹ سے گیسٹ ہاؤس تک مکملی کار میں سفر کریں تاکہ وہاں حکومت کے باشندے اپنے چھتئی مہمان کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ سوڈان کے حالات ان دنوں ایسے تھے کہ مکملی کار میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چھتئی وفد کے محلے کو اس تجویز سے اختلاف تھا۔ جب چوآن لائی کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے نائبین سے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ اس تجویز پر عمل کریں اور سوڈانی حکام کے ساتھ مکملی کار کا انتظام کریں۔

”سر اس میں خطرہ ہے۔“

”ہمیں دوستی زیادہ عزیز ہے، جیسا کہا جا رہا ہے ویسا کرو۔“

انہوں نے مکملی کار میں، چین سوڈان دوستی زعمہ ہاؤس کے قلمی حکام نعرہ کے درمیان گیسٹ ہاؤس تک کا سفر طے کیا۔ چین کے لیے ایک صبر آزمایہ وقت وہ تھا جب مارکسزم اور لینن ازم کے بنیادی اصولوں پر منظرے کے نتیجے میں چینک اور ماسکو کے اختلافات مکمل کر سامنے آ گئے۔ روس نے چین پر دباؤ ڈالا شروع کیا اور حالات بگڑ گئے۔ روس اس خوش حالی میں مبتلا تھا کہ چین خوف زدہ ہو کر ویت یونین کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ اس نے چھتئی حکومت کو اطلاع دیے بغیر سیکڑوں معاہدے منسوخ کر دیے اور امدادی منصوبوں پر کام کرنے والے تمام افراد کو یک وقت واپس بلا لیا۔ ان فرسوں کی ادا جی کا تقاضا بھی شروع کر دیا جو کوریائی جنگ کے دوران لیے گئے تھے۔

یہ چوآن لائی کی بے خوفی تھی کہ انہوں نے اس دباؤ کا جواب دینے کے لیے مناظرانہ جدوجہد تیز کر دی اور روس کی عارت گری کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ حالات ایک بار پھر سازگار ہونے لگے اور صرف ایک سال میں چین اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پا چکا تھا۔

یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ امریکا سے مجزوتے ہوئے تعلقات بھرتی کی سطح پر آ گئے۔ یہ تعلقات یہاں تک خوشگوار ہوئے کہ امریکی صدر جے ایم کسن 1973ء میں چینک انٹرپورٹ پر اترے اور ان کے سات روزہ دورے کا آغاز ہوا۔

73 سالہ وزیراعظم چوآن لائی چین کی سر زمین پر

قدم رکھنے والے پہلے امریکی صدر کا غیر مقدم کرنے کے لیے خارے کی بیڑی کے قریب کھڑے تھے۔ شدید سردیوں کے دن تھے۔ انہوں نے سردی سے بچنے کے لیے بھورے رنگ کے چمچے پر گہرے رنگ کا اور گوت پینٹ رکھا تھا۔ وہ باوقار اعزاز میں کھڑے ہونے کے باوجود نہایت لاف نظر آ رہے تھے۔

عوام اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ چو ایک عظیم بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ان پر کئی بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور اب تنہیں ہو چکا تھا کہ انہیں گیسر ہے۔ بیرونی مہمان تو صرف یہی کہتے ہوں گے کہ وہ بیمار ہیں یا بہت تھکے ہوئے ہیں یا عمر کا تقاضا ہے کہ اب ان کی عمر 73 سال کی ہو چکی تھی۔

اس بیماری اور تقاضے کے بعد انہوں نے کئی برٹاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ بیمار ہیں اور اگر بیمار بھی ہیں تو کس عظیم بیماری میں مبتلا ہیں۔ انہیں مذاکرات میں مسلسل مشغول رہنا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سماجی تقریبات، عشاہائے اور قہر انے بھی تھے جو صدر امریکا کی پزیرائی کے لیے منعقد کیے جا رہے تھے اور چوآن لائی کو یہ حیثیت وزیراعظم ان میں شریک ہونا ہوتا تھا۔ مذاکرات کے درمیان یہ البتہ دیکھا جاتا تھا کہ وہ مختلف وقتوں سے مختلف اقسام کی گولیاں کھاتے رہتے تھے۔ یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ شرکائے حکومت بھی سمجھتے ہوں کہ ہائی بلڈ پریشر وغیرہ کی گولیاں ہیں جو انہیں کمانی پڑتی ہیں۔

ایک روز مکتھو کے دوران انہوں نے صدر چین سے عجیب بات کہی یا ان کے منہ سے نکل گئی۔

”اگر اچانک مجھ پر دل کا دورہ پڑے اور میں مر جاؤں تو آپ کو اس سے شکوکہ کرنی پڑے گی جو میری جگہ لے گا۔ یہ سلسلہ کرنا نہیں چاہیے۔“ یہ بات انہوں نے غیر ارادی طور پر کہہ دی تھی۔ وہ اپنے مہمان کو یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ مرنے والے ہیں لیکن انہیں اپنی حالت کا اعتراف بھی تھا۔

”یہ بات آپ اس لیے تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ آپ کی طبیعت زیادہ غراب ہے؟“ صدر چین نے چونک کر پوچھا۔

”اتنی بھی غراب نہیں کہ میں مری جاؤں۔“ چوآن لائی نے مصروفی میں ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

”پھر آپ نے یہ بات کیوں کی؟“

”اس لیے کہ موت کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت آ سکتی

ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مذاکرات میں قحط پڑے ہو۔ یہ ایک مفروضہ تھا حقیقت نہیں۔“

بات آئی کی ہو گئی۔ مذاکرات ختم ہوئے اور اعلامیہ جاری ہوا تو بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ دونوں ممالک میں سال کے عرصے سے ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ امریکی ذرائع ابلاغ عوامی جمہوریہ چین کو بین الاقوامی عزم کہتا تھا جبکہ چھتئی اخبارات امریکا کو کٹر سامراجی طاقت کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ سوویت یونین اور چین کے تعلقات میں یکاڑ بیکڑا ہو گیا۔ روس نے چین کی سرحد پر اپنی دس لاکھ فوج جمع کر کے ان تعلقات کو حریف کشیدہ کر دیا۔ ان حالات میں امریکا سے تصادم کی جگہ مفاہمت ہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ چوآن لائی کی دوراندیشی نے اس راستے پر قدم رکھ دیا۔ انہوں نے صدر چین کے دورے سے پہلے ہی اخبارات کے ذریعے حالات کی تبدیلی سے عوام کو آگاہ کیا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے۔ صدر چین کو اب تک کالیاں دی جا رہی تھیں کہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے چین آنے کی دعوت کیوں دی گئی ہے۔ کٹر سامراجی، عوامی ہال میں دعوتیں کیوں اڑا رہا ہے۔ اس آگاہی کے باوجود چوآن لائی کے مخالفین اس دورے کے خلاف تھے اور شدید چہارے تھے کہ چوآن لائی اپنے اصولوں سے ہٹ گئے ہیں۔ وہ ایک سامراجی ملک کی طرف ہاتھ بوجھا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک چوآن لائی کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔

پچیس سال کی دشمنی ایک ہفتے میں ختم نہیں ہو سکتی تھی لیکن یہ امید کی جاسکتی تھی کہ رفتہ رفتہ یہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے گی۔

چین رخصت ہو گئے۔

چوآن لائی کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ کام کا یہ دورہ اٹکا تھا کہ ان کے پاس اسپتال میں داخل ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ روز بروز لاغر سے لاغر ہو رہے جا رہے تھے۔ پارٹی کی اعداد و ثبوت پھوٹ اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ بہت سارے قریبی مددگاروں اور ساتھیوں کو برطرف کیا جا چکا تھا۔ ان کے پاس معمولی سا عہدہ کیا تھا جس سے وہ کام چلا رہے تھے۔ کام کا یہ دورہ اٹکا بیڑا کہ صحت جواب دے گی۔ انہوں نے اب عوامی اجتماعات میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ منظر سے بالکل ہٹ گئے تھے۔ بیماری کو چھپایا جا رہا تھا لیکن عوام یہ سوجھ بوجھ نہ تھے کہ

وہ سحر سے کیوں ہٹ گئے ہیں۔ کچھ کو یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ وہ بیمار ہیں، کچھ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ بھی کوئی سیاسی داؤ ہے۔ کچھ یہ سوچتے ہیں کہ یہ جانب حق ہے کہ ان کے مخالفین نے انہیں خاموش کر دیا ہے۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں ہو رہی تھیں۔

ان سب باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت تھی۔ چنانچہ لائی حسب معمول پارٹی اور حکومت کے روزمرہ کے معاملات انجام دے رہے تھے لیکن مخالفین اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ ان مخالفین میں سے ایک وائیک ہوٹک دن کچھ زیادہ ہی بے قرار تھا۔ وہ چھانگ شا روڈ ہو گیا جہاں ماؤز نے ٹھکے تھے۔ اس نے چھانگ شا کو کچھ کرناؤ سے ملاقات کی اور وزیراعظم اور پی کاہن کی تحلیل کا مسئلہ اٹھایا۔

”وزیراعظم اب کام کرنے کے لائق نہیں رہے۔ کاہن اس سے قانکہ اٹھا رہی ہے اور من مانی کرنے پر تلی ہوئی ہے لہذا یہ برا ضروری ہے کہ سب سے وزیراعظم کا انتخاب ہو اور موجودہ کاہن کو فارغ کر دیا جائے۔“

ماؤز کو معلوم تھا کہ چوان لائی کی بیماری ناقابل علاج ہے اور ان پر ان کی صحت سے زیادہ بوجھ پڑ رہا ہے۔ اس لیے شاید وہ وائیک ہوٹک کی تجویز پر غور کرتے لیکن وائیک ہوٹک نے جلد بازی سے کام لیا اور ماؤز سے ٹھک کو قائل کرنے کے لیے چوان لائی پر بے بنیاد الزامات کی بارش کر دی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اب ایک لمبے بھی انہیں برداشت کرنا ممکن کو تھانے کے برابر ہوگا۔ ماؤز نے ٹھک اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے کہ چوان لائی بیمار ہیں لیکن اس جیسے قلعہ رنڈا پر کوئی الزام لگائے یہ انہیں برداشت نہیں تھا۔ وہ تھکے سے اٹھ کر وائیک ہوٹک کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے صاف کہہ دیا کہ چوان بدستور کام کرتے رہیں گے۔

چوان لائی کے مخالفین جن سازشوں میں لگے ہوئے تھے وہ اس سے خبر نہیں تھے۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وائیک ہوٹک نے جینر میں سے ملاقات کی ہے۔ ضروری تھا کہ وہ بھی ملاقات کریں۔ انہوں نے اپنے سیکریٹری کو اس سفر سے آگاہ کیا تاکہ فلائٹ کا بندوبست ہو۔

آنکھ لٹا کر وائیک ہوٹک کے ارکان انہیں ایک بار پھر اپنے درمیان پا کر بہت خوش ہوئے کیونکہ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے کوئی سفر نہیں کیا تھا۔

اخباروں نے بھی اس خبر کو نمایاں کر کے شائع کیا۔ اس خبر سے لوگوں کو بھی یہ تاثر ملا کہ انہوں نے اپنی بیماری کو شکست دے دی ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ بدستور بیمار تھے۔ سڑکے قائل ہو گئے تھے۔ وہ صرف اس لیے سڑکے پر لگے تھے کہ جینر کا مسئلہ داؤ پر تھا۔

انہوں نے ماؤز سے صحت میں ملاقات کی اور تمام باتیں تفصیل سے زیر بحث آئیں۔ بالآخر جینر میں ماؤز نے ٹھک نے فیصلہ سنا دیا کہ چوان لائی بدستور کام اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ وزیر کا انتخاب بھی وہ اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں۔

وہ چھانگ شا کے سفر سے واپس آئے تو پہلے سے بھی زیادہ کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ چلنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی لیکن چپے پر خوشگوار سہارا تھا۔ انہوں نے اپنے محلے کے ارکان سے ایک ایک کر کے ہاتھ ملایا اور ان کی تحریک دریافت کی۔ جب ان کی تحریک دریافت کی گئی تو وہ صرف اتنا کہہ سکے۔

”سفر خوشگوار رہا۔“

محتاج کب سے انہیں مجبور کر رہے تھے لیکن اس کے لیے انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس پابندی کے لیے وہ تیار نہیں تھے لیکن اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ انہیں بیچک اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ انہیں مٹانے کا کینسر تشخیص ہوا تھا۔ اس کے علاج کے لیے انہیں ایک سے زیادہ آپریشنوں سے گزرنا تھا جہاں اسپتال میں داخل ہونے پڑے۔

اسپتال میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ ریاستی امور سے غافل رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا نائب وزیراعظم روزمرہ کے امور انجام دے رہا تھا لیکن ان کاموں کی نگرانی اور غیر ملکی مہمانوں سے ملاقات کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ان کاموں کی انجام دہی کے لیے انہوں نے اپنا دفتر بیچک اسپتال میں منتقل کر دیا۔

وزیراعظم بننے کے بعد سے اب تک ایک سادہ سا کمران کا دفتر تھا جس میں ماؤز نے ٹھک کے ایک بچے کے سوا کوئی اور آرائشی چیز نہیں تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کشادہ میز تھی جس کی حالت بتاتی تھی کہ بہت زیادہ استعمال ہو چکی ہے۔ چھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن ان کا دفتر تھا اور یہی چیزیں دفتر کے طور پر اسپتال کے ایک کمرے میں منتقل

ہو گئیں۔

1975ء کے اختتام تک انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ اس وقت کو زیادہ سے زیادہ مصروف رہ کر گزارنا چاہتے تھے۔ ایک مصروفیت ان کے ہاتھ آگئی۔ ایک چینی ڈسٹری (نیو چائنا ڈسٹری) حرب ہو رہی تھی (انہوں نے اس وقت کا مسودہ نظر چائی اور اصلاح کے لیے اپنے پاس منگوا لیا۔

موتھن اس خدمت میں جھکا ہوئے کہ وزیراعظم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ معاملہ سچ میں ایک جائے۔ مسودہ واپس نہ آنے کا بہت بڑا رگ بجائے۔

ایک دن یہ مسودہ پہلی ٹھک ہاؤس لایا گیا تو تمام اراکین حیرت زدہ رہ گئے۔ وزیراعظم نے ان کی توقع سے بہت پہلے مسودہ واپس کر دیا تھا۔ ان پر ان کے دستخط تھے اور معاشیوں پر تبصرے بھی تحریر کیے تھے لیکن یہ دیکھ کر تمام اراکین افسردہ ہو گئے کہ تحریر میں فکری نمایاں تھی۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جب وہ لکھتے تھے تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

حالت کی اس خرابی کے باوجود بعض سرکاری تقاریب ایسی ہوتی تھیں جہاں ان کی نمائندگی کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ تو لاڈا کا ہوا یا آئی ان تقاریب میں شرکت کرتا تھا۔

عوامی جمہوریہ کے قیام کی بچیسویں سالگرہ آئی تو ان کی شرکت لازمی تھی۔ ان کے پی آریشن ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ وہ تقریب میں شرکت نہ کریں لیکن وہ اس قومی دن کے استقبال میں شریک ہونے اور اس تقریب کی صدارت کرنے کے لیے عوامی ہال میں داخل ہوئے تو مہمانوں پر ایک خوشگوار حیرت طاری ہو گئی۔ ان کی صحت کے بارے میں لوگ فکر مند تھے اور اب وہ ان کے درمیان تھے۔ انہوں نے تقریر بھی کی۔ یہ مختصر تقریر تالیف کی کوئی شے نہیں ہوئی۔ دیر تک تالیف کے شور کے سوا ہال میں کچھ نہیں تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح جاق وچ بند نظر آ رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر زردی چھلی ہوئی تھی۔ تقریب میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ پچھلے دو برس سے سرطان کے مرض میں مبتلا ہیں۔

چینی قومی عوامی کانگریس سے بھی خطاب کیا جس کا اجلاس جنوری 1975ء میں ہوا تھا۔

پارٹی کی دسویں مرکزی کمیٹی کے دوسرے عمل اجلاس کی صدارت بھی کرتی تھی۔ پارٹی کی اندرونی تحلیل

شدت اختیار کر گئی۔ وہ اس بحران سے بچنے کے لیے سخت محنت کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں قوم سگین بحرانوں میں گھری ہوئی تھی اور اس سے ٹھکانا ضروری تھا۔ وہ کئی ہفتوں تک ان اجلاسوں کے لیے تقریریں تیار کرتے رہے۔ ایک ایسا مریض جس کے لیے یقیناً بھی دشوار تھا وہ سخت دماغی محنت کر رہا تھا۔ ماؤز سے ٹھک بار بار انہیں پیغام بھجو رہے تھے کہ تقریر کو زیادہ سے زیادہ مختصر رکھنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس پر کچھ نہ کچھ بھی کر رہے تھے۔

چوان لائی کا وزن تیزی سے گھٹ رہا تھا لیکن سب سے زیادہ تشویش اس بات پر تھی کہ ان کے پیروں میں سوجن آگئی تھی۔ اب ان کے لیے دشوار ہو گیا تھا کہ چپے کے جوتے پہن سکیں۔ انہیں یہ فکر تھی کہ وہ مہمانوں کا خیر مقدم کس طرح کریں گے۔ انکی دونوں کوربائی لیڈر کم ال ٹھک کی آمد ہوئی تو انہوں نے اپنے لیے کپڑے کا ایک ڈھیلہ ڈھالنا ہوا۔

یہ آخری مہمان تھے جن سے بیچک اسپتال میں انہوں نے ملاقات کی۔

اب ان کا ایک ہی شعل رہ گیا تھا کہ اسپتال میں اپنے کاؤچ پر بیٹھے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اہم ترین امور پر غور کرتے رہیں۔ ان دنوں ایک سوال انہیں چاروں طرف سے گھیر رہا تھا۔ کیا کینسر کا علاج دریافت کر لیا جائے؟ انہیں قوی امید تھی کہ لیکن روایتی چینی طب کے حکمراں قدر تجربے اور علم کی عود سے اس مہلک بیماری پر فتح پاسکتا ہے۔ آخری دنوں میں وہ پُر زور انداز میں اس خواہش کا اظہار کرنے لگے تھے کہ لیکن کے روایتی ڈاکٹروں اور مغربی طب کے ڈاکٹروں کو ایک ساتھ مل کر اس بلیو مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وہ ایک اہم آپریشن سے گزر رہے تھے اور بہت کمزور ہو چکے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ چینی عوامی فوج آزادی کے مارشل اور نائب وزیراعظم اور کیونسٹ پارٹی کے سیاسی پیروں کے دکن خدو لوگ کی کیوریٹ سروس ہونے والی ہے تو وہ اس میں شرکت کے لیے بے چین ہو گئے۔ ڈاکٹر ایک مرتبہ پھر اس حق میں تھیں تھے کہ وہ باہر نہیں لیکن انہوں نے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا۔

لوگوں کو توقع نہیں تھی کہ وہ سوگواروں کے درمیان لیکن نظر آئیں گے لیکن وہ ایک دہاں نمودار ہوئے۔ وہ دماغی الجھنے کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ اس وقت بھی ان کے جسم پر

تاریکی کا آئینہ

شکیل صدیقی

اس کسی ابتدائی زندگی پر آزار تھی اور اسی زندگی نے اسے حوصلہ مند بنایا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے عیش و عشرت کی ارضی جنت تک پہنچ گیا۔ اس نے خود کو اپنے آپ میں منفرد اداکار بنا کر ایسا نام کمایا کہ لوگ مثالیں دینے لگے۔



بالی ووڈ کے ایک مشہور اداکار کی زندگی کا تسلسلہ

اسٹیفن ایڈون کنگ اسکاٹ لینڈ کے ایک شاعرانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی قامت چوٹ چار انچ ہے اور وزن تقریباً 200 پاؤنڈ۔ اس کی رنگت عام برطانوی افراد کی طرح سے سفید ہے مگر آنکھیں نیلی ہیں۔ سر کے بال موٹے اور سیاہ ہیں، جب کہ داڑھی کے بال کبھی کبھی سفید ہیں (اس نے ابھی داڑھی نہیں رگی ہے)۔ مونچھ کے بال البتہ سیاہ ہیں، اس لیے کہ وہ بھی بھار شوقی مونچھیں رکھ لیتا ہے۔ اس کی بیانی چونکہ بچپن ہی سے قابل اعتبار نہیں

ہر بار ہارشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ 7 جنوری 1976ء کی رات کو کسی وقت دھیرے سے اٹھا آنکھیں کھولیں۔ انہیں آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھ کر ڈاکٹر اور نرسیں ان پر جھگڑیں۔

”یہ رات کا وقت ہے نا؟“

”جی سر۔“

”اس وقت ناٹم کیا ہوگا؟“

”رات کے گیارہ بجے ہیں۔“

”تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟“

”سر، آپ کی خدمت کے لیے۔“

”اب تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ جاؤ دوسروں کی خبر گیری کرو۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے تم ان میں سے کسی کو بچا لو۔“ انہوں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ہارشی میں چلے گئے تھے۔

8 جنوری 1976ء کی صبح کو پنجاب کے سرحدی علاقہ کا ایک عظیم رہنما داغ مفارقت دے گیا۔ ان کی بیماری چھپائی گئی تھی موت نہیں چھپائی جاسکتی تھی۔ یہ خبر سننے ہی پوری قوم سکے میں آ گئی۔ یہ صرف ایک وزیراعظم کی موت نہیں تھی ایک ایسے عوامی آدمی کی موت تھی جس نے دل و جان سے عوام کی خدمت کی تھی۔

سیت گاڑی جس میں چائن لائی کا تابوت رکھا تھا۔ پیچھے اسپتال سے اٹھائیں کے پایاؤ شان قبرستان کی طرف روانہ ہوئی۔ لوگ اس سے پہلے ہی غول در غول قبرستان کی طرف جانے والی شاہراہ پر جمع ہو چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ بچوں کو ان کے والدین نے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ لوگ بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے ہوئے تھے۔ عورتوں نے اپنے بالوں میں سفید کاغذی پھول لگائے ہوئے تھے۔ (یہ پھول جین میں سوگ کی علامت سمجھے جاتے ہیں)

شاہراہوں پر چھٹی چھٹی سکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ قبرستان نزدیک آیا تو یہ سکیاں درو پاک جینوں میں تہذیب ہو گئیں۔

سڑکیں جوڑ ٹیک کے شور سے گونجتی رہتی تھیں اب وہاں میت گاڑی کے ریجنے کی آواز بھی یا لوگوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ماخذات

چوائن لائی (آپ بیٹی) ترجمہ: احفاظ الرحمن

ایک بے حس سوٹ تھا اور بالوں میں ابھی طرح کٹھی کی ہوئی تھی لیکن بہت زیادہ سن رسیدہ نظر آ رہے تھے۔ چلے ہوئے اپنے پاؤں اٹھانے کے لیے پوری طاقت خرچ کر رہی پڑ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتے ہوئے اس بستر کی طرف بڑھے جس پر وہ رہنا رکھا ہوا تھا جس میں لوگ اپنے تاثرات نگہ رہے تھے۔ قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ کھٹے ہوئے ان کے ہاتھ بڑی طرح کانپ رہے تھے۔ دھکا کرنے کے بعد انہوں نے ہر لوگ کی پیوی کی طرف دیکھا۔

”میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں اسے بھانہ نہ سکا۔“

”یہ تو بھانہ ہی تھا۔“ ہر لوگ کی پیوی نے کہا۔

”بہت جلد میری ابھی وقت آنے والا ہے۔ میں خود کو نہ بچا سکوں گا۔“ انہوں نے کہا اور وہاں سے ہٹ گئے۔ ان کے مددگار انہیں وہاں سے لے کر چلے گئے۔

ان کا ایک آپریشن اور ہونے والا تھا۔ تیاریاں کی جا رہی تھیں کہ انہیں اطلاع ملی کہ جنوب مغربی صوبے یون ٹان میں راستے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں پھیپڑے کے سرطان کی شرح میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے ڈی تھان اسپتال کی پارٹی سیکرٹری کو اپنے پاس بلا بھیجا۔

”کیا تمہیں اس صورت حال کا علم ہے؟“

”جی ہاں، ہم اسے بڑی تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔“

”آپ لوگ اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟“

”کئی اجلاس ہو چکے ہیں جن میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔“

”اس مرض کی افزائش روکنے کے لیے فوری طور پر وہاں ایک طبی ٹیم روانہ کی جائے۔ اس کے بعد اجلاس بھی کرتے رہنا۔“

وہ اپنی حالت بھول کر اس مرض کے علاج کے لیے کوشاں تھے۔ وہ مختلف ڈاکٹروں کو آمادہ کر رہے تھے کہ وہ اس مرض (سرطان) کے علاج کے لیے تجربات کرتے رہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس سے محفوظ رہیں۔

تقریباً چودہ آپریشن ہو چکے تھے۔ ہر آپریشن کے بعد ان کی حالت سنبھل جاتی تھی مگر پھر بگڑ جاتی تھی۔ انہیں تقریباً دو سال اسپتال میں رہتے ہوئے ہو چکے تھے۔

اپنے دوست ہر لوگ کی رسم تعزیت میں شریک ہونے کے تقریباً سات ماہ بعد ان کی حالت پھر بگڑ گئی۔ ان

ہے، اس لیے وہ چشمہ لگا تا ہے۔ وہ اپنی تصاویر پر دستخط نہیں کرتا۔ البتہ جب اس کا کوئی ماحول بنے یا وہ فراموش کرتا ہے تو وہ تصویر پر دستخط کر کے اسے بجا دیتا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ اس کا دل کیسا ہے تو اس نے جواب دیا: ”میرا دل ایک چھوٹے لڑکے جیسا ہے۔ اور میں نے اسے ایک مرجان میں ڈال کر اپنی میز پر رکھ دیا ہے۔“

اس کی کتابیں دنیا کی 33 زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور 35 ممالک میں فروخت ہو چکی ہیں۔ مجموعی طور پر اس کے ناول اور کتابیں 30 کروڑ کی تعداد میں آچکی ہیں۔ اس وقت وہ تین ریڈیو اسٹیشنوں کا مالک ہے۔ اس کے ماحول نے اسے ناسٹر آف ہارر کا خطاب دے رکھا ہے۔

اسٹیفن ایڈون کنگ پورٹ لینڈ مین میں 21 ستمبر 1947ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والدین کی غیر متوقع اولاد ہے۔ اس لیے کہ معائنہ نے اس شخص کا اکتہار کیا تھا کہ ان کے ہاں اولاد نہیں ہوگی، لہذا جب اسٹیفن پیدا ہوا تو انہیں بہت حیرت ہوئی۔ وہ ڈونا لڈ اور ٹلی روڈ کا پہلا بیٹا تھا۔

اس کے والدین پئیس بری کنگ میں رہتے تھے۔ غالباً اسی لیے کنگ اس کے نام کا جزو ہے۔ والدین میں جب ناجانی ہوئی تو انہوں نے نتیجہ دیا ہوتا مناسب سمجھا مگر یہ طبیعتی بیڑے پر اسرار انداز میں ہوئی۔ اس کا باپ سٹیز مین تھا اور برقی آلات فروخت کیا کرتا تھا۔ اس کے لیے اسے ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹا پڑتا تھا۔ ایک رات وہ سگٹ کا پکٹ لینے کے لیے گھر سے نکلا اور پھر بھی واپس نہ آیا۔ اسٹیفن کی عمر اس وقت صرف دو برس تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا کہنا ہے کہ دو برس کی عمر میں میں نے اس کا خاکہ و ماخ میں محفوظ کر لیا تھا لیکن حقیقت میں میرا باپ کیسا تھا اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔

اسے اور اس کے چھوٹے بھائی ڈیو کو اس کی ماں نے پروان چڑھایا۔ دونوں بھائیوں نے مختلف جھگڑوں پر رہائش اختیار کی۔ مثلاً وہ انڈیانا کے علاقے فورٹ وین میں رہے جہاں ان کے باپ کے اور بھی رشتے دار تھے۔ ان کے نزدیک رہنے کی بنا پر اس کی ماں کی ڈیڈلز بددیانتی تھی۔ اسٹیفن خود کو غیر محفوظ سمجھتا تھا۔ وہ نفسیاتی بیمار ہو گیا تھا۔ وہ سوئے میں چمک جاتا تھا کہ باپ کی طرح سے اس کی ماں بھی اسے اور بھائی کو چھوڑ کر نہیں چلی جائے گی۔ اسے ہولناک خواب آتے تھے۔ ایک بار اس نے اپنی ماں کو تابیت میں لپیٹ دیکھا۔ وہ خود ایک برگلہ کے درخت کی سب

سے اونچی شاخ سے لٹک رہا تھا اور اس کی گردن میں رسی کو پھندا لگا ہوا تھا۔ گھر سے اس کے سر کے گرد منڈلا رہے تھے۔ ایک نے نزدیک آکر اس کی دائیں آنکھ پر چھینچھی مگر ماری نہیں۔ بہر حال وہ خواب تھے جس کی زندگی کی تاہوار میں کی بنا پر اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئے تھے۔

اس کی ماں کو جب فرار نہ ملا تو وہ اپنے چھوٹے سے خاندان کو لے کر کنگلی کٹ کے علاقے اسٹارٹورڈ میں رہ گئی۔ اس وقت اسٹیفن کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ قسمت نے وہاں بھی ان کے قدم چھینے نہیں دیے۔ کنگ آکر اس کی ماں نے وہ بارہ مین کے علاقے دور باہم میں سکونت اختیار کر لی۔

اس وقت اسٹیفن نے ایک ہولناک حادثہ دیکھا۔ اس کا ایک دوست فرین سے ٹکرا اور پھر کٹ کر ہلاک ہو گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اسٹیفن کے خوف ناک کہانیاں لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے مگر اسٹیفن نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی یادداشت میں اب اس واقعے کا بظاہر کوئی ٹک نہیں ہے۔ اس کے اہل خانہ نے بتایا کہ جب وہ گھر واپس آیا تھا تو اس کی زبان لٹک تھی اور وہ درجہ سہا ہوا تھا۔ بعد میں خاندان والوں کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنے دوست کو حادثے سے دوچار ہوتے دیکھا تھا۔

اس کی ماں کے والدین بڑھاپے کی وجہ سے پریشان کن زندگی گزار رہے تھے۔ جب اسٹیفن کی خالہ روڈ نے اپنی بہن سے گزارش کی کہ اگر وہ والدین کی دیکھ بھال کر لے گی تو وہ اسے گزروے کے لیے مناسب رقم دے دیں گے۔ ٹیلی نے والدین کی خدمت کرنے کی رضامندی ظاہر کر دی۔

خاندان کے افراد نے نہ صرف یہ کہ اس کے ماخ پر اخراجات برداشت کیے بلکہ اسے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا مکان بھی لے کر دے دیا۔ جب اسٹیفن کے نانا اور نانی کا انتقال ہو گیا تو اس کی ماں کو پانچ لینڈ ہول کے کچن میں کھانا پکانے کا کام مل گیا۔

اسٹیفن نے دور اہام کے گرامر اسکول میں تعلیم کا آغاز کیا اور اس کے بعد فرین فالز ہائی اسکول اور 1966ء میں مگرجویٹ کر لیا۔ یونیورسٹی آف مین میں ہی اس نے اسکول کے ہفتہ وار اخبار میں کالم لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس اخبار کا نام ڈی مین کس تھا۔ اسٹیفن کو چونکہ سیاست سے بھی دل چسپی تھی لہذا اس نے چھوٹی سی سٹیٹ بنالی اور خود اس کا نام ممبرن بیٹھا۔ اس کی سٹیٹ کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ

جنگ سے فکرت کی جائے اور انسانیت کو امن اور بھائی چارے سے رہنے دیا جائے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ امریکانے اپنے نام میں جو جنگ شروع کر دی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ جنگ پر خرچ ہونے والے اخراجات آخر لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیوں نہیں کیے جاتے؟

اسٹیفن نے 1970ء میں جب مگرجویٹ میں کر لیا تو سے ہائی اسکول لیول کے بچوں کو پڑھانے کی اجازت دے دی گئی۔ مگر جب میڈیکل بورڈ نے اس کا منسلک معائنہ کیا تو اسے نئی کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسے ہائی بلڈ پریشر ہے۔ اس کی روحانی کم زور ہے اور ساعت میں نقص ہے۔ اسٹیفن مایوس ہو کر ایک طرف نہیں بیٹھ گیا۔ کچھ نہ کچھ کرنا تھا، لہذا اس نے اپنی ایک سائیڈ کی تاجا سے شادی کر لی۔

وہ مین یونیورسٹی کی فوٹو لائبریری میں کپائٹ اسٹڈی کر رہے تھے۔ دونوں میں آنکھ دکھا ہو گیا۔ اسٹیفن کو چونکہ مسلم کی حیثیت سے میڈیکل بورڈ نے پڑھانے کی اجازت نہیں دی تھی اس لیے وہ ایک لائبریری میں مزدوری کرنے لگا۔ وہ لکھنے کے مرض میں مبتلا تھا چنانچہ 1959ء میں ایک مقامی اخبار میں مضامین لکھنا شروع کر دیے۔ وہ اخبار میو گراف مشین پر طبع ہوتا تھا اور اس کی اشاعت صرف ایک سو تھی۔

اسے بچنے کے شوقین خواتین و حضرات پڑھتے تھے، اس لیے کہ اس میں بچنے کی دل چسپ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً مسز اسمتھ کے ہاں چوتھا بچہ پیدا ہوا ہے۔ مسز جوزف اپنا کب مسز جرد میں دل بچھی لے رہی ہیں اور ایک بچہ بھرا ہے۔ شوہر سے طلاق لے کر چھڑے شادی کر لیں گی۔ مسز خود بھی شادی شدہ ہیں لیکن اب ان کا دل اپنی بیوی سے بھر گیا ہے، وغیرہ۔

اسٹیفن کو اس سے کوئی بڑی شہرت تو حاصل نہ ہوئی، بہر حال بچنے والے اس کے نام سے ضرور واقف ہو گئے۔ اس لیے اسے اس وقت شامشاہی جب اس نے ایک چلنے پونے اخبار میں کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ ان کہانیوں کا معاوضہ اسے نصف سینٹ ملا کرتا تھا۔ یہ بڑی رقم نہیں تھی لیکن اس کا دل بڑھانے کے لیے بڑی رقم تھی۔ اس لیے اسے عرصہ دور ہوا تھا کہ اس کی کہانیاں پسند کی جاتی ہیں لہذا اخبار کا مدیر اسے شائع کر رہا ہے اور معاوضہ بھی دے رہا ہے کہانیاں لکھنے کا اسے اتنا شوق تھا کہ اس نے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ جب

اس کے اساتذہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس پر پابندی لگا دی۔ ان کا کہنا تھا کہ لکھنے کے لیے مطالعہ کرے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اس نے مردوں کے ایک میگزین میں ایک کہانی لکھ کر بھیجی۔ کہانی اطفال سے شائع ہو گئی اور اس کے دوستوں نے وہ واہ واہ مچا دی۔ انہوں نے اسے اسرار کا کہہ کر حیران کئے۔

اسٹیفن نے کرسٹل مصنف کی حیثیت سے 1967ء میں اسٹارٹنگ مسز میگزین میں اپنی نگاہیں فلورڈائی کہانی لکھی جو شائع ہوئی اور اسے مناسب معاوضہ بھی ادا کیا گیا۔

اسٹیفن کی ابتدائی کہانیاں سائنس فکشن پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ اس کی سائنسی معلومات بے حد بھلی تھیں اس لیے وہ تصدیقات میں نہیں جاتا تھا۔ پلشر وہ کہانیاں بچوں کے صفحات پر شائع کرتے تھے اس لیے وہ بچوں کو سائنسی فکشن لکھتی تھیں۔ ان کے روکتے کڑے ہو جاتے تھے۔ خود اس کے روکتے اس دن کڑے ہو گئے جب اس نے اپنی آخری کے گھر کے اسٹور میں رکھے ہوئے ایک کسک کو کھولا۔

اس کسک میں بہت سے کتابیں فکشن ہوتی تھیں۔ اسٹیفن کنگ نے ان کتابوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا تو معلوم ہوا کہ چند سائنس فکشن کتابیں ہیں اور باقی خوفناک کہانیوں کے مجموعے اس نے وہ سارے مجموعے بڑھ ڈالے تو دل میں چنگ پیدا ہوئی کہ اسے اسی انداز میں لکھنا چاہیے۔ بڑے ہوں یا چھوٹے پر ساریت سب کو پسند آتی ہے اور انسان نہ معلوم دنیا اس کے بارے میں معلوم کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ وہ چڑیس اسے درجہ حیرت میں ڈال دیتی ہیں جو ان چاہتی اور ان دیکھی ہوں۔

اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ خود کو مزدوری کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کمزور سا شخص ہے، اس لیے مشقت کا کام نہیں کر سکتا۔ شادی کے بعد بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے اس نے مردوں کے رسائل میں کہانیاں ہی لکھنا شروع کر دیں۔ یہ ابتدائی کہانیاں اس کے ایک مجموعے ”ناؤٹ شفٹ“ میں شائع ہوئیں۔

اپنی بتاریخوں پر قابو پانے کے بعد اسے میڈیکل بورڈ نے ایک انگریزی اسکول میں پڑھانے کی اجازت دے دی۔ مین میں وہ اسکول سمیڈن میں تھا۔ صبح وہ تعلیم دیا کرتا تھا اور شام کو کہانیاں لکھتا تھا۔ یہ کام اس نے ہفتہ وار

چھیلوں میں بھی انہما ہونا شروع کر دیا۔

وہ ایک اچھا معلم تھا۔ طالب علم اس کی کلاس میں دل چسپی لیتے تھے اور خاموشی سے درس لیتے تھے۔ مگر اسٹیفن کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اسے بھڑک کر دکھایا ہو۔ اس نے بتایا "میں جب بڑھا کر کھڑا ہوتا تو بہت تھکا ہوا ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں آج بے ڈراما کر کے آ رہا ہوں۔ بات نہیں کرتا تھا۔ ہوجاتی تھی بلکہ اس کے بعد مجھے اپنے طالب علموں کی کامیابیوں پر چک کر ہنسنے لگتا تھا۔ اس کے بعد اپنے پندریہ کام میں بھی غور کے لیے وہ قیامت کی بات تھا۔

میں نے حساب لگایا کہ اگر میں مزید تین برس تک یہی کچھ کرتا رہا اور میرے معمول میں فرق نہ آیا تو میں کسی کچھ کی طرح نا کارہ ہو کر رہ جاؤں گا۔ کہانی لکھنا تو درکنار میں کاغذ پر آؤں تو بھی لکیریں تک نہیں سمجھتا ہوں گا۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک دیباچہ ساز آدمی تھا، ہر انداز آجائیس برس رہی ہوگی۔ اس نے آفس کے فرش پر آنکھیں بند کیے خاموش پڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیض سامنے سے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس عالم میں وہ محض بہت بولناک نگ رہا تھا۔ نہ بول خاموشی میں چکاؤڑوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی جلی آواز سنائی دے رہی تھی جو آفس سے باہر پائل انداز میں پھرکاٹ رہی تھیں۔ وہ دو کورین طرزی ایک عمارت تھی جہاں وہ آفس قائم تھا۔

مگر بڑھ کر یقیناً آپ کے دماغ میں آیا ہوگا کہ یہ اسٹیفن تنگ کے کسی ناول کا باب ہے۔ لیکن اس وقت آپ حیرت کے جزو خارج نہیں ہوئے۔ کمانے لگیں گے جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ کسی اور کا نہیں بلکہ خود اسٹیفن تنگ کا قصہ ہے۔ اس نے اس روز پیر کے آٹھ گھنٹے ڈنچے پیئے تھے اور کوئین بھی استعمال کی تھی۔ فرش پر بے ہوش کی حالت میں گرے۔ اس کی ناک فرش سے ٹکرائی تھی، اس لیے ناک سے خون نکلنے لگا تھا جو رستا ہوا سینے تک پہنچ گیا۔ جس سے قمیض سرخ ہوئی تھی۔

یہ خوف ناک کہانیاں کا مصنف اسٹیفن تنگ تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، مصنف اتنی سخت محنت کرنے اور محنت اٹانے کے لیے نشیات کا سہارا لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اسٹیفن نے بھی زیادہ شراب پینا شروع کر دی اور اس کا نشہ جب جسم میں نہ دے سکا تو اس نے نشیات بھی

استعمال کرنا شروع کر دیں، جس میں الفاؤن، ہیگ، وینک، ریگس اور پائل بھی شامل ہے۔ اس نے باڑی کا وہ 1980ء تک شکار رہا ہے۔ اپنی ماں کے مرنے کا بھی بہت قلق تھا، اس لیے وہ اس کی قبر پر جا کر روتا کرتا تھا۔ اسی غم اور دوست بیز کے ڈبے اور سگریٹ کے ٹوٹے اس کے کمرے سے صاف کیا کرتے تھے اور اسے پیچ بکھاتے رہتے تھے کہ وہ خود کو بیلن تنگ نہ کرے۔ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی تحریروں کے منتظر رہتے ہیں۔

اسے نشیات کی ات کب تک تھی؟ بعض افراد کا خیال ہے کہ اپنے پہلے ناول کی کامیابی کے بعد، ہونا تو یہ چاہیے تو کہ وہ مطمئن ہو جاتا اور خوشیاں مناتا، لیکن اندر سے وہ پچیس برس کا شکار ہو گیا۔ اسے اندیشے ستانے لگے کہ اگر اس کا دوسرا ناول نا کام ہو گیا تو اس کی شہرت کی ڈور کٹ جائے گی اور وہ آوارہ و تنگ کی طرح گمنا کی یادداشتوں میں ڈوب رہا جائے گا۔

وہ چنگیز بارڈر تھا، اس لیے اس کے دماغ میں ہر وقت قحطی چیزیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ مثلاً سانپ، بچہ، وقت قحطی چیزیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ مثلاً سانپ، بچہ، وقت قحطی چیزیں گردش کرتی رہتی تھیں۔

1973ء میں اس نے ایک کہانی کا خاکہ بنایا اور اس پر کام کرنے لگا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک لڑکی "کارن" و "ہائٹ" تھی۔ کہانی ابھی اختتام تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ اس سے آگیا اور اس نے صفحہ 100 کے نوکری میں ڈال دیے۔ اس کی خوش قسمت تھی کہ اس کی بیوی تیار تھی اس سے مشورہ و مشورے کو کوڑے کی نوکری سے نکال کر بڑھایا۔

اسے سو رہ پند آیا۔ اس نے اپنے شوہر سے بحث و جھجھکی کی کہ یہ حقیقت میں کہانی نہیں بلکہ ناول ہے۔ اسٹیفن نے ایک نئی محنت اور حوصلے کے ساتھ اسے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ جب کہانی ختم ہوئی تو وہ ناول کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے ناول کا نام "کیری" تجویز کیا۔ یہ ایک لڑکی کی کہانی تھی جو پر اسرار قوتوں کی مالک ہوتی ہے۔

ناول "کیری" جنوری 1973ء میں شائع ہوا تو اس نے اسے اپنے بچوں کو اس کا سوہو دیا۔ انہوں نے اس سے مکی میں اس کے حقوق وصالی ہزار ڈالر میں خرید لیے۔ اسٹیفن تنگ کے لیے یہ بڑی رقم تھی۔ جب کہ اس کی بیوی کو ابھی اس کی صلاحیتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

دوسری طرف بچوں نے اسے بتایا کہ اگر ناول بھرے پچھنے کے بعد بیس سیکڑے میں شامل ہو گیا تو پھر اسے انسانی معاوضہ ملے گا کہ اسے بچوں کو گھر بڑی بھی نہیں

دے گا۔ اس نے اسے اور وہ صرف ناول لکھ کر گزارا کر سکے گا۔ اسے اس نے کم راسخ کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

1973ء کے اوائل میں جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی ماں بیمار ہے اور اسے شدت سے یاد کر رہی ہیں تو وہ بے چین ہو گیا اور اپنے چھوٹے سے خاندان سمیت جنوبی مین میں چل گیا۔ اس نے ہیکل سہاگو کے قریب ایک مکان کرائے پر لیا اور ماں کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا دوسرا ناول "کیری" لکھنا شروع کر دیا۔ وہ ناول ختم ہوا تو تیسرے ناول کا پلاٹ ڈھن میں آگیا اور اس نے "میرا دھم" نامی ناول لکھ ڈالا۔ اسی اثنا میں 59 برس کی عمر میں اس کی ماں کا سرطان میں انتقال ہو گیا۔

موسم بیمار میں اس کا ناول "کیری" شائع ہوا اور بیکٹالوں کی رحمت نہ کیا۔ قحطی کی آمدنی ہوئی تو اسٹیفن تنگ نے اسے ناول کا پلاٹ تیار کیا اور خاندان سمیت کالاریڈو چلا گیا۔ اسی اثنا میں ایک فلم ساز نے اس کے ناول "کیری" کے حقوق فلم بنانے کے لیے خرید لیے۔ تنگ کی فلمی ادارت میں تبدیل ہوئی۔ دل چاہا کہ اسے یہ بات کہ اس کی بیوی کو بھی اس کی صلاحیتوں پر یقین ہو گیا اور اس نے تنگ کو مصنف تسلیم کر لیا۔ 12 مئی 1973ء اس کے لیے خوش قسمتی کا دن ثابت ہوا۔ اس کے پبلشر نے اس کے ناول "کیری" کے حقوق دوسرے ادارے کو چار لاکھ ڈالر میں فروخت کر دیے، تا کہ وہ اس کا ناول اپنے شائع کر سکے۔

پبلشر نے تنگ کو نوٹ کر کے یہ اطلاع دی اور بتایا کہ معاوضے کے مطابق وہ اسے میں ہزار ڈالر ادا کرے گا۔ تنگ کا دل چاہا کہ وہ خوشی سے چٹخا ہو کسی جنگل میں چلا جائے اور دھندلا، پرندوں، چمڑوں اور حیوانوں تک کو یہ خوش خبری سنا دے۔ اسے سر دست وہ انساؤں میں تھا، لہذا اس نے اپنی بیوی کو دھڑلے پر تیار کر کے ساتھ میں دیا جس کی فرمائش وہ عرصے سے کر رہی تھی۔

کولاریڈو میں وہ ایک برس رہا اور اس نے اپنا ناول "کیری" شائع مکمل کر ڈالا۔ پھر 1975ء میں وہ اپنے وطن میں واپس آگیا اور اس نے کرائے کا مکان چھوڑ کر مغربی مین میں ایک مکان خرید لیا۔ وہاں اس نے اپنا تیسرا ناول "دی اسٹینڈ" لکھا۔ مکان میں چونکہ بچوں کا شوق اوروں کو چار پتا تھا اس لیے وہ ایک ماہ کے لیے انیس پارک کے اسٹیجے ہوئی کے گھر گھر 217 میں چلا گیا۔

وہ بعض اوقات تنہائی میں خوف زدہ ہو جاتا کرتا تھا۔ مگر

☆ 1998ء میں فارنس میگزین نے 40 فنکارین کی ایک فہرست بنائی جنہوں نے تحریروں کے ذریعے لوگوں کو تفریح فراہم کرنا اپنا شعار بنایا۔ جانیس مصنفوں میں اس کا نمبر 31 واں تھا۔

☆ 2001ء میں اٹلی میوزیم سالانہ بین الاقوامی متعقد ہوئے اور اس میں فلم، ٹیلی ویژن موسیقی اور ٹیلی فون سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ مصنف کی حیثیت سے اسٹیفن کو اعزاز دیا گیا۔

☆ اس نے اپنی زندگی میں کئی ریکارڈ قائم کیے ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنا ایک ناول ڈی رنگ مین جو 300 صفحات پر مشتمل تھا صرف دس روز میں مکمل کر لیا تھا۔

☆ اسٹیفن کو 2003ء میں پینٹل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے گولڈ میڈل دیا گیا ہے۔

☆ 1996ء میں اسے ایک کہانی پر "اوہ ہیری ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ کہانی کا نام "دی مین ان بلیک سوٹ" تھا۔ بعد میں اس کہانی پر فلم بنی تھی۔

☆ اسٹیفن کو اب تک 6 گرام اسکور 6 ہار گانڈ اور 5 کوس ایوارڈ مل چکے ہیں۔

☆ 2003ء میں راسٹر ایسوسی ایشن نے اسے "لائف ایچیوٹ ایوارڈ" دیا۔

☆ 2007ء میں کینیڈین پریس نے گانڈ نے لائف ایچیوٹ ایوارڈ سے نوازا۔ اس سے پہلے کسی غیر کینیڈین کو یہ ایوارڈ نہیں دیا گیا تھا۔

☆ جب اس کی قوت متقلب اپنے عروج پر پہنچ گئی اور وہ ایک برس میں کئی ناولیں لکھنے لگا تو اس نے ایک فلمی نام "رچرڈ جین" بھی اختیار کر لیا۔ اس نام کے تحت اس نے 1977ء میں "ریگ" 1979ء میں "لاگ" 1981ء میں "روڈ ورک" 1982ء میں "دی رنگ مین" اور 1984ء میں "دی ٹیمپلر اشاعت" کے لیے مختلف اداروں کو دیا۔ اس کے علاوہ وہ جان سوکولن کے نام سے بھی لکھتا ہے۔ "دی رنگ مین" پر بننے والی فلم میں اسٹیل شوانڈ نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم ہائس آف آفس پر ہے۔ حد قبول ہوئی تھی۔ بدل چپ بات یہ کہ ناول رنگ مین اس نے ایک ہفتے میں لکھا تھا۔

☆ وہ دو بھائیوں کے والد ہیں۔ 90 سال لکھ چکا ہے۔

یہاں تھائی ملنے پر اسے لکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں اس کی بیوی تالا جھانگی اس سے ملنے کے لیے آئی۔ یہ دیکھ کر اسے مسرت ہوئی کہ اس نے اپنا ناول تین چوتھی مکمل کر لیا ہے۔ اس نے گنگ کو شہرہ دیا کہ اب آجیہ وہ اپنے ناول ہول کے کمرول میں بیٹھ کر لکھے۔ بچوں سے بہت دور ہٹا کر اسے ارتکاز حاصل ہو سکے اور اس کی تحریک ختم نہ ہو۔ گنگ نے اس سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد اس نے تین ناول مرکزی مقام ہوئے ہی ہو گیا۔ ایک ناول میں اس نے ہول کے پارٹنر کو مرکزی کردار کی حیثیت دے دی۔

اس کے بعد ڈیڑھ دنوں کی باری آئی۔ اس ناول کے حقوق اس نے ڈاننگ نامی پبلشر کو فروخت کیے۔ جسے ناول شائع کرنے کا قدیم تجربہ تھا۔ اس کے بعد اس نے تین ناول مزید لکھے۔ اس طرح سے اس کے ناولوں کی مجموعی تعداد سو ملین (دس کروڑ) سے بھی زیادہ ہو گئی۔

اس کے دوسرے ناول کے سرورق پر اس کے نام کے ساتھ خوفناک مصنف بھی درج تھا اور کیری کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے پڑھنے والوں نے اسے درشت نامک مصنف کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ ناول کی فروخت سے پبلشر کو پچاس لاکھ ڈالر حاصل ہوئے جس میں سے نصف اس نے گنگ کو ادا کر دیے۔

اپنے ناول کے پلاٹ کے لیے اب اسے لندن کی فضا سازگار دکھائی دی تو 1977ء میں اس نے اپنے خاندان کو چھوڑا اور ایک سال لندن میں بسر کیا۔ دبیر کے وسط تک وہ وطن واپس آ گیا اور اس نے سینٹر لوئل میں ایک اور مکان خریدا۔ یہ نیا مکان چیکور نامی مقام پر تھا۔ چیکور میں نیا مکان خریدنے کی ایک اور وجہ تھی کہ یوٹی ورٹی آف مین میں شعلیتی ڈاننگ پر پکڑ دیا جھوٹا کر لیا تھا۔

ناول نویسی کے ساتھ وہ نیا کمانے کا شوق کم نہیں ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنے پبلشر تبدیل کرنا شروع کر دیے۔ دانی گنگ ایک بڑا اشاعتی ادارہ ہے اور ہزاروں کی تعداد میں کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس نے اسٹیشن گنگ کو بہت اچھا معاوضہ دے کر اس کی ناولیں شائع کیں، لیکن اٹھارہ برس کے بعد 1997ء میں اسٹیشن نے اعلان کیا کہ وہ اپنے پبلشر دانی گنگ کو چھوڑ رہا ہے۔ اس لیے کہ اسے ایک مکان خریدا ہے جس کی قیمت ایک کروڑ ستر لاکھ ڈالر ہے۔ اس ناول کا نام بلیز آف یون (بلیزوں کا قہیلا) ہوگا۔ کسی پبلشر نے اسٹیشن کے مطالبے پر کان نہیں دھرا اور اسے ایڈوائس

دینے پر تیار نہیں ہوا۔

بہر حال مسکن اینڈ شوئر کی کچھ میں آگیا کہ اس کے ناول اب بھی گرم کیک کی طرح سے فروخت ہوتے ہیں۔ انہوں نے اسے ایڈوائس کے طور پر آئی لاکھ ڈالر اور کر دیے۔ یہ معاوضہ ایک ہزار صفحات کے ناول کے لیے ہوا تھا۔ اسٹیشن نے اس کے لیے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ ناول کی فروخت کے بعد جو منافع ہوگا اس میں سے اسے پچاس فی صد حصہ ادا کیا جائے گا۔

اس کے تقریباً سارے ناولوں پر فلمیں بن چکی ہیں۔ وہ کئی ٹیلی ویژن سیریزوں کا مصنف بھی ہے۔ ناولوں کے بعد اس نے اپنی کہانیوں کو نئے انداز سے اضافہ کر کے لکھا اور ہم بندی کے لیے دسے دیے۔ ان میں سے زیادہ تر فلمیں کامیابی سے ہٹ کر رہیں۔

اب وہ ناول نگاری کی حیثیت سے چارواگ عالم میں اپنا لوہا منوانا چکا تھا۔ اس لیے یوٹی ورٹی کا خیال تھا کہ اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ 1979ء کے موسم بہار میں وہ سینٹر لوئل میں واپس آ گیا۔ اس کے خاندان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کریموں میں لوئل باؤس میں اور سڑکیوں میں چیکور میں رہیں گے۔ سڑکیوں کے لیے انہوں نے فلوڈ ٹرا کو بھی اپنے لیے بہتر پالیسیاں کے ہاں تین اون دی ہوئیں۔ جن میں ٹوی ورٹیکل، جوزف مل اور اوین فیل شامل ہیں۔ بڑے بڑے کی شادی ہو چکی ہے، اس لیے اب وہ داوائن کیا ہے اور اس کے تین بچے ہیں۔

جوزف مل نے بھی لکھنے کو شہر بنالیا ہے۔ اس کا قلمی نام جریل ہے۔ وہ باپ کی طرح سے درشت نامک ناولیں لکھتا ہے۔ اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ راکٹ میں آچکا ہے اور اس پر ایک بیرونی حمایت کار نامہ جیڈن فلم بنانے والا ہے۔ جب کہ دوسرے بیٹے اوین فیل کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 2005ء میں شائع ہوا ہے۔

1980ء میں اس نے چیکور میں 24 منزل مکان خریدا اور اس کی تزئین و آرائش کرائی۔ مکان کی کمر کیوں کی شیشوں پر چکاؤڑوں کی تصویر بنوائیں اور چاروں طرف لوہے کی رینگ لگوائی تاکہ کوئی غیر وہاں منہ اٹھا کر داخل نہ ہو سکے۔ اس کے ماحول کو گرم ہوا تو انہوں نے مکان کے پچہ کا نیا شروع کر دیے تاکہ اس کی جھلک نظر آجائے۔ وہ اپنے بیرو کو کھینچے کے سختی رہتے تھے۔

انہیں فلمی پائپن تھا کہ وہ فحشیت کے نشے میں ڈوبا ہوا

اجتماعی سینرز

کہتے ہیں مورس وہ طرح کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو مد کے اندر زبان نہ کھتی ہیں، دوسری زبان کے اندر منہ کھتی ہیں۔ ویسے ایک بات تمام مردوں میں مشترک ہے کہ وہ کان نہیں دھکیں۔ دنیا کا دستور ہے، وہی چیز اپنے پاس رکھ جائے جسے استعمال کر سکیں۔ چنانچہ شوہر اپنے پاس کالوں کا رکھنا بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ کی بات ڈانگی کی تو اسے مردانہ مردانگی کے اظہار کے لیے رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ شوہر بیٹے کے لیے انکو مردانہ اصول کو منہ داتے ہیں، وہ اس کی ہمیں کوئی خاص معلوم نہیں صرف اتنا بتا رہے ہیں کہ شادی کے بعد مرد دھکیں رہتے ہیں اور یہ سن جاتے ہیں، یعنی شادی کے بعد مرد کو یہ کی کار سے بن جاتا ہے۔ مرد کے چہرے پر سوچوں کو جو مقام حاصل ہے، وہ اجتماعی سینرز کا ہے۔ اس میں نامک کے نیچے لہذا ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ والدین اپنی نامک کی خاطر سوچوں کے آگے جھک جاتے ہیں اور یہی کے آگے سوچیں۔ فرمائے کسی نے یہ جھکا کہ صورت کس قسم کا شوہر جانتی ہے؟ تو ہوا، اپنے باپ جیسا۔ چنانچہ چلائی اپنے ہونے والے شوہر کا وہی ہش کرتی ہے جو اس کی ماں نے اس کے باپ کا کیا ہوتا ہے، ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ لڑکی کی دھکی کے وقت بیکے والے دھاڑیں مار مار کر اس لیے دوتے ہیں کہ شوہر لڑکی کی جدائی کا کام ہوتا ہے۔ سالانہ کر لڑکی والہ دی انکھوں کے سامنے اس وقت اپنے شوہر کا منہ اور مادہ کا مستقبل ہوتا ہے۔

مجبور کرئی کہ اب وہ اسے ٹائپ کرے۔

کہانی کی خوبیاں اور خامیوں سے قطع نظر وہ پلاٹ بنانے لگا اور انہیں پھیلانے لگا۔ اچھی چھلاک میں اس کے اندر بیٹھا ہوا مصنف چھلاک لگا کر باہر آ گیا۔ وہ مارش کے سوتے پھر اٹھنے لگے اور ناول نگاری کا ایک باہر مچر میدان محل میں آ گیا۔ اب جو ناول لکھے گئے۔ ان میں دھند، تاریکی اور آسب غائب تھا۔ بہر حال اس کے ماحول کو یقین تھا کہ وہ ایک نایک دن اپنی روش پر لوٹ آئے گا اور ان کی کھلی دور کرے گا۔

تو کیا اب وہ کوئی نو فحش کرے گا؟ ایک اخباری نمائندہ نے پوچھا۔

میں صرف سگریٹ پیتا ہوں۔ دن میں تین سگریٹ سلاکتا ہوں۔ صبح، دوپہر اور رات۔ میرا ڈاکٹر کہتا ہے کہ تم تین سگریٹ پیتے ہو لیکن یاد رکھنا کہ یہ تین کے برابر ہیں۔ اگر تم نے ایک سگریٹ زیادہ پی لیا تو یقین کر دو کہ یہ چالیس ہو جائیں گے۔ چالیس سگریٹ پینے سے پیچیزوں کو کتنا نقصان پہنچتا ہے، یہ تم کو معلوم ہی ہوگا؟

وہ چونکہ فحش کار ہے چنانچہ اپنے کان کے زمانے وہ انچ پر بلاؤنگ کرتا، خود اداکاری کرتا اور سیٹ پر عجیب عجیب چیزیں رکھتا تھا۔ اس نے کی بارصوتی اثرات دینے کے لیے حیرت انگیز چیزیں استعمال کیں۔ جب اس کے ناول فلم بند ہونے لگے تو بہت سے حمایت کاروں نے اس کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اسٹیشن گنگ نے جابر رومیرو کی فلم نائن رائڈر میں اپنی کلقتانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ خیر سے اس نے 1985ء میں ایک فلم کا منظر نامہ لکھا اور اس کی

اپنے مطالعے کے کمرے میں لڑکھ رہا ہوتا ہے۔ ایک روز اس کی بیوی تالا جھانے دیکھا کہ وہ ہول کی حالت میں پڑا ہے اور اس نے ڈھیروں تے کر کے فرش خراب کر دیا ہے۔ اس نے میز کی ساری دھاریں اور کمرے میں رکھے ہوئے فیصلوں کی تلاش کی اور اس میں سے ساری فحشیت کی چیزیں نکال لیں اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

دوسرے دن اس نے اپنے رشتے داروں اور بچوں کو کمرے میں جمع کیا اور اسٹیشن کو بلا کر کہا کہ وہ اب تک ان چیزوں سے شوق کرتا رہا ہے۔ اس نے ان چیزوں سے ترک فعل نہ کیا تو وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اسٹیشن کے لیے یہ لکھ کر تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کا خاندان اسے چھوڑ دے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے گم میں زندہ رہے۔ اس نے تو بہ کر لی۔ ابتدا میں یہ یاد کہ وہ چھپ چھپا کر فحش اور چیزیں استعمال کرتا رہا لیکن پھر ساری چیزیں ایک طرف ہوئیں اور وہ صاف سحر ہو گیا۔

پھر اسے جس چیز کا وہ فحش قرار دیا سامنے آ گیا۔ فحشیت سے اس پر جو بے خودی طاری رہتی تھی وہ اس کے سہارے لکھ لیا کرتا تھا۔ مگر جب ان چیزوں کا ساتھ چھوٹ گیا تو وہ لکھنے اور نت سننے واقعات سوچنے سے محذور ہو گیا۔ اس کے دماغ کا غائب خالی ہو گیا۔

اس موقع پر تالا جھانے اس کی مدد کی اور اس کیفیت سے باہر لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ راتوں کو اس کے سر ہانے بیٹھ جاتی تھی اور اسے کہانی کا پلاٹ بنانے کو کہتی۔ پھر اس سے بحث و مباحثہ کرتی۔ جب کوئی خیال قائل ہو جاتا تو وہ اسے

جہاں سے کامیابی کے فرشتے بھی اچھا ہوئے۔ ظلم کا نام دیکھیں
اور ذرا رنج "تھا جو اس کی گھسی ہوئی ایک کہانی ٹکس پر مبنی تھی۔
وہ اور اس کی بیوی تھیں ایک مقامی اسکول میں تادار
بچوں کو دینی تعلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی قوی
اداروں میں بھی مجلس بچوں کی امداد کے لیے رقابت میں
کرتے ہیں۔

اسے راک ایئر رول موسیقی سننے کا اور ایسی تقریبات
میں شریک ہونے کا شوق ہے جہاں راک ایئر رول کے
پروگرام ہوتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ گھنٹوں ساحل
پر گانے کی تحلیلیں سناتا ہے۔ وہ لیوی جینی کی چلوئیں
پہنتا ہے اور جینی چنا پسند کرتا ہے۔ ایک جینی ہال پوائنٹ اپنی
جیب میں ضرور رکھتا ہے۔ اسے بیس بال کے مقابلے میں
ورٹن پر دیکھنا پسند ہیں۔ وہ ان کا دیوانہ ہے۔

دوست ناک اور خوفناک ناولیں لکھنے میں اس نے کافی
تجربات کیے ہیں۔ اس نے مکمل ناولوں کے علاوہ سیریز بھی
لکھی ہیں جن میں "ڈاکٹر بار سیریز" سمیت مشہور ہوئی جس
میں مرکزی کردار خصوصاً تھے۔ اس سیریز کا پہلا ناول "مکمل نظر"
تھا جو زیادہ مقبول نہ ہوا۔ وہ چند بکسٹائوں کے سیشنوں کی
زیر نگرانی میں ناول لکھتا ہے۔ ہفت میں باری اور پانچ میں
ناول پر اس سیریز کو مقبول کر دیا۔ اس کے کارٹین کواب اس
سیریز کے ناولوں کا انتظار ہوتا ہے۔

اس کے ناولوں کے بارے میں ایک تجربہ نگار کا کہنا
ہے کہ بعض اوقات ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی سوائے
اس کے کہ اس کا انداز بیان قدرے مختلف ہوتا ہے۔ مثال
کے طور پر سٹیل لٹ جڈیہ دور کے ماحول میں بیان کی ہوئی
کہانی ہے جو اس سے پیشتر تمام اسٹورک اپنے ناول
"ڈرا کیو لائن" میں کر چکا تھا۔ جب کہ ڈی اسٹینڈ کی کہانی
"لارڈ آف رگڑز" سے بہت ملتی جلتی ہے جو ہے۔ آدرا تانکر
نے لکھا ہے۔ جس میں بدی اور اچھائی کی قوتیں برسرِ پیکار
ہوتی ہیں۔

ایک انٹرویو کے دوران اس سے پوچھا گیا کہ وہ
خوفناک اور ماورائے کہانیاں کیوں لکھتا ہے۔ اس کا حقیقت سے
کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس نے جواب دیا کہ گزشتہ دنوں میں
نے گوگل پر ایک کہانی پڑھی تھی اور اس کے مصنف کا کہنا ہے
کہ وہ جتنی کہ کہانی لکھیں گے۔

ایک شخص کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھالیا اور
اسے پلاسٹک کی ٹھیک میں لپیٹ کر گھر لے آیا۔ پھر اس نے

ایک چار میں الگوٹل بھری اور ہاتھ کو اس میں ڈال دیا۔ اس
کو اس نے دھانے میں رکھ دیا۔ اپنا علاج کر لیا اور زخم پر
بندھوا لیا۔ اس کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ ایک بار سردی کے موسم میں
اس کے بازو کی وہ جگہ جہاں بھی اس کا ہاتھ تھا اڑھتا تھا۔ یہ
خشنی ہوئی۔ اس نے ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے پوچھا کہ تمہارا
ہاتھ کہاں ہے؟

اس شخص نے جواب دیا کہ دھانے میں ایک چار میں
بند ہے۔ ڈاکٹر نے جہاں سے اسے جاکر چیک کر دیا۔
شخص دھانے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ چار جو کہ چھٹ
رکھا تھا ٹوٹ گیا ہے اور ٹکڑی سے آنے والی سرد ہوا ہاتھ میں
لگ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے چار کو لے جاکر آنکھوں کے
قریب رکھ دیا۔ اسے سردی لگنا بند ہو گئی۔ اسے آپ کیا کہیں
گے؟

اسٹینڈ بلا ناؤ لکھتا ہے۔ جن دنوں وہ لکھنے کی چھٹی کون
ہے وہ کمرس کا دن ہوتا ہے، اس کی سال کر دیا پھر چار چار
جو اس کی بیوی کی سال کر دیا ہے۔ بعض اوقات وہ دو یا تین
کہانیاں کا پلاٹ ایک ساتھ لے کر بھی لکھتا ہے۔ جو کہانی کچھ
میں آجاتی ہے وہ اس پر کام کرنے لگتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ
لکھنے کے ساتھ پڑھتا بھی ہے۔ وہ رائٹر جو لکھتے ہیں اگر
پڑھتے نہیں وہ بھی اچھے فکر نہیں بن پاتے۔ اہلیت دیکھ لو۔ وہ
جانتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ وہ کیوں لکھتا ہے تو اس نے
جواب دیا کہ وہ قلم چاہتا ہے۔ لکھنے کے لیے ہوا تھا، اس نے
اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ لکھنا ہی اس کی زندگی ہے۔ اس
کے پسندیدہ رائٹروں میں رچرڈ میسن اور ایچ بی لوکران
شامل ہیں۔ ان کے بعد اگر وہ کسی سے متاثر ہے تو ایڈگر ایلز
پڑے۔ اس نے اپنے ناولوں میں پو کے متعدد دیکشن استعمال
کیے ہیں۔

اس سے جب ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کہ ناول
کہانی لکھنا چاہیے تو اس نے جواب دیا کہ اس کی پہلی قاری
قاری کو اپنی طرف بلائی ہوئی ہوتا ہے۔ اگر پہلی لائن میں
پہلا ہی اگراف ایسا ہوتا ہے کہ قاری اس میں
جائے اور پھر اسٹوری لکھنا چاہیے کہ قاری کو بیٹھ لے اور اس
کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے
تو اس کہانی کو پھر سے لکھنا چاہیے۔ قاری اتنا انتظار کرے
کر سکتا۔ وہ کہانی کو ایک طرف پیچھ دے گا۔

مگر میں نہیں کہہ رہا ہوں کہ کہانی کی پہلی سہری پڑا
دینے والی ہوئی چاہیے۔ باقی کہانی میں کچھ نہیں ہوا

کہانی حالات اور ہوج پھر قاری اسے آخر تک پڑھتا چلا
جائے گا۔ کہانی یا ناول میں محسوس ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اسے
کوئی نہیں پڑھے گا۔
اسٹینڈ کا کہنا ہے کہ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر محسوس
ہوتے ہیں، اس لیے وہ انہیں خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ
اپنے ناولوں میں یہ صورت حال بھی پیش کرتا ہے کہ بحالت
خوف و وحشت لوگ ایک دوسرے سے کیسا سلوک کرتے
ہیں۔

لوگوں کو خوف زدہ کرنے کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ
پہلے اپنے کرداروں کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ ان سے
عزت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد حالات و واقعات سے
خوف زدہ ہونے لگتے ہیں۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ وہ اسے ناول لکھ چکا
ہے، کیا اب بھی کوئی ایسا خیال ہے جس پر اس نے طبع آزمائی
کئی ہو؟ اب وہ کس موضوع پر لکھنا چاہتا ہے؟
اسٹینڈ نے جواب دیا کہ اس کے دماغ میں ہزاروں
خیالات گردش کرتے رہتے ہیں، جو دماغ توڑ کر باہر آنا
چاہتے ہیں۔ ٹھیک بالکل جام ہے۔ میں ان میں سے کسی
ایک خیال کو باہر آنے کا موقع دیتا ہوں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے
باہر نکالتا ہوں۔

میں ساتھ برس کا ہو گیا ہوں۔ اب میں کتنا کچھ سکتا
ہوں؟ زیادہ سے زیادہ وہ برس تک میرا دماغ حیرت انگیز کر
سکے گا۔ میں اپنے ناول "ٹری اسٹوری" اور "ڈی اسٹینڈ" سے بھی
افنی ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ پبلشر مجھے اس
کی ہماری رقم ادا کرے۔ میں کسی نئی مکان میں منتقل نہیں ہونا
چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس ناول پر فلم بنائی جائے یا وہ
میں اپنے کے طور پر چھوٹے اسکرین پر پیش کیا جائے۔ میں یہ
چاہتا ہوں کہ صدمہ ختم ہو جائے اور میں اس کے حوالے سے یاد
رکھ جاؤں۔

☆☆☆☆

1999ء میں اسٹینڈ ایک افسانہ ہٹا کر حادثے سے
دور چار ہوا۔ وہ بڑی سڑک (ہائی وے) کے کنارے جا رہا تھا
کہ اسے ساڑھے ایک ٹرک نے ٹکرا دیا تو وہ اچھل کر فضا
میں پھوٹ اور پڑ چلا گیا۔ جس کے نتیجے میں اس کی حالت
ناگوار ہو گئی۔ اس کی چند پہیلیاں ایک ٹاک کی ہڈی
اور گھسے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے علاوہ اس کے پیچھے زلو کو
شیرے نقصان پہنچا۔ وہ اس طرح سے مجروح ہوا تھا کہ اس کے

بچنے کی امید نہ رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے جان تو رکشش کی اور
اس کے عضو آرٹھریس کیے جس کے نتیجے میں اس کا دھانچا بڑ
گیا۔ تین ہفتوں کے بعد اسے مین میڈیکل سینٹر سے جانے کی
اجازت دے دی گئی۔ اسٹینڈ نے احتیاط برتی اور مکمل پیچھے
پر پڑ کر وقت گزارا۔ وہ ماہ بعد وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے
قابل ہو گیا۔ ایک ماہ تک فزיותרپائی کرانے کے بعد وہ چلنے
پھرنے کے قابل ہو گیا اور عام انسانوں جیسا ہو گیا۔ اس سے
اخباری نمائندے نے پوچھا کہ کیا محسوس کرتا ہے تو اس نے
جواب دیا کہ میں ہاتھ برس کا ہوں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے میری ہڈی نیاں ہیں۔

یہ کہانی یہاں پر شرم نہیں ہوئی۔ اسٹینڈ نے وہ ٹرک
خرید لیا جس نے اسے شدید زخمی کیا تھا پھر ایک سال بعد جب
وہ اپنی صحت مندی کی خوشیاں منا رہا تھا تو اس نے ایک
بھونڈے سے اس ٹرک کے اپنے ہاتھ سے ٹکڑے کر
دیے۔ جب ڈرائیور سے پوچھا گیا کہ یہ حادثہ کیسے ہوا تو اس
نے بتایا کہ اس کا کتا جو پچیس برس پرانا تھا۔ اس کا کتا
کو بے لگا ہوا اس لیے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ جے نے اس پر ہلکا سا
جرمانہ عائد کر کے اسے گھر جانے دیا۔

وہ صحت مند تو ہو گیا لیکن اس کی تعلیمی صلاحیت بہر حال
متاثر ہو گئی، اس لیے اس کا ب دو زیادہ دیر تک بیٹھ نہیں سکتا۔ اس
نے 2002ء میں اعلان کیا کہ اب وہ ناول نہیں لکھے گا۔ اس
اعلان سے خوشی ہوئی کہانی پلاٹ ڈی ناول لکھ رہا تھا جسے بعد
میں آن لائن پیش کر دیا گیا۔ اس کا آنے والا ناول "رائڈنگ
وی بیٹ" ہے۔ 2004ء میں اس نے اپنی زندگی کا سب سے
طویل ناول "انڈر وی ڈوم" لکھا۔ جو بہت جلد ہی بارک نامی
بیسٹ سلیزسٹ میں داخل ہو گیا اور کئی ہفتوں تک گرم گرم کی
طرح فروخت ہوتا رہا۔

وہ کافی عرصے تک صحت اتار رہا اس کے بعد
2011ء میں اس کا ناول 11/22/63 مارکیٹ میں
آیا۔ اس ناول کا بیرو ماسٹی میں سڑک کے جان ایف کینیڈی
کے قاتل کو کینیڈی کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش
کرتا ہے۔ 2013ء میں اس کا ناول "جوائے لینڈ" آیا۔ سرائے
رسائی پر مبنی اس ناول میں قتل کی ایک واردات کی کہانی ہے۔
اس کے علاوہ اکتوبر 2013ء میں اس نے اپنے ناول "ڈی
شاننگ" کا دوسرا حصہ پیش کیا، جو جوہر پارک نامی بیٹ
سلیزسٹ کی رو سے فروخت کے اعتبار سے پہلے نمبر پر رہا۔

خانماں پر باد

مسید احتشام

فلسطین، جوہر وظلم کی سرزمین جس پر مسلمانوں کا حق ہے پھر بھی وہ ان کی نہیں ہے۔ وہاں کے مظلوموں پر کیسے کیسے اٹھنا ٹوٹے اسے ہم نے بھی بھلا دیا ہے۔ ماضی قریب کی یہ روداد خونِ مسلم کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے کہ کس طرح اپنی ہی سرزمین سے انہیں نکال باہر کیا گیا۔

لہور لاوے والی روداد تو چٹکان



حکومت ہاتھ ڈالنے کے لیے بے یقین ہے۔ "ایڈرن نے کارٹر سے سرگوشی کی۔" میں اس جہاز "پورٹیا" پر حیف سے رو آگئی کے وقت سوار ہوا تھا لیکن اب تک اس مسافر کو شناخت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں اور نہ ہی اس ایجنٹ کو پہچان سکا ہوں جو یقیناً اسی جہاز پر موجود ہے۔ دونوں بلا کے پھلاک ہیں۔ اگر وہ سستے سے والے میں ہیں تو میرے لیے انہیں شناخت کرنا ناممکن ہے۔ چہ یہ ہے کہ مجھے عربی زبان کم کم آتی اور میں ان لوگوں میں گھل مل نہیں سکتا لیکن اگر وہ ہمارے سیلون والے سے ہیں تو بات دوسری ہے۔

"کارٹر میں تم سے شرط لگا سکتا ہوں، جیسے ہی کوئی ملک ان مہاجرین کو لینے پر آمادہ ہو جائے گا، خواہ وہ کوئی بھی ملک ہو، ویسے ہی کوئی ناخوش گوارہ اقتدار جنم لے گا۔ میرا قیاس ہے کہ ہمارے اس اسرائیلی دوست نے اس وقت تک کے لیے چینی کارروائی ملتوی کر رکھی ہے کیونکہ ایک امریکی جہاز پر کسی کو مل کر کے بچ کر لانا بہت مشکل ہے۔"

"کھل؟" کارٹر چونک پڑا۔ ایڈرن نے شانے لپکائے۔ "در اصل اسرائیلی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی فوجی کھال تک ہے۔" وہ بولا۔ کارٹر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکا

جاسوس موجود تھا اور کارٹر کا کام اسے شناخت کرنا تھا۔ وہ "ریٹاک" کے مقام سے تین گھنٹے قبل فلسطینیوں کے ایک فرضی حامی اور حب وطن کی حیثیت سے سوار ہوا تھا۔ یہ ایک اچھا بہروپ تھا لیکن اپنے اس بہروپ کی وجہ سے وہ مسافروں میں مقبول نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے ایک مسافر کے ہر مسافر اس سے دور بھاگتا تھا اور وہ واحد مسافر شروع ہی میں اسے شناخت کر چکا تھا لیکن کارٹر بھی اس مسافر کی اصلیت سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ برطانوی حکومت کا ایک لہائیکہ تھا اور وہ بھی کارٹر کی طرح مسافروں پر نظر رکھنے کی غرض سے جہاز پر موجود تھا۔ اس نے کارٹر کو اپنا نام ایڈرن بتایا تھا ساتھ ہی اسے اپنے مشن سے آگاہ کیا تھا۔ وہ بھی ہمارا کارپور اتھارڈ کیے ہوئے تھا۔ وہ معنوی طور پر نظر آتا بھی تھا۔ اس نے خود کو اسرائیلی قید سے فرار ہونے والا ایک پولیس آفیسر ظاہر کیا تھا۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کو نظر انداز کرنا ہی دانش مندی تھی لیکن ان تین ہفتوں کے دوران ان ہیوں نے کئی موقعوں پر بے حد محبت بھرے انداز میں ایک دوسرے سے تباہ خیال کیا تھا مگر وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے قریب نہیں رہ سکتے تھے۔

"جہاز پر ایک ایسا مسافر بھی سوار ہے جس پر اسرائیلی

فراغ ولی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جہاز کے لیے تیل فراہم کیا تھا اور مہاجرین سے لدا ہوا یہ جہاز برطانیہ کے فراہم کردہ ایجنٹوں کے مل بوتے پر پھیرا دیا تو اس عبور کر چکا تھا۔ یہ لوگ اب تک عبور ہوئے، برازیل، بنما، وینزویلا کے در پر دھک دے چکے تھے لیکن کوئی بھی ملک ان بد نصیب مہاجرین کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ جہاز کے بوڑھے ٹینٹن میک نے عہد کیا تھا کہ وہ ان بے وطن مہاجرین کے لیے کبھی نہ کبھی کوئی جگہ تلاش کرے گا۔ وہ آزادی کا زبردست حامی تھا اور انسانوں کو بھیج کر یوں کی طرح جہاز پر سوار کر کے سمندر کے حوالے کر دیے جانے پر سخت برہم تھا۔ اس کی انسانیت نوازی نے مسافروں کو حوصلہ بخشنا تھا اور صورت حال اتنی بری تھی جتنی ایسے حالات میں ہونی چاہئے تھی۔ جہاز کے سستے حصہ میں ڈھائی سو مسافروں کا جھوم تھا جب کہ تقریباً تین درجن مسافروں نے کیبنز پر قبضہ جمارکھا تھا۔ جہاز میں اشیاء خورد و نوش کی قلت تھی اور جب سمندر میں جوار بھاتا آتا تھا تو جہاز ہچکے لکھنے لگتا لیکن سب وطن کی آس نے ان مہاجرین کے حوصلے بلند کر رکھے تھے۔ جہ کو خیر باد کہنے کے بعد سے اب تک صرف چار مسافروں کی موت واقع ہوئی تھی۔

☆☆☆

کارٹر شروع ہی سے مسافروں پر گہری نظر رکھتے ہوئے تھا۔ مہاجرین کے اس جہاز پر کم از کم ایک اسرائیلی

آبی جہاز پر سوار ہے خانماں پر باد مسافروں کو دیکھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا جتنی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ ان پریشان حال مہاجرین کی زبوں حالی نے اسے اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ بعض اوقات یہ بھول جاتا تھا کہ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کا نمائندہ ہے۔ شاید وہ اوریڈیو دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی غافل امریکی، اچھی خاصی عربی زبان بول لیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے جھگے میں بے حد اہم تصور کیا جاتا تھا۔ عربی زبان بولنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا لڑکپن جدہ میں گزارا تھا جہاں اس کا باپ شہر کے محکمہ آب رسانی میں مکینین کی حیثیت سے ملازم تھا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ واپس امریکا چلا گیا تھا اور شروع شروع میں انگریزی اسے عجیب و غریب زبان لگتی تھی۔

امریکا کے لیے فلسطین سے وسیع پیمانے پر بے وطن کیے جانے والے ان مہاجرین پر نگاہ رکھنا اشد ضروری تھا۔ چنانچہ امریکی حکومت کی ایما پر، کارٹر، ایک جلا وطن شہری کے روپ میں مہاجرین کے اس جہاز پر موجود تھا۔ تقریباً سارے مسافر فلسطین کے مقام صید سے سوار ہوئے تھے اور کسی بھی ملک میں پناہ حاصل کرنے کے ارادے سے ملک در ملک پھرنا گزرے تھے لیکن کوئی بھی ملک اپنے مسائل کے پیش نظر انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ برطانیہ نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے خیال سے بے حد سفاقت اور

کیونکہ اس نے اپنے گھر سے خاموش رہنے کا عہد کیا تھا۔

☆☆☆

شاید وہ بہت کچھ جانتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کسی شخص سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ اس نے عرصے پر موجود مسافروں کی طرف دیکھا۔ ان میں مولوی سلمان اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھا، جو اس کے بازوؤں سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے شاید ہی باپ بیٹی کی ایسی پرورش اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والی جوڑی دیکھی تھی لیکن ممکن ہے، غریب الٰہی کے احساس اور ان کے ساتھ پیش آنے والے انصاف کے لیے اس قدر قریبی طور پر انہیں اس حد تک ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہو۔ ہر جہد کو، جو ان کا مقدس دن ہوتا ہے، مسلمان لہجہ میں متعقد کرتا تھا۔ وہ اپنے فرشتے کے لوگوں کے درمیان تقریر کرتے ہوئے، کوئی بہت ہی پرانے کی نظر آتا تھا۔

کارٹر نے ایک بات نوٹ کی تھی۔ وہ یہ کہ لڑکی کسی مسافر سے بات نہیں کرتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ تعداد کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ طعام کے موقعوں پر بھی اس کے روئے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ دونوں باپ بیٹی کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ عرصے پر غصے نظر آتے تھے لیکن لڑکی زیادہ تر اپنے کنبہ میں ہی مقید رہتی جو اس کے باپ کے کنبہ سے ملتی اور کارٹر کے کنبہ سے کچھ ہی فاصلے پر مخالف سمت میں واقع تھا۔ لڑکی کو ایک اعتبار سے خود اور پریشانی کہا جاسکتا تھا۔ اس کی عمر تقریباً پچیس سال رہی ہوگی۔ سر اور آدھا چہرہ ڈھکا رہتا تھا۔ اپنے باپ کے برعکس وہ دہلی بلی تھی۔ کارٹر کے ذہن میں ایک دوسری بات کی ماں کا خیال آیا تھا۔ نہ جانے وہ زندہ تھی یا اسراخیلوں کے قلم و بریت کا شکار ہو گئی تھی۔

ان دونوں پر نگاہ رکھنے والا وہ شخص کارٹر ہی نہیں تھا۔ بلکہ ایک اور درمیانی عمر اور چہرے جسم کا چشمہ والا شخص بھی ان پر مسلسل نگاہ رکھتے ہوئے تھا۔ وہ یقیناً مسلمان نہیں تھا۔ اس کا نام سلام و نسک تھا اور وہ جب سے جہاز پر سوار ہوا تھا، اس وقت سے ان دونوں باپ بیٹی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تھا لیکن اس نے کبھی ان سے ٹکھو کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کارٹر نے باپ بیٹی کے قریب سے گزرتے ہوئے، لڑکی پر ایک اپنی ہوئی نگاہ ڈالی اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی کے گلے کی رنگت بقیہ حصوں کی بہ نسبت پرلنگ تھی۔ اس کا رنگ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اسی لیے رنگت نظر آتی تھی۔

☆☆☆

جہاز کے بوڑھے کپتان میک کے ہاتھ میں میک فون اور اس کے پاس ہی ایک مسافر کھڑا تھا۔ "آجنگ" وہ میجر "توجہ فرمائیے۔ ممکن ہے ہمیں ہوائی اڈے کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جانے۔ تاہم ہم لڑکی کی حکومت اب تک اس بات پر فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔ ہم ایک دو دن میں اس کے فیصلے سے آگاہ ہو جائیں گے۔ دریں اثنا امریکی حکومت کی لڑکی حکومت سے کہا جاتا ہے کہ وہ عارضی پناہ دینے کی پُر زور سفارش کر رہی ہے۔ کیونکہ حکومت کے فیصلے سے آگاہ ہونے تک جہاز ہوائی بندرگاہ سے باہر نکلے سمندر میں کھڑا رہے گا۔ ساتھ ہی اپنے حوصلے بلند رکھو۔ اگر کیونکہ حکومت نے ہمیں مسٹر کردیا تو ہم اپنی کوششیں ترک نہیں کریں گے اور میں اپنے پورا دنیا کو یورپ کے پانچوں میں ہرگز واپس نہیں آؤں گا۔"

مہاجرین کی بیشتر تعداد انگریزی زبان سے ناواقف تھی۔ مسافر ایک دوسرے کو کھینچتے ہوئے آگے بڑھ کر کپتان کے قریب پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کی حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کپتان پر اس طرح بھی ہوئی تھیں گویا اس نے ان پر ہر چوک دیا ہو۔ ماحول میں ایک عجیب سی سسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کپتان نے اعلان ختم کر کے میک فون پر قریب کھڑے ہوئے ایک مسافر کو ہٹا دیا تاکہ وہ اس کے اعلان کا عربی میں ترجمہ کر کے سب کو سنا دے اور جو بھی اپنے اس فرض سے فارغ ہوا مجمع سے آہو بکا کی صدا میں ملے ہوئے لیکن۔ اس آہو بکا میں سارے جہاز کی ہلچل اور عروسی مٹی ہوئی تھی۔ ان کے شانے بھول گئے تھے اور ہر جگہ گھمے تھے۔ قابلاً انہیں اس قسم کی فطرتی تسلیاں پہلے ہی مل جاتی رہی تھیں۔ جہاز کا غلغلہ سمجھ کر ہانک کر چیخے پھینچا رہا تھا اور وہ بائیں اور دائیں نشست، پورے قدموں سے میز حیاں اترنے لگے تھے۔ عرش، مسافروں سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ جب چینی سے ٹبل رہے تھے۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھی جو حسب معمول اپنے باپ سے قریب ہوئی تھی اور سلام و نسک بھی تھا۔ جس کی نگاہیں معمول کے مطابق ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اینڈرزن حسب عادت تجا ٹیل رہا تھا۔ کارٹر جو بھی اس کے قریب سے گزرا، اس نے اپنے جیزوں کو جنبش دیے بلکہ سرگوشی کی۔ "میں نے اس لڑکی کو پہلے ہی نہیں دیکھا ہے۔" کارٹر کوئی جواب دے بغیر عرصے کے سرے تک سچا گیا۔ پھر مڑا اور اس کے قریب سے گزرتے ہوئے پوچھا "کہاں"

"میں نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے کمال یقین ہے۔ میں کسی کی قہقہہ بھی نہیں بھولوں۔"

کارٹر دوبارہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور باپ بیٹی کے قریب سے گزرتے ہوئے، لڑکی پر ایک اپنی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اگلی مرحلہ اینڈرزن نے سرگوشی کی۔ "شاید برا عظم چوب سے کسی مقام پر۔ اس سال یا گزشتہ سال۔"

جہاز کا سائرن بج اٹھا۔ طعام کا وقت ہو گیا تھا۔ سیلون کے مسافر بچے اترنے لگے۔ طعام کی میز پر کارٹر کی نشست میز کے دوسرے سرے پر مسلمان اور اس کی بیٹی کے تقریباً مقابل واقع تھی۔ سلام و نسک اس کے دائیں جانب ایک نشست چھوڑ کر بیٹھا تھا اور ان دونوں کے درمیان ایک تھوڑی سی عورت براجمان تھی۔ طعام کے دوران ان بہت سی پتھریں کھنکھو ہوئی۔ جلاؤنوں کی طبیعت ہلکی پھلکی کھنکھو پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی اور پھر اچھی ساری زبانیں بولی جا رہی تھیں کہ لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ اینڈرزن کافی فاصلے پر براجمان ہونے کی وجہ سے کارٹر کی نگاہوں سے تقریباً اجمل تھا۔ ہاں، کپتان میک اپنے چیف افسروں کے درمیان میز کے وسط میں تھا۔ لوگ خاموشی سے کھانے میں مشغول تھے۔ کھانا تقریباً اختتام کو پہنچ گیا تھا کہ دلہا کپتان اپنی نشست سے اٹھ کر سب سے تعاقب ہوا۔ "دوستو! آج میں ایک پھل سے آپ لوگوں کی تواضع کرنا چاہتا ہوں جو ہندوؤں نے ہمیں ساحل سے بچھا دیا ہے اور ان کے اس سلوک نے ہمارا دل جیت لیا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے اسٹینڈرڈ جان کو اشارہ کیا۔

اسٹینڈرڈ جان اپنی اصل وجاہت، ہالوں کی رنگت اور سردی آنکھوں کی وجہ سے نہ صرف سونی صد نازی نظر آتا تھا بلکہ نازی ہی تھا لیکن مسافروں سے اس کا رویہ ہمیشہ قابل تعریف رہا تھا۔ کپتان کو اشارہ پا کر وہ باہر چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں مسکرتوں سے بھری ایک بہت بڑی قاب سنبھالے داخل ہوا۔ مسافروں کے منہ سے مسرت بھری چٹخیں نکل گئیں۔ جان نے مسکرتے میں بڑی ڈشوں میں سجادے۔ مسکرتوں نے بعد کسی نے بھی مسکرتے نہیں دیکھے تھے۔ اگرچہ جو بھی امریکا کے مختلف ساحلوں سے انہیں کھانے پینے کی مختلف اشیاء بھیجی گئی تھیں لیکن ان میں مسکرتے شامل نہیں تھے۔

کارٹر اور اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھوڑی سی عورت نے مسکرتوں پر بیک وقت ہاتھ مارا۔ نتیجتاً نصف درجن

مسکرتے ڈش سے لڑھکتے ہوئے، مولوی کی بیٹی کی گود میں جا کرے۔ وہ ایک لمبے کے لیے گھبراہٹ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور مسکرتے اٹھا کر خاموشی سے میز پر رکھ دیے۔ کارٹر نے دیکھا، اس کے معذرت طلب کرنے کے باوجود لڑکی نے اپنی نگاہیں نہیں اٹھائیں۔ ہر شخص مسکرتے کے جھٹکے اٹارنے اور کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ پھر کارٹر نے محسوس کیا، لڑکی نے اس پر ایک اپنی ہوئی نگاہ ڈالی تھی۔ یہ شخص ایک لمبی بات تھی۔ پھر وہ مسکرتے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

"میں ان بے چاروں کو مسکرتے کھاتے ہوئے دیکھ کر بے حد خوشی محسوس کر رہا تھا۔" اسٹینڈرڈ جان نے کارٹر کا شکریہ ادا کرنے پر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"تم مسافروں سے بہت اخلاق سے پیش آتے ہو۔" کارٹر نے اعتراف کیا۔

"کیوں نہ آؤں؟" وہ بولا۔ "مسٹر مرنی، آپ مجھے کی کوشش کریں۔ ہم سارے عیسائی دعوے نہیں ہیں۔" "کاش تمہارے بیشتر ہم وطن بھی تمہاری طرح محسوس کرتے۔" کارٹر نے کہا۔

"مسٹر مرنی، یقین کریں، ہم میں سے لاکھوں افراد صرف اسرائیل کی شکست دیکھنے کے لیے زندہ ہیں۔"

کارٹر عرصے پر چلا گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ ہوائی جہاز کی روشنیوں سے حد قریب محسوس ہو رہی تھیں۔ سیلون کے تقریباً سارے ہی مسافر عرصے پر موجود تھے اور حسرت آمیز نظروں سے جھلملاتی روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔ نچلے عرصے پر بھی کچھ مسافر موجود تھے۔ وہاں سے قرآنی آیتوں کی آوازیں ہولے ہولے لہرائی ہوئی۔ کارٹر کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اس نے جھک کر نیچے دیکھا اور اسے یاد گیا کہ یہ جد کی شب تھی اور مسلمانوں کے مقدس دن جد کی شب کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہاں اس کی نگاہ مولوی کی بیٹی پر پڑی جو کچھ فاصلے پر عرصے کے جھٹکے پاس تھا کھڑی تھی۔ اس کی نظریں بندرگاہ کی جھلملاتی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں لیکن عرصے پر صرف وہی تھا جس میں تھی۔ ایک طرف اینڈرزن بھی تھا کھڑا تھا۔ کارٹر خاموشی سے اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ "تمہارے کھیل کی رفتار کیا ہے؟" اس نے غم مچانے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے، میں جی راہ پر لگ گیا ہوں۔ تم اپنی

مناؤ۔ "ایڈورن نے بھی دھیرے سے پوچھا۔
 "میں نے ایک کو شناخت کر لیا ہے۔" کارٹر نے سرگوشی کی۔
 "ایک کوا؟ کیا جھیں ایک سے زیادہ کی تلاش ہے؟"
 "میں ایک جازی اور ایک ایسے مسافر کی تلاش میں ہوں جو آپس میں گم نہ ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ ان میں کون سے دو افراد مجھے مطلوب ہیں۔"
 "اگر تمہاری مراد سلاوونکی سے ہے تو۔" ایڈورن نے سرگوشی کی۔ "میں شروع ہی سے اس پر لکھ رکھے ہوں۔"
 "نہی مراد سلاوونکی سے نہیں ہے حالانکہ وہ میرا دوسرا مطلوب شخص ہو سکتا ہے۔" کارٹر نے کہا۔
 "ان میں سے دو افراد سے تمہاری کیا مراد ہے؟" ایڈورن نے پوچھا۔
 اسی لمحے دو مسافر کھن سے ان کے قریب آ گئے۔ ان کے قریب آنے کے انداز سے بیگانگی اور بے پروائی ایک ری حقی کی لیکن کارٹران کے بارے میں دوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا، مولوی کی بنی کے پاس پہنچ گیا جہر دستور ساحل کی روشنیوں پر نظر پڑا۔ بھائے کھڑی تھی۔ وہ بھی اس کی تقلید میں روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر مرلی زبان میں گویا ہوا۔
 "میرے خیال میں آپ اس بات کی توقع کر رہی ہیں کہ کل ہم لوگ ساحل پر پہنچ جائیں گے۔"
 "ہم سبھی اس کی توقع کر رہے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اس کی آواز مدہم اور حزن من قدر ہے ہماری تھی۔ انکی آواز ہمارے دلوں کے لیے حد درجہ کشش رکھتی ہے لیکن اس نے گردن موڑ کر کارٹر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔
 "نیلے عرشے سے تلاوت کی مدھرے سانی دے رہی ہے۔" کارٹر نے سلسلہ نظم دراز کرتے ہوئے کہا۔
 "ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
 "آپ موما اپنے والد کے ہمراہ نظر آتی ہیں۔" تان؟
 "ہاں، موما۔" اس نے جواب دیا۔ اس وفد اس کے لیے تھیں قدرے برہمی کی آمیزش تھی۔ گویا وہ تنہائی چاہتی تھی۔
 "مجھے افسوس ہے کہ میں نے سنگترے گرا دیے تھے۔"

وہ محض میری حماقت تھی۔" کارٹر بولا۔
 "کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔ یہ کہنے کے بعد ہی اس نے ٹپکس اٹھا کر کارٹر پر ایک تیز ہمرسری نظر ڈالی اپنی گردن موڑی۔
 اس کا یہ انداز اس بات کا مظہر تھا کہ وہ اب مسافروں کو نہیں کرتا چاہتی تھی۔ کارٹر اس کے پاس سے ہٹ کر عرشے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گئے کی کچھ دیر کے بعد اس نے مڑ کر اس جگہ نظر دوڑائی جہاں کارٹر کھڑی تھی تو وہ جگہ سناں نظر آئی۔ لڑکی جا چکی تھی۔ سارے ہی مسافر بچے جا چکے تھے۔ عرشے کا آخری حصہ بالکل ویران ہو رہا تھا۔
 وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا، آخری حصے تک پہنچ گیا۔ اس نے سمندر کی تاریک لہروں پر نظر پڑ کر کوئی لمحہ نہیں بے یقین کی سرحد کو چھو چکا تھا۔ اسے مطلوبہ شخص مل گیا تھا لیکن وہ اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔
 معاسے کچھ قائل پر، گنگے کے قریب ہی کی محض موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹ کر اس جانب دیکھ اور سکتے میں رہ گیا۔ فرش پر ایک شخص ساکت پڑا تھا دوسرے ہی لمحے اسے خیال بڑھا کر کہیں سے وہ بڑی تیزی میں جتا ہوا کرے ہوش ہو گیا ہو۔ کوئی انوکھی بات نہیں لیکن سمندر بالکل پرسکون تھا اور پھر سمندر میں کی ہلچل دینے کے بعد موما اس قسم کی حکایت نہیں ہوتی ہے۔ وہ لمحے لکھ کر اس شخص کو مہر تار بائیں اس شخص میں کسی طرح سے بھی جیش نہ تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اپنے جان تھا اور مردہ تھا۔ اس کی پشت پر ایک گہرا زخم تھا۔ اسے عقب سے دل کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی تھی۔ اس نے زخم میں ہاس کے ارد گرد کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ کل کے بعد ہتھیار سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس کے لباس کی حفاظت کی تھی کیونکہ ساری جینیں ان کی تھیں۔ شاید قاتل گلت میں تھا یا پھر اسے بیویوں کو سیدھا کرنا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن اس نے انتہائی مہارت سے کیا کیا تھا۔
 کارٹر نے فوراً محلے کے ایک فرد کو بلا کر اسے آگاہ کیا۔ اس نے کارٹر سے لاش کے پاس رہنے درخواست کی اور کیپٹن کو بلائے چلا گیا اور ان کے کارٹر اس صورت حال کو سمجھ پاتا، وہ شخص کیپٹن کو اپنے لے کر آ گیا۔ کیپٹن نے لاش کا معائنہ کیا۔ یہ کب

اس نے کارٹر سے پوچھا۔
 "میں نہیں جانتا۔" کارٹر نے جواب دیا۔ "میں نے تین دن یا چار دن پہلے لاش دیکھی ہے۔"
 "تم نے کسی کو بھی قریب سے نہیں دیکھا؟"
 "عرشے پر جم غفیر تھا۔ میں اپنے خیال میں ممکن ٹل رہا تھا اور آیا تھا کہ اس پر نظر پڑی۔"
 "اچھا، اب سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں مسافروں کو اس سانچے سے لاعلم رکھنا ہے۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ جان ملیل ہے۔ اگر کہیں یہاں، ہونا میں اترنے کی اجازت نہ ملی تو پھر نہیں مجبوراً انہیں تانا پڑے گا کہ جان مر گیا ہے۔ یہ مسافروں میں خوف اور دہشت پھیلانے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے جین سے ہرگز توقع نہیں تھی کہ جان ہٹا رہے گا۔ بے چارہ۔"
 "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ یہودیوں سے نفرت کرتا ہے اور اسرائیلی کی گھلت کا حسنی ہے۔" کارٹر نے آگاہ کیا۔
 "اور یہ جی ہے۔" کیپٹن نے برجوش لہجے میں تائید کی۔ یہ ایک اچھا انسان تھا۔ میں نے اسے استنبول سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ تم اپنی زبان بند رکھو گے اور بالکل گوشتے بن جاؤ گے کچھ گئے؟" اس نے اپنے ماتحت کو ہدایت کی جو داشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے جان کی لاش کو ایک تک مہرے جا رہا تھا۔
 "آؤ، ہم لاش کو اس کے کیپٹن میں پہنچا دیں لیکن انداز لیا ہوا کہ دیکھنے والا یہی سمجھے کہ یہ جل رہا ہے۔" کیپٹن نے غل سے کہا۔ "اور تم بھی ہمارے ساتھ آؤ۔" اس نے آخری ہلکا کارٹر سے قائل ہو کر کہا۔
 "میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔" کارٹر نے پیشگی ہی۔
 "میں ہم یہ کام خود کر لیں گے۔ تم بس عام انداز میں ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔ یہی کافی ہوگا۔"
 جہاز کے محلے کو اس سانچے سے آگاہ کرنا ضروری تھا اور جب انہیں علم ہوا تو وہ حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن کیپٹن نے انہیں خاموش کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آیا اور کارٹر کو لے کر اپنے کیپٹن کی سمت روانہ ہو گیا۔ کیپٹن میں پہنچ کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ "تم جان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیا میں مٹھو کہ افرا کی فہرست میں شامل ہوں؟"
 کارٹر نے سوال کیا۔
 "ہر شخص اسی فہرست میں شامل ہے اور تم جانے دو کہ ہر موجود ہے۔ یہ سب سے زیادہ جہازری وطنیت کیا ہے؟"
 "میں نے بہ حیثیت چیک خود کو رجسٹر کرایا ہے، جسے فلسطینیوں کا حامی ہونے کے شک پر نکال دیا گیا ہے۔"
 "میں جانتا ہوں۔ اور اگر یہ جی ہے تو تم پہلے چیک ہو جس نے کسی طور پر غدار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے مسافروں کو کس طرح بے وقوف بنایا ہے۔ لیکن تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے اور نہ ہی اوہلوں کی مجھے بے وقوف بنا سکتا ہے۔"
 اوہلوں کی، ایڈورن کا جعلی نام تھا۔ کارٹر مسکرایا۔
 "کیپٹن، ہم کافی ہوشیار ہو۔" وہ بولا۔
 "تمہارا خیال لٹا ہے۔ اوہلوں کی اگر یہ ہے اور اس کا تعلق سیکرٹ سروس سے ہے۔ تم دونوں، مسافروں کی صف سے یہ آسانی الگ کیے جا سکتے ہو۔ جھیں کسی قسم کا اقرار کرنے کی ضرورت نہیں۔"
 "میں کبھی نہیں سکتا۔" اس وفد کارٹر نے گھلت تسلیم کر لی۔ "میں تم سے معاملہ صاف رکھنا چاہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے اس واقعہ سے تنبیہ نہ کر لیا ہوگا۔"
 "میں اپنی سوچ سے خوب آگاہ ہوں لیکن مجھے ریکارڈ کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔" کیپٹن بولا۔ "جھیں جا ہے، ہمارا ریڈیو ٹوٹا ہوا ہے۔ میں ساحل پر موجود حکام کو پکارتے کے لیے ایک لائچ سٹیج رہا ہوں۔ وہ اگر جھیں پوچھ کچھ کے لیے لے جائیں گے۔"
 "اور اس دوران میں میں کیا کروں گا؟"
 "مجھے جاؤ اور وہاں انتظار کرو۔ مسافروں میں شامل نہ ہونا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔"
 "اگر میں گرفتار ہو گیا تو ازراہ کرم، میری طرف سے امریکی قونصل کو مطلع کر دینا۔" کارٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 کیپٹن نے اس پر اعتبار کیا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا، لیکن سے نکل کر خاموشی سے روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن پر ایک بوجھ سا تھا۔ اگر جان واقعی مجاہدوں کا بعد تو تھا تو ممکن ہے یہودیوں کے لیے ہاتھوں نے اسے ہٹا کر لیا ہو۔ اگر وہ ایک رضا کار فوجی تھا تو بھی یہودیوں کی لکھ میں اس کے جرائم کی نوعیت کم نہیں ہوگی تھی۔ جوتی امریکا میں یہودیوں

☆☆☆
 ”میں تمہارا احسان مند ہوں۔“ وہ ایڈورسن سے

ایئر دین کا منہ کھلا کا کھلا روٹ گیا۔ "کیا؟ کب؟ کہاں؟"
کارڈ نے پورا واقعہ شروع سے آخر تک بیان کر دیا۔

اگر اس نے اندر سے ایک پستول نکالا اور سوٹ یس تو دوبارہ مقل کر کے پستول جیب میں ڈال کر راہداری میں

کارڈ ایک شخص ہی سانس لے کر مڑا اور اس نے قدم
بڑھایا ہی تھا کہ فرش پر پڑے ہوئے ایک سوٹ کیس سے الجھ
کر گر پڑا۔ فرش پر سلاؤسکی کے کپڑے پھرے ہوئے تھے۔

وہ پھٹلی لپک کر اٹھا اور دوسرے ہی لمحے کوئی مرد شے اس کے رخسار سے لگی۔ ساتھ ہی ایک کرخت لیکن پرسکون آواز اس کی سماعت سے غمرائی۔ "حرکت مت کرنا، مسٹر مرنی۔ یا جو کوئی بھی تم ہو۔ پستول کی نال پر سائنس لگا ہوا ہے۔ دیکھنا، اس کے پاس پستول تو نہیں ہے۔" اس آواز نے دوسرے ہی لمحے کو غلط کیا اور دوسرے ہی لمحے نے پستول کا رٹر کے ہاتھ سے اچک لیا۔ یہ مولوی تھا۔ پستول بدست لڑکی وہ بارہ غلط ہوئی۔ "بہت خوب۔ اب ہم ڈیڑی کے کین میں چل کر منتظر کریں گے۔ چلو حرکت میں آجاؤ۔"

☆☆☆

کارٹر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ رانی کے کمرے میں گہری تاریکی تھی لیکن لڑکی کارٹر کے بے حد قریب کھڑی تھی۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔" وہ غلط ہوئی۔ "یعنی کاغذات کی۔"

"میں تمہارا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔" کارٹر کے لہجے میں اچھا بھلا تھا۔ "میرے منہ کا امتحان مت لو۔" وہ غمرائی۔ "کیا مجھے تم کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں شروع ہی میں تمہیں پہچان لئی تھی اور حلام کے موقع پر تمہاری امتحانہ حرکت نے یہ بات نہیں کر دیا تھا کہ۔۔۔ درحقیقت تم کوں ہو۔ کیا میں یہ بتاؤں کہ اس شخص سے تمہارا کیا تعلق تھا جسے سلاؤنسکی کیجے تھے؟ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں اس کی پوچھتگی ہوں تو اس نے کاغذات تمہارے حوالے کر دیے۔ اب کیا تم وہ کاغذات زندہ حالت میں میرے حوالے کرنا چاہو گے یا مرنا پسند کرو گے؟"

"س" تم سے بحث کرنے کی کوشش میٹ ہے۔ تم نے انتہائی غیر مناسب رویہ اختیار کیا ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں وہ کاغذات کبھی نہیں دیکھے جن کا تم ذکر کر رہی ہو۔"

"میں سات تک تمہاری۔ یہ مدت تمہارے لیے کافی ہوگی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔"

"رکو۔ رکو۔" اچانک مولوی وہشت سے چیخ اٹھا۔ "ممكن ہے، یہ بچہ کہہ رہا ہو۔ سلاؤنسکی نے وہ کاغذات کئیں چھپا دیئے ہوں گے یا کسی اور کے حوالے کر دیئے ہوں۔ ہم مزید کسی کے خون سے اپنا ہاتھ رکتا نہیں چاہتے۔ ہم دوسرا راستہ نہیں چاہتے۔"

"شٹ اپ، بڑھے، احمق۔" فرماں دار بنی گئی۔ "پانچ۔ چھ۔" وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔ "سات۔" مولوی رونے لگا۔ کارٹر اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی اسے گولی نہیں مارے گی۔ تاہم اس کا ذہن شدید تناؤ کا شکار ہو گیا تھا۔ ویسا ہی تناؤ کین کے ماحول پر چھا گیا تھا۔

پستول کی نال پر سبز حیاں اترتے ہوئے، اس بات کی کوئی اُمید نہیں تھی کہ اس باہر بھی اینڈرزن یا کسی اور جانب سے کوئی مداخلت ہوگی۔ اسے کامیابی کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ لڑکی کی ہدایت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ جہاز کے جس حصے میں نمودار ہوئے تھے، وہ بالکل ویران تھا۔ "کوئی چال چلنے کا فائدہ نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے، کپڑے اتار کر چھلانگ لگا دو۔ جس جگہ تین منٹ کی مہلت دیتی ہوں۔" لڑکی بولی۔

"میں انسان ہوں کوئی کھڑی نہیں۔" کارٹر جمل کر بولا اور کپڑے اتارنے لگا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ غور کر رہا تھا کہ کس پہلو سے لڑکی پر حملہ کرے۔ دائیں پہلو سے؟ نہیں لڑکی کے پستول کی گولی میں اس کے قلب میں بدست ہو جائے گی۔ بائیں پہلو سے؟ لیکن اس صورت میں اس کے چکر کا بھرتا بن جائے گا۔ یہ انتہائی مستحکم فیصلہ تھا۔ اس نے اپنا کواٹ اتار دیا تھا۔ کیا ایک اس نے کوٹ لڑکی کے سر کی طرف اچھال کر بائیں جانب چھلانگ لگائی۔ کوٹ لڑکی کے سر کے گرد لوٹ گیا۔ لڑکی نے ہلکا کر گولی

چلا دی۔ نضا گولی کی آواز سے حرا حشی۔ اچانک مولوی نے لڑکی کا پستول والا ہاتھ بازو سے قلم لیا اور دوسرا ہاتھ شانے پر رکھ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ "جلدی کرو، جلدی۔ میں مزید نہیں ٹھہر سکتا۔" وہ چیخا۔ لڑکی کوٹ میں الجھ کر رہ گئی تھی اور اس سے قبل کہ وہ بڑھے کو دکھادے کہ کوٹ سے نجات حاصل کرتی، کارٹر نے بڑھ کر اس کی چیز پر بھرپور ہتھ مارا۔ وہ اچھل کر رو کر جاگری اور فرش پر ٹھکر کر ساکت ہوئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آواز پیدا کرتا ہوا دور جا کر اٹھا۔

جائے واردات پر سب سے پہلے پہنچنے والا شخص اینڈرزن تھا۔ اس کے پیچھے کینٹن، اپنے اس سامی کی رفاقت میں چلا رہا تھا جس نے جان کی لاش اٹھانے میں اس کی مدد کی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے فرش پر پھری ہوئی بے ہوش لڑکی پر نگہ ڈالی، پھر کارٹر پر اور آخر میں مولوی کی جانب دیکھا جو اتار پیچھے جا رہا تھا۔

"خاموش۔" کینٹن فریاد کیا۔ "کیا تم جہاز کے مسافروں میں خوف و ہراس پھیلاتا چاہتے ہو؟ اور یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟" کینٹن نے تیزی سے سوال کیا۔

"یہ اس شخص کے بارے میں کہہ رہے ہو جو اس وقت تمہارے سامنے لڑکی کے ہمیں میں بے ہوش پڑا ہے۔" کارٹر نے ٹپکھن سے کہا۔ "اس بڑھے کو لے جا کر لاک اپ میں بند کر دو۔ جان اور سلاؤنسکی کو اسے قتل کیا ہے۔"

☆☆☆

کینٹن کے کینین میں اینڈرزن کہہ رہا تھا۔ "مجھے یقین تھا کہ میں نے اس شخص کو نہیں دیکھا تھا لیکن وہ چونکہ لڑکی کے ہمیں میں تھا، اس لیے مجھے اس کو پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کا نام شلٹر ہے اور وہ ہمیں بدلنے میں ماہر ہے۔ پانچ چھ سال قبل اس نے برلن میں کافی دھوم مچائی تھی بہر حال۔۔۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے بہروپ نے مجھے بھی دھوکا دے دیا لیکن تم اس کی طرف سے کیوں مشکوک ہو گئے تھے؟" اس نے کارٹر سے پوچھا۔

"در اصل اس کے گردن کی رنگت نے میرے ذہن میں شبہات کو ختم دیا تھا اور تم نے بھی اس پر غور کیا ہو گا لیکن یہ کوئی بہت اہم یا چوڑا دینے والی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے جس شے پر غور کیا وہ اس کے کھٹنے تھے۔ عورتوں کے کھٹنوں کی بناوٹ مردوں کے کھٹنوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ جاننے کے لیے تمہیں کسی ماہر بشریات سے

رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک عام آدمی بھی اس سے واقف ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے کھٹنے مردوں جیسے تھے۔ تاہم میرے شبے نے اس وقت تک یقین کی منزل کو نہیں چھوڑا تھا تا وقتیکہ میں نے اس پر ایک پرانا آزمودہ حربہ استعمال نہیں کیا۔" کارٹر نے ایک لمبے وقفہ کیا اور دوبارہ گویا ہوا۔ "اس روز حلام کے موقع پر میں نے قصداً شلٹروں پر ہاتھ مارا تھا اور شلٹر نے اس کی گود میں جا کر رہے تھے اور جب اس کے کھٹنے آپس میں ملنے کی بجائے جھیل گئے تو میرے شبے نے یقین کی منزل کو چھو لیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے لیکن بد قسمتی سے وہ میری اس چال کو سمجھ گیا اور جان گیا کہ میں اس کی حقیقت سے واقف ہو گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اہم شخص جس کی مجھے غمرائی کرنی تھی، اس چھاپہ پر موجود ہے لیکن مجھے اس وقت تک یقین نہیں آیا کہ وہ شخص سلاؤنسکی ہے، جب تک اسے شلٹر نے قتل نہ کر دیا۔ علاوہ ازیں میں مہاجرین میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔"

"لیکن سلاؤنسکی نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" اینڈرزن نے کہا۔ "اس کی کیا وجہ تھی؟" "در اصل، وہ وہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس جو کاغذات تھے، وہ اتنے اہم تھے کہ وہ اپنے قریب آنے والے ہر شخص کی جانب سے مشکوک ہو جایا کرتا تھا۔ اسے میرے بارے میں بھی کچھ لگتا تھا۔" "شاید وہ یہ سمجھا ہو کہ میں ہی وہ یہودی ایجنٹ ہوں جو اس کے کاغذات حاصل کرتا چاہتا ہے یا پھر ممکن ہے میری نازیوں سے فرضی حمایت کی شہرت نے اسے اس حرکت پر اکسایا ہو۔"

"تو پھر شلٹر نے جان کو کیوں قتل کیا؟" کینٹن نے سوال کیا۔ "میں جانتا ہوں۔" اینڈرزن نے جواب دیا۔ "جان میرے لیے کام کر رہا تھا اور شلٹر اسے برطانوی ایجنٹ کی حیثیت سے پہچان گیا تھا۔ ممکن ہے اس نے اسے اشتعال یا خوف کے باعث قتل کر دیا ہو یا پھر اس نے سوچا ہو کہ میں اور کارٹر ایک دوسرے سے شریک کار ہیں اور ہم نے کاغذات جان کے حوالے کر دیئے ہیں۔ میرا کام صرف اسرائیلی جاسوس کا پتہ لگانا تھا اور میں کسی قسم کے کاغذات کی موجودگی سے قطعاً لاعلم تھا۔ یہ تمہارا مکمل تھا کارٹر۔"

"مسٹر" کارٹر مولوی سے غلط ہو۔ "اب تمہارا فرض ہے کہ تم سب کچھ تفصیل سے بیان کر دو۔"

مولوی آگے بڑھا۔ اس پر بیانی کیفیت طاری تھی۔
 ”ہاں۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں ہائی بھری۔ ”میں تم
 لوگوں کو جانتا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ سلاؤنسکی کو میں اس وقت
 سے جانتا تھا جب وہ رائلہ میں مقیم تھا۔ وہ میرا بہت پرانا
 دوست تھا اور ریلواری ایک نئی قسم ایجاد کرنے کے تجربات
 کر رہا تھا جو کسی بھی حکومت کے لیے ایک انتہائی اہم اختیار
 ہوتا لیکن چونکہ اس کی ماں قسطنطنیہ تھی، لہذا اسے کیمپ میں
 پھنچا دیا گیا۔ بعد میں جب اسرائیلیوں کو اس کی ایجاد کی
 اہمیت کا علم ہوا تو انہوں نے اسے رہا کر دیا تاکہ وہ اپنے
 تجربات مکمل کر سکے لیکن وہ اپنی ایجاد کے قارمولے کے
 ساتھ کسی نہ کسی فرار ہو گیا۔“

مولوی ایک لمحے کے لیے رکا اور سانس لے کر دوبارہ
 گویا ہوا۔ ”اس کے فرار ہونے پر اسرائیلیوں نے اس شخص
 شلزو کو قارمولہ حاصل کرنے پر مامور کیا۔ اس شخص نے پتلا
 لیا کہ میں سلاؤنسکی کا پرانا دوست ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ میری
 یورپی ماں کو میرے دوستوں نے اپنے یہاں پناہ دے رکھی
 ہے۔ لہذا اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کا ساتھ
 نہ دیا تو وہ میری ماں کو یہودیوں کے حوالے کر دے گا۔ وہ
 غریب اسی سال سے بھی زیادہ عمر کی ہے اور انجمنی ہے۔
 میں یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اسے کسی کیمپ
 میں بھیج دیا جائے چنانچہ میں اس کے ہاتھوں کھلونا بننے پر
 مجبور ہو گیا۔ اس نے میری بیٹی کا روپ بھارا۔ اور مجھے
 اپنے منسوبے پر عمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ خدا کی پناہ میں کتنی
 سخت اذیت میں جھٹا تھا، بیان نہیں کر سکتا۔ اب خدا کا شکر
 ہے، میری ماں سکون کی موت مرے گی۔“

”غور طلب امر یہ ہے کہ۔۔۔“ کارڈ نے اسے
 مخاطب کیا۔ ”وہ کا قذات کہاں ہیں؟ اگر وہ شلزو کے ہاتھ
 نہیں گئے اور اس نے انہیں نہیں چھپایا بھی نہیں ہے
 تو۔۔۔“

”نہیں، چناب۔۔۔“ مولوی بول پڑا۔ ”سلاؤنسکی
 جانتا تھا کہ اس کی عمرانی کی چارہ تھی، لہذا اس نے
 کا قذات میرے حوالے کر دیے تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ
 شلزو کو ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہیں گزرا کہ کا قذات میرے
 زیرِ جامد کے نیچے موجود تھے۔“

☆☆☆☆

جب مہاجرین کے علم میں یہ بات آئی کہ جہاز پر ایک
 قاتل موجود ہے اور پولیس بوٹ آکر وہ لاشیں لے گئی ہے

لیکن قاتل اب بھی ان کے درمیان موجود ہے تو جہاز کے
 ایک سرے سے دوسرے سرے تک زبردست خوف و ہراس
 پھیل گیا۔ پولیس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ چونکہ کل
 کیوں کے حدود میں ہوئے ہیں چنانچہ قاتل ان کے حوالے
 کیے جائیں۔ جبکہ کینٹین سیک کا یہ موقف تھا کہ قاتل چونکہ
 امریکی جہاز پر ہوا ہے، لہذا قاتل کو امریکی حکومت کے
 حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس پر مقدمہ چلا سکے۔
 کیمپ کی پولیس اور کینٹین سیک کے درمیان اس مسئلے
 پر کافی بحث ہوئی لیکن کینٹین اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔
 ناچار کیمپ کی پولیس نے اس کے موقف کے آگے سر تسلیم
 کر دیا۔

☆☆☆☆

”آچنگ۔۔۔ تو چہ فرمائیے۔“ کینٹین سیک اپنے ہاتھ
 میں بیگ فون قیام کر چنچا۔ ”کیمپ کی حکومت تمام مہاجرین کو
 اپنی سر زمین پر عارضی پناہ دینے پر رضامند ہو گئی ہے۔ تم
 ترمیم کر کے انہیں بتا دو۔“ اس نے آخری جملہ اپنے ساتھی
 سے کہا اور بیگ فون اسے چھوڑ دیا۔

ترجم نے مسافروں کو خوش خبری سنائی اور سارے
 مسافر ایک دوسرے سے غلغلہ مچا کر ہونے لگے۔ وہ رو رہے تھے،
 ہنس رہے تھے، بچ رہے تھے۔ اعلیٰ مسرت کے سارے ہی
 انداز نظر آرہے تھے۔ کارڈ، اینڈرسن کی طرف مڑا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور
 تھا، لہذا تمہیں اپنے دشمن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتا
 سکا۔“ وہ بولا۔ ”شاید ہمیں مستقبل میں ایک دوسرے کے
 ساتھ کام کرنے کا موقع ملے۔“

”یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔“ اینڈرسن نے
 غلوں سے جواب دیا۔ ”حقیقت تو یہ ہے کہ ان دستاویزات
 سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا جو اگر شلزو کے ہاتھ لگ جاتے تو پتا
 نہیں کتنی بڑی تباہی آتی۔ میرا کام کھس ایک یہودی کا پتلا لگا
 تھا اور تم نے اس کا پتلا لگا لیا۔ اس طرح میرا کام آسان
 ہو گیا۔ حالانکہ ہم دونوں کا ہدف ایک ہی تھا، صرف نوعیت
 مختلف تھی۔“

کارڈ عرصے کا جھگڑا تھا سائل کو قریب آنے
 ہوئے دیکھنے لگا، پھر اس نے ہٹ کر مسافروں کی طرف
 دیکھا جن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسوؤں نے دیے سے
 روشن کر دیے تھے۔



جنگ و محبت

ڈاکٹر عبدالرب الہی

وہ دونوں اپنی اپنی فوجوں کو لے کر ایک دوسرے کے مقابل آئے ایک
 طرف ترک فوج کا کمانڈر، حبیب جھمنہ بہادر سپاہی تو دوسری
 جانب تاتاری خون، شہنشاہ تیمور تھا لیکن دونوں ہی مستقبل سے
 بے خبر تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ جلد
 ہی ایک دوسرے کے رفیق سفر بن کر دنیا کو چھوڑ کر دیں گے۔

تاریخ کے بھروسے سے ایک حیران کر دینے والا قصہ۔

یہ پانچ سو سال قبل کا ذکر ہے۔ قسطنطنیہ میں کھرام
 چاہوا تھا۔ بازاروں، گلیوں اور گھروں میں خون کی ندیاں
 بہ رہی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ترکی کے چارہزار
 جوانوں کی لاشیں باسٹوں کی تلوار پر تیری ہوئی نظر آتی
 تھیں۔ شاہی محل کے عین سامنے تیموری افواج اپنا ڈیرا
 بنائے بیٹھی تھی۔ ترک سپہ سالار زنجیروں میں بکڑا ہوا اپنی
 زندگی کا فیصلہ سننے کو تیار بیٹھا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اس پر
 خوف طاری نہ تھا۔



”موت مانگتا ہے۔ یا زندگی؟“ معاویہ بنی سوری قانع
اعظم کی آواز بلند ہوئی۔
یزدانی نے بہادروں کی طرح سر اٹھا کر جواب
دیا۔ ”اگر عزت کی زندگی ملے تو بہتر ہے ورنہ موت،
کیونکہ عزت کی زندگی سے موت بڑا درد دینے والا ہے۔“

تیمور کو ایسے الفاظ سننے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا
تھا۔ اس کا چہرہ لال چھوکا ہو گیا۔ سکوار کے دہشت پر ہاتھ
رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”عزت کی زندگی تو اس لیے
چاہتا ہے کہ ایک بار پھر تختہ تختہ کو حیا کی کارزار بنا سکے۔
میں اسلام کی خدمت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں اور
اس وقت حیا کی ترلوں کو نیست و نابود کرنا سب سے بڑی
خدمت ہے۔“

یزدانی نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے پیچھے کھڑا تو جوان
جوش غیتہ کے مارے آگے آکر بولا۔ ”تو خود کو مسلمان کہتا
ہے۔ خدا کی قسم تو کیا یہ یاد کرتا، ہنزہ زار کو اچانک اسلام
ہے؟ کیا نبی رسول کریم کی تعلیم ہے؟ مجھے لگتا ہے تو مجھے کل
کرتے گا۔ لیکن حقیقت کا اظہار کرنا ہی ایک سچے مسلمان کا
فرض ہے۔ تاہم کیا یہ سب اسلام کی خدمت ہے یا ملک گیری
کی ہوس ہے؟ کیا یہ کس اور معصوم بچوں اور عورتوں کو کل
کرنا اسلام ہی ہے؟“

برسوں خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظر اس بے باک
اور خوبصورت نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔
یزدانی کو اس نوجوان کی لاش اپنی آنکھوں کے
سامنے ترپتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مگر تیمور کا ہاتھ ہر طرف ہاتھوں
دک گیا۔ نوجوان کی باتیں حیر کی طرح اس کے سینے میں
بجست ہو گئیں۔ بسا اوقات بڑے بڑے بزرگوں کی
صحت کا ذوق بابر بھی اثر نہیں ہوتا ہے۔ مگر کبھی ایک لفظ
انسان کی زندگی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یزدانی اپنی موت سے
خوفزدہ نہ تھا مگر اپنے نوجوان بچے کے انہماک کا خیال آتے
ہی گھبرا گیا۔ نرم لہجے میں بولا۔ ”یہ ابھی بچہ ہے اور نا تجربہ
کار ہے اس کی باتوں کی پروا نہ کرنا۔“

تیمور کی دنیا ہی بدل چکی تھی، وہ دیر سے دیر سے چلا
ہوا یزدانی کے قریب آیا اور پوچھا۔ ”یزدانی، تمہارا اس
نوجوان سے کیا رشتہ ہے؟“
”یہ میرا بیٹا ہے اور اس کا نام حبیب ہے۔“ یزدانی
نے بتایا۔

”حبیب! تمہارے الفاظ سخت اور تلخ ہیں مگر میں
میں سچائی ہے۔۔۔۔۔ تم نے میری زندگی کا رخ ایک لمحے
میں بدل دیا ہے۔ میرا خیال ہے انقلاب آتا ہوا نظر آتے گا
ہے۔“ تیمور یہ کہہ کر اپنے چہرے میں چلا گیا۔ اس کے چہرے
پر لکھو پریشانی کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔
☆☆☆☆

جس وقت سورج رات کی تاریکی مٹاتے ہوئے دھما
کو اپنے چہرے سے منور کرنے کی تیاریوں پر تھا اس وقت
تیمور لکھو سوچ میں گم تھا۔ وہ یزدانی اور اس کے بیٹے حبیب
کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ سپاہیوں نے اسے دیکھ کر
دروازہ کھولا اور تیمور اندر داخل ہو گیا۔
وہ یزدانی سے بولا۔ ”یزدانی! اتیرے نوجوان نے
نے میری سوچ، میرے خیالات میں ایک عظیم انقلاب
پیدا کیا ہے۔ میں ساری رات تیرے بیٹے کے الفاظ
خود کرتا رہا ہوں، حقیقت مجھ پر حیا ہو چکی ہے۔ میں
اب تک سچائی سے کوسوں دور تھا اور۔۔۔ حقیقت میں گمراہ
تھا۔ جبکہ اسلام۔۔۔ واقعی حیا اور فطرت گری نہیں
بلکہ محبت اور یکجہت سکھاتا ہے۔ جبر نہیں۔ محبت کا
درس دیتا ہے۔“

یزدانی اور اس کا بیٹا حبیب اس ایک تکرار پر
حیران و ششدر ہو کر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ تیمور
نے حبیب کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھتے ہوئے
کہا۔ ”حبیب! آج تمام ترک پرہیزگار دیے جائیں گے۔ کیا
تم نے ایک گمراہ انسان کو سیدھے راستے پر آتے دیکھا
ہے۔“

”اس قدر دانی کا میں مشکور ہوں۔ مگر حبیب ابھی
نا تجربہ کار ہے۔“ یزدانی نے جواب دیا۔
”کیا تم میری اس درخواست کو قبول نہیں کر سکتے؟
اسے میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دو۔“
یزدانی خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
اسی روز شام کو سارے ترک قیدیوں کو رہا کر دیا
گیا۔ باقی کدو بے فکری میں سرست و خوشی کی ایک کٹی
لہر دوڑ گئی۔ یزدانی آتش پرست تھا۔ مگر کئی سالوں سے وہ
دل کی گہرائی کے ساتھ اسلام سے متاثر ہوتا رہا تھا۔
یزدانی کی غیر معمولی بہادری اور جرات کے سبب سارے
ترک اسے خاصی عزت و احترام کے ساتھ دیکھا کرتے
تھے۔ اس کی ایک ہی بیٹی امت الحبيب تھی جو یزدانی کو

بیٹوں سے بھی زیادہ پیاری تھی اور جس کی پرورش بھی اس
نے بیٹوں ہی کی طرح کی تھی۔ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی،
مگر سوار کی کرتی اور تھوڑے دنوں میں ہی اس نے
حرب و شہر کے فن میں دسترس حاصل کر لی تھی۔
میدان جنگ میں اپنے باپ کے ساتھ شجاعت و بہادری
کے کارنامے نمایاں انجام دیتی رہی تھی، غلیظ وقت
اس کی بہادری نے اس قدر خوش تھا کہ اسے اٹھارہ سال
کی عمر میں ایک اعلیٰ فوجی عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ یہی
اس کی حبیب کے نام سے جانی جاتی تھی۔

امت الحبيب کے والدین اسے امیر تیمور کے ساتھ
پہلے ہی پر تیار تھے۔ مگر حبیب کے دل میں نہ معلوم کیا آئی کہ
وہ تیمور کے ساتھ جانے پر تیار ہوگی۔ عز و ذوق کا رعب کی منت
ہدایت کے باوجود اسے جانے سے کوئی نہیں روک سکا تھا۔
آخر کار وہ تیمور کے ساتھ چلی گئی۔

چار دانگ حبیب کی انصاف پسندی اور شجاعت کے
چہرے ہونے لگے۔ حبیب اب تیمور کا وزیر بن چکا تھا۔ تیمور
اسے اس قدر چاہنے لگا تھا کہ وہ اس کے کان سے سنتا تھا اور
اس کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

سرقد میں امن و امان کی حکومت تھی۔ سب لوگ
نوجوان وزیر حبیب پر اپنی جان بھروسہ کرنے پر تیار رہتے
تھے۔ تیمور تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظروں سے دور
نہیں کرتا تھا۔

ایک روز تیمور نے محبت بھری نظروں سے حبیب کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے بہت محبت کرتا
ہوں۔ حبیب! کیا تمہیں یہ معلوم ہے؟“

”آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ بھلا میں آپ کے
احسانات کیسے بھلا سکتا ہوں۔“ حبیب نے کہا۔
تیمور نے دوبارہ مسکراتے ہوئے اور بڑے غور
سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حبیب تم بہت
خوبصورت نوجوان ہو، پھر بھی تمہاری زندگی گزار رہے ہو۔
مجھے یقین ہے کہ دنیا کی حسین ترین عورت بھی تمہیں اپنے
محبوب کے روپ میں دیکھ کر خود کو خوش قسمت ترین
انسان سمجھے گی۔ لیکن اگر تم واقعی تمہاری زندگی گزارنا چاہتے
ہو تو پھر شای کل میں چل کر رہو، وہاں تمہیں ہر طرح کا
آرام و تسکین ہوگا۔ مجھے خود بھی معلوم کہ میں کیوں بے
اختیار تمہاری طرف کھینچا جا رہا ہوں۔ میں یہی چاہتا ہوں
کہ تم بروت میری نظروں کے سامنے رہو۔“ تیمور کی

آواز میں محبت کی مٹھاس تھی اور آنکھوں سے محبت بھرے
جذبات نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

یہ سن کر حبیب کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ کبھی
شاید تیمور اس کے راز سے واقف ہو گیا ہے۔ اس خوف کے
باعث اس کا چہرہ پتلا پڑنے لگا مگر فوراً ہی اس نے خود کو
سنبھال لیا اور کہا۔

”میں تو آپ کا شکر یہ ادا کرنے سے بھی قاصر ہوں۔
آپ کے احسانات اور ذرہ نوازی کے سامنے الفاظ کم
پڑنے لگے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ شای کل میں رہنا میرے
لیے مشکل ہے۔“

”کیوں؟“ امیر تیمور نے دریافت کیا۔
”اس لیے کہ جہاں دولت ہوتی ہے، وہاں لوٹ مار کا
خطرہ ہوتا ہے پھر زیادہ قدر دانی اور عزت افزائی دشمن پیدا
کرنے کے حراش بھی ہوتی ہے۔“ حبیب نے جواب دیا۔
”عیب! کیا تمہارا کوئی دشمن بھی ہے؟“ تیمور نے

پوچھا۔
”ہاں! اول تو میں خود اپنا دشمن ہوں۔“ حبیب نے
جواب دیا۔

تیمور کے سارے دلائل بے کار ثابت ہوئے۔ وہ
کچھ سوچتا رہا پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حبیب
نے سکون کا سانس لیا۔ اس طرح اس کا راز۔۔۔۔۔ راز ہی
رہا۔

ملک کے مغربی حصے میں بغاوت پھوٹ پڑی۔
حبیب تیموری افواج لے کر اس بغاوت کو کچلنے کے لیے
روانہ ہو گیا۔ بغاوت والے علاقے میں یسائی رچے تھے
مگر مسلمانوں نے سکوار کے زور پر اس علاقے کو فتح
کر کے انہیں غلام بنالیا تھا۔ یسائیوں پر ”جزیہ“ عائد
کرنے کے علاوہ انہیں گرجاؤں میں ٹھکانا دینے کی بھی
ممانعت تھی جس کے خلاف یسائی دنیا میں اٹھ اٹھ گئی
تھی اور وہ اپنے جائز حقوق کی حفاظت کی خاطر لڑنے
مرنے پر آمادہ تھے۔

حبیب کی دلوں تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخر کار
یسائیوں پر عائد جزیہ کو معاف کیا گیا اور گرجاؤں میں ٹھکانا
بجائے کی پابندی ختم کر دی گئی۔

مسلمان لشکر یسین کی بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور قلعے کا
محاصرہ کر لیا۔ حبیب قلعے میں بند ہو گیا۔ محروم اب بھی سچائی
کی خاطر جنگ کرنے اور لڑنے پر تیار تھا۔

تجور کو جب حبیب کی خبر نہ ملی تو وہ پریشان ہو گیا۔ آخر کار تجور کی خدمت میں ایک قاصد پہنچا اور کورٹش کیا تاکہ عرض کی۔

”جہاں چاہا جزئیہ معاف کر دیا گیا۔“
 ”جزئیہ معاف کر دیا گیا؟ مگر کس کے حکم سے؟“ تیمور نے دریافت کیا۔
 ”ذریعہ حکم سے اور ساتھ ہی گرجاؤں میں گھنٹا بجانے کی بھی اجازت دے دی گئی ہے۔“ قائد نے عرض کیا۔

کیا۔ "وزیر کا فروں کے ساتھ مل چکا ہے اور آپ سے باقی ہو گیا ہے۔ اسلامی لشکر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔" قاصد نے آگے بتایا تو میر نے جوش اور غصے سے کہنے لگے۔ "قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا اور حبیب قتل ہونے کے لیے تیار ہے۔"

وہ دو بیٹوں کی طرح اپنے کمرے میں ادھر ادھر چکر لگانے لگا۔ پھر ایک دم قاصد کی طرف پلٹا اور کہنے لگا۔ ”جیب کافروں سے چھلایا ہے۔ کیا تجھے پتا ہے کہ کافر کے

کہتے ہیں کا فرد ہوتا ہے جو مظلوم اور کمزور کو تنگ کرے، جو دوسروں کا حق غصب کرے، جو دوسروں کی آزادی چھین لے اور بد ذات اتو ہی وقت یہاں سے نکل جا۔“

اس کے بعد حمزہ منزلوں پہ منزل مارتا ہوا بھاگتا
والے علاقے میں پہنچا۔ جب عجیب تک یہ خبر پہنچی کہ حمزہ
آگیا ہے تو اس نے بھی تیور سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے
ہتھیار سنبھال لیے۔ جبکہ میرانیوں کے پیروں تلے
زمین کھل گئی۔ وہ تیور کے فے اور انعام سے ابھی طر
واقف تھے۔ مگر ان کے تمام احمیہ اس وقت بے فہ
ذات ہوئے جب تلے کا محاصرہ ختم کر دیا گیا اور تیور
افواج کا سفید جھنڈا اٹھ کے نام پر لہرا کر نظر آیا۔

حبیب، بیسائی پادریوں کے ساتھ قلعے سے باہر
اور تیور کے قدموں میں جاگرا۔ تیور نے اسے اٹھا کر
پینے سے لگا لیا۔ اور مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا تو مجھ سے لڑ

وہ بھی کہ وہاں کیا رہا حبیب؟
 "ہاں! اصول اور صداقت کے سامنے تجوروں کی
 وقت نہ تھی۔" حبیب نے جواب دیا۔
 تجوروں کے چرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور حبیب
 آہستگی کے ساتھ خود کو تجوروں کی آغوش سے الگ کر دیا۔

ایک ہی دن میں نقشہ بدل چکا تھا۔ تیمور جیسا تھیں ان کا
علاقہ ان کے حوالے کر کے حبیب کے ساتھ واپس آ گیا۔

شام کا وقت تھا۔ تیمور اور حبیب باہجے میں کچھ کھڑے تھے۔ تیمور نے کھٹکھٹا کا موضوع بدلے ہوئے پوچھا۔
 ”حبیب! میں اپنے دل کی ایک بات تم سے کہنا چاہتا
 ہوں۔“
 ”جی ہاں۔“
 حبیب نے دھڑکتے دل سے کہا۔ ”جہاں پتا نہ لگے۔“

اب تم اس وسیع سلطنت کو سنبالو۔ تم ہی اس کے مالک ہو۔ میں اب یاد الہی میں مصروف ہو جاؤ۔ چاہا ہوں۔“ یہی طور نے کہا۔

”منگور ہے۔“ حبیب نے سہراتے ہوئے کہا۔
 ”خدا تمہیں سلامت رکھے۔“ تیمور نے اطمینان کا
 سانس لیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد حبیب نے کہا: "اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کا وزیر حبیب ایک مرد نہیں بلکہ عورت ہے تو پھر.....؟"

تجورو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے دل کی حد ہو سکتی ہے۔“

نہیں ہوئی؟“
 ”نہیں“ تیمور بولا۔ ”اس لیے کہ میں نے نہیں
 قطعہ میں ہی یہاں لیا تھا کہ تم مرد ہیں عورت ہو۔“

یہ سن کر حبیب نے شرم و حیا کے باعث اپنی آنکھوں سے
جھکا لیں۔ پھر تھوڑے سے اسے اپنی آنکھوں سے کہ قریب کر
ہوئے اس کی حیا پار آنکھوں میں جھانک کر پوچھا: "کیا

”یہ آپ اپنے دل سے پوچھیں۔“ حبیب -
محجوبانہ انداز میں جواب دیا۔

عام ہو گئی اور ہر طرف خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جانے لگا۔
بڑی دھوم دھام سے تیمور اور جیبیب رشتہ کار دواج

شک ہو کر ایک دوسرے کے لئے رشتہ اور نام
میں۔ اس کے بعد حبیب کو حیدرہ بانو بیگم کے نام سے
جانے لگا۔

74 جولائی 2014ء



قسط نمبر: 229

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفقاں کی یاد
تجائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے تاد روزگار حال حال ہی نظر آتے ہیں۔ جو تصنف
مندی سے علم واپس 'صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے یوزوال کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے لہن رسا کی
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی ٹھکن کا شکار نظر
آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں ذہنیت کی
تفلیس اس کی پیشانی پر ثبت کر دیتے۔ مختلف شعبے ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی پروا مل رہی تھی۔ وہ
مستند اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ بہد و شہد
اور عملی علاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل
وشق ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانہ کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
غائب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے قلمی دنیا تک دراز ایک داستان و رواستاں سرگزشت

ایک زمانے میں بی بی دی سارے خاندان کے لیے ایک عقیدہ اور ایک نئے کار کا ذریعہ تھا۔ اس ادارے نے جتنی عرصہ ادارہ کار، جدت کار، گھوکار اور ہنرمندوں کو تربیت اسے کر بہت بڑا کام کیا جس کی وجہ سے ساری قوم کو

مهاجرت مصری گزشت

ایک بھترین اور صحت مند وقت گزاری کا موقع مل رہا تھا۔ لی
 فی دی ایک ایسا جوش تھا جو سارے خاندان کے چھوٹے
 بڑے فرد کو دل بھگی کا سامان فراہم کرتا تھا۔
 لی فی دی کا جب آغاز ہوا تو اس کے ایم وی اے لم تھے

7 جولائی 2014ء

جنہوں نے اس جھڑل کو حکومت کی مداخلت سے پاک رکھا تھا۔ جب تک حکومت اور بیوروکریسی کی مداخلت سے یہ جھڑل آزاد تھا اس کا ہر پروگرام قابل دیدہ ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ نگاہیں اور بہترین دلچسپ پروگرام مغربی ممالک سے منگائی دی ہو دکھایا جاتا تھا۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک قابل فخر ادارہ تھا جس کے مقابلے میں بھارتی دور درشن کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ بہترین موسیقارہ گائیکہ ڈراما نگار ٹی بی وی سے اپنے پروگرام نشر کرتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے فن کار بھی تھے جنہیں ٹی وی پروگراموں میں پہلی بار پیش کیا گیا اور انہیں ایسی تربیت دی گئی کہ بہت جلد دوسرے لوگوں کو... بھی اپنے فن کے اعتبار کا موضوع ملا۔ برصغیر کے معروف اور نامور ترین فن کار اپنی فن کارانہ صلاحیت کو پیش کرتے اور ادا حاصل کرتے تھے۔

ریڈیو پاکستان اس وقت بھی قابل تحریف اداکاروں کی خدمات حاصل کرتا تھا لیکن سرکاری اور غیر سرکاری طریقہ کار کا فرق اس وقت بھی نمایاں تھا۔ ایک مثال یہ ہے کہ استاد بڑے غلام علی خان جیسے مایہ ناز گائیک کو ریڈیو سے ایک پروگرام کا دوسرا روپے معاوضہ دیا جاتا تھا۔ جب معاوضے کے مطالبات مسخر کر دیے گئے تو انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ پختہ میں ان کے پروگراموں کی تعداد بڑھادی جائے لیکن اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل بخاری صاحب نے اس کے لیے بھی معذرت کر لی۔ اور ہندوستان سے استاد بڑے غلام علی خان کو بلاوے پر بلاوے آ رہے تھے اور بہت پرکشش آفرزدی جارہی تھی۔ استاد بڑے غلام علی شاید کم معاوضے پر اپنا پیٹ کاٹ کر کرن کی خدمت کرتے رہتے مگر پاکستان میں ان کی پڑائی اور قدر و قیمت بھی نہیں تھی۔ ہال آف ریل برداشتہ ہو کر انہوں نے رخت سطر ہاتھ دھا اور ہندوستان روانہ ہو گئے۔ جہاں انہیں سر آگھوں پر بٹھایا گیا اور قدموں میں بڑے بڑے قیمتی اداکاروں نے سر جھکا دیا۔ بڑے غلام علی خان کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی حیثیت اور مرتبہ کیا ہے۔ یہ تذکرہ تو کھس اس وقت کے حالات کی ایک جھلک دکھانے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس وقت موضوع یہ ہے کہ ٹی بی وی نے اپنے پروگراموں کے ذریعے قوم کو ایک معیاری اور بہترین تفریح فراہم کی تھی۔ چھوٹے بچے جو موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے اور خدا اور ملا جلیوں سے بھی بالامال تھے انہیں موقع دیا گیا کہ

وہ اپنی صلاحیتوں کو بھرتا بنائیں۔ بچوں کے لیے موسیقی سکھانے کے جو پروگرام شروع کیے گئے تھے ان میں ٹی بی وی نے بڑی بڑی اور گلوکاری کے آداب بھی سکھائے جاتے تھے۔ اس پروگرام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قلمی صنعت کے نامور موسیقار شکیل رحیم، علی الدین اور علی احمد جیسے ماہرین بچوں کی مکمل میں شریک مگ شپ کر کے ان میں خود امدادی کا جذبہ پیدا کرتے تھے۔ پاکستان کے بہت سے نامور گلوکار اور گلوکارائیں ان ہی پروگراموں کے ذریعے سامنے آئے اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ جہان مسیح جیسے موسیقار اور گلوکار، نازیہ حسن حدیقہ کیانی، شاز یہ منگور جیسے فن کار ان ہی پروگراموں کے ذریعے سامنے آئے ہیں۔

نازیہ حسن کو پاکستان بلکہ برصغیر کی پہلی پاپ گلوکارہ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے کیریئر کا آغاز ٹی بی وی کے بچوں کے پروگرام ہی سے کیا تھا۔ نازیہ حسن نے آج پر اچھی تحریکوں سے پرہیز کیا۔ پاکستان میں اور بیرونی ملکوں میں انہوں نے Girl Next Door کی حیثیت حاصل کر لی تھی جسے سارے خاندان والے اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ بعد میں وہ اپنے والدین کے ساتھ انگلستان پہلی گئیں جہاں انہوں نے اپنے بھائی زویب حسن کے ساتھ گلوکاری کی تربیت جاری رکھی۔ گھر والوں نے بھی ان کے ساتھ ہوا پورا تعاون کیا لیکن انہوں نے اپنے بھائی زویب کی حدود سے ایک ویلے یو ایلم پیش کیا۔ ایک بالکل نواورہ نو آواز اور گنگنا ٹوکی کے گانے اس گیت نے برصغیر سمیت ساری دنیا میں دھوم مچا دی۔ گیت کے بول تھے۔

”آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات ہی جائے۔“ اس ایک نغمے نے نازیہ حسن کا نام چارواک عالم میں مشہور کر دیا۔ نازیہ اور ان کے بھائی زویب نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ دراصل وہ گلوکاری کو اپنے ذریعہ معاش نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ یہ ان کا شوق تھا۔ اس شوق کو انہوں نے دوسرے پیشہ ور گلوکاروں سے زیادہ شہرت دی۔ آج پر ان کے گانے کا انداز مہذب اور باوقار ہوتا تھا۔ آج پر انہوں نے نکلنے اور قریب کی روایت کو بھی نہیں اپنایا۔ وہ جب آج پر نمودار ہوتی ہیں تو آج ان کی باوقار شخصیت کی وجہ سے جگ جایا کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ان

کے بھائی نے بھی ایلیج پر ان کے ساتھ گلوکاری شروع کر دی۔ اپنے چتر گیت یہ دونوں خود ہی بناتے تھے۔ طرز میں بھی ان ہی کی بنائی ہوئی تھیں۔ نازیہ حسن نے اردو میں پاپ میوزک کا انداز بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان کے اس گانے کی مقبولیت سے متاثر ہو کر بھارتی فلم ”قربانی“ میں بھی یہ نغمہ شامل کیا گیا اور ناٹینسن کی پیچرڈ اور مہذب آواز نے سب کو سمجھو کر رکھ دیا۔ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور اقوام متحدہ کے کسی ادارے سے بھی وابستہ نہیں۔

انہوں نے بات یہ ہے کہ اس معصوم بھولی بھائی لڑکی کا انجام بہت دردناک ہوا۔ سسرال والوں نے ان کی قدر نہ کی۔ انہوں نے ایک بچے کو بھی جنم دیا تھا مگر اسے بہت چھوٹا سا چھوڑ کر دنیا سے رخصت



ہو گئیں۔ جن وجوہات کی بنا پر وہ اس دردناک انجام کو پہنچیں انہیں شاید احساس تک نہ ہوا کہ انہوں نے معاشرے، موسیقی اور ایک خاندان کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے اور دنیائے موسیقی کو کیسے بے بہا سرمائے سے محروم کر دیا ہے۔

دیکھیے، دراصل تذکرہ حدیقہ کیانی کا کرتا تھا۔ حدیقہ نے ٹی بی وی کے بچوں کے پروگرام ہی سے آغاز کیا تھا۔ حدیقہ کیانی نے رفتہ رفتہ گلوکاری کی دنیا میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ حدیقہ نے بہت کم اعتراض دیئے ہیں اور ان کی حقیقی زندگی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ حدیقہ نہ صرف گلوکاری میں ایک بااثر نام ہے بلکہ انہوں نے ایک حساس اور ہمدردی بھی پایا ہے۔ غلامی کاموں میں وہ بیچہ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔



نازیہ حسن اپنے بھائی اور والدین کے ہمراہ
نازیہ حسن اپنے بچے کے ہمراہ

سیلاب آئے ڈنڈا آئے، کوئی اور آفت ملک پر نازل ہو جائے، حدیقہ امدادی کاموں میں پیش پیش رہتی ہیں۔ اور دور دراز ویران علاقوں میں ماری ماری بھرتی ہیں۔ اپنا سرمایہ بھی ان کاموں پر خرچ کرتی ہیں اور اس بلند مقصد کے لیے چندہ بھی اکٹھا کرتی ہیں۔ قدرت نے انہیں بھی ایک معصوم چہرے سے نوازا ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور مہذب پس منظر اور تربیت نے انہیں ایک خصوصی مقام عطا کیا ہے۔ تعلیم یافتہ اور اچھی تربیت حاصل کر کے ایسی ہی فن کارائیں سامنے آتی ہیں۔ نازیہ حسن کی طرح حدیقہ کیانی نے بھی پاپ میوزک اور روایتی شرقی گلوکاری میں قابل قدر مقام حاصل کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی معصوم بچی نے اپنے شوق اور لگن کی بدولت سبیل رعنا کی تربیت سے پوری طرح استفادہ کیا اور آج وہ ایک بین الاقوامی شخصیت کی مالک ہیں۔ سبیل رعنا کے پروگرام میں وہ اتنی چھوٹی تھیں کہ گانے بھی نہیں سن سکتی تھیں۔ صرف دوسروں کے گانوں پر سر ہلاتی رہتی تھیں۔ نازیہ حسن کے ساتھ تو ان کے بھائی گایا کرتے تھے لیکن حدیقہ کیانی نے جب گلوکاری کا آغاز کیا تو ان کی بہن



موقع پر سولہ لاکھ سے زائد شائقین نے ان کی موسیقی کے انعام کو سراہا۔ اس گانے کا اہم 70 لاکھ سے زیادہ تعداد میں فروخت ہوا تھا۔ اس تجربے سے حوصلہ پا کر انہوں نے "روشنی" کے نام سے ایک خالبہم پیش کیا جس کی ایک کروڑ سے زائد کاپیاں فروخت ہوئیں جو کہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

انہوں نے سید لوری قلم "سرم" کے لیے بھی مددنا
 سچ کے ساتھ نگرانی کی۔ ایک موسیقار کی حیثیت سے
 مددنا سچ کی پہلی قلمی۔ "قلم سرم" کی موسیقی بہت پسند
 کی جاتی تھی۔ یہ قلم میں گانے کا پہلا مواد تھا جس نے ان
 کی شہرت اور مقبولیت میں حریف اضافہ کر دیا۔ اب وہ ایک
 عالمگیر شہرت کی مالک گلوکارہ بن چکی ہیں جو اپنے شائقین اور
 مذہب اعدائے کے خوالے سے بھی بہت مقبول ہیں۔

اس گانے میں حدیقہ نے اداکاری بھی کی تھی اور روتے ہوئے اصلی آنسو بہاتے تھے۔ شایع وہ اس گانے میں کھوگئی تھیں اور ان پر وہی کیفیت طاری ہوگئی تھی جو گانے کے نہیں مطابق تھی۔ اس گانے میں حدیقہ کے بھائی عرفان نے بھی حصہ لیا تھا۔

حدائق کیانی ایک گلوکارہ کے علاوہ ایک بہت اچھی مقررہ اور فن وین انٹرنیٹ ہیں۔ ایک قابل ذکر بات یہ کہ وہ اپنے ہمراہ اسٹائل خود بناتی ہیں۔ پال بنوانے کے لیے بھی کسی بھی بار لڑیں گی۔

نہ صرف ایک بڑا اور پرمشہور شخص تھا بلکہ اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اعلیٰ درجے پر پہنچے۔ حلیہ کیانی کی والدہ ان کے لیے تعلیمات خصوصی تھیں۔ وہ بہت اچھی شاعرہ تھیں اور حدیقہ ان کے ساتھ کر کے ان کی طرف سے لکھنے میں بھی مشغول رہتی تھیں۔ حدیقہ کیانی نے یوں تو پورے امریکا اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا لیکن انہیں عالمی شہرت ہوشن (امریکا) میں ایک میٹرک شرم شریک ہونے کے بعد حاصل ہوئی۔ یہ شرم 2008 میں ہوشن پارک میں منعقد ہوا تھا۔ اس شو کی مہمان خصوصی شیلا جینسن تھیں جو بذات خود ایک عالمی شہرت یافتہ گلوکارہ ہیں۔ شیلا جینسن نے اپنی ہارس جیسے اور اسے کی رقصہ بھی ہیں۔ ان کے اس شو میں چند ہزار سے زائد موسیقی کے دلدادہ خنواں اور مردوں نے حصہ لیا تھا۔ ایک غیر ملک کے اتنے بڑے مجمع کے سامنے گلوکاری کا مظاہرہ کرنا ان کی خود اعتمادی کی دلیل ہے۔

حقیقتہً ان کامیابیوں کی وجہ سے مغرور نہیں ہو گیا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ انحصار اور انسانیت سے محبت کا مظاہرہ کرتے لگیں۔ مظفر آباد کے ہولناک زلزلے میں انہوں نے فلاحی کاموں کا ایک شاندار مظاہرہ کیا۔ انہوں نے زلزلے میں یتیم و یتیم رہنے والے ایک بچے کی کفالت کی فذوری بھی قبول کی اور اس کی پرورش کے تمام اخراجات برداشت کر دی ہیں۔ 2006 میں انہیں اسلام آباد میں بہترین گھوکادہ کی حیثیت سے تمغہ امتیاز سے نوازا گیا۔ حقیقتہً کیانی نے زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے پاکستان میں اور بیرون ملک چندہ اکٹھا کرنے کی مہم چلائی۔ وہ اپنی تمام مصروفیات کو چھوڑ کر زلزلہ زدہ علاقوں میں آتے ہوئے غریب لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے گاؤں گاؤں پھیل پھریں رہیں۔ اس طرح انہوں نے ایک حساس اور نڈے دار فکرا رہنے کا ثبوت فراہم کیا۔

2006ء میں عدالت نے ایک فیہ جریہ کیا۔ انہوں نے "رف کٹ" کے نام سے اپنے انگریزی کانوں کا اہم چٹا کیا۔ اس اہم میں شامل ان کے کانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ عارف اہم کے ساتھ انہوں نے ایک کانہ "آس پاس" گا یا جس کو بہت بے برائی حاصل ہوئی اور علف فی دی جتنو سے یہ کانہ بار بار تکر کیا۔ عدالت کیانی کی ایشیائی گلوکارہ جس جنہوں نے بی بی سی لندن سے شبیہ کلا کے مقابلے میں شرکت کی اور کامیابی حاصل کی۔ اس

ایزم لگایا کہ حدیث نے ان کے کانے کی دھن چوری کر کے یہ کہتا ہے۔ وزیر داخل کا یہ دعویٰ درست نہیں ثابت ہو سکا لیکن حدیث نے اس کا حیاتی سے حائر ہو کر اردو کا قول میں بغضی الفاظ استعمال کر کے ایک نرالی قسم کی موسیقی کی طرح ڈالی۔ اس کانے میں انہوں نے اردو کاری بھی کی تھی اور ایک دھنی مریض کا کردار ادا کیا تھا۔ ان کا اردو بغضی کی آمیزش کا انداز پسند کیا گیا تو انہوں نے اسی انداز کا ایک اور گانا کر پیش کر دیا اس کے بول تھے۔

یادِ جن دی آتی
آکھ جنواں تل بھرا آتی

علاقہ کراچی کا تعلق ایک شریف اور عظیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ 11 اگست 1994ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم..... راولپنڈی میں ہی حاصل کی۔ گائیک اور موسیقی کا شوق دیکھ کر گھر والوں نے بھی محبت ہی میں ان کی حوصلہ افزائی کی۔ لاہور آکر انہوں نے بچوں کے پروگرام..... ”رنگ بگلی دنیا“ میں باقاعدگی سے شرکت کی اور اساتذہ سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے فن کا راسخہ بھانجان کے چہرے نظر گھرا والوں نے انہیں معروف آرٹ کے تخلیق ادارے امین سی اے (پیشہ کالج آف آرٹ) میں داخل کرادیا۔

حدائقہ نے عوام کے سامنے پہلی مرتبہ راولپنڈی کی
ایاقہت ہال میں گلوکاری کا پُر احساں مظاہرہ کیا۔ اسی روز سنے
والوں نے کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں موسیقی کے افق پر ایک
نیا ستارہ طلوع ہو رہا ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی تقاریب
میں بھی شرکت کی اور ملک سے باہر یونان، ترکی، بلغاریہ
وغیرہ میں بچوں کے پروگراموں میں شرکت کر کے اسی
اعزاز دہی حاصل کیے۔ یہاں سے حدائقہ کیانی کے اسی
سٹرک آغا ز ہوا، انہوں نے لاہور کے کئی کئی ایسی اداروں میں
تعلیم و تربیت حاصل کی۔ انہوں نے کلاسکی موسیقار استاد
فیض خان سے بھی تربیت حاصل کی۔ جہاں جہاں سے
موسیقی کے موتی جن سکتی تھیں وہاں وہاں سے ایسے فن میں
اضافے کو پیش کی۔

وہ مختلف ممالک میں بھی نکلواکاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ان کے ساتھ گایا کرتی تھیں اس لیے کیانی سسز کے نام سے ان کی گلوکاری اور شہرت کا آغاز ہوا۔ کافی عرصے تک یہ دونوں ہمیشہ ساتھ گاتی ہیں مگر کچھ عرصے بعد کیانی وجہ سے حدیقہ کی بہن نے گانا بند کر دیا اور حدیقہ کیانی نے تنہا گلوکاری شروع کر دی اور بہت کامیابی اور مقبولیت حاصل کی۔ وہ اپنی خوش اور فن کاری کے باعث ترقی کی منزل طے کرتی رہیں۔ آج ان کا نام اور ان کی آواز ہر جگہ گونج رہی ہے۔ انہوں نے آغاز میں گلوکاری کا سیدھا سادہ انداز اپنایا۔ انہوں نے سنجیدی اور دوسرے علاقوں کے لوگ گیتوں کی وجہ سے شہرت حاصل کی لیکن رفتہ رفتہ چند سال بعد وہ نئے رنگ میں جلوہ گر ہوئیں۔ مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے مغربی الفاظ اور مغربی انداز اپنایا۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ ایک موسیقی کے مقابلے کے پروگرام میں بھی سچ کے ردار میں ان کی حیرت زدگ کر حیرت ہوئی کہ کیا وہی حدیقہ کیانی ہے؟

ان کا تو رنگ و جنب اور انداز ہی بدل گیا۔ درے
کہ وہ اسی راستے پر چل کر کون سے جدید انداز اپنائیں گی۔
ان کی گلوکاری نے سب کے دل سہ لیے تھے مثلاً
دو پیامبر اعلیٰ کا۔

اس گھنٹے سے انہیں بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔
 سکیل رحمان، خلیل احمد، مصباح الدین اور ثار بڑی جیسے
 موسیقاروں نے جس کو سکھایا اور اللہ نے سرحدی آواز بھی
 دی ہو وہ کیوں نہ مقبول اور شہرت حاصل کرے گی؟

حدائق نے ایک اور نیا تجربہ کیا۔ انہوں نے ایک پنجابی لوک گیت اور ایک انگریزی گانے کی آمیزش سے ایک ملا جلا نمونہ مرتب کیا۔
پنجابی لوک گیت کے بول ہیں۔

بہت سے ہاریاں تھیں تانے کنڈاں مپ کے آواں گی ہوا
مین کے۔

اس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ چاہے دروازے اور
کھڑکیاں بند ہوں دھاریں پھانے کر آؤں گی۔ یہ موسیقی کا
ایک بالکل نیا انداز تھا۔ انہوں نے اس پنجابی نغمہ گیت
میں پنجابی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی قسم کا گیت ترتیب دیا
تھا۔ یہ ایک بالکل نیا انداز تھا۔ اس پر تنقید اور کٹ چینی بھی کی
گئی لیکن اس گانے کو سب سے پسند کیا گیا۔ ایک پاکستانی
موسیقار و ذرا افضل (جو کہ اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے



ہندو کاٹھن کی یادگار تصویر

نظر آ رہے تھے۔

جزل آئزن ہاور نے یونٹ محل کے مطابق تقریری اور حاضرین کو بتایا کہ آئندہ جنگوں کے لیے انہیں کیا کرنا ہوگا۔

تقریر ختم کرنے کے بعد جزل آئزن ہاور ڈاکس سے نیچے اترے لیکن ان کا ہر قانون میں الجھ گیا اور وہ سنبھل نہ سکے اور میزوں سے لڑکھ کر فرش پر گر گئے۔ احترام اور رعب کے باوجود تمام حاضرین نے ساختہ فیس نہ بنے۔ جزل آئزن نے کسی شرمندگی یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا اور وہ بے اختیار مسکرا دیے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر فوجیوں نے خوش ہو کر کرائی ٹوئیاں ہوا میں اچھال دیں۔ اس واقعے سے وہ بہت لطف اندوز ہوئے۔ کرنے کے بعد بجائے ناراض ہو کر رخصت ہونے کے انہوں نے بھی مسکراتے ہوئے اپنی ٹوپی ہوا میں اچھالی اور فوجیوں کی خوشی میں شریک ہو گئے۔ ایک ہی لمحے میں ماحول بدل گیا اور سب اس خوشی اور قہقروں میں شریک ہو گئے۔ اس واقعے نے تمام ماتحت فوجیوں کو جزل آئزن کا گرویدہ کر دیا اور انہوں نے سب کا دل جیت لیا۔

اس طرح کا ایک واقعہ قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ پیش آیا تھا جو تھمپور میں مسلم لیگی لیڈروں کے ایک اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ دو دن کے بعد عید الفطر آئے والی تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ عید کی نماز بھی اسی گراؤڈ میں ادا کی جائے۔

عید کی نماز کے موقع پر پچاس ہزار سے زائد افراد عید کی نماز ادا کرنے کے لیے میدان میں موجود تھے۔ یہ 27 دسمبر 1941 کا واقعہ ہے۔ نماز اور خطبہ ختم ہونے کے بعد ایک جھم نے قائد اعظم کو گھیر لیا۔ وہ سب قائد اعظم سے ہاتھ ملانے یا ان سے عید ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس طرح کے جھم سے قائد اعظم گھبراتے تھے۔ قائد اعظم ان سب سے ہاتھ ملانے کی بجائے آٹچ پر ہتھی گئے اور مائیکروفون کی طرف بڑھے۔ انہوں نے مائیکروفون

ہو مجھے اور ایک معمولی سی بدحرامی اور بدتمیز چٹائی کی وجہ سے گورنر ڈیوٹی جتنی ہوئی باڑی ہار گئے کیونکہ وہ اپنے فیسے پر قابو نہیں پاسکتے تھے اور امریکی دولہے سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ بدحرامی اور فیس کی وجہ سے جو شخص اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکا وہ کلی امور میرے خوش اسطولی اور خوش دلی سے ادا کرتے گئے۔

یوں تو صدر ٹرومین بھی فیس میں آجاتے تھے لیکن وہ بہت جلد اپنے حراج پر قابو پا کر لوگوں کو خوش کرنے کا کریم جانتے تھے جس کی وجہ سے لوگ ان کے غصے کو بھول جاتے تھے اور ان کی خیر سے باڑی پر فیس دیا کرتے تھے۔

وہ ایک کامیاب اور بڑے باب امریکی فوجی کمانڈر تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہر کیا تھا۔ ان کے رٹائرڈ ہونے کا وقت آچکا تھا۔ 1941 میں جب جاپانیوں نے ہل ہار پر حملہ کیا تو جنگ کا رخ ہی پلٹ گیا۔ آئزن ہاور کو ترقی دے کر جزل آئزن کے عہدے پر فائز کر دیا گیا کیونکہ امریکی صدر جانتے تھے کہ کامیابیاں جزل آئزن کے قدم چمکتی ہیں۔ وہ ایک ذہین اور بہت اچھے جزل ہیں۔ آئزن ہاور کو امریکی ”کنک“ کہا کرتے تھے۔ امریکی فوج کے چیف جزل مارشل نے بہت سوچ سمجھ کر جزل آئزن کا انتخاب کیا تھا۔ وہ جسکی جالوں میں مہارت رکھتے تھے اور ان کے فیصلے عموماً کامیاب ثابت ہوتے تھے۔ ایک کامیاب کمانڈر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے کرکٹ کے کپتان کی طرح قائدانہ صلاحیتیں ہوتی ضروری ہیں۔ جزل آئزن ہاور نے افریقہ میں جرمنوں کے خلاف نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ قائد کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے ماتحتوں اور سپاہیوں کی محبت اور وفاداری حاصل رہے۔ ایسے قائد کے لیے اس کے ماتحت جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جزل آئزن ہاور میں یہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ حاضر جواب اور خوش حراج بھی تھے۔ کمانڈر کا چارج لینے کے بعد فوجیوں کے ایسے گروپ سے خطاب کیا جن میں امریکی، برطانوی، آفریقی، فرنجی اور عرب فوجی بھی شامل تھے۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے پہلے بھی آئزن ہاور کو نہیں دیکھا تھا مگر ان کے کارناموں کے بارے میں سن رکھا تھا۔

جزل آئزن ہاور فوجی بیچاروں میں ملیں تھے جو کچھ تنگ تھے جس کی وجہ سے وہ ایک فوجی سے زیادہ پولیس آفیسر

کیوں نظر آ رہے ہیں۔“ بابا جی بولے۔ ”تم نے سچ کہا۔ یہ سب لوگ معمولی اور جتنی لباس پہنے ہوئے ہیں مگر ان کی شخصیت میں ایک بڑی کمی ہے۔“

”وہ یہ ہے کہ ان سب کے چہرے مسکراہٹ سے محروم ہیں۔ یاد رکھو مسکراہٹ بھی انسان کی شخصیت کا ایک ضروری حصہ ہے لیکن دیکھو، ان کے چہروں پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہیں ہے جو لباس کا ایک ضروری حصہ ہوتی ہے۔“ بابا جی نے درست ہی کہا تھا کہ آس پاس کی شخصیت کے چہرے پر خوشی، مسکراہٹ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہر کوئی گرمند اور کسی سوچ میں نہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد اشتقاق صاحب نے خود سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا تو انہیں ہر شخص کا مکمل نظر آیا۔ اس کے بعد اشتقاق صاحب کو احساس ہوا کہ مسکراہٹ انسان کے لیے کتنی ضروری ہے۔ مسکراہٹ نہ صرف انسان کے چہرے کو جگمگاتی ہے بلکہ سارے ماحول میں املا کر دیتی ہے۔ حالانکہ مسکراتے کے لیے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لیے صرف ذمہ دلی اور حاضر جوابی کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں امریکا کے انتخابات کا واقعہ یاد آیا جس کا اس زمانے میں بہت چرچا ہوا تھا۔ صدر روز ویلف سولہ سال تک امریکا کے صدر رہ چکے تھے۔ ان کے بعد صدر ٹرومین کو کافی مقبولیت حاصل رہی۔ اس کی ڈیموکریٹک پارٹی کو پورا یقین تھا کہ کامیابی ان کے امیدوار کے حصے میں آئے گی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی جانب سے گورنر ڈیوٹی امیدوار تھے اور عام طور پر خیال کیا جا رہا تھا کہ صدر فوجی تھیں۔ لیکن ان کے پاس کامیابی کا یقین تھا کیونکہ صدر روز ویلف اور ٹرومین مقبول اور کامیاب صدر ثابت ہوئے تھے۔ سب کو یقین تھا کہ اس نئی منظر کی وجہ سے گورنر ڈیوٹی یقیناً کامیاب ہو جائیں گے لیکن ایک معمولی واقعے نے کامیابی اور گورنر ڈیوٹی کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہو گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ ری پبلکن پارٹی کے ایک جلسے میں چند لوگوں نے گورنر ڈیوٹی سے چھپے ہوئے سوالات پوچھنے کو گورنر ڈیوٹی فیس میں آگئے اور پارٹی کے دو کرڈ پر برس پڑے۔ اس ایک واقعے کو مینے نے بہت اچھالا۔ اخبار لڑی یون نے لکھا ”ڈیموکریٹک پارٹی شکست کھا گئی۔ گورنر ڈیوٹی ناکام

یوں تو بچوں کی موسیقی کے پروگرام کی وجہ سے کئی گلوکار اس نے نام چھوڑا لیکن نازیہ حسن اور حدیقہ کیانی کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ لیکن اس پروگرام نے نصف درجن سے زیادہ گلوکار اور گلوکارائیں موسیقی کی دنیا کو دی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حدیقہ کیانی ہی اس کی مقبول ترین گلوکارہ ہیں۔

☆☆☆

کیا ہم ہنسنا مسکراتے اور خوش ہونا بھول چکے ہیں۔ مشکلات اور مسائل کو پہلے بھی تھے لیکن کبھی بھی کسی اور قہقہے کی آواز سنائی دے جاتی تھی لیکن اب تو جیسے ہر کوئی نظرات کے سمندر میں غرق ہے۔ ایک اخبار سے یہ لوگ حق بجانب بھی ہیں۔ پاکستان کی اٹھارہ کروڑ آبادی کا مشکل سے ایک یا ڈیڑھ فیصد ہوگا جس نے کبھی خوشی اور قہقروں پر اجارہ داری حاصل کر رکھی ہے۔ ہر مگر ان کے زمانے میں عام لوگوں کے لیے مشکلات اور مسائل کے انبار میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ حالات نے سفید پوش متوسط طبقے کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ حالانکہ ہر ملک کا متوسط طبقہ ہی ریزہ کی بڑی ہے لیکن مہنگائی، بے روزگاری اور حکومت کی بے نیازی نے اس ریزہ کی بڑی پر سب سے زیادہ ضرب لگائی ہے۔

فوجی اور مسکراہٹ انسانوں کے لیے ایک ذریعہ اور زیادتیش کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں اشتقاق مرحوم کا بیان کیا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک روز اشتقاق صاحب اپنے بابا جی کے ساتھ کھیں جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ بابا جی کی نظریں سڑک پر گزرنے والے ہر شخص کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بابا جی بہت خاموش اور گرمند نظر آ رہے تھے۔

اشتقاق صاحب نے پوچھا ”بابا جی آپ آج کس خیال میں نظر آ رہے ہیں؟“

بابا جی بولے ”میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کوئی ایک شخص بھی مجھے مکمل لباس میں نظر نہیں آ رہا۔“

اشتقاق صاحب نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور کہا ”بابا جی کبھی لوگ تو ایسے کپڑوں میں ملیں ہیں۔“

بابا جی بولے ”مگر ان کا لباس مکمل نہیں ہے۔“

اشتقاق صاحب نے ایک بار پھر اطراف میں نظریں دوڑائیں اور پھر بولے ”بابا جی میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ مکمل لباس میں ہیں مگر بھی آپ کو لباس سے محروم

سنیائے کے بعد کہا "میرے دوستو! آپ سب کو عید مبارک ہو۔" اس کے جواب میں مجمع نے بیک آواز کہا۔ "آپ کو بھی عید مبارک ہو۔" قائد اعظم مسکرائے اور بے تکلفانہ انداز میں سب سے مخاطب ہو کر کہا "آپ سب کے جذبات کی میں قدر کرتا ہوں۔ میری بھی خواہش ہے کہ ہر شخص سے ہاتھ ملاؤں اور عید کی مبارکباد دوں۔ اگر میں آپ میں سے صرف چند لوگوں سے مصافحہ کرتا تو محروم رہ جاتے والوں کو بہت مایوسی ہوتی۔ میں عید کے مبارک موقع پر کسی کو مایوس یا خاموش نہیں دیکھنا چاہتا۔ لیکن آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ چھاس ہزار لوگوں سے مصافحہ کرنے کے بعد میں صرف دونوں ہاتھ نہیں چھوڑ کر جاتا۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ آپ کا قائد ہاتھوں سے محروم ہو جائے؟" سب نے تیار کر کہا "بالکل نہیں۔ ہم تو آپ کو معمولی تکلیف میں بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔"

قائد اعظم نے مسکرا کر دونوں ہاتھ ہلا کر کہا "شکر ہے کہ میں یہاں سے اپنے دونوں ہاتھ صحیح سلامت لے کر جا رہا ہوں۔ آپ سب کا بہت شکر یہ اور عید مبارک۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھے اور جب تک نظر آتے رہے دونوں ہاتھ ہلا کر سب کو الوداع کرتے رہے۔

جنرل آئزن ہارڈ کی طرح قائد اعظم بھی عموماً سنجیدہ رہتے تھے اور بہت کم مسکراتے تھے۔ قائد اعظم ہلہ عام میں ہی مسکراتے تھے لیکن بہت کم۔ ان میں مزاح کی حس بہت زیادہ تھی۔ جیسا کہ اس مشہور واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائد اعظم مسلم لیگ کے ایک اہل اس سے خطاب کر رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ قائد اعظم جب تقریر کرتے تھے تو انگریزی نہ سمجھنے والے بھی خاموشی سے ساکت ہو کر ان کی تقریر نہ کرتے تھے۔ یہ ان کی آواز کا رعب و دبدبہ تھا یا بولنے کا انداز جو سب کو مسحور کر دیتا تھا۔ جو لوگ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ان کے انداز بیان سے واقف تھے وہ بھی پوری توجہ سے ان کی تقریر نہ کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے ایک ان پڑھ دیہاتی سے پوچھا "تم تو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے پھر بھی اسے غور سے قائد اعظم کی تقریر نہ کرتا کیوں نہ سمجھتا رہے ہو۔"

اس شخص نے جواب دیا "میں ان کی تقریر تو نہیں سمجھ سکتا لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہی کہہ رہے ہیں۔"

ایک بار قائد اعظم تقریر کر رہے تھے کہ مولوی فضل

حق جو مسلم لیگ کے ایک ممتاز لیڈر اور بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے پنڈال میں داخل ہوئے۔ سب کی نظریں مولوی فضل حق کی جانب اٹھ گئیں۔ انھیں شیر بنگال کہا جاتا تھا کیونکہ وہ بہت بڑا اور بے ہنگم تھے۔

قائد اعظم اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور کہا "شیر آگیا ہے اس لیے مجھے کو پیپ جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

جب مولوی فضل حق اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو قائد اعظم نے کھڑے ہو کر دوبارہ تقریر شروع کر دی۔

قائد اعظم مسکرائے میں بھی بھل سے کام نہیں لیتے تھے بشرطیکہ کوئی دلچسپ اور لطیف بات کی جائے۔

یہ دو مثالیں صرف اس لیے چنیں گئی ہیں کہ مسکراہٹ انسان کی سماعت بلکہ اس کا زیر ہوتا ہے۔ کیا آپ نے بھی کسی جانور کو بھی مسکراتے ہوئے دیکھا ہے؟ فی نہیں۔ دراصل یہ خوبی اللہ تعالیٰ نے صرف انسان ہی کو عطا کی ہے۔

یقین کیجئے، مسکرائے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ البتہ چہرے کی ریش اور عضلات میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ صرف مسکراہٹ سے مسکرائے والے کا چہرہ جھکا اٹھتا ہے بلکہ مقل میں موجود ہر شخص مسکرائے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ باہمی کشیدگی دور کرنے اور ماحول کو پرسکون کرنے کے لیے بھی مسکراہٹ ایک نفسیاتی وجہ ہے۔

مہذب ملکوں میں مسکرائے ان کی عادت میں شامل ہے۔ جب ہم بمبئی بارنگ سے باہر گئے تو ہمارا پہلا بڑا حیرت تھا۔ یہ شہر اس زمانے میں اپنی خوبصورتی اور رعین کے حوالے سے بہت مشہور تھا۔ اس کو شرق کا پیرس کہا جاتا تھا۔

ہم اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ جب برنس انڈین کے ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو دروازے پر کھڑی ہوئی انر ہوٹس نے مسکرا کر ہمیں ویل کم کہا۔ اس کے بعد بھی جب ہم انر ہوٹس کو طلب کرتے تھے تو وہ چراغ الزدین کے جن کی طرح فوراً حاضر ہو جاتی تھی مسافروں کی بات مسکراتے ہوئے غور سے سنتی اور بلاتا خیران کی ضرورت پوری کر دیتی تھی۔

حیروت سے رخصت ہوتے وقت ایئریشن سے کاؤنٹر پر ایک خوش فعل خاتون تعریف فرما تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اس طرح مسکرائیں جیسے مدت سے ہمیں نہاکی

ہم نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا کہ شاید ان کا کوئی فیضانا ہمارے پیچھے کھڑا ہے مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ لیکن ان قانون کی مسکراہٹ کی وجہ سے اجمیت کی برف پھل گئی اور ہم نے عقلی سے ان سے بات چیت شروع کر دی۔

مسکرائے غائب غیر ملکوں کے حرات کا ایک حصہ ہے۔ ہم امریکا کی خارج کاؤنٹی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب ٹکڑے باہر نکلے تو فٹ پاتھ پر ایک خاتون ہمارے پاس سے گزریں تو کھپیں ملنے ہی... مسکرائیں لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ ہم کافی دور تک چلتے ہوئے چلے گئے تاکہ اس علاقے کے خیرانیہ سے واقفیت ہو سکے۔ راستے میں، مکان میں بینک میں جس سے بھی ہمارا سامنا ہوا وہ نکالنے ہی مسکرایا ضرور۔ پاکستان میں ہم نے بھی کسی انہی سے مسکرا کر ملنے نہیں دیکھا اس لیے بہت اچھا لگا۔ غیر ملکی کرکٹیں تبدیل کرنے گئے تو وہاں ایک اسٹارٹ، درمیانہ عمر کے صاحب بیٹھے تھے۔ جسے بھی نظر میں لیں ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ظاہر ہے کہ جواب میں ہمیں بھی مسکراہٹ پڑا۔ خواہ کوئی آپ کا کام نہ کرے اور محذرت کر دے، ملاقات کا آغاز مسکراہٹ ہی سے کرے گا بعد میں ہم نے دیکھا کہ ہر مہذب ملک میں مسکرائے ایک ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ نے کارلڈ باؤک کر دی ہے یا ٹریک تو زمین کی خلاف ورزی کی ہے تو بھی پولیس کے سامنے آپ کی طرف آنے کا تو پہلے مسکرائے گا اور پھر دریافت کرے گا۔

"امید ہے آپ کا دن اچھا گزرے گا۔ ایسا جملہ سن کر بھی خیال آنے لگا کہ یہ تو بہت خوش حرات اور نرم دل پولیس والا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کہے گا "سرا آپ نے فلاں ٹریک قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔"

اور جب سے چالان کی کاپی نکال کر چالان آپ کے حوالے کر دے گا۔

پھر Have a good day کہہ کر مسکراتا ہوا چلا جائے گا۔ اگر پولیس والا کسی ملزم کو گرفتار کرے گا تو پہلے مسکرائے گا۔ پھر مزاح پری کرے گا اور چالان کی پرہی حوالے کر دے گا۔

چالان ہونے کے بعد مقررہ تاریخ تک آپ اس کے خلاف عدالت چلانا چاہے ہیں تو اپنا موقف پیش کر سکتے ہیں۔ اگرچہ آپ سے ملنے ہوا تو چالان ضائع کر دے گا اور آپ پر مسکراتے ہوئے جرم نامہ ٹھیک دے گا۔

البتہ ایک بار ہم کو مسکراہٹ تو ملی لیکن چالان کی پرہی

نہیں ملی ہوا یہ کہ ہم رات کو گیارہ بجے کے قریب دھنسن کے رہنے والے تھے۔ اپنے گھر واپس جا رہے تھے جو درجنیا میں تھا۔ رات کا وقت تھا اور سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ اس لیے ہم تیز رفتاری سے کار چلا رہے تھے۔ امریکی شہروں میں یہ رواج ہے کہ مختلف علاقوں میں سیدر لٹار تھیل ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً چھپاں آبادی زیادہ ہے یا کوئی نچوان علاقہ ہے تو رفتار کی حد ملتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہر جگہ رفتار کے لیے سائن بورڈ لگے ہوتے ہیں لیکن کچھ اول تو سائن بورڈ پڑھنے کی عادت نہیں ہے دوسرے سوچا کہ اتنی رات ٹریفک تو ہے نہیں سڑکیں خالی پڑی ہیں اس لیے کار کو ساٹھ ستر گھنٹہ میٹر کی رفتار سے بھاگتے رہے۔

اچانک ایک جگہ پیچھے ہمیں پولیس کار کی روشنی نظر آئی۔ ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ اتنی رات مجھے بھی پولیس ہمارا پیچھا کرے گی۔ لیکن کچھ دیر بعد یقین آ گیا کہ یہ پولیس والا ہماری ہی تاک میں ہے۔ مرنے کا نہ کرتا۔ اتنی رفتار سے کار چلاتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ چند لمحے بعد پولیس کار ہمارے ساتھ آ کر روک گئی اور ایک اسٹارٹ پولیس والا اپنی کار سے اتر کر ہماری طرف آیا۔

اس نے جھک کر کھڑکی میں سے ہمیں دیکھا۔ مسکرایا اور گلا ایٹک کہنے کے بعد بولا۔ "مٹریس کی کھومٹ سے آپ کا پیچھا کر رہا ہوں۔ آپ بہت تیز رفتاری سے کار چلا رہے تھے۔"

ہم نے کہا "دراصل پاکستان سے نئے نئے آئے ہیں اس لیے روڈ سائین نہ دیکھ سکے۔ مگر آئیے آپ نے ہمارے لیے اتنا ہینر دل خرچ کر دیا۔"

مسکرا کر بولا۔ "سرا، یہ ہماری ڈیوٹی ہے اب آپ بتائیے کہ کس دفعہ کے تحت آپ کا چالان کاٹا جائے کیونکہ آپ نے کی مقامات پر اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "یہ فیصلہ تو آپ کریں گے اور ہمیں آپ کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔"

وہ مسکرایا اور بولا۔ "سرا، آپ نے غور نہیں کیا ہے میں اس سے مشتق تو نہیں ہوں لیکن ملٹی پلیم پر ہم اپنے ملک میں آئے ہوئے مہمان کو ایک موقع دیتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے۔ میں آپ پر آئندہ نظر رکھوں گا۔ اگلی بار آپ کو جرم نامہ ادا کرنا ہوگا۔ اوکے! گڈ نائٹ اینڈ سوٹ ویلکم ٹو امریکا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا لیکن اس دن کے

بعد ہم نے دو بار وہی قلمی نہیں کی۔
 مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ آپ اپنی مسکراہٹ سے
 بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور دوسروں کے دل جیت سکتے
 ہیں۔ مسکراہٹ کو اپنائیے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے،
 فائدہ ہی فائدہ ہے۔

☆☆☆☆

30 مارچ کو ناصر کاظمی کی بری بالکل خاموشی سے
 گزرتی۔ کچھ لوگوں نے مختصر تقارب اپنے طور پر منعقد کیں
 لیکن یہ ناصر کاظمی جیسے شاعر کے شایان شان نہ تھا۔ ناصر
 کاظمی اپنے اسلوب اور انداز کے اعتبار سے ایک انوکھے
 انداز کا شاعر تھا۔ ناصر کاظمی کا ہر انداز دوسروں سے مختلف
 تھا۔ جب اس نے شادی کی تو سہاگ رات کو اپنی بیگم کو بتایا
 کہ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم میری دوسری بیوی ہو۔ یہ
 سن کر دہن کا چہرہ اتر گیا۔ وہ پریشان ہوئی کیونکہ کوئی بھی
 عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی بننا نہیں چاہتی۔
 نئی دہن کی پریشانی دیکھ کر ناصر نے پوچھا: ”کیا تم
 اپنی سوکن کا نام نہیں پوچھو گی؟“

دہن غریب کیا جواب دیتی۔ خاموشی سے سر جھکا لیا۔
 دو لہانے جیب سے ایک کتاب نکال کر پیش کی اور
 کہا: ”یہ ایک غریب شاعر کی طرف سے منہ دکھائی ہے۔
 میں نے لڑپن ہی میں شاعری سے شادی کر لی تھی۔ دراصل
 یہ میری پہلی بیوی کی طرف سے دوسری بیوی کے لیے ایک
 تحفہ ہے۔ امید ہے تم اسے پسند کرو گی۔“

یہ سن کر دہن کے دم میں دم آیا۔ اس کے بعد ان
 دونوں کی زندگی ایک مثالی شادی کہلائی۔ ناصر کو راتوں میں
 شوہر کی سڑکوں پر دوستوں کے ساتھ گھومنے کی عادت تھی۔
 ناصر کاظمی بچپن ہی سے ایک شاعرانہ حیران لے کر آیا تھا۔
 اسے پھولوں اور کیتھڑوں سے مشق تھا۔ ناصر کاظمی ایک
 عجیب و غریب مزاج کا آدمی تھا۔ نوکری سے دور بھاگتا تھا،
 اگر بعد وہ دوست پارٹے دار کہیں ملازمت دلا بھی دیتے تو
 ناصر کاظمی دوسروں کی طرح دفتری پابندیوں اور نظم و ضبط کا
 قائل نہ تھا۔ ایک بار ریو پاکستان میں اسے ریو پلا آرٹسٹ
 مقرر کر دیا گیا مگر وہ بھی وقت پر دفتر نہیں آیا۔

ایک بار بارہ بجے دفتر پہنچا تو اسٹیشن منیجر سے آنا
 سامنا ہو گیا۔ منیجر نے پوچھا: ”ناصر صاحب، آپ نے
 گھڑی دیکھی ہے۔ کیا تھک رہے ہیں؟“
 ”جی ہاں“ سانسے دیا ہر پر گھڑی مچی ہوئی اور بارہ

بجے کا وقت بتا رہی ہے۔“
 ”لیکن آپ کے ریو اسٹیشن پہنچنے کا وقت تو نو بجے
 صبح ہے۔“

”جی وہ تو میں جانتا ہوں لیکن آج اتنا س کھانے کو
 چاہ رہا تھا۔ اسے اچھے اور میٹھے انٹاس چھوڑ کر کون آتا ہے۔
 یہ کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اسٹیشن ٹیکسٹ ورائٹر
 مکیا۔ ناصر کاظمی کا شاعرانہ مقام اتنا بلند تھا کہ لوگ اس
 نوکے ہوئے گھبراتے تھے۔

ناصر کاظمی کا اصلی نام ناصر رضا تھا مگر جب باقاعدہ
 سے شاعری شروع کی تو سوچا کہ دوسرے شاعروں کی طرح
 اس کا بھی ایک قصہ ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں اکثر
 شیرانی کی رومانی شاعری کا بہت چرچا تھا۔ خصوصاً
 نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول تھے۔ اس طرح ناصر رضا
 ناصر کاظمی بن گیا۔

ناصر کاظمی انبالہ میں پیدا ہوا۔ اس کے والد فوج
 میں مصروف تھے جن کا نام محمد سلطان کاظمی تھا۔ ناصر
 ابتدائی تعلیم انبالہ میں حاصل کی پھر مسلم ہائی اسکول لاہور
 اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا۔ اس
 کے اشعار کا پہلا مجموعہ ”برگ“ نے 1952 میں شائع ہوا
 تھا۔ یہ وہی کتاب تھی جو کہ اس نے منہ دکھائی میں اپنی دہن کی
 پیش کی تھی۔

ناصر کاظمی نے مختلف رسائل میں مدبر کے طور پر کام
 کیا مگر جلد ہی ان کا چھوڑ دیا۔ کئی انگریزی کتابوں کے تراجم
 میں بہت اچھے ترسے کیے۔ اس کی تصانیف درست قول
 ہیں۔
 برگ نے (فزیلیس) دیوان (فزیلیس) پہلی بارش
 (فزیلیس) نشاط و خواب (تکلیس) مخر چھایا (معلوم وراثت)
 شک و شبہ کے کنارے (تیزی مجموعہ) انتخاب میر و انتخاب
 نظیر، انتخاب انشاء، ناصر کاظمی کی ڈائری
 ناصر کاظمی کی شاعری میں ایک نفسی اور دماغی
 کیفیت کے ساتھ ساتھ بے تعلقی کا عنصر بھی شامل تھا۔

ناصر کاظمی کے دادا سید شریف آسن کاظمی کا خانہ
 رکھیں تھے۔ یہی چوڑی زمینوں کے مالک تھے۔ ان کے
 سب کچھ تھا مگر وہ اپنے دوستوں کی طرح ملازمت سے
 خواہش مند تھے۔ بالآخر انہوں نے پولیس میں انسپکٹر
 ملازمت کر لی۔ اس زمانے میں پولیس کے پاسی کو دیکھ
 لوگ ڈر جاتے تھے۔ وہ تو انسپلر تھے۔ اس لیے بہت ہار



کافی ہاؤس میں خرافق صاحب کے ساتھ ناصر کاظمی، محمد ظیل اور انصار حسین

بشر تھے۔ دیکھا دیکھی ان
 کے والد نے بھی ملازمت
 کر لی مگر انہیں فوج میں جانے
 کا شوق تھا اس لیے انہوں
 نے فوج میں ملازمت کر لی۔
 حالانکہ ملازمت کے محتاج نہ
 تھے۔ ناصر کاظمی کو سب لگنے
 اور بھولتی کہانیاں گھڑنے کی
 عادت تھی۔ یہ عادت ان کے
 مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔

1954 میں سیلاب
 آیا اور دریائے راوی کا پانی
 راج گڑھ تک آ گیا۔ صوفی
 تیسرے ان دنوں راج گڑھ میں
 رہا کرتے تھے۔ پانی اترا تو
 سب ان کی خدمت پہنچنے
 کے لیے آئے مگر ناصر کاظمی نہ
 جاسکا۔

چند روز بعد صوفی تیسرے
 ریو اسٹیشن گئے تو ناصر کاظمی
 سے ملاقات ہوئی۔
 صوفی تیسرے نے شکوہ کیا

کہ ناصر تم میری خبر نہ لینے
 نہیں آئے۔ ناصر کاظمی نے فوراً ایک کہانی گھڑ لی۔
 انہوں نے طرز پیش کیا، وہ ملاحظہ کیجیے۔

”صوفی صاحب“ میں اپنے ایک دوست کی جیب
 میں آپ کے لیے آنے کی دو ہریاں، چینی اور جاول لے
 کر آیا تھا مگر ریت کے پاس گھوڑا اڑ گیا۔ آگے چل کر ہی نہ
 دے۔ کوچران نے اس کو مار مار کر چلانے کی کوشش کی مگر وہ
 جیب گھوڑا تھا۔ مار مار کر بھی اس نے قدم آگے نہیں بڑھایا۔
 صوفی صاحب اس داستان کو سن کر خوش ہو گئے یہ نہیں
 سوچا کہ جیب اور گھوڑے کے اڑ جانے کا کیا تعلق تھا۔ یہ
 ناصر کی عادت بن چکی تھی۔ سنے لوگ ان کی باتوں پر یقین
 کر لیتے تھے۔

ناصر کاظمی کے والد کا تدار نو شہر ہوا تو ناصر کو بہت
 حرا آیا۔ ان کو ایک بہت بڑا گھر دیا گیا تھا۔ مگر کے نزدیک
 سٹریٹس لائن گزرتی تھی۔ ریل کی چٹک چٹک اور آہن

کی سیٹی کی آواز اس کو بہت اچھی لگتی۔ اس کا ایک اور شوق
 گھر کی چھت پر چڑھ کر چاندنی کو دیکھنا تھا۔ جھوٹ بول کر
 حیران کرنا ناصر کاظمی کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ایک بار انہوں نے باقر رضوی کو ایک قصہ سنایا۔
 ”باقر، تم نے مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی کی عمارت
 کے سامنے بیٹھوں کی توپ۔ تو دیکھی ہے۔“
 ”ہاں، وہاں سے گزرتے ہوئے ہر روز دیکھتا
 ہوں۔“

”جب میں رات کو دو بجے اپنے گھر جاتا ہوں تو مجھے
 توپ کے پاس تھارنک پر ایک بیڑھیا نظر آتی ہے۔“
 ”کیا ہر بار؟“

”ہاں، ہر بار۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوتا کہ یہ
 بیڑھیا اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہے۔ وہ بیڑھیا کالے
 رنگ کی ہوتی ہے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا: ”اماں“

جی "اپنا چہرہ تو دکھاؤ۔"

"اس نے چہرے سے چادر ہٹائی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ہے وہ کون جی؟"

"کون جی؟"

"وہ میری ماں جی۔"

"واقعی؟"

"جی کہہ رہا ہوں۔ میں تو خود حیران رہ گیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد میں نے رات کو اس راستے سے گزرتا چھوڑ دیا۔"

ناصر کا لگی بچپن ہی میں عجیب و غریب حرائج کا مالک تھا اور عجیب و غریب شرارتیں کرتا تھا۔

ایک بار جب وہ چھ سال کا تھا دہلی کا تہوار آ گیا۔ دہلی میں چلتے چلتے جاتے ہیں۔ ناصر نے بھی کئی چلتے خریدے اور کسی طرح کٹھن کی کوئی کے چھوڑے پہنچ گیا۔ اس نے پٹاخوں میں آگ لگائی اور چلتے ہوئے چلتے کٹھن کی کوئی کے احاطے میں پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس زمانے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔

کاٹھن میں نے بھی عدم تعاون کا اعلان کر دیا تھا۔ مسلم لیگ نے بھی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس زمانے میں سہاسی چند یوں نے بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ بڑاوا ہند کی فوج فرینوں کے نیچے جم رکھ کر فوجی گاڑیوں کو ازاد پتی تھی۔ سرکاری املاک کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ انگریزی حکومت یہ بھی کہ سہاسی چند یوں کی باغیانہ تحریک فوجیوں تک پہنچ گئی ہے۔ سہاسی چند تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ انگریز کٹھن نے ان پٹاخوں کا الزام بھی سہاسی چند یوں کے کھاتے میں ڈال دیا۔

شہر کی ہوا میں ہلچل مچ گئی لیکن صرف ایک بچہ ایسا تھا جس کو حقیقت کا علم تھا۔

ناصر کا لگی کو کیتور پالنے کا بھی شوق تھا۔ جب اس شوق کا اظہار اپنی ماں سے کیا تو اس نے کہا "دیکھو بیٹے، کیتور بھی سید ہوتے ہیں اور تم بھی سید ہو۔ کیا تمہیں یہ اچھا لگے گا کہ تم سیدوں کو چھروں میں بند رکھوا دو ان پر ظلم کرو۔"

لیکن ناصر کو کیتوروں سے عشق تھا۔ اس کو فطرت کی ہر چیز سے عشق تھا۔ وہ آسمان پر بندوں اور کیتوروں کو پرواز کو دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ کیا میں بھی ان پرندوں کی طرح پرواز

کر سکتا ہوں۔

اپنا شوق بجا کر کرنے کا اس نے ایک نرالا طریقہ نکالا۔ وہ اپنا عجیب و غریب اظہار کے ایک کیتور خرید کر لایا اور اس کو کھڑکی سے اندر پھینک دیا۔ کیتور کے پرواز پر پھر پھر ابھرتا کہ کیتور نے اس پاس دیکھا تو اس کو ایک کیتور چمن میں اترا ہوا نظر آیا۔

ناصر نے اندر آ کر کہا "اماں، اماں، دیکھو اللہ میرا نے ہمیں ایک کیتور بھیج دیا ہے۔ یہ تو اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔ اللہ کی دین کو ہم کیسے ٹھکرایا کریں گے۔"

اماں کچھ کی کہ بیٹے کی شرارت ہے لیکن اس کی طرف کے آگے اس نے ہار مان لی۔ اس کے بعد اسے دن کو کھڑکی کے راستے کیتور آتے رہے۔ اماں حیران تھی کہ کیتور اس کے گھر کیوں آ جاتے ہیں۔ اس دوران میں اس کے گھر میں بہت سے کیتور تشریف ہو گئے۔ وہ چمن میں کیتوروں کے دوستان میں بیٹھ جاتا اور جب چاروں طرف کیتور اڑتے تو ان کے پرواز کی پکڑ پکڑ ابھرتی اس کو بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کیتوروں کو دانت کھلاتا تھا۔ کیتور بھی اس سے باتیں ہو گئے تھے۔ ہر وقت اس کے پاس منڈلائے پھرتے۔ بھی ہاتھوں پر اور بھی کندھوں اور سرول پر چڑھ جاتے تھے۔ ناصر کا کافی دیر تک کیتوروں میں گھرا رہتا اور بہت خوش ہوتا تھا۔ کیتوروں کا شوق اس کو ساری عمر رہا۔ اس نے کیتوروں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ایک بار وہ ریل کے ذریعہ ساہیوال جا رہا تھا۔ اسٹیشن کے نزدیک ہی اس کو ایک کیتور فروخت کرنے والے کی دکان نظر آئی۔ مختلف کیتوروں کو دیکھ کر وہ بے تاب ہو گیا اور فرین سے اتر کر کیتور والے کے پاس جا کر کیتور دیکھ رہا۔ ہر کیتور کے بارے میں وہ معلومات بھی فراہم کر رہا تھا۔ کیتور والے نے پوچھا "بلائی کیا آپ کیتوروں کا کاروبار کرتے ہیں؟"

ناصر نے فوراً کپ لگائی۔ "میں دنیا بھر سے مختلف کیتور اکٹھے کرتا ہوں۔ ہاں ہر سے کیتور اپورٹ بھی کرتا ہوں اور انکے پورٹ بھی کرتا ہوں۔ دنیا بھر سے کیتوروں کے شوقین مجھ سے مشورے مانگتے ہیں۔"

دکاندار بہت مرحوب ہوا۔ اس گفتگو میں لاہور کی فرین چلی گئی۔

دکاندار نے کہا "بلائی آپ کی فرین تو چلی گئی۔" ناصر نے بے غری سے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟ جب فرین

میں ہوتی تھی کیا اس وقت لوگ سفر نہیں کرتے تھے۔" ناصر کا لگی نے دوسری فرین کا اظہار نہیں کیا اور پیدل ہی چل پڑا۔

جب دوستوں کو پتا چلا کہ وہ پیدل ہی لاہور آ گیا ہے تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ناصر نے کہا "تم لوگ میٹھوں کے حامی ہو گئے ہو۔ جانتے ہی نہیں ہو کہ پیدل سفر کی قدر کتنا ہے۔ درخت، ہیز و زار، ہرے بھرے کھیت، میدان، کھلا ہوا بالکل صاف آسمان، یہ نظارہ تو پیدل چلتے دانتے ہی دیکھ سکتے ہیں۔" ناصر کا لگی کو پڑھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ گھر میں ہر طرح کی کتابیں موجود تھیں۔ وہ شعر و شاعری پڑھنے میں بہت تیز تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح مطالعے کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ قصہ چار درویش، الف لیلا، لکھنؤ، ہندوستان، شاہناہم، فردوسی، خسرو و شیرین، ہر چکا تھا جو اس کے ذہن پر نقش ہو جاتی تھیں۔ میراٹھس کے مرثیے اس کو زبان پر آتے۔ دوسرے شعرا کا کلام بھی اذہر تھا۔

یہ شاعروں کی شاعری پڑھ کر ہی اس کو شاعری کا شوق ہوا تھا۔ بچہ تھا لیکن اساتذہ کا کلام اسے اذہر تھا۔ اسے شاعری کے راز سے بھی واقفیت ہو گئی۔ اس کو احساس ہونے لگا کہ اس میں بھی شاعری کے جراثیم موجود ہیں۔ اس نے جو پہلا شعر کہا وہ یہ تھا۔

تقول ہے جنہیں تم بھی تری خوشی کے لیے وہ بھی رہے ہیں حقیقت میں زندگی کے لیے اس نے اپنی پہلی غزل عمل کر کے پانا کو پیش کی۔ انہیں بچپن میں آیا کہ اتنا کم عمر بچہ ایسی غزلیں بھی لکھ سکتا ہے۔ انہوں نے نواسے کی بہت حوصلہ افزائی کی۔

جب وہ لاہور پہنچا تو اس کو اپنی مرکز میں اس کو بڑے تہ سے شاعروں اور شہر نگاروں کی محبت حاصل ہوئی۔ لاہور نے اس کی شاعری کی آبیاری کی۔ لاہور میں اس نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا تو اس کی شاعری میں مزید نگار پیدا ہو گیا۔ نہ صرف کالج کے مشاعروں میں بلکہ کل ہند مشاعروں میں بھی اسے مدعو کیا جانے لگا۔ اب ادب و ذوق حضرت اور ادبی حلقہ اسے پکارتے لگے۔

1942 میں لاہور میں یو اسٹین سے ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ناصر کا لگی کو بھی بلور مشاعرہ دیا گیا تھا۔ ایک نوجوان طالب علم شاعر کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس مشاعرے میں اس کو پہلی بار ہندوستان کے نامور

شعرا کو دیکھنے اور ان کی زبانی ان کا کلام سننے کا موقع ملا تھا پھر بھی اس کے اشعار کو بہت پسند کیا گیا۔

یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اختر شیرانی کی تصوراتی محبوبہ کے برعکس ناصر کا لگی کی حقیقت میں ایک محبوبہ تھی۔ اگرچہ اس نے بہت ذات خود کی کو اس کا نام نہیں بتایا مگر قریبی بار دوست جان گئے۔ اس کی محبوبہ کا نام میراٹھس ہے۔ وہ اسے کہاں اور کیسے ملی تھی۔ ان کے چھڑنے کا سبب کیا تھا یہ حقیقت ہمیشہ پردہ راز ہی میں رہی اور اس کے قریب ترین دوست بھی شخص انداز سے ہی قائل کرتے رہے۔ یہ شعرا نے شعیرا ہی کے لیے کہا تھا۔

ماہیں نہ ہو اور اس راہی پھر آئے گا دور صبح گاہی یہ اشعار میراٹھس کے چھڑنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔

یہ ایک اس میں ایک تبدیلی آئی تھی۔ ہر وقت سکرانے اور ہنسنے ہنسانے والا شخص ابھی سما گیا تھا۔ اس کی شاعری میں جبر کی شکایت اور زور دینا ہو گیا تھا۔ کافی عرصے میراٹھس کی یادوں کو دل سے لگائے بیٹھا رہا۔ ایک قریبی دوست کو اس نے صرف اتنا بتایا کہ میراٹھس کی شادی ہو گئی ہے۔ اس کے بعد پھر بھی اس کی زبان پر میراٹھس کا نام نہ آیا۔ میراٹھس کی لیکن ناصر کا لگی کے کلام پر اپنے اثرات چھوڑ گئی۔

اسی زمانے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ دوسرے شہروں کے مسلمانوں کی طرح ناصر کے گھروالوں کی زندگی بھی انہاں میں خطرے میں پڑ گئی۔ مسلمانوں کا کل عام ہور رہا تھا۔ معصوم اور پاک بچہ ہزاروں کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ وہ خورا گھروالوں کو لاہور لانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر انہاں پہنچ گیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس سفر کے دوران میں کسی نے اس کا تہذیب پانام نہیں دریافت کیا۔ اس کے گھروالے اپنے آپ کی شہر اور کالوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ بمشکل ناصر کا لگی نے انہیں حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔

انہاں میں ناصر کا خاندان تو تھا لیکن کیتور بھی تھے جنہیں وہ خاندان ہی کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔

انہاں میں باوا دست سنگھ سے ناصر کی بہت گاڑی چھٹی تھی کیونکہ وہ بھی کیتور پالنے کے شوقین تھے اور ناصر سے کہا کرتے تھے۔ اگر بھی اپنے کیتور فروخت کرو تو میرے سوا کسی کو نہ دینا۔ یہ بات ناصر کو یاد تھی۔ انہاں پہنچ کر وہ سیدھا باوا سنگھ کی حویلی پہنچا۔ اس بے سرو سامانی کے عالم میں اس کو

تجہ دیکھ کر بادا مست سنگھ پریشان ہو گئے۔ ناصر نے بتایا کہ ہر طرح خیریت ہے لیکن میرے کیتروں کا کیا ہوگا۔ انہوں نے اس کے کیتو خریدنے کا وعدہ کر لیا اور پھر کہا کہ میں تمہیں اپنی حویلی میں رکھ لیتا اور تمہارے خاندان کو بھی ایٹوں کی طرح رکھتا۔ لیکن آج کل انسان حیوان بن چکے ہیں۔ پورا شہر مردخن بن جانے لگا اور ہوسکا ہے وہ میری حویلی پر حملہ کر کے تم سب کو نقصان پہنچائیں۔ لیکن کیتو تو نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان۔ میں تمہارے سارے کیتو خرید لیتا ہوں حالات درست ہوتے اور تم واپس انبالہ آتے تو یہ میرے پاس تمہاری امانت ہیں۔

اس زمانے میں بھی ہندو سکھ اور مسلمانوں میں ہمدرد اور درمند لوگ تھے۔ بادا مست سنگھ بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اپنی جیب میں سچا عافیتوں کے ساتھ ناصر کو اس کے گھر بھیجا اور کہا کہ انہیں حفاظت سے ان کے گھر پہنچا دو اور ان کے گھر والوں کی بھی حفاظت کرنا۔ ناصر نے کیتروں کی کاٹیں بادا مست سنگھ کے آدمیوں کے حوالے کر دیں۔ اس کو اطمینان تھا کہ وہ ان کیتروں کو اپنے بچوں کی طرح رکھیں گے۔ جب اس کا گھر کیتروں کے پول کی پٹری پڑا ہوا تھا اور فخریوں کی آوازوں سے محروم ہو گیا تو اس کو یہ گھروں پر اندھنہ لگا۔ اس وقت اس نے یہ قول کیا۔

تجہ بن گھر کتنا سوتا تھا
دیواروں سے ڈر گتا تھا

اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ بہت دیر تک روتا رہا جیسے کوئی اپنے عزیز کے لیے روتا ہے۔ اس نے کھانا پیو چھوڑ دیا۔ دروازے بند کر کے کمرے میں بیٹھ کر آنسو بہاتا رہا۔ گھر والے اس کو ملنے دیتے رہے کہ اس کے کیتو بہت محفوظ ہیں۔ اگر لاہور جا کر رہنا ہوا تو اور کیتو خرید لیتا۔ والد کو اس نے بالآخر انبالہ چھوڑنے پر رضامند کر لیا اور اس طرح وہ انبالہ چھوڑ کر لاہور آ گیا۔ وہ دوبارہ پھر بھی انبالہ نہیں گیا۔

اسی رات سکھوں اور ہندوؤں کے ایک جھوم نے اس کے گھر کو گھیر لیا۔ مسلمان بھی اس کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا۔ ساری رات یہ جنگ جاری رہی۔ مسلمانوں کا کوئی ہائی انتھان نہیں ہوا مگر اگلے دن ہی سادے نعلے والوں نے انبالہ چھوڑ کر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ گھروں کا کھیتی سامان وہیں چھوڑا اور جیسے تیسے جانیں

بچا کر اپنے آبائی گھروں کو خیر باد کہہ کر پاکستان کا رخ کیا۔ یہ سب ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ انبالے سے لاہور کا سفر کافی طویل تھا۔ اٹھارہ گھنٹے تک ٹرین کا انتظار کرنا تھا۔ وقت بھی ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے گزرا۔ خدا خدا کر کے ٹرین آئی اور یہ سب گئے اور آیات پڑھتے ہوئے خیریت سے لاہور پہنچ گئے۔

لاہور ناصر کا گھر کے لیے بنائے تھے۔ لاہور کی روکسنگ گلی کو چنے رستوران، پاک پانی ہاؤس، کافی ہاؤس، چائے بیچنے کا ہوم، انارکلی، نیا گنبد، جمیوں کی توپ، دھانی گھر، لاہور کا ریلوے اسٹیشن جہاں رات گئے وہ چائے پیے جاتا تھا۔ ایسٹ روڈ کے سینما گھر اور اور چائے تھے، میکو روڈ کی فلمیں ختم ہوتے وقت کی روٹیں ہرچرخہ تھیں لیکن لاہور کا سیاگ اجڑ چکا تھا۔ فسادات نے جو جی اور بڑا دی بھلائی تھی اس کے نشانات شہر کے پچھلے نظر آتے تھے۔ لاہور تو وہی تھا لیکن اس کی روح اور گرمیوں سے چور چور تھا۔ بہت سے پرانے دوست چھڑ گئے تھے۔ لاہور کی ثقافتی تخلیق یہ وہ کے سہاگ کی طرح یاد تھی۔ لاہور کی جھیں یا اجڑ گئی تھیں۔ اس لاہور میں اگر ناصر کا گھر کو خوشی سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔ لیکن اگر لاہور نہ آتا تو اور اس کے خاندان والے کہاں جاتے۔ بڑی مشکل سے جانیں اور عزتیں بچا کر لاہور کے پوسکون ماحول میں چلی گئے تھے جہاں جان اور عزت کے شے کا کوئی اثر نہ تھا۔

پہلی بار جب وہ لاہور آیا تھا تو بڑے شاپنا خاندان میں آیا تھا۔ ہر طرح کا آرام تھا۔ اب سوال سرچھپانے کے لیے گھر کی تلاش کا تھا۔ لاہور میں بے شمار ہندوستان سے آنے والے بے گھر لوگ گھروں کی تلاش میں تھے۔ کچھ بددیانت لوگوں کی وجہ سے بہت سے گھر اور دکانوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ان میں مقامی لوگ بھی شامل تھے۔ کچھ لوگوں نے دشمنی دے کر بڑے بڑے شائد گھر حاصل کر لیے تھے حالانکہ وہ ہندوستان میں ٹوٹے پھوٹے گھر چھوڑ کر آئے تھے، ناصر کا گھر ایک جاگیردار خاندان سے منسلک رہا تھا۔ آگے کوٹے ہی پیش و آرام دیکھا تھا مگر نقد پر کے بدلے کی دیر لگتی ہے۔ کافی ٹھوکر کھانے اور گلی کوچوں کے پیچھے لگانے کے بعد ناصر کا گھر لاہور کی مین روڈ پر ایک ٹوکیو گئی۔ وہ متروکہ جائداد تھی۔ اس نے قسمت جانا اور اس خاندان کے ساتھ اس گھر میں منتقل ہو گیا۔ گھر میں ساز و سامان تھا نہ قالین پر سے نہ فرنیچر کچھ بھی تو اس

حققی دانشوروں کی غیر موجودگی کے سبب کئی خود ساختہ دانشور حضرات وجود میں آ گئے ہیں۔ ہر میدان میں اور ہر جہاز پر ایسے خود ساختہ دانشور ملتے ہیں۔ خود ساختہ دانشور حضرات دراصل دانشور کے زمرے میں آتے ہیں۔ وہ اس بات کو نہیں مانتے۔ سینہ ٹھوکر کھاتے ہیں کہ ہم دانشور ہیں۔ خود ساختہ دانشوروں کی پچکان بہت آسان ہے اپنی بات کو پیش کرنے کا ان کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ گھٹار کے دو غازی ہوتے ہیں اور ان کے کردار کے بارے میں علم نہیں ہوتا۔ چتر پٹیل ان کا ٹیکہ کلام ہوتے ہیں جیسے میری باتیں رائے میں۔ آپ حضرات کے سامنے مجھ جیسے جاہل شخص کا لب کشائی کرنا نہیں گستاخی قرار نہ پائے۔ میں غلط کتب ہوں۔ آپ حضرات کی محبت اور سرپرستی نے مجھ جیسے ذرے کو آلاب بنا دیا۔ اب کوئی دانشوروں سے پوچھے بھائی صاحب! جب آپ اسے کتہہ حقیر اور حقیر ہیں تو خاموشی سے کسی کوٹے میں بیٹھ کیوں نہیں جاتے اور اپنی علمی اور کم مائیگی کا اظہار کیا ضروری ہے؟ سیاست دان لائبریر اور قلمبند کی دان شور ہوتے ہیں۔ انہیں شور شرابا، نعل فہاز اور دھوم دھڑکا پیا کرنے کا کفن خوب آتا ہے۔ سیاست دان بہت اچھے فن کار ہوتے ہیں لیکن ان کی بد قسمتی ہے کہ سیاست سے اداکاری کے میدان میں قدم رکھنے کا رواج نہیں ہے جبکہ فن کار کے لیے اداکاری سے سیاست میں داخل ہونا آسان ہے۔ سیاست اور اداکاری دونوں پیسے ہی میلے پاکی ہو سکتی ہیں۔ وہ کچھ بھی کریں اور کچھ بھی جانیں گھر سے کی آگھ اور سکھانوں کے قلم کی گرفت میں رہتے ہیں۔ دور حاضر میں سیاست اور اداکاری ایسے گڈلے ہو گئے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ سیاست میں اداکاری ہو رہی ہے یا اداکاری میں سیاست۔ دونوں صورتوں میں جھگڑنا عام کو پڑتا ہے۔

اقبال: دانشور از عابد محر

میں نہ تھا۔ اپنا سچا بھائی گھر تو وہ انبالہ میں چھوڑ آئے تھے۔ صرف ضروری سامان اور جو تھوڑا بہت زور گھر میں تھا وہی پرانی میں باندھ کر لے آئے تھے۔ یہی ان کا سرمایہ تھا۔ یہی بچا سچا سامان ان کی زندگی میں رہ گیا تھا۔ ناصر کا گھر بھی کچھ چھوڑ دیا تھا۔ گھر بار، فرنیچر، جاگیریں اس کو سب سے زیادہ دکھ کیتروں سے چھڑنے کا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے کیتروں کو جمع کیا تھا۔ وہ خالی وقت میں کھٹوں ان کیتروں کے جھرمٹ میں بیٹھا رہتا تھا۔ ان کے ساتھ کھیتا تھا۔ کیتو بھی اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ جب وہ ان کے پاس جاتا تو اس کو گھیر کر بیٹھ جاتے اور اٹھ بھلیاں کرتے تھے۔ کوئی بازو پر بیٹھا، کوئی سر پر، کوئی ان کی پچلی ہوئی قلم پر رکھا ہوا دانہ چنچن مار کر کھارہا ہے۔ جب کیتو کی ناک کی چوٹی اس کی پچلی سے دانہ چنچن تو اس کو ایک عجیب قسم کے ضرور کا احساس ہوتا تھا۔ پھر کیتروں کی فزفون کی آواز اس کے کانوں میں رس مگوئی کی۔ اب وہ ساری باتیں خواب و خیال بن چکی تھیں۔ مشکل سے تو رہتے کو گھر ملا تھا۔ اس میں کیتروں کی کانوں کی جگہ کہاں؟

اس کے والد کو لاہور میں ایک نوکری مل گئی مگر کچھ بہت کم تھی۔ ان حالات میں ناصر کا گھر کے لیے تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس نے بھی ممبر کر لیا۔ جب بھی کچھ چمن کیا تو تعلیم کا کاروبار نہ کر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کا کیا سوال تھا۔ وہ بہت

خوبصورت خواب نے کربا کستان آیا تھا لیکن سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ نہ تعلیم جاری تھی، نہ بچہ میں کچھ تھا۔ کچھ پرانے اور کچھ نئے دالوں کے ساتھ وقت گزارنے کے سوا اور کوئی کر سکتا تھا۔ وہ جہاں بھی بیٹھتا انبالے کی باتیں خوب ملک مریخ لگا کر بیان کرتا۔ مبالغہ کی عادت اس کے کام آئی۔ جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتا تو اس میں اتنی رنگ آمیزی کرتا کہ وہ ایک خوبصورت داستان معلوم ہوتی۔ یار لوگوں کے ہاتھ میں ایک بھانہ آ گیا۔ وہ جان بوجھ کر اس کو انبالے کے قصے سنانے کے لیے چھیڑا کرتے تھے۔ ناصر کاظمی نے دوسرے شاعروں کے بارے میں خیالی آرائی شروع کر دی۔

کسی نے کہا کہ جوش شیخ آبادی کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ معمولی بات کو بھی وہ ہماری بھرم الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ یہ سن کر ناصر کاظمی نے کہا: "جوش صاحب بھی عجب آدمی ہیں۔ انہی پر بیٹہ کرچہ پا کا کٹا رکھتے جاتے ہیں۔" یہ فقرہ جوش صاحب کے کانوں تک پہنچ گیا۔ وہ مسکرا کر رہ گئے۔ اب ایک معروف شاعر کی حیثیت سے ناصر کاظمی کو شہرت ہو چکی تھی اور اس کو شاعروں میں بلایا جاتا تھا۔ جہاں معاوضہ بھی مل جاتا تھا۔ ان دنوں مشاعرے کم ہوتے تھے۔ لیکن کچھ نہ کچھ معاوضہ مل ہی جاتا تھا۔ ایک بار وہ مشاعرے میں شرکت کے لیے کوئٹہ جا رہا تھا۔ سخت گرمی تھی شاعروں کی کوشش تھی کہ اسے انٹرکنٹیننٹل یوٹی میں کھیل جائے۔ باقر رضوی زیادہ پریشان تھے۔ ناصر کاظمی نے باقر رضوی سے کہا: "باقر صاحب، آپ اسے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟"

باقر رضوی نے کہا: "ناصر صاحب ستر بہت لمبا ہے اور گرمی بہت زیادہ۔ اگر انٹرکنٹیننٹل یوٹی کا انتظام نہ ہوا تو ہم لوگ تو قیم جان ہو جائیں گے۔ کوئٹہ جا کر مشاعرے میں کیا خاک پڑیں گے؟"

ناصر کاظمی نے فوراً کہا: "باقر صاحب ایک بات تو بتائیے۔"

"جی ہاں۔"

"یہ بتائیے کہ کیا امام حسینؑ کے ہاتھ میں انٹرکنٹیننٹل یوٹی اس بات کا باقر صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ خاموشی سے کان دیا اگر انٹرکنٹیننٹل یوٹی چھوڑ کر عام یوٹی

میں بیٹھ گئے۔ ناصر کاظمی بہت کھرا اور پڑھا لکھا تھا۔ پھر وہ ان مبالغہ آمیز باتیں کہیں کرتا تھا۔ اس کا سبب ایک نام لفظیات نے یہ بتایا کہ دراصل وہ اپنی نامکمل حسرتوں اور نا کامیوں کو بھلانے کے لیے دروغ گوئی کرتا تھا۔ اس نے بہت اچھے دن دیکھے تھے مگر اب غربت میں دن گزار رہا تھا۔ انہی آسودہ خوابوں کو مل دینے کے لیے وہ مبالغہ آمیز کرتا تھا اور خود اپنی طرف سے بھی بہت سے قصے کھڑے کرتا تھا۔ وہ ایک ایسا بلند خیال رکھنے والا آدمی بن گیا تھا جس کی بیہوشی تھی۔ آرام وہ زندگی گزارنے کی حسرت میں وہ خود کو بٹھا رہتا تھا۔ اگر اس کا کوئی محبوب بچھا جاتا تو وہ خود بھی دوسروں کی فہمی میں شامل ہو جاتا لیکن حالات کے غلبہ فراز اور مایوسیوں نے اس کی شاعری میں گہرائی اور مزہ خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ بے شمار پرانی یادیں، دکھ، مایوسیاں اور بے کامیاں اس کی شاعری کے لیے ایک مضبوط سہارا بن گئی تھیں۔ اس کی شاعری میں گہرائی اور غیر الٹا ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی شاعری کی پہچان ہو گئی۔ اور وہ اپنے دور کا ایک معروف اور قابل ذکر شاعر بن گیا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں ایک سے ایک بڑا شاعر مروجہ لیکن ناصر کاظمی کے ایک منفرد انداز کی وجہ سے ان سب کے ہوتے ہوئے بھی اس کی شاعرانہ عظمت میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کے اشعار میں بلند خیالی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے خیالات میں بہت کشادگی اور بلندی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم کاظمی دیکھتے ہی دیکھتے ایک مکہ بند شاعر کی حیثیت سے جانے لگا تھا۔ کئی لوگ اور شعر اس کے طرز کلام سے متاثر ہو کر اس کی بیروی کرنے لگے تھے۔

اس زمانے میں سیر غیازی بھی ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ دونوں کے انداز بیان میں سادگی اور نیا پن تھا۔ دونوں اپنے ماضی کی یادوں کو بھول نہیں پاتے تھے۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے تو روایت یہ ہے کہ معروف شاعروں کے مقابلے میں سیر غیازی اور ناصر کاظمی ترجیح دوں گا۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی سیاب دی اور نیا لباس دیا تھا۔

ناصر کاظمی کو بھی رفتہ رفتہ شعور اور احساس ہو گیا۔ جس وطن کی خاطر اس نے اور لاکھوں مسلمانوں نے جان مال اور عزت کی قربانیاں دی تھیں اس پر خود غرض نہ رہا۔ پرست، طالع آزمائے لوگ قابض ہو گئے ہیں۔ آبادی

ایک انتہائی مختصر حصے نے ہر جہت پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ وہ پاکستان نہیں جس کا خواب ناصر کاظمی اور اس جیسے دوسرے نوجوانوں نے دیکھا تھا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے اس کو اپنا ماضی زیادہ شدت سے یاد آنے لگا تھا۔ ماں باپ کے سامنے سے وہ محروم ہو چکا تھا۔ وہ ایک بے یمن اور بے قرار روح کی طرح راتوں کو لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا رہتا تھا۔ گھر میں ماں باپ نہ تھے نہ اس وقت تک اس کی شادی ہوئی تھی۔ البتہ اس نے ایک ایک کر کے کسی طرح کچھ حاصل کر لیے تھے۔ اب سبھی اس کے دل بھلاوے کا زور پر تھے وہ نہ شاید ذہنی الجھنیں اور ذہنی کی تھنیاں اسے چھوڑ کر دیتیں۔

اس دوران مختلف رسائل کی ادارت بھی کی مگر جلد ہی اس کی تھک چکی اور چل ہوئی تھی مگر وہ اپنی تھائی میں گھر جاتا تھا۔ بھول شاعر

کیا لطف! انجمن کا جب دل ہی بچھ چکا ہو اس کے بے تکلف احباب کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا اور ان کی تھنیں ہی اس کے لیے دل بھلاوے کا سبب تھیں۔ اس کے قریبی دوستوں میں انتظار حسین، شاہد عید، مظفر علی سید، صلاح الدین شیخ شامل تھے۔ یوں تو ہماری سرسری ملاقات ناصر کاظمی سے کئی بار ہوئی لیکن جب روزنامہ "آفاق" کا آغاز ہوا تو یہاں بہت سے ذہین اور چمکے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ انتظار حسین بھی ان میں شامل تھے اور ہمارے کمرے میں ہی ان کی بھی میز تھی۔ یہاں ناصر کاظمی سے زیادہ بات چیت اور ملاقاتوں کا بہانہ ملا۔

دوست احباب اس کو شادی کرنے پر مجبور کر رہے تھے مگر وہ تھنوں کے زہر سے ہٹکارا پائے۔ "ہاں ہاں" کے مانگ و دم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کے پیرد ادارت کر دی۔ ٹھہری میں ایک جگہ اس کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی مگر لڑکی دالوں کا مطالبہ تھا کہ وہ پہلے کوئی ملازمت کرے۔ تھنوں کی ادارت نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اس کی شہرت سارے پاکستان میں اور ملک سے باہر تک پہنچ گئی تھی۔ کی صرف نوکری کی بھی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ شادی کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ اس لیے بھی کہ ناصر کاظمی نے اس کی پرانی عادتوں پر بھی اعتراض نہیں کیا بلکہ انہی سے قول کیا۔

ناصر کاظمی کی آواز ان کے دل پہ جتنے جسم کے مقابلے میں ہماری اور پڑا تھی۔ ہماری اور ناصر کاظمی کی ملاقاتیں

آفاق کے دفتر تک ہی محدود رہیں کیونکہ کسی اور جگہ جانے کی ہمیں فرصت نہ تھی۔ ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس میں اکٹھے ملنا ہوتا تھا۔ ناصر کاظمی کے کلام کے سونے کے طور پر کچھ غزلیں اور قصیدیں ملاحظہ کیجئے:

تم آگے ہو تو کیوں انتظار شام کریں
کہو تو کیوں نہ ابھی سے کچھ اہتمام کریں
غلوں و دقا لوگ کر چکے ہیں بہت
میرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں

☆ ☆ ☆
خدا! اگر کبھی کچھ امتیاز دے مجھ کو
تو پہلے خاک فشیوں کا انتظام کریں

☆ ☆ ☆
کہاں لے آئی تو مجھے تقدیر
میں کہاں آگیا ہوں میرے خدا

☆ ☆ ☆
شہر در شہر گھر بجائے مجھے
یوں بھی جشن طرب منائے مجھے

☆ ☆ ☆
پھر سادوں رُست کی پون چلی تم یاد آئے
پھر بچوں کی بازیب بھی تم یاد آئے
پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سندھ میں
رست آئی پہلے پھولوں کی تم یاد آئے
پھر کا کا بولا گھر کے سونے آگن میں
پھر اُمرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے

☆ ☆ ☆
ناصر کاظمی کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بھتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بھتر ہے
کلی جو تھا وہ آن ٹھہری جو آن سے گل منہ جانے کا
روکی سوگی جوں جانے شکر کو تو بھتر ہے
کڑے بدل کر بال بکرا کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصر کمر میں رہو تو بھتر ہے

☆ ☆ ☆
بھری دنیا میں جی نہیں گنا
جانے کس جڑ کی کس ہے ابھی
شہر کی ہے چراغ گلیوں سے ابھی
زندگی تھ کو دھوڑتی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر

مُن نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
یاد کے بے نشان جزیروں میں
حیرتی آواز آ رہی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
مُن نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا
دن گزارا تھا بڑی مشکل سے
پھر حیرا وعدہ شب یاد آیا
حال دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا
بیٹھ کر سایہ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

کُن کو دل میں چھپا کر دیکھو
دھیان کی شمع جلا کر رکھو
وہ دنواڑ ہے لیکن نظر شناس نہیں
پیرا ملاح میرے پارہ گر کے پاس نہیں
بجی بھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب ان دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں

ہم بھی مسافر تھے کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا
اک اجڑے سے اسٹیشن پہ
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا

ابو الحسن لکھی نے بھی کافی عرصہ ریڈیو پاکستان لاہور
میں کام کیا تا جملہ عرصہ دراز سے وہ امریکا میں ہیں لیکن
لاہور کو اور خصوصاً ریڈیو پاکستان کے ساتھیوں کو نہیں بھولے۔
امریکا میں رہ کر بھی وہ ماحول پاکستانی ہیں۔ ابھی بھی لاہور کا
بیمبر لگا لیتے ہیں تو ملاقات ہو جاتی ہے۔ 1999 میں جب
ہم امریکا گئے تو ان ہی کے گھر ٹھہرے تھے اور وہ سارے
کام چھوڑ کر ہمیں دہشتیں اور درجنیہ دکھاتے رہے تھے۔
بہت محبت کرنے والے اور مضد ارادی ہیں۔

انہوں نے لکھا ہے کہ جب ناصر کاظمی بہت بیمار تھے
اور میڈیٹال میں کیمپری کے عالم میں پڑے تھے تو ریڈیو
کے اسٹاف نے ان کے میڈیکل کے بلوں کی ادائیگی کے
بارے میں کہا تھا۔ وہ اسکرپٹ رائٹر تھے مگر میڈیکل میں ادائیگی
کرنے والے آمادہ نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسٹاف
آرٹھروڈ کے میڈیکل بل ادائیگی کیے جاتے۔ اس سلسلے میں
فقی صاحب اور اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر کے درمیان
جو مکالمے ہوئے ملاحظہ کیجئے کہ ہمارے ملک میں کون کون
کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔
جب میڈیکل بل ادائیگی سے انکار ہوا تو فقی
صاحب نے کہا۔

”ناصر کاظمی اردو کے مایہ ناز شاعر ہیں۔“
”ہوں گے۔“
”ناصر کاظمی جیسے فن کار روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔“
”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“
”ناصر کے علاج پر اگر توجہ نہ دی گئی تو وہ مر جائیں
گے۔“

”میرے ہیں تو مر جانے دو۔“
ریڈیو پاکستان میں ناصر کاظمی کی جتنی عذوق تھی اتنی ہی
اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر کی جتنی مکران کے پاس اختیارات
تھے اور ہمارے ملک میں چھوٹے سے اختیار والے بھی
انسانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں۔
ایک اور اسٹاف ریجنل ڈائریکٹر نے فقی صاحب کے
مکالمے ملاحظہ کیجئے۔

انہوں نے بیزاری سے کہا ”وہ ریڈیو میں کرتے ہی
کیا ہیں ان کے آنے جانے کے اوقات ہیں مگر کیا بھی“
وقت بے وقوف آئے۔ کیا انہوں نے اسٹاف آرٹھروڈ کے
ریجنل ڈائریکٹر سے بھی دھمکا لیا ہے۔ ریڈیو میں ان کا کیا کنٹری بیوٹن
ہے۔

فقی صاحب ”کیا ریڈیو پاکستان کا یہ اعزاز نہیں کہ
ناصر کاظمی جیسا عظیم فن کار ملازم ہے؟ کسی بھی
ریجنل اسسٹنٹ کے مرنے پر اپنی کنٹریکٹ انیسویں نہیں
کرے گا لیکن ناصر کاظمی مرے گا تو ملک کا وزیراعظم سوچے
جیان جاری کرے گا۔ ملک کا ہر ریڈیو اسٹیشن اور اخبار اس نام
کو گولڈن ٹیک پھیلائے گا۔“
فقی صاحب اسٹاف یونین کے جنرل سیکریٹری تھے
انہوں نے لاہور میں یہ مطالبہ سنانے کے لیے جلا

لے۔ نعرے لگائے۔

”لوگ اسپتال پہنچے تو بیک وقت ایسے بہت سے لوگوں کو
ناصر کاظمی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارا جیوش میڈی اسپتال پہنچا تو
اسی آئی ڈی کے ایک کارکن نے مجھ سے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ
رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”کچھ بھی نہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ
دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح ریڈیو کے اسٹاف کو بھی
میڈیکل الاؤنس دیا جائے۔“

انہوں نے فوراً اپنی نوٹ بک میں یہ معلومات درج
کر لیں۔

ناصر کاظمی سے ملاقات کے لیے صرف دو تین افراد
ہی ایک وقت میں جاسکتے تھے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے
تو ناصر کاظمی نے انہیں کھول دیں۔

فریڈ خانم ان کی یہ حالت دیکھ کر اٹھکرا ہو گئیں۔
فریڈ خانم نے ناصر کاظمی کی جو فرنگل گائی تھی اس کا ایک
مصرعہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے پیو جانے
میں نے انہیں آرٹھروڈ کے جلوس کے بارے میں
بتایا اور کہا کہ مقرب ایک ہنگامہ ہونے والا ہے۔
وہ بولے ”فقی صاحب ان چھوٹے چھوٹے ہنگاموں
سے کام نہیں چلے گا۔ مقرب ایک بہت بڑا ہنگامہ ہونے
والا ہے۔“

ان کا اشارہ واضح طور پر اپنی موت کی طرف تھا۔ اس
ہنگامے کے بعد پاکستان لیگی یونین نے ان کا انٹرویو لیا۔
اس انٹرویو میں ناصر کاظمی نے کہا تھا ”شاعری ایک
بہت بڑی (غل نام) کام ہے۔۔۔ میری جی میر، غالب، وارث
شاہ کا ریڈیو معاش کیا تھا؟“

ناصر کاظمی کی آواز اثر انگیز، مردانہ اور گھبراتی تھی۔
ان کی آواز میں تو حقیقی طور پر مٹا نہیں تھی۔ ریڈیو والوں
نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ناصر کاظمی نے جوش شیخ
آبادی سے ایک بہت اچھا انٹرویو کیا تھا لیکن اس کے بعد
ان کی اس خوبی سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

ناصر کاظمی کرشن گھر میں رہتے تھے مگر پھر یہ مگر مقدمہ
باز ہوئی کی وجہ سے ناصر کاظمی کو پناہ ناصر کاظمی نے اس مگر
میں سے شہر پورے اور پھول لگائے تھے۔ مگر خالی کرنے
کے بعد انہوں نے سٹے مالک سے گھر میں آکر پودوں کو پانی



گھوکا رو
مدحین
قرباں

دیتے اور دیکھ بھال کرنے کی اجازت نہ لی تھی۔ وہ چائنا ڈ
ہر روز وہاں آتے، پودوں میں پانی دیتے۔ ان کی کاٹ
چھانٹ کرتے۔ سرکشیوں میں پودوں سے باتیں کرتے
اور انہیں خدا حافظ کہہ کر چلے جاتے تھے۔

ناصر کاظمی ایک دلچسپ شخصیت کے مالک
تھے۔ کتابی چہرہ، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، کوٹ
چٹون اور ٹائی سینتے تھے۔

ایک سگ ریڈیو سے ان کی وفات کی خبر پڑی تھی۔
میکلو روڈ کے پاس ایک قبر میں لٹا کر انہیں منوں منی سے
دفن کر دیا گیا۔ ریڈیو پاکستان کے تمام اسٹیشنوں سے یہ خبر
شعری گئی۔ تمام اخباروں نے سیاہ ماحیے کے ساتھ یہ خبر شائع
کی۔ ان کا یہ شعر اس روز بہت یاد آیا۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا
قبرستان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے
فاتحہ پڑھی۔ ناصر کاظمی کی یہ فرنگل کانوں میں گونج رہی تھی۔

کون اس راہ سے گزرتا ہے
دل بونگی انتظار کرتا ہے
دھیان کی سیر جیوں پہ بچھلے پیر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
اللہ مغفرت کرے عجیب آد اور دقا۔

آخر میں پشاور سے شوکت رحمن تنگ کا خط۔ وہ ہیں بار
ایک چٹو گھوکا رو کے بارے میں معلومات فراہم کر رہے
ہیں جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ پشاور کے خطے سے جنم
لینے والے فلاکوں میں ایک معتبر نام گھوکا رو مدحین
قرباں کا بھی ہے۔ وہ معروف فنی اداکارہ سیمائی بھائی

سرگزشت

ماہنامہ

کی ایک اور قابل فخر پیش کش

خطانمبر

انسان خطا کا پتلا ہے غلطی ہماری سرشت میں داخل ہے
بڑے لوگوں کی چھوٹی اور چھوٹے آدمیوں کی ایسی بڑی غلطیاں
جنہوں نے تاریخ، وقت، زندگی اور حالات کا دھارا بدل دیا
دلوں کو چھو لینے والی سچ بیابیاں دلچسپ قصے اور انوکھی
وارداتیں ہر تحریر آپ کو حیرت زدہ کر دے گی

یہ ایک ایسا خاص شمارہ ہے جسے آپ مجلد کر کر محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

بہت جلد آپ تک پہنچ رہا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرالیں

ہیروئن ”پگلی“ کا کردار ادا کیا تھا۔ سیف الدین سیف کا
”پگل“ میں گیت ہیں ہم مجھ کے قولا کہ چلے رہی گوئی
”مجموعہ“ میں گیت ہیں ہم مجھ کے قولا کہ چلے رہی گوئی
غیر صورت قتل و نگار اور غلامی آنکھوں والی یہ
یہ پہلی اور آخری فلم تھی۔ ”مکنا“ میں سیما پر کوثر پر دیکھیں
آواز میں یہ گانا قلمبند ہوا تھا۔
”آنکھیں ملا کے خار سے دل کو مٹا دیا۔“
”مکنا“ کی تلاش کے بعد ناکم یا ڈروں میں سیما
اور کریوں پر سیما کی تصویریں چھپنے لگیں۔ دکاتوں کے
ساتھ بورڈوں پر ”مکنا“ سے لے کر سیما کی تصویریں نمایاں
ہوئیں۔ غرضیکہ سیما کے حسن و جمال کا بہت چرچا ہو رہا
پاکستان قلم انٹرنیٹ میں ایک ہی فلم سے کسی دوسری اداکارہ
کو اتنی مقبولیت شاید ملے ہی ہو جتنی شہرت ان کے لیے
آئی۔ سیما اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریب
رحمت کرے۔ آمین!

سیما کے فنی ورثے کو ان کی بھانجی مد جمین نے
آگے بڑھایا۔ پاکستان کی پہلی چٹو فلم ”سوسف خان
شیر بانو“ کی کامیابی کے بعد چٹو فلمیں بڑی تیزی سے
پھی شروع ہوئیں۔ پشاور کا ایک پارٹی نے وی ٹی وی
کے نام سے ”ماموئی“ چٹو فلم بنانے کا اعلان کیا تو اس
کے لیے مد جمین کو ہیروئن منتخب کیا گیا۔ اس فلم نے
ڈائریکٹر کا مران جے جنہوں نے فلم ”چنگیز خان“ میں
ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ سوات میں آؤٹ ڈور پر جاتے
ہوئے ”ابدارہ“ گاؤں میں ”ماموئی“ کے قلمبند کردار
کے قریبی رشتے دار کو ذاتی تھانہ کی بنا پر ایک شخص نے
کر دیا جس کے بعد فلم بنانے کا سلسلہ التوا میں چل گیا
بعد ازاں اسکاٹ لینڈ سے آنے والے فخر عالم نے ان
فلم کو مکمل کرنے کا پروگرام بنایا۔ فلم میں چند تبدیلیاں
کی گئیں۔ ہیرو کے لیے فخر الدین درانی کی جگہ دیکھل خان
منتخب کیا گیا لیکن مد جمین کو فلم کی ہیروئن برقرار رکھا گیا
فردوس جمال کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس نے چودہ سال کی
میں 80 سالہ بوڑھے کا کردار ایسا ادا کیا کہ بعد میں
ڈراموں کی اولین ضرورت بن گئے۔

مد جمین کا اصل نام شریہ ہے۔ وہ تولاہاش خانہ خانہ
تعلق رکھتی ہیں۔ وہ چودہ سال کی عمر میں فلموں کی دنیا
بن گئیں۔ ”ماموئی“ کے ہیرو دیکھل خان کا اصلی نام

ہیں۔ جنہوں نے انور کمال پاشا کی ایک فلم میں ہیروئن کا
کردار کیا تھا۔ 1978ء میں جب میرا قیام مغربی جرمنی
کے شہر فریڈرٹ میں تھا۔ ایک دن میں اپنے چند دوستوں
کے ہمراہ ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا، یہ ریسٹورنٹ ایک
پاکستانی نے ایشیائی لوگوں کے لیے اولیپا کے نام سے بنایا
تھا۔ یہاں صرف پاک و ہند کی موسیقی اردو، پشتو، فارسی کے
نغمات لی وی پر دہرائے اور سننے کو ملتے تھے۔ پاک و ہند
ہال میں بیٹے ہوئے انچ پر رکھے ہوئے بڑے سائز کے ٹی
وی پر مد جمین تولاہاش کی تصویر اور آواز ابھری اور ہال میں
رکھے ہوئے آئینوں سے مد جمین کی آواز نے ایک جادوئی
سہاں بانجھ دیا۔ دیا بر غیر میں رہنے والے لوگوں کے دل
و لیے بھی بہت کمزور ہوتے ہیں اور پھر پریس میں اپنی
زبان کا گمان کر انکھوں سے انکھوں کی لڑیاں برسی شروع
ہو جاتی ہیں اور یہی کیفیت ہم دوستوں کی بھی مل گئی۔ یہ ایک
پشتو طرحیے فوک گانا تھا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ یا اللہ
کر دے۔ گل میں نے جاناں کے دیار کے لیے جانا ہے۔
یا اللہ کج کر دے۔

شہرت، ناموری، مقبولیت اور کمال فن بسا اوقات
فکاہوں میں رعونت، بڑاچن اور تکبر پیدا کر دیتی ہے۔ مد
جمین تولاہاش ان چیزوں سے مبرا ہیں۔ ان کی شیریں آواز
ایک لمحے رس کی طرح کروڑوں دلوں میں ایک عجیب سی
کیفیت پیدا کر دیتی ہے، انہوں نے اپنے فن کے ذریعے
مقبولیت کی معراج حاصل کی۔ لوگ ان کے لیے دل اور
آنکھیں فرش راہ رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی زوردار دل، خوش خلق
اور خوش اخلاقی فن کارہ ہیں۔ ان کی شخصیت ان کے فن کی
طرح منجھی اور پختہ کش ہے۔ دنیا میں نمن جادو مشہور ہیں۔
دولت، حسن اور آواز۔ جوانی اصل جاننے کے بعد حسن تو قلم
ہو جاتا ہے۔ دولت سے انسان سب کچھ خرید سکتا ہے مگر
آواز نہیں۔ آواز کا جادو ان دونوں پر حاوی ہے۔ مد جمین
پشتو ادب و ثقافت کا ایک نمونہ ہیں۔ پشتو نہ
جاننے والے بھی ان کی آواز کی شیرینی اور مٹھاس سمجھتے
ہیں۔ انہیں بچپن سے ہی موسیقی کا جتن تھا۔ ان کے
والدین انہیں فلموں کی بڑی اداکارہ بنانا چاہتے تھے۔ مد
جمین سے قبل ان کی خالہ سیما نے فلمی دنیا میں بڑا نام کمایا۔
ڈائریکٹر انور کمال پاشا نے اپنے عروج کے دنوں میں آغا خان
اسے گل کے لیے فلم ”مکنا“ بنائی تو سیما مد جمین کے مقابلے
اس فلم میں ہیروئن تھیں۔ اس فلم میں سیما خانم نے معاون



ایک برقی رات

ابن کبیر

انتقام کسی آگ بھڑک اٹھے تو پھر کجھال نہیں بچھتی۔ وہ بھی انتقام کسی آگ ہی میں جھلس رہا تھا لیکن عقلمند تھا۔ ایک ایسا راستہ اختیار کیا کہ سب حیران رہ گئے۔

مغرب سے درآد ایک جرم کا قصہ

صبح سے عرف گری جی۔ جری مورن لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا۔ آئین دان روشن تھا۔ آگ کی زوروشی چر سے پڑ رہی تھی۔

گزشتہ ڈیڑھ ماہ کے دوران یہ تیرا موقع تھا، جب اسے دھکی آئینہ کی سیل موصول ہوئی اور اس بار بار پہلے سے سخت تھا۔

اس نے دن اٹھایا چھوڑ دیا۔ وسیع دریائے مکان میں خاموشی تھی۔ کڑی کے شیشے دھندلا گئے تھے۔ کہیں دور

اللہ اور کڑی تھا۔ پشاور کے ایک معتبر خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ قلموں کے شوق کی خاطر ان کے چچا نے انہیں قلم باموچی، میں میر و کا کردار دلایا۔ لیٹل خان کے نام سے قلموں میں آنے والے اس خوب روحو جوان نے بعد میں پشتو کی کئی قلموں ویدین و رحمہ خان، کے علاوہ کئی قلموں میں میر و کے طور پر کام کیا۔ بعد میں وہ مدجین قزلباش کے جیون ساھی بھی بنے۔ مدجین سے ان کی اولاد بھی ہوئی لیکن زندگی نے لیٹل خان کو زیادہ صہلت نہیں دی۔ ان کی بے وقت موت نے مدجین کو تنہا کر دیا لیکن انہوں نے ایک آہنی چٹان کی طرح بچوں کی خاطر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ قلم باموچی 1970 کے لگ بھگ بنی تھی۔ بد قسمتی سے یہ قلم فنی کنزرویوں کی وجہ سے بری طرح فلاب ہوئی۔ مدجین کے لیے یہ بہت دشمن وقت تھا۔ انہوں نے بطور گھوکا رو پشاور ریٹیل سے گھوکا رو کا آغاز کیا تھا۔ پشاور کی وی بیٹلر کے قیام کے بعد انہوں نے ٹیلی وڈین سے لاتعداد پشتو ہندو کو اردو ڈراموں میں بہر وین کی حیثیت سے کام کیا۔ مدجین نے ریٹیل کے علاوہ ٹی وی پر بھی گانے گائے۔ ان کی پوری توجہ موسیقی کی جانب تھی۔ ڈراموں کے عروج کے دنوں میں ہی انہوں نے اداکاری کو خیر باد کہہ دیا اور صرف گھوکا رو کی طرف توجہ مبذول کر دی۔ ان کا موازنہ گلزار بیگم، مشور سلطانہ سے کیا جائے گا۔

مدجین کے دور میں کھوکا رو انہیں میدان میں آئیں اور چلی گئیں۔ انہیں وقتی طور پر شہرت بھی لی مگر مدجین ایک چٹان کی طرح اپنے مقام پر کھڑی رہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ٹاپ پر پہنچنا بہت آسان ہے لیکن وہاں پر پہنچ کر اسے برقرار رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انہوں نے کسی بھی طرح اپنی مقبولیت کم نہیں ہونے دی۔ اپنے فن کو لوگوں سے تسلیم کروایا۔

مدجین کو جنون کی حد تک موسیقی سے لگاؤ ہے۔ انہوں نے ریٹیل شہر اری، ایس ٹی سی اور جاوید اختر سے بہت کچھ سیکھا۔ پشوالہ گھرانے کے استاد راج علی خان کی شاگردی اختیار کی، وہ بڑے فخر سے کہتی ہیں: ”میں نے ان نامور شخصیات سے گانا سیکھا جو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ان ہی کی بدولت آج موجودہ مقام پر ہوں۔“ مدجین کی آواز کے مداحوں نے انہیں ”بیل سرحد“ کا نام دیا۔ واقعی وہ اس اعزاز کی مستحق ہیں۔ 1971 کی جنگ میں ان کے ترانوں کو بہت

باہر جی خانے میں خاناں کھٹ پٹ کر رہا تھا۔
 پہلی ای میل موسم سرما کے آغاز میں موصول ہوئی۔
 پیغام ایک جیلے پر مشتمل تھا۔ ”تمہیں اپنے گناہوں کا خیرباد
 بھگتنا پڑے گا۔“

جیری نے اسے عجیبی طرح سے نہیں لیا۔ انگریز پتہ پر چل
 سازی عام ہے۔ لوگوں کو سستے سستے طریقوں سے یہ خوف بنایا
 جاتا ہے۔ انجینیئیر نہیں سے جیسے جانے والے اس پیغام
 کو اس نے کسی جگہ کی بھڑکی کوئی کوشش کرنا دیتے ہوئے
 نظر انداز کر دیا تھا۔

جس روز دوسری ای میل ملی، قصبہ برقانی طوفان کی
 لپیٹ میں تھا۔ اس نے پولیس سارجنٹ سے رابطہ کرنا
 مناسب جانا۔

پولیس ڈاؤن ریاست ہینسلوانیا کا ایک خاموش پہاڑی
 قصبہ تھا۔ وہ فلاڈلفیا سے 103 کلومیٹر دور تھا۔ وہاں زندگی
 پرسکون تھی۔ اور یہی تھی جیری کو وہاں لانی تھی۔ ایک بھر پور
 زندگی گزارنے کے بعد اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ جیل کے
 نزدیک اس نے شان دار کوئی خریدی تھی۔ تین برس بعد ہی
 اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اسے ڈاؤن کے اگلے قبرستان
 میں دفنایا گیا۔ اس کا بیٹا کچھ عرصہ تک اس کی وکالت کرتا تھا۔
 باپ جیلے میں شدید اشتقاقیات تھے۔ ڈیڑھ برس سے ان کے
 درمیان بات چیت بند تھی۔ رشتے میں آنے والی دراڑ اسے
 مطالعے کے حوالے قریب لے گئی۔ طبعی کار کا وہ زبردست
 کھلاڑی تھا۔ یہاں آتے ہی قصبے کے طبعی کلب کارکن بن
 گیا۔ چھ سات گالف کے شائق بھی مل گئے۔ وہ ہر اتوار کو ان
 کے ساتھ گالف کھیتا۔

قصبے والے جیری سے متعلق زیادہ نہیں جانتے تھے۔
 بس اتنا جانتا تھا کہ طبعی اور گالف کا یہ دلدار دو تھو جیری میں بڑس
 کرتا تھا، اب کاروبار سمیٹ کر یہاں آن بندا۔ کتابوں کا دیریا
 ہے اور کتابیں پولیس ڈاؤن کے ایک اسٹور سے خریدنے کے
 بجائے فلاڈلفیا سے بذریعہ ڈاک منگواتے تھے۔

وہ اکثر کہتے: ”بڑے مہیاں اپنی کوئی شے میں مزے کر
 رہے ہیں۔ بس باغبانی اور کتابیں کیا زندگی پائی ہے بھائی؟“
 سارجنٹ کی بھی یہی رائے تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ
 جیری کو کوئی دھمکیاں دے رہا ہے، وہ حیران رہ گیا۔ ”میں ابھی
 اپنے والد کا رونا دھونا کرتا ہوں۔“

برق کا طوفان اتنا شدید تھا کہ دونوں اہل کار کی سمیٹے
 بعد جیری کی حوصلہ شکنی ہو گئی۔ بوڑھے نے یہ تار کاٹیں مایوس

کر دیا کہ وہ اس احمقانہ پیغام کو خالی کر چکا ہے۔
 ایک اہل کار نے جیری کی کسی کچھڑا کی پیمائش
 وہ ای میل بازیافت کر لی جائے۔ کیوں کہ اس کے ذریعے
 دھمکانے والے بد معاش تک پہنچا جاسکتا ہے، تو بوڑھے مایوس
 نال گیا۔

”چھوڑ دے جی“ ہوگا کوئی دیوانہ۔ اب مجھ سے کسی کی
 کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”کیا آپ کو
 دیکھنا پسند فرمائیے؟“
 کڑا کے کی سردی تھی اور دونوں اہل کار طوفان سے
 کر یہاں پہنچے تھے۔ اس لیے انہوں نے جیری کی پیشکش
 قبول کر لی۔

☆ ☆ ☆
 ”ماضی تمہارے قہقہے میں ہے۔ وہ جلد تمہاری ہڈی
 لے لے گا۔“

جیری نے پانچویں بار یہ سطر پڑھی۔ اسے ابھی نہیں
 ہوئی۔ گزشتہ بیانات تو اس نے جتنے منکرانے ہم کر کے
 تھے مگر اس بار تو کچھ دینے والے نے اس کے ماضی کی طرف
 اشارہ کیا تھا۔ یہ شخص اسے بخوبی جانتا ہے۔

اس نے ای میل ایڈریس دیکھا۔ پھر دروازے پر
 کاغذ لٹا دیا۔ اس پر وہ ایڈریس درج تھے، جن سے گزشتہ
 بیانات جیسے گئے۔ تینوں نے حلقہ تھے۔
 کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر ریسور اٹھایا۔ وہ
 ڈاکل کرنے کو تھا مگر پھر ایک دم رک گیا۔

گزشتہ سات برس میں ماسوائے اپنے بیٹے کے اس
 نے کسی ایسے شخص کو نہیں فون نہیں کیا تھا جس کا متعلق اس نے
 بیٹے ہوئے کل سے تھا مگر ٹھیک اس لیے وہ کچھ ایسا کرنے
 تیار ہو گیا۔ وہ اپنے ایک پرانے ساتھی مائیکل کو فون کرنے
 لگا۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ای میل ارسال
 کی، جس میں وہ تین ایڈریس درج تھے جن سے اسے اس
 آجی بیانات ملے۔ وہ چاہتا تھا کہ مائیکل ان کا
 لگے۔ اسے یقین تھا کہ جلد ہی کبھی ملے جائے گی۔
 اپنے قریبی مطلقوں میں جیسے تالوئی کنگ کے ہم سے معرکہ
 تھا۔

اس نے ایک جام بنایا۔ پھر اچانک کچھ یاد آیا۔ وہ
 نکک گیا۔
 ”ہیلو۔ فلاڈلفیا ایک اسٹور؟ جیری مورن بات کر

ہوں۔ میں نے سٹونی شیلٹن کا ایک ٹاول آرڈر کیا تھا؟“
 بوڑھے کے ہاتھ میں جام تھا۔ پولیس ڈاؤن میں برف
 گر رہی تھی۔ سیلوں اور بیٹھے مائیکل کی اٹھیاں کی بوڑ
 پر حرکت کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆
 ”آہ، کتنے برس بعد رابطہ ہوا۔ کسی نے بتایا تھا کہ حالیہ
 دنوں میں آپ نے کچھ پرانے دوستوں سے رابطہ کیا ہے۔
 خیر، آپ نے آئی ڈی کے بارے میں پوچھا ہے۔ میں نے
 جہاں چین کی ہے۔ یہ تینوں آئی ڈی تین الگ الگ آدمیوں
 نے بنائی جو ملک کی مختلف ریاستوں میں بستے تھے۔ مزید
 معلومات حاصل کی تو ایک حیران کن انکشاف ہوا۔ وہ تینوں
 ہی کچھ برس قبل ایک انسانی حادثے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔“
 بوڑھے نے جام کا کھونٹ لیا۔ پھر سے پرتاؤ تھا۔ اس
 نے مزید نہ کہا۔

”کو آپ نے اس چھان بین کی وجہ بیان نہیں کی مگر
 مجھے یقین ہے کہ معاملہ عجیب ہی ہوگا۔ میرے خیال میں آپ
 کا سامنا ایک شاطر آدمی سے ہے جو تین بد قسمت انسانوں کی
 آئی ڈی استعمال کر رہا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو
 بھی ایک فون کر دیجیے گا۔ نیاز مند حاضر ہو جائے گا۔ اور
 سنا میں، ان دنوں کوئی کسی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ ایک اسٹور
 سے خریدتے ہیں یا بذریعہ ڈاک منگواتے ہیں؟ ویسے آج کل
 آپ کہاں مقیم ہیں؟“

بوڑھا مسکرایا۔ ”تم بالکل نہیں بدلے مائیکل۔“
 اس نے اپنے پرانے بااقتدار ساتھی کو یاد کیا جو ہمیشہ کچھ
 نہ کچھ جاننے کے لیے مضطرب رہتا تھا اور اس لیے اسے یہ
 بات پریشان کر رہی تھی کہ جیری مورن کہاں ہے۔
 بوڑھے نے جام کا ایک اور کھونٹ لیا۔ مائیکل کے
 حوالے سے وہ مطمئن تھا۔ اگرچہ وہ کچھ بڑا کیچڑ تھا مگر اس
 کے ساتھ وہ جیری کی بھی محبت کچھ نہ کچھ تھا۔ اگر کوئی ای میل
 آئی ڈی کے ذریعے اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا، تو بتائے
 بیٹھنا ان کے اس خاموش قصبے کے وہ اوتاری کے کسی بھرے
 گئے شہر جا لگتا۔ وہاں کسی تارک مارت کے چھوٹے سے
 قہقہے میں اسے وہ شخص قتل جاتا جس نے ای میل اکاؤنٹ
 بنایا تھا مگر اس شخص کو دھوکا لگا دیا تھا جو آج اسے استعمال
 کر رہا تھا۔

جیری کی احتیاط پسندی قابل فہم تھی۔ یہ اکاؤنٹ ہی وہ
 اکاؤنٹ ذریعہ تھا جس کے ذریعے وہ اپنے ماضی سے جڑا ہوا تھا

ورنہ وہ ہر رابطہ منقطع کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

فون بجایا۔

دوسری طرف فلاڈلفیا ایک اسٹور کا منیر تھا۔ ”مسٹر
 جیری مورن؟ آپ نے سٹونی شیلٹن کا جو ٹاول آرڈر کیا تھا،
 وہ آج روانہ کر دیا جائے گا۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں برف گر
 رہی ہے۔“

”دوست سنا ہے۔“ اس نے گرون ہلائی۔ ”موسم خاصا
 خراب ہے۔“
 ”اگر طوفان رکاوٹ نہیں بننا تو امید ہے کہ برسوں تک
 کتاب آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ ویسے جناب۔ ایک بات
 پوچھ سکتا ہوں؟“

”جی ضرور۔“ بوڑھے نے کہا۔
 ”یہ کتاب تو آپ کو پولیس ڈاؤن میں بھی یہ آسانی مل
 جائے گی۔ پھر ڈاک خرچ اور انتظار کا بھگت کبوں؟“
 ”کچھ مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ ایک اسٹور سے کتاب
 خریدنا مجھے بھی پسند نہیں رہا۔ ہمیشہ ڈاک ہی کے ذریعے
 منگوائی۔ پرانی عادت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا آپ کو اس پر
 کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں جناب، ہمیں کیوں اعتراض ہوگا۔“ منیر نے
 خوش دلی سے کہا۔ ”ڈاک کے ذریعے کتاب منگوانے کی
 عادت ضرور بچپن میں پڑی ہوگی۔ میرے والد کا بھی یہی
 معاملہ تھا۔“

”کیا آپ جانتے ہیں۔“ وہ ماضی میں چلا گیا۔ ”جو
 کتاب میں نے آرڈر کی ہے، وہ سٹونی شیلٹن کا پہلا ٹاول
 ہے۔ اس خریدنے مجھے گرویدہ بنالیا تھا۔ میں نے اپنی ذاتی
 کاپی پر اس کا انوکراں بھی لیا۔ انیسویں صدی کا یہ مجھے سے خالص
 ہوگی۔ خیر، میں کتاب کا شہرہوں کا شکر ہے۔“

جیری کڑکی میں آن کڑا ہوا۔ طوفان کی شدت اب کم
 ہو چکی تھی۔ باہر تار کی پھیل رہی تھی۔ اسے فلاڈلفیا میں واقع
 اپنا گھڑی اپارٹمنٹ یاد آیا، جس کا ایک حصہ کتابوں کے لیے
 وقف تھا۔ چار ہزار کتابیں پلٹے سے حلیف میں تھی۔ بچپن
 میں یہ لت پڑی۔ پہلے اگھا کڑکی کے ٹاولوں نے گرویدہ
 بنایا، پھر سٹونی شیلٹن کے بحر میں آگیا۔ اس کے تمام ٹاول
 اس کے پاس تھے مگر ایک روز اچانک۔ اسے اپنی لاہریری،
 اپنا قہقہ، اپنا شہر پرشے چھوڑی پڑی۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو
 مصائب اسے بکڑ لیتے۔

کچھ عرصے وہ ایک بدکردار سرائے میں رہا۔ اس کے تمام بچک اکاؤنٹ منجمد ہو گئے تھے۔ البتہ ایک اکاؤنٹ کا دشمنوں کو مطلع نہیں تھا۔ وہ اس کی بہن کے نام پر تھا۔ اپنی کالی کا بڑا حصہ اسی میں رکھا کرتا۔ بچک بھر جبری کا دوست تھا۔ اس نے خاموشی سے آدمی رقم لکھوائی۔ بڑی کا ہاتھ تھا اور اس سرسبز اور خاموش جیسے میں کھپتی گیا جہاں نئی زندگی بھر رہی۔ ہوا کا زور دار جھڑکن کی سے گر لیا۔ جبری کو حال میں لوٹ آیا۔ ہاں میں آہٹ ہوئی۔ خاناں ماں دروازے پر کھڑا تھا۔ "کچ تیار ہے۔"

"ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ وہ دھکی آئینہ پیٹات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ "مجھے سارا جنٹ سے رابلہ کرنا چاہیے۔"

یہ خیال اس نے فوراً ہی رد کر دیا۔ "جیس۔ اگر اس نے میرے نامی سے حلقہ چاہتا تھا تو میں کیا جواب دوں گا۔ مجھے کسی پر اتنے سے سرائے رسائی مدد ملنی چاہیے۔"

ایچانک اس نے اپنے خاناں ماں سے سوال کیا۔ "تم کسی سرائے رسائی کو جانتے ہو؟"

"جی نہیں؟" وہ چونکا۔ "جی میں تو نہیں۔ البتہ شاید ہمارا کارڈ وکس جانتا ہو۔ پہلے وہ ایسی ہی کسی تھی جسے چوکیدار تھا۔"

"ہوں۔ اے سمجھو۔"

☆ ☆ ☆

قلاؤنڈا پر سرد شام اتر رہی تھی۔

ڈبلیو ایچ کسٹنٹ فرم میں فون بجنا۔ یہ ایک کشادہ دفتر تھا، جو مرکزی شاہراہ پر واقع شیرالکو لیمارٹ کی پارہویں منزل پر تھا۔

"ڈبلیو ایچ کسٹنٹ فرم۔ میں آپ کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

فون اٹھانے والے واہن ویگل کو ایک بوڑھی عمر بڑا آدمی آواز سنائی۔ "مجھے ایک معاملے میں آپ کی مدد درکار ہے۔"

"ہم اسی لیے یہاں بیٹھے ہیں جناب۔ فرمائیں کیا واقعہ ہوا ہے؟"

"مجھے ایک سرائے رسائی درکار ہے۔ ایک قابل سرائے رسائی۔"

"جے فکر ہیں۔ شہر کے بہترین سرائے رسائی ہمارے

رابطے میں ہیں۔ اپنا پتا تمہیں کیا فرماؤ جناب بریٹس ڈون؟"

اس کی انگلیاں جبری سے کی پوڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے کپڑا سرکین پر پوئیس ٹاؤن کا نقشہ چسک رہا تھا۔

"پوڈ میں ہے سیکورٹی ڈور ہے۔" اسکرین پر موسیقی اپ ڈیٹس بھی آ رہی تھیں۔ "اور شاید اچھی وہاں برف کر رہی ہے۔ اچھا معاملہ کیا ہے؟ اور کوئی آپ کو دھمکیاں دے رہا ہے۔ اکی ٹیل کے ذریعے۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ اپنا نمبر لکھوا تمہیں۔"

"میں اس ایجنسی کیش میں کروں گا۔" جبری کی آواز دور سے آتی معلوم ہوئی۔

"کیش میں؟" واہن سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی فرم شہریوں اور نجی اداروں کو سرائے رسائی کی خدمات فراہم کرتی تھی۔ وہ مختلف سرائے رسائی اداروں سے رابطے میں رہتا۔ آرڈر پکارتا کیس کی نوعیت کے مطابق سرائے رسائی کا انتخاب کرتا۔ کیس حل کرنے کے بعد وہ اپنی فیس کا پندرہ فی صد واہن کو دینے کا عہد کرتا۔

وہ ایک شاطر اور پارسو آدی تھا۔ سبھی اگر سیدھی دلی سے نہیں نکلتا تو اچھی نمبر کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ اس سے رابطہ کرنے والے فقہ اپنے مگر میں ہونے والی چوری، آفس کے کھیلے یا دھکیلے آئینہ فون کال کا مسئلہ کروانے کے منتظر نہیں ہوتے تھے۔ کچھ لوگ براہ راست غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہوتے اور اچھے کاروباری آدمی کی طرح واہن ان سے بھرپور تعاون کرتا۔

"کوئی مسئلہ نہیں جناب۔" پالا خراس نے کہا۔ "کیش بھی چلے گا جس فیس تمہاری بڑھ جائے گی۔"

"اس کی پروا نہیں۔" پوڈ سے لے کر آواز فون پر کھڑا تھا۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد واہن نے مورگن کسٹنٹ کا نمبر ڈائل کیا۔ مورگن کو فیلڈ میں آئے چند ہی برس ہوئے تھے۔ یہ ظاہر وہ ایک لامباٹی نو جوان تھا مگر اسی کی کارکردگی شان دار تھی۔ البتہ جبری مورگن کا کیس اُسے سوچنے کا سبب تھا اس کی قابلیت نہیں تھی۔

مورگن کا حلق کارکن کاؤنٹی سے تھا اور پوئیس ڈون اسی کاؤنٹی کا حصہ تھا۔ دو مہینے قبل اُسے مورگن کا پیغام موصول ہوا کہ اگر کارکن کاؤنٹی کا کوئی کیس آئے تو اسے ہی سونپا جائے۔ اسی بہانے وہ اپنے آبائی علاقے کا پکر لگا لگا۔

"سیلو مورگن کسٹنٹ بول رہا ہوں۔" نو جوان کی بڑا احتیاد آواز اس کی ساتھیوں سے گر لائی۔

"تمہارے لیے خوشخبری ہے لڑکے۔" واہن چپکا۔

"تمہاری کاؤنٹی سے ایک کیس آیا ہے۔ تم نے کہا تھا نا؟"

"بہت خوب! ہاں! آپ سمیت میں نے چند دوستوں سے اس معاملے میں درخواست کی تھی۔ ویسے کیس کیا ہے؟"

"جے فکر ہو، یہ کل ہونے والی ایک ڈسکی کا معاملہ نہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "معمولی کیس ہے۔ ایک صاحب ہیں جبری مورگن۔ انہیں کوئی دھمکیاں دے رہا ہے۔ بڑے میاں سے بھڑکی فیس لینا اور کچھ دن کاؤنٹی میں آرام کرنا۔"

"اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے اُن کا ایڈریس بتائیں۔" مورگن نے کہا۔

ایڈریس سمجھانے کے بعد واہن نے کہا۔ "یوے میاں جلدی میں گتے ہیں مگر تم کل صبح ہی روانہ ہونا۔ ٹھگے موسمیات کے مطابق آج رات پوئیس ٹاؤن میں برف کا طوفان آنے والا ہے۔"

"کل کا دن ہی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی مجھے برف باری سے نفرت ہے۔" مورگن نے دھیرے سے کہا۔

واہن سے بات کرنے کے بعد اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ "سیلو میں مورگن کسٹنٹ بات کر رہا ہوں۔" مجھے ایک گاڑی چاہیے۔"

☆ ☆ ☆

وہ اسرار دات تھی۔

برف سے ڈھکے درختوں کے جھنڈ میں تاریکی حرکت کر رہی تھی۔ تیز ہوا جب درختوں کے سچ سے گزرتی تو ایک جچ میں تبدیل ہو جاتی۔

ڈنر کے بعد جبری آرام کری پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ مکان میں بالکل تنہا تھا۔ خاناں ماں اپنے گھر جانے کا ایک ایک آہٹ ہوئی۔ وہ جبری سے پلاٹا۔ ڈور تاریکی میں کوئی کھڑا تھا۔

"کون ہے؟" وہ چٹایا۔ "اوہ وکس، گدے یوں خاموش کیوں کھڑے ہو؟"

"جناب، وہ میرے ایک دوست کی طبیعت خراب ہے۔ مجھے اس کی عیادت کے لیے جانا ہے۔" وہ منہ نیالا۔

"تمہارے دوست کی طبیعت خراب کی رات ہی کیوں خراب ہوتی ہے؟" پوڈ حاسکرایا۔ "کسی لڑکی کا پکر تو نہیں؟"

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

طائر جلاوطن

کے زمانہ انگریز سرافراز قلم کا نیا شاہکار

ستاروں پر کمند

چاہتوں کو درد و ہام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہو نیاں بھی کبھی بھی ہو جاتی ہیں۔ روزوں کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے انہیں وہاں بنا دیتے ہیں جس وقت اور طاقت اور طاقت کی چاشنی کے لیے ایک دل پر باداستان

سہ ماہیہ

کے صفحات پر شاہ جولائی 2014 سے ملاحظہ فرمائیں

”لڑکی... وہ نہیں... وہ تو...“ دھکس پڑھ لگایا۔

”تم اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اس نے دو ٹوک الفاظ میں سوال کیا۔

دھکس خاموش کھڑا رہا۔ یوڑے نے جب سے کچھ پیسے نکالے۔ ”یو۔ آج کی رات اپنے دوست کی عیادت میں صرف کرو۔ اور کھانا شراب پینے سے خود کو باز رکھنا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ دھکس نے جھکتے ہوئے کہا۔ ”میں جلد لوٹ آؤں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کوٹ کی جیب چھینٹائی۔ اس میں ایک پائل بھی آخری بار اس پائل کا استعمال یوڑے نے نو برس قبل کیا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے تک وہ کتاب میں ڈوبا رہا۔ اس اشیا میں ملوان میں شدت آگئی۔ برلانی جھگڑا ملنے لگا۔

کتاب ختم کرتے ہی اسے ایک بکھڑا پایا۔ اس نے اپنے بیٹے کو فون کیا۔ دوسری طرف سے دیکھا تو ٹک سٹائی دی۔

”میں میگا تیرا پانچ بات کر رہا ہوں۔ اس وقت میں گھر نہیں۔ میرے صہریائی اپنا بیٹا ہمہ گیر کر رہا ہے۔“

”پانچ۔“ یوڑے صاف صبر سے بڑبڑایا۔ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”تم اپنے باپ کا نام اپنے ساتھ لگنا پسند نہیں کرتے۔ اور یہ قابل فہم ہے۔ البتہ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی ماں کا نام چنا۔ تمہاری طرح میں بھی اسے بہت یاد کرتا ہوں۔ اس کے بغیر زندگی کتنی اجاڑ اور دھوری ہے۔ میں نے تمہیں سالگرہ مبارک کہنے کے لیے فون کیا تھا پیارے۔ اچھا الوں۔“

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ بہت مغموم تھا۔ جیسے ہی یوڑے نے فون رکھا، دروازے کی گھنٹی بجی۔

اس کے جسم میں سسکی دوڑ گئی۔ ہاتھ جیب تک گیا۔ پائل برف کی طرح سرخ ہوئی۔

☆☆☆☆

”کون ہے؟“ یوڑے کی آواز مکان میں گونجی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے پین ہول سے جھانکا۔

باہر فٹہ تاریکی اور برف تھی۔ اسے بے چینی محسوس ہوئی۔ پائل پر گرفت مضبوط ہوئی۔

ایک ایک دھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

”شاید ہوا کا جھگڑا تھا۔“ جی بی بیڈ لیا۔ کڑکی سے باہر جھانکنے پر اسے باغ برف سے ڈھکا نظر آیا۔ سڑک پر گاڑی

کے پیوں کے نشان تھے۔ یکدم ڈور بٹل چٹائی۔ وہ تیزی سے دروازہ کھینک گیا۔

”کون ہے؟“ اسے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی۔ پین ہول سے جھانکنے پر اسے ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے اوپر کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ہیٹ تھا۔ تاریکی کے باعث چہرہ کھربکھریاں آ رہا تھا۔

”میں ایک سراغ رسا ہوں۔ ڈیوڈا کی کسٹنٹ فرم کی طرف سے۔“ آدمی نے اوپلی آواز میں کہا۔

اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔ اب وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ نیلی آنکھوں والا ایک نوجوان تھا۔

”مسٹر جیری مورن۔“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”میں میگا تیرا کیڈی۔“

”اوہ۔“ میگا تیرا اچھا۔“ یوڑے کا دھیان اپنے بیٹے کی طرف چلا گیا۔

”کیا میں اندازہ کر سکتا ہوں؟ یہاں بہت خفہ ہے۔“ ضرور ضرور۔ دراصل میں آپ کی اتنی جلدی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔“ وہ سنبھل چکا تھا۔

اس نے دو جام بنائے۔ آتش دان میں کچھ ٹکڑیاں ڈالیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئے۔ سامنے بیٹھے تھے۔

”مجھے مسز وائس نے بتایا کہ آپ کو دھکی آمیز ای میل موصول ہوئی ہیں۔“ اس نے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

”درست۔“ یوڑے نے گھونٹ لیا۔ ”مگر اس سے پہلے کہ میں اپنا مسئلہ بیان کروں، میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے پاس میں بتاؤ۔“

”ضرور۔“ نوجوان نے ہاتھ رگڑے۔ ”میرا تعلق نیو جرسی سے ہے۔ میں گزشتہ چار برس سے اس لینڈ میں ہوں۔ پہلے میں ویلک بیٹھا جاتا تھا مگر ٹیڈ کی نامکافی موت کی وجہ سے یہ خواب ادا ہوا رہ گیا۔ سراغ رسائی سے دلچسپی اس جانب لے آئی۔“

”جی آئی ہو جاتی ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”گزارہ ہو جاتا ہے جناب۔“ نوجوان مسکرایا۔ ”پھر اچھی بات یہ ہے کہ مجھے یہ کام پسند ہے۔“

”تمہارے والد کا انتقال کیسے ہوا؟“

”ایک ٹریفک حادثے میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھ بیٹھے۔“ نوجوان کی آنکھوں میں ماضی کی پرچھائی تھی۔ ”اگر زخمی ہوتے تو اس وقت آپ کی عمر کے ہوتے۔“

دان شور

بہت دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں اپنے ایک سب ایئر دوست کے ساتھ اخبار کے دفتر میں بیٹھا کپ شپ کر رہا تھا۔ ایک صاحب غصے میں بچرے تخریب لائے۔ صورت سے بڑے گھسے معلوم ہو رہے تھے۔ چہرے سے خرافات اور زبانت کھڑی تھی۔ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں پائپ تو دوسرے ہاتھ میں ایک خوبصورت بریف کیس تھا جو غالباً کتا بوں اور کاغذوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ٹیک آٹھوں پر گئی تھی تو دوسری ٹیک گئے میں ٹنگ رہی تھی۔

موصوف میرے دوست سے مخاطب ہوئے۔ ”آپ نے آج کے اخبار میں میرا مکمل بیان شائع نہیں کیا ہے۔“

سب ایئر نے تخریبیوں کیا۔ ”جناب! ٹیک کی گئی کے باعث آپ کا بیان مکمل شائع نہ ہو سکا ہوگا۔“

”ٹیک کی گئی دوسروں کے لیے ہو سکتی ہے میرے لیے نہیں۔“ موصوف نے اسی غصے میں کہا۔

”میں نے آپ کو کچھ ناخوش جناب والا کی تخریب۔“ میرے دوست نے اپنی لاشی کا اظہار کیا۔

”آپ مجھے نہیں جانتے؟“ موصوف نے حیرت کا اظہار کیا اور سینہ پھلا کر فرمایا کہ ”میں اس شخص کا ایک بہت بڑا دان شور ہوں۔“

”دان شور؟“ ہم دونوں نے ایک ساتھ دہرایا۔

”جی نہیں دان شور ہوں۔ کسی مسئلے پر اور کسی بھی اہم واقعے پر میری رائے لی جاتی ہے۔ میرے خیانات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ میں یوں سمجھ کر سمجھ رہا ہوں۔“ موصوف نے ہمیں کھنکھایا۔

موصوف کے سمجھانے کے باوجود ہماری کچھ میں نہ آیا کہ دان شور ہے کیا بلا؟ میں نے اپنی کم علمی کا اظہار کیا۔

”معاف فرمائیے دان شور اب بھی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔“

موصوف نے عقارت سے ہمیں دیکھا اور سب ایئر نے گویا ہوئے۔ ”معلوم نہیں کس نے تمہیں اس کرسی پر بٹھایا ہے۔ دان شور کے معنی نہیں جانتے اور سب ایئر بنے بیٹھے ہو۔ دان شور کو انگریزی میں (INTELLECTUAL) کہتے ہیں۔“

”دان شور؟“ یعنی ان کی مراد انشور ہے۔“ میں نے سوچا۔

انتہاس: دان شور از عابد معمر

دان شور

”میں کر دکھ ہوا۔“ یوڑے نے دھیرے سے کہا۔

”ویسے میرا بیٹا بھی اکیل ہے۔“

”شان دار کیا وہ آپ کے ساتھ رہتا ہے؟“

”نہیں، وہ دوسرے میں ہے۔“ یوڑے حاشا مغموم ہو گیا۔

دان شور

”آج اس کی سالگرہ ہے۔“

دان شور

”اگر ان سے بات ہو تو میری طرف سے انہیں سالگرہ مبارک ضرور کہیے گا۔“

دان شور

”ضرور۔“ جی بی سکریا۔ اُسے یہ نوجوان اچھا لگا۔

دان شور

”اب کام کی بات کرتے ہیں۔“ وہ سیہ حاکم ہو کر بیٹھ گیا۔

دان شور

جی بی نے اسے دھکی آمیز بیانات سے متعلق بتایا۔

دان شور

اپنے دوست مائیکل کا تذکرہ کیے بغیر اس سے حاصل ہونے والی معلومات سے لڑکے کا گھوٹا۔

جی بی نے اسے دھکی آمیز بیانات سے متعلق بتایا۔

”کیوں کتا بی دھکیوں میں وہ آپ کے ماضی کا ذکر کر رہا ہے اور جہاں تک اس ناؤن کے کیتوں کا تعلق ہے وہ

آپ کی گزشتہ زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے،
 ہاسوائے اس کے کہ آپ نیوجرسی میں تجارت کرتے تھے۔
 اس نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ ”آپ کے ٹیلی
 فون ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں سوائے
 اپنے بیٹے کے آپ نے کسی ایسے شخص سے رابطہ نہیں کیا، جس کا
 تعلق آپ کے ماضی سے ہو۔“
 تیز ہوا میں ایک چیخ سنائی دی۔ چیری کے جسم میں سسنی
 دوڑ گئی۔ ”تم نے میرے فون ریکارڈ نکھال لیے۔ یہ غیر قانونی
 ہے۔“

”جناب میں ایک سرخ رساں ہوں۔ کسی معاملے کا
 قانونی اور غیر قانونی ہونا میرا موضوع نہیں، میرا مقصد تو فقط
 آپ کا مسئلہ حل کرنا ہے۔“ اس نے ایک لمبے کا وقت کیا۔
 ”ساتھ ہی میں ایک ایمان دار شخص ہوں۔ یہ میرے والد کی
 تربیت کا اثر ہے۔ ورنہ کون اس قانونی رات سبکو مل کر کاغذ
 ملے کر کے اس خاموش قصبے آیا۔ بار میں بیٹھ کر آپ کے
 بارے میں معلومات اکٹھی کرتا، ٹیلی فون ریکارڈ نکھواتا۔“
 چیری گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”تم
 مجھے حنا کر کے میں کا سبب رہے تو جہان۔“

”شکریہ تو اب ضرور مکمل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ
 سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اگر میں لٹاؤ نہیں ہوں تو آپ تہادت کی
 الف بے سے بھی آگاہ نہیں۔ نیوجرسی کے بارے میں آپ
 خاک نہیں جانتے۔ آپ کا تعلق فلاڈلفیا سے ہے۔“
 مجھڑ پوری قوت سے دہرایا۔ ”گھریا۔ چیری کرسی سے
 اچھل پڑا۔ غیر شعوری طور پر ہاتھ جیب میں دیکھ گیا۔
 ”تم۔“ وہ بکھلایا ہوا تھا۔

”شانہ رہیں جناب۔“ نوجوان نے صوفے کی
 پشت سے ٹپک لگائی۔ ”مجھے دکھ ہے کہ میں نے آپ کو یوں
 چونکایا۔ براے سہرا بھی مجھے وضاحت کرنے دیں۔“
 یوزمے کی آنکھوں میں شہادت تھی۔ وہ گہری آنکھوں
 سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“
 ”کیا مطلب؟“ حیران ہونے کی باری اب نوجوان
 کی تھی۔

”میں نے باہر برف پر جائز کے نشانات دیکھے تھے مگر
 دودھ کو کھولنے پر مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ تم پیدل تو یہاں
 نہیں آتے ہو گے؟“
 ”بلاشبہ میں پیدل نہیں آیا۔“ وہ بالکل مطمئن تھا۔

”میں نے اپنی گاڑی درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کی ہے
 آتی برف باری میں اسے کچلے آسمان تلے چھوڑنا نثری حواش
 ہوتی۔“

”کیا واقعی؟“ یوزمہ حنا کر کھڑکی تک گیا۔ برف کی
 دیوار کے پیچھے۔ جھنڈ میں اسے ایک گاڑی کا ہیولہ نظر آیا۔
 وہاں سونے پر آکر بیٹھ گیا۔
 ”تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ میرا تعلق نیوجرسی سے نہیں
 فلاڈلفیا سے ہے۔“

وہ مسکرایا۔ ”ایک اچھا سرخ رساں چیزوں کا پارک
 بنی سے جائزہ دیتا ہے جناب۔ میرے نزدیک آپ کے ماضی
 میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ جو آدمی اپنا ماضی چھپاتا چاہتا ہے، وہ
 جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ آپ نے اپنا تعلق نیوجرسی سے
 ظہر کیا۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب ہے کہ آپ کا تعلق امریکا
 کے کسی اور شہر سے تو ہو سکتا ہے مگر نیوجرسی سے قطعی نہیں
 ہو سکتا۔ پھر آپ سے ایک پوچھ ہوئی۔ نیوجرسی میں خطرناک اور
 گالف بھی مقبول نہیں رہے۔ آپ کا تعلق فلاڈلفیا سے
 ہے۔ اس کے وجوہات ہیں۔“

چیری اوجھ سے کن رہا تھا۔
 ”پہلا جھوٹ تو فلاڈلفیا ایک اسٹور کی جانے والی فون
 کاٹر ہیں۔“ اس نے کاغذ کا پرزہ نکھال لیا۔ ”اور دوسرا جھوٹ آپ کا
 گالف کپ ہے، جس پر فلاڈلفیا کے ایک کلب کا لوگو تھام ہے۔
 اب آپ یہ تو نہیں پوچھیں گے کہ میں نے وہ کیپ کب
 دیکھا۔“

یوزمہ اب نہ سکون تھا۔ ”جس کھوئی پر تم نے اپنا کوٹ
 لٹکایا وہ ہیں میرا ایک رنگ تھا۔ درست؟“
 ”بالکل درست!۔“ وہ مسکرایا۔ ”تو چلیں، آپ کے
 ماضی میں پچھلے ہیں، تاکہ ہم اس بد معاش تک پہنچ سکیں۔“

☆☆☆☆

”میں ایک قاتل ہوں۔“ اس نے کہا۔ پھر باہر کی طرف
 دیکھا۔ برف باری تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کی خوشبو آوازوں میں
 تسلسل آ رہی تھی نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے لگا
 تھا ایک مسکراہٹ۔ تم درست ہو۔ میں نے ساری زندگی
 فلاڈلفیا ہی میں گزار دی۔ کیا تم نے کبھی کراٹا نام سنا ہے؟“

”کب کب؟“ نوجوان نے نام دہرایا۔ ”فلاڈلفیا میں
 روشت کی علامت۔ شراب کا سب سے بڑا بیرونی پاری۔ جسے
 کے اڑے چلانے والا۔ آغوا اور مکمل کے کئی معاملوں میں

ماں

چھوٹا سا لفظ ہے ماں نہ مطمئن تھی تعریفیں اس لفظ پر کر چکا ہوں کوئی کتنی نہیں لیکن جب کبھی بھی یہ لفظ زبان پر آیا اس
 لفظ کی لمبائی پائیداری کی معنی ”مطمئن“ کی آیات کئے واقعات کئے بھلائی اس ایک لفظ میں ہیں۔ ایک عظیم ہدف ہے
 جس رخ سے جائیں بات کریں۔ اس ایک لفظ کو اگر ہم قرآن کی آیات کی روشنی میں دیکھیں تو قرینہ آئینہ دل زور میں
 دیکھیں عظمت کے ساتھ موجود ہے لیکن ظاہر سے قرآن سے بڑی کتاب تو دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ قرآن میں ماں
 کے بارے میں کوئی تفصیل کوئی پرانا واقعہ نہیں ملے گا مگر آیت ”مطمئن ہوئی قرآن میں ایک دو آیتیں ہی ماں کے موضوع
 پر موجود ہیں لیکن یہ مختصر سا ذکر بھی قرآن میں حیران کر دیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات میں جاہلیت کے ماں کی
 مکمل تصویر ہے۔ اللہ اپنے حبیب پر آیتیں اتار رہا ہے۔ سورہ قصص میں ارشاد ہے ”ہم نے باور ہوئی پر وہی کی۔“ ماں
 کتنی عظیم ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء پر وہی کرنے والا ماں پر بھی وہی کرتا ہے ماں کا مقام دیکھیں۔

”اتقوا ماں“ ”ماں از ملامہ و از مکر خیر اختر نفوی

لوٹ۔ اتنا شاطر کہ کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔ انتہائی
 بارسوخ۔“

”اپنی تعریف سن کر اچھا لگا۔“ یوزمہ مسکرایا۔ ”ماں میں
 ہی ایک بکر ہوں، جس کا نام سننے ہی ذہن قمر قمر کا پتہ لگتے
 تھے۔“
 نوجوان نے پہلو بدلا۔ ”پھر ایسا کیا ہوا کہ بک بکر
 اچانک دوپوش ہو گیا؟“

”اس کا سبب ایک پولیس افسر تھا۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔
 ”میں ایک فحاشت پسند، جھنجھب یافتہ اور کتاب دوست
 شخص ہوں۔ میرے کام کرنے کا طریقہ بہت صاف سہرا
 تھا۔ پولیس بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کے لیے میں نے
 رشوت کا بھی سہارا لیا۔ مگر پھر ایک پولیس افسر نے مجھے جیل
 پہنکانے کی ضمان لی۔ مجھے کہتے وہ کہ وہ بہت ذہین اور
 باصلاحیت تھا۔ جب وہ قانونی طریقے سے مجھ تک نہیں پہنچ
 سکا تو اس نے میری ہی تکنیک اپنائی۔ رشوت کا سہارا لیا۔
 میرے ہی آدمیوں کو خرید لیا۔ تمام جھوٹ حاصل کر لیے
 افسر۔“

”اور آپ نے اسے لٹکانے لگا دیا۔“ نوجوان نے اس
 کی بات کاٹ دی۔ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ”کیا آپ اور جام لینا
 پسند کریں گے۔ ماضی کے تذکرے کے دوران سرخ واٹن
 بھرتن ہے۔“
 یوزمہ مسکرایا۔ ”میرے پیارے میاں یہ تو تم کتنے ذہین
 آدمی! سرخ واٹن مجھے پسند ہے۔“

نوجوان ہارنک گیا اور جام بنانے لگا۔ کھڑکی سے اس
 نے چھوٹے لٹکر والی۔ پھر اپنی نشست پر ابٹیں آگیا۔

”فکرے لوگے۔“ چیری نے کہا۔ ”تو میں تمہیں بتا رہا تھا
 کہ اس ڈھنڈھ شخص نے جھوٹ حاصل کر لیے۔ جب مجھے پتا
 چلا تو میں آگ بگولا ہو گیا۔“

اس نے بڑا سکھوت لیا۔ ”اور میرا خضر قابل فہم تھا۔
 وہ مجھے بڑا دکرنا چاہتا تھا۔ ذرا تم ہی بتاؤ، کیا جرم کی دنیا میں
 جگہ بنانا آسان ہے؟ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔
 باپ اوائل عمری میں چھوڑ کر چلا گیا، بیماری کے آسیب
 نے میری ماں کو کھل لیا، میں نے سڑکوں پر زندگی گزار دی۔ جرم
 کی دنیا میں نام بنانے میں بہت وقت اور محنت لگی ہے۔ میں
 آسمان پر پہنچ گیا تھا، مگر وہ بد بخت شخص مجھے پھر سے سڑک پر
 لانا چاہتا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ
 اسے دانتے سے بٹا دوں۔“

اس نے گلاس ہڈیوں سے لگایا۔ ”لیکن اس بار بھی
 میں نے ایک صاف سہرا طریقہ اختیار کیا۔ ایک سادہ سا کار
 حادثہ بس!۔“
 ”مگر اسے راستے سے ہٹانے کے باوجود آپ کو
 فلاڈلفیا چھوڑنا پڑا۔“ سرخ رساں نے کہا۔ ”ویسے اس امر کا
 نام کیا تھا؟“

”اس کا نام؟“ چیری نے ذہن پر زور ڈالا۔ ”شاید
 ویل جیکسن یا شاید نورمن جیکسن۔ مجھے یاد نہیں۔“ اس نے
 گلاس خالی کر کے بیڑ پر رکھ دیا۔

”مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ اس کی ٹیلی آنکھوں میں ہلکا
 اندھا تھا۔ آج اس کے بارے میں سوچ کر ہی مجھے ہماری
 پن محسوس ہو رہا ہے۔ بے شک میں نے اسے لٹکانے لگا دیا مگر
 وہ تمام جھوٹ پہلے ہی میرے حوالے کر چکا تھا۔ بہت ہی

مہینہ منبر گزشت

ی۔ محمدی دہرائی۔
[10] جولائی 2014ء

ملوثات ہیں۔ اس نے چند نام گنوائے اور ان میں سے

زیادہ تر تجسس عمل اُن کے لیے آپ کا ماسی بازیافت کرنا
جولائی 2014ء

الوداع

حسن درازقی

اپنی قومی ایترا لائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایترا لائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اہل اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے خوشہ خالص



ہوگی۔ پوچھنے لگے۔ ”ہو یا شاہ کہاں کا قصد (قصد) ہے۔“
”بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کھانا کھاؤں گا پھر لندن شہر گھوموں گا۔“ میں نے جواب دیا۔
انہوں نے بتایا کہ آگے جا کر اگر میں سیدھے ہاتھ پر مڑ کر توڑا آگے جاؤں تو فاسٹ فوڈ کی دکان میں نظر آئی گی خاص طور سے ڈیپر کرکی۔ میں نے وکٹوریہ سے آتے ہوئے بھی ڈیپر کرکی دکان میں دیکھی تھیں۔ ڈیپر کرکا سہرا سیکڑ وٹل کے سر جاتا ہے۔ یہ انگلستان کی خاص نقاد نہیں ہے۔ اسی طرح جس طرح ہزار امریکا کی نہیں بلکہ اٹلی کی خاص نقاد ہے۔ ویسے بھی طاہر علی کے زمانے میں پاکستان میں جو ”بین کباب“ ملا کرتے تھے وہ آج کل کے ڈیپر کر کے کی گناہ پادہ لہنے ہو کر کرتے تھے۔ خاص طور سے کراچی میں دلی سوسائٹی

کمرہ مستقل تھا۔ ویسے بھی ایک پاؤڈر کا حیدر آبادی لڑکا ذات بھی مل چکا تھا۔ زیادہ دل و قال کرنا مناسب نہ تھا۔
ایسا سوچا کیس کیسے میں رکھ کر میں ہاتھ دھوئے چلا گیا۔
ایسے ہوٹلوں میں کھانا شہر کے ہوتا ہے۔ ہر منزل پر ایک غسل خانہ۔ صبح کے وقت اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔
پھر ہاتھ دھو کر واپس آیا تو بھوک لگ رہی تھی۔ شام ہو چلی تھی۔ ویسے بھی کینیڈا میں جلدی کھانا کھانے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اس پرستم تھا کہ رات کا کھانا کرائے میں شامل نہ تھا۔ صرف اسکے دل و دماغ کا ناشائش شامل تھا۔ پھر لندن بھی دیکھا تھا۔ ان تمام عوام کا تقاضا یہ تھا کہ میں دروازے کا دروازہ کروں۔ میں نے یہی کیا۔
ہوٹل سے باہر نکلے گا تو ہوٹل کے مالک سے ملے بغیر

وہ پیدل ہی ہائی وے پر آگیا۔ اسے سڑک پر گاڑی کی ہیل لائن دکھائی دیں۔ اس نے اشارہ کیا۔ گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سیاہ قلمی لباس پہنا تھا۔

”وزیر مسٹر ماٹیل، کیا مجھے گھر تک کی لٹل مل پلاس گئی؟“

یوڑھا ہنسلا۔ ”ضرور لڑکے۔ تمہارے لیے تو جہاں کی حاضر ہے۔“

”ویسے اتنی میل آئی ڈی والا نقد۔ آپ نے خوب گھڑا۔“ نو جوان نے کہا۔ ”تین الگ الگ آڈی نور تیر

ایک ہی فضائی حادثے میں مارے گئے۔“

”اسے پراسراریت پسند تھی۔“ ماٹیل کی نظریں تاریک سڑک پر چلی گئیں۔ ”اور میں نے اگلے چھری کی طرح کانٹے پر وہی کھانا کھا لیا جو چھلی کو بھاتا تھا۔“

رات کے دوسرے پہر وہ اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔ اس نے ٹائم سوٹ پہنا اور خود کو میسر کے حوالے کر دیا۔

صبح فون کی گھنٹی سے آگٹھ گھنٹی۔ دوسری طرف داس تھا۔

”لو کہ میرا شہر یہ ادا کرو کہ میں نے جسیں کل رات پویش ٹاؤن جانے سے باز رکھا وہاں تو عرف کے طوقان نے زندگی معطل کر رکھی ہے۔“

”کیا واقعی؟“ وہ آنکھیں ملنے ہوئے اٹھا۔

”اچھا ستوا، ایک بری خبر ہے۔“ واسن نے کہا۔ ”پتھر بڑے میاں نے اپنے کیس کے سلسلے میں راپٹ کیا تھا وہ آج صبح اپنے مکان میں مردہ پائے گئے۔ سردی سے ان کا جسم

گیا تھا۔ ابھی ابھی خبروں میں دیکھا۔ شاید انہیں ہارنٹ ایک آیا تھا۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“

”ہاں پیارے، بڑے میاں بھڑی اسی تھے۔“

”اب اس گاڑی کا کیا ہوگا جسے میں نے پویش جانے کے لیے بک کیا تھا؟“ مورگن نے منہ بتایا۔

”پیارے، یہ قصاں تو ہمیں برداشت کرنا پڑے گئے۔“

واسن نے قہقہہ لگایا۔ ”شکر کرو برف کے طوقان سے آگے گئے۔“

فون رکھ کر مورگن گاڑی میں آن کھڑا ہوا۔ سر کاٹا سورج لگاؤ لگایا پر چسکے ہاتھ۔

”ہوگا۔“
”لوگوں نے جنہیں... یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم ویکس سے مل۔“ یوڑھے کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

نو جوان مسکرایا۔ ”آپ نے جاسوسی ناول تو بہت پڑھے مگر سراغ رساں کے طریقوں کی انجیل سے بھی واقف نہیں۔“

چھلی بار جب میں قہقیرے میں آیا تو چھلی میک اپ میں تھا اور جہاں تک آج رات کا نقش ہے۔ میں بار میں گیا ہی نہیں۔

میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں سیدھا یہاں چلا آیا۔ گاڑی جھنڈ میں کھڑی کی۔ جہاں تک پیوول کے نشانات کا معاملہ ہے، برف باری کچھ دیر اور جاری رہے گی، نشانات جلد مٹ جائیں گے۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ سگار بچھا کر اسے احتیاط سے ایک چھلی میں ڈالا۔ راکھ صاف کی۔ رومال سے گلاس اور صوفے سے اگلیوں کے نشان مٹائے۔ یوڑھا بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

آتش دان دھیرے دھیرے سرد پڑنے لگا تھا۔ سردی اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھی۔

نو جوان نے کوٹ پہنا۔ ”الوداع جناب! امید ہے کہ پھر بھی ملاقات نہیں ہوگی۔“

جس ہی وہ دروازے پر پہنچا فون کی گھنٹی بجی۔ نو جوان رک گیا۔ یوڑھے نے فون کی طرف دیکھا۔ اس نے فون تک پہنچنے کی کوشش کی مگر جسم جم گیا تھا۔

گھنٹی بجتی رہی۔

”اگر آپ کے بیٹے کا فون ہو۔“ نو جوان نے کہا۔ ”تو اسے میری سے طرف سے سالگرہ مبارک ضرور کہیے گا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

گھر سے میں بوت کی ہی خاموشی تھی۔

☆☆☆☆

جب برفانی طوفان کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ کاربن کا ڈنکی کی حدود سے نکلنے ہی طوفان کی شدت ٹوٹ گئی۔ لگاؤ لگایا کے نزدیک فٹنگ لگی رہ گئی۔

اس نے شالی ہائی وے پر واقع ایک گیراج کے سامنے گاڑی روکی۔ گیراج کا مالک ایک شرابی تھا۔ اسے گاڑی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد سوزا رضائی دیے۔

مورگن نے اسے آگٹھ ماری۔ آڈی مسکرایا۔ ”میں تمہاری گرل فرینڈ کوئیں ٹاؤن کا آج رات تم کسی اور لڑکی کے ساتھ صبح جستی کر رہے تھے۔“

میں DMS اسکول کے نزدیک ایک سچ کباب کی دکان تھی جہاں کے کباب انتہائی لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ مصالحے کی تیزی اور مرچوں کے استعمال میں بھی اپنا جواب آپ دیتے تھے۔ اس سچ پر بنے ہوئے کباب کو بن میں رکھ کر اور کئی دفعہ مقدار کے ساتھ چٹنیا کیا جاتا تھا۔ آسٹرو پچھے جائیں اور بن کباب کے حوالے سے کہیں جائیں۔ میں نے انگلستان میں آکسفورڈ میں کھانے کے باؤل اسی اعزاز میں پاکستانی ریستورانٹ میں پاکستانی کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ آسٹرو پچھے رہے ہیں اور پاکستانی کھانے کے بھارے لہ رہے ہیں۔

انگلستان کی خاص غذا پھر لڑائی یا مشہور زامش اینڈ پیس ہیں۔ میں نے ٹش اینڈ پیس پر اکتفا کیا۔ بڑے میں پکائی ہوئی کاؤش ہے جو کئی۔ مجھے اپنے یہاں کی کئی ہوئی پام فرٹ پکائی کی یاد آگئی۔ اس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ پام فرٹ کے ڈالنے کی یادوں میں زیادہ دیر کھوئے رہنا مناسب نہ تھا کہ شہر لندن بھی دیکھنا تھا۔ خاص طور سے پکاؤلی اسٹریٹ کہ اس کا ذکر بچپن سے ہی سنتے چلے آ رہے تھے۔

سڑک کے کنارے فٹ پاتھر پر ایک بڑے میاں پھول فروخت کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان سے پکاؤلی کا راستہ معلوم کیا جائے۔

میں نے ان کے پاس پہنچی کہ ان کو مخاطب کیا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ پکاؤلی یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

بڑے میاں نے مجھے کچھ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا۔ "کون سی جگہ؟"

"پکاؤلی" میں نے دہرایا۔

کہنے لگے "بیک مین۔" اس زمانہ میں بیک مین ہی ہوا کرتا تھا۔ "میری ساری زندگی اس شہر میں گزری ہے۔ اس شہر میں اس نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

میں نے اسرار کیا۔ "ہے کیسے نہیں۔ ضرور ہے اور ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

وہ ناراض ہو گئے۔ "تم شاید لندن پہلی دفعہ آئے ہو لیکن میں اسی شہر میں پیدا ہوا، پلا بڑھا۔ جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر طے کیا۔ اس شہر کا چھپا چھپا ہوا دیکھا ہوا ہے۔ میں تم سے شرط لگنے کو تیار ہوں کہ لندن شہر میں پکاؤلی نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

اس کے باوجود جب میں سفر ہوا کہ پکاؤلی نہیں کچھ نزدیک ہی ہے تو وہ پیش میں آ گئے۔ اب ایسا بات درست ثابت کرنا ان کی انا کا مسئلہ بن چکا تھا۔

میں نے ایک صاحب آ رہے تھے بالکل رواجی "پیش پینٹین" کمرے کیلئے رنگ بنی بیسٹ۔ ال رنگ کی واسکٹ اور بوٹائی، سر پر قلیت بیسٹ، ہاتھ میں چوڑی، منہ میں سگار۔ پھول والے نے ان کو روک کر مخاطب کیا۔ "یہ پائل کو جو ان لندن میں کسی ایسی جگہ جانا چاہتا ہے جس جگہ کا لندن میں کوئی وجود نہیں ہے۔ مگر یہ سفر ہے۔ آپ ذرا سے سمجھائیں۔"

ان صاحب نے مجھے بڑی شفقت سے مخاطب کیا۔ "تو جو ان تم کہاں جانا چاہتے ہو۔"

"پکاؤلی" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ صاحب کمری سوچ میں پڑ گئے۔

"لندن میں اس نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔" انہوں نے کافی غور کے بعد جواب دیا۔ پھول والے نے میری طرف قاتمانہ نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنا ایک ان صاحب کی آنکھوں میں چمک آئی۔ "اودا اب میں سمجھا۔ تم نے ڈی جانا چاہتے ہو۔" پھر انہوں نے اپنی چوڑی الٹا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ "اس سڑک پر چلے جاؤ وہاں سے تیری سڑک پر جائیں ہاتھ مڑاؤ اور سیدھے چلے جانا تم پہلے ڈی چلے جاؤ گے۔ اگر تم جاؤ تو کسی سے معلوم کر لینا سڑک پکاؤلی مت کہنا" کیے ڈی کہنا۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور "کے ڈی" کے لیے اپنا راستہ پکڑا۔ تلفظ اور لہجہ کا یہ مشکل مرحلہ میرے ساتھ چلے بھی بار بار گزر چکا تھا اور آج وہ آنے والے برسوں میں چلی گزرے گا۔ امریکا میں جب لوگ میری بات کو نہیں سمجھ سکتے تو کہا کرتے تھے "تجہا ربرطاونی ایکسٹ" پھر چپ میں برطانیہ آ گیا تو مجھے سننا پڑا۔ "تجہا ربرطاونی ایکسٹ" حقیقت یہ ہے کہ یہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ دراصل ہم پاکستان میں اتنی زیادہ انگریزی بولتے ہیں کہ ہمارا خود کا ایک ایکسٹ مین چکا ہے جو برطانوی اور امریکی ایکسٹ دونوں سے جدا ہے۔

ایکسٹ کے علاوہ میرے بولنے میں دو خرابیاں اور بھی ہیں ان خرابیوں کی طرف میری توجہ میرے ایک ساتھی اسٹین والش نے دوائی۔ اسٹین اور میں کینیڈا میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ اسٹین خود تو برطانوی نژاد کینیڈین تھے مگر اس

دوسری مہدی میں میٹر میڈ کا لکھنے کا سہرا ایلون مسورسوفی کے سر بند تھا ہے۔ اس میٹر میڈ کا میں 1505ء اور بات تجویز کی تھی تھی۔ جن میں 386 خانات سے اور 44 خانات سے حاصل کی گئی تھی۔ مسوفی اودیہ کے مختلف حوال کا فرق بھی جانتا تھا۔ اسے سولیم کاربونیٹ اور پوتا شیم کاربونیٹ کا فرق معلوم تھا۔ وہ ڈریس آکسائیڈ کی طرح آکسائیڈ سلیکٹ آکسائیڈ "آکسائیڈ" تھے اور اسے کے مرکبات کے ذریعے اثرات اور ان جیسے چوے کی جلد پر ہال دور کرنے کی خاصیت کا بخوبی علم رکھتا تھا۔ حالیہ تجویز پلاسٹر آف پیرس کی ترکیب واستعمال کا اسے بخوبی علم تھا۔

یورپ کا اور وہ جس کا فلسفہ آج بھی پوری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ مشہور مسلمان فلسفی طبیب اور ہیئت دان ابو الولید بھرا بن رشد تھا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب "الکلیات فی الطب" میں تحقیق و تجربے کے بعد یہ ثابت کیا کہ اگر کسی شخص کو چچک لقل آئے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس مرض سے محفوظ ہو گیا۔

اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس اور انگریز سائنس دان

کی یہی پاکستانی تھی جس کا نام زریعہ لکھی تھا۔ انگریز حرف "ع" نہیں ادا کر سکتے ہیں وہ اس کو زیادہ تر حرف "ا" کی طرح ادا کرتے ہیں۔

نتیجتاً اسٹین یہی کوئی کے بجائے "مہی" کہہ کر پکارتا تھا۔ جب میاں یہی کی چار چٹ کی لڑائی ہو تب بھی یہی ہیٹ خوش ہو جاتی لڑنا بھول جاتی۔

اسٹین کو میرے ساتھ کافی وقت گزارنا پڑتا تھا۔ وہ میری بات مشکل سے سمجھ پاتا تھا۔ پھل جاتا تھا۔ ایک دن اسی پھل ہٹ کے عالم میں مجھ کو مخاطب کیا۔ "میں تمہاری بات کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"کیوں نہیں سمجھ سکتے۔" میں نے بھی اسی انداز سے اس کو جواب دیا۔

"اس لیے نہیں سمجھ سکتا کہ ایکسٹ تو تقریباً ہر پاکستانی کا ہوتا ہے۔ مگر تمہارے ساتھ وہ بڑے مسکے اور مکی ہیں۔"

پھر ان دونوں مسائل کی وضاحت کی "ایک تو یہ کہ تم ہوتے پوری طرح نہیں سمجھتے ہو اور دوسرا یہ کہ تم جلدی جلدی اور بہت تیز جیز بولتے ہو۔"

ہم دونوں میں مصالحت اس وعدہ پر ہوئی کہ آجندہ میں آہستہ بولنے کی کوشش کیا کروں گا۔ معاملات کچھ تو سحر کے محر پوری طرح نہیں۔ بے چارہ اسٹین۔

آہستہ بولنا یہاں بھی کام آیا اور میں نے اب جس سے بھی پوچھا اس نے سچ سبب اشارہ کیا۔

میں مزید بچکے بغیر "کے ڈی" چل چکا تھا۔ اس کی مشہوری بے سبب نہیں تھی۔ زندگی سے بھر پور اور پھل پھل والی مگر کسی۔ میں کیسے کھوت رہا۔ پھر بول آ کر ہو گیا۔ سچ

ناشتے سے فارغ ہو کر برہم کے لیے نکل پڑا۔ وہاں

کی ٹرین کو تلاش کرتے کرتے لندن کے اسٹیشن اسٹیشن پہنچ گیا۔ برصغیر کے لیے ٹرین لندن کے اسٹیشن سے ہی چلا کرتی تھی۔ مگر چند ایک ٹرینیں "میری لے یون" سے بھی چلا کرتی تھیں۔ لندن سے برصغیر کا سب سے لمبا ایک ہوٹل تھا۔ اس کے لیے وہاں سے شمال مغرب کی طرف۔ لندن سے برصغیر کے درمیان سفر کا دورانیہ تقریباً ۱۰ گھنٹے کا ہے۔ ٹکٹ کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے معلوم کیا "برصغیر کی ٹرین کس وقت جائے گی؟"

اس نے پیچھے سرزد ہوا پر گل ہوئی گھڑی کو ایک نظر دیکھا اور کہا۔ "آٹھ منٹ بعد۔"

"جلدی سے ایک ٹکٹ دے دیں۔" میں نے جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"ڈسٹرین یون دے؟" اس نے پوچھا۔

برطانیہ کی ٹرینوں میں ایک طرح کے ٹکٹ ملتے ہیں جو ڈسٹرین کہلاتے ہیں۔ یہ آٹے کے ٹکٹ ہوتے ہیں جو صرف اسی دن استعمال کیے جاسکتے ہیں جس دن ان کا اجرا ہو۔ یہ ٹکٹ دوسرے ٹکٹوں سے نسبتاً کافی سستے ہوتے ہیں۔

"ون دے" میں نے جواب دیا اور ٹکٹ لینے کے بعد اپنے سوٹ کیس کو تفریقاً کھینچا ہوا لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ پلیٹ فارم پر پہنچا ہی تھا کہ گاڑی نے سینی بجائی اور نعرہ لگایا "آل بورڈ" میں نے ہاتھ بٹھکے اپنے سوٹ کیس کو ڈبے کے اندر دھکیلا اور خود بھی سوار ہو گیا۔ ڈبے کا دروازہ میرے پیچھے بند ہو چکا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ حرکت میں آئی تھی۔ ڈبے کے کھینے بعد برصغیر۔

لندن برطانیہ کا سب سے بڑا شہر مانا جاتا ہے۔ اس میں کوئی دو آراء نہیں ہیں۔ کسی کو اس امر سے اختلاف نہیں ہے۔ لیکن جب بات دوسرے نمبر پر آنے والے بڑے شہر کی ہوتی ہے تو اختلافات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ کسی شہر کی بڑائی متعین کرنے کے لیے مختلف کوائف کے بل بوتے پر اس شہر کو جانچا جاتا ہے۔ ان کوائف میں آبادی، معیشت اور ثقافت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت سے لے کر 2000 تک برصغیر کو برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن 1996 کے بعد سے لوگوں میں اختلاف ہے کہ برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر برصغیر ہے یا مانچسٹر۔

1996 میں آئرش ریپبلکن آرمی IRA نے مانچسٹر کے مرکز "کارپوریشن اسٹریٹ" پر ایک زبردست بم دھماکا کیا۔ ان کا مقصد مانچسٹر کو معاشی طور پر مفلوج کرنا

تھا۔ اس دھماکے میں کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا مگر شہر معاشی و معاشی تباہ ہو گیا۔ نقصان کا اندازہ سات سو ملین پاؤنڈ کے لگ بھگ ہے۔ اس تباہی کے بعد مانچسٹر میں قریب ۱۰ سال کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں مانچسٹر کی معیشت پہلے کے مقابلے میں اور بھی بہتر ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے اس بہتری کو گناہ سے تاحد دعوے کے لیے مانچسٹر کا رخ کیا۔ آج مانچسٹر کی معیشت برصغیر سے بہتر ہے اور 2011 کی مردم شماری کے مطابق مانچسٹر کی آبادی برصغیر کی آبادی سے کوئی ایک لاکھ نفوس زیادہ ہے۔ اب ان دونوں شہروں میں جھڑپ ہے کہ برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر کون سا ہے۔ اس جھڑپ میں بعض دوسرے شہر مثلاً لیڈز پول وغیرہ بھی شامل ہیں۔ لیکن میں برصغیر اس جھڑپ کو چکانے نہیں آیا تھا۔ صرف تصویر بہت بڑھائی کرنے اڑھیس سال بعد کا یہ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میری ٹرین برصغیر پہنچ چکی تھی۔

برصغیر میں تین ریلوے اسٹیشن ہیں۔ نیو اسٹریٹ، مور اسٹریٹ اور اسٹول۔

لندن کے میری لے یون اسٹیشن سے چلتے والی گاڑیاں صرف مور اسٹریٹ یا اسٹول جاتی ہیں۔ میری ٹرین نیو اسٹریٹ اسٹیشن پر آئی تھی۔ اسٹیشن سے باہر آکر میں نے ٹیکسی پکڑی اور یو نیورسٹی کا رخ کیا۔

یو نیورسٹی کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ 1825 میں برصغیر میڈیکل کالج قائم ہوا برصغیر میڈیکل اسکول کے نام سے۔ پھر 1875 میں مین سائنس کالج قائم ہوا۔ اس کے بعد 1900 میں ہڈر فیلڈ شاہی فرمان ان دونوں کو ملا کر یو نیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ نام "یو نیورسٹی آف برصغیر" رکھا گیا۔

اس زمانے میں آکسفورڈ اور کیمبرج کا دور تھا۔ ان دونوں یو نیورسٹیوں کی عمارتوں کی تعمیر چروں کو تڑپ کر کی گئی تھی۔ اس کے برعکس برصغیر یو نیورسٹی گندہ عمارتوں پر مشتمل تھی جو لال اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ لال اینٹوں سے بنائے جانے کی بنا پر یہ برک یو نیورسٹی کہلاتی تھی کہ اس کو اور مزید بڑھائی یو نیورسٹیوں کو آکسفورڈ اور کیمبرج سے جدا طور پر پہچاننا چاہیے۔ ان یو نیورسٹیوں کو وہ درجہ حاصل تھا جو آکسفورڈ اور کیمبرج کو حاصل تھا۔ 1960 کے بعد جب لاقتصاد پولی ٹیکنک اور دوسرے ادارے وجود میں آئے تو کھوری اینڈ دانی یو نیورسٹیوں کو بھی تعلیمات حاصل

ہوئی۔ آج یو نیورسٹی آف برصغیر قومی سطح پر دسویں اور چھٹیں الٹا قومی سطح پر ساتویں نمبر پر مانی جاتی ہے۔ جن مشہور شخصیتوں نے میرے علاوہ اس ادارے سے تعلیم حاصل کی ہے ان میں برطانیہ کے سابق وزیر اعظم جیمز کین اور آئینڈ نیشنل یونٹا کا بریٹن شامل ہیں۔

میرا اہلہ انجینئرنگ پڑھوٹش کے ڈپارٹمنٹ میں ہوا تھا۔ میرے قاریخ تحصیل ہونے کے بعد یو نیورسٹی نے نہ چاہا کہ اس ڈپارٹمنٹ میں تعلیم حاصل کرنے کا اعزاز حرج طلب ہو حاصل ہو۔ اس عزت افزائی کے نظریے کے تحت میرے ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس ڈپارٹمنٹ کو ٹیکنیکل انجینئرنگ کے ساتھ ضم کر دیا مگر میں اس کا فائدہ اٹھا چکا تھا۔

یہ تو عام اور غیر اہم معلومات تھیں۔ اہم معلومات یہ ہیں کہ یو نیورسٹی کی حدود میں پہنچ کر میں نے ٹیکسی سے اپنا سوٹ کیس اتارا، ٹیکسی والے کو روک دیا اور شہر سے ادا کیا اور سوٹ کیس کو ڈسٹوٹے ہوئے ایڈیشن آفس میں داخل ہوا۔

ایڈیشن آفس میں سوٹ کیس ایک کونے میں رکھ کر میں کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی خاتون نے مسکراہٹ بھیری "میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"جی میں یو نیورسٹی میں داخلہ کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"کس ڈپارٹمنٹ میں؟"

"انجینئرنگ پڑھوٹش میں۔"

انہوں نے اپنی دراز کھول کر ایک ٹائپ شدہ لسٹ نکالی۔ "آپ کا نام۔"

میں نے اپنا پورا نام بتا دیا۔ "اس میں سے آپ کا سر نیم کون سا ہے۔"

ہمارے یہاں جب کوئی لسٹ بنتی ہے یا ٹیلی فون ڈائریکٹری جچتی ہے تو وہ ہمارے پہلے نام سے شروع کی جاتی ہے۔ مغرب کا حساب دوسرا ہے۔ وہ لوگ پہلے "سر" لکھتے ہیں اس کے بعد پہلا نام۔ "روڈائی" میں نے بتایا۔ یہاں میں چسپ کیا۔ کھنڈے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے میرا "ق" حلق کی گہرائیوں سے ادا ہوا تھا۔ اور پھر سونے یہ سہا گہرا لفظ دکھائی دیکر میرا نام بھینے کی کوشش کرتی رہا۔ تھک بار کر میں نے اپنا نام کا قند پر لکھ کر ان کو چھایا تو معاملہ آگے بڑھا۔ انہوں نے مجھے خوشخبری سنائی کہ میرا نام لسٹ میں موجود ہے اور یہ کہ میں ٹیکس کے پیچھے جمع

کر وادوں۔ یہاں ایک دفعہ پھر میرے ساتھ ریڈیو کی گئی۔ لیکن یہ ریڈیو یو نیورسٹی نے نہیں بلکہ حکومت پاکستان نے کی تھی۔

میں کا سلسلہ یہ تھا کہ برطانوی اور دولت مشترکہ کے ملکوں کے لیے سال بھر کی ٹیکس صرف پچاس پاؤنڈ تھی۔ اس کے برخلاف بانی تمام ممالک کے طلبہ کو ٹیکس کے ضمن میں ڈھائی سو پاؤنڈ دینے پڑتے تھے۔ ڈھائی سو پاؤنڈ اس زمانے میں خاصی بڑی رقم گروائی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب چند مہینے بعد میں نے اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں چار پانچ سال پرانی آسٹرن سٹی گاڑی خریدی تو اس کی قیمت صرف دوسو پاؤنڈ تھی۔

پاکستان 1972ء میں عارضی طور پر دولت مشترکہ سے علیحدہ ہوا تھا جس کی قیمت مجھے ادا کرنی پڑی۔ اب حکومت پاکستان پر واجب ہے کہ وہ میرے دوسو پاؤنڈ کا نقصان پورا کرنے کے لیے مجھے چار سال پرانی آسٹرن سٹی دان میں دے۔ آسٹرن سٹی آج کل پختیہ ہزار ہا زر کی بیک رہی ہے۔

یو نیورسٹی میں داخلے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد خاتون نے مجھے پاؤنڈ جانے کا حکم دیا تاکہ میرے رہنے کا بندوبست ہو سکے۔

پاؤنڈ کے شعبہ میں پہنچا تو وہاں پر موجود صاحبزادی نے کھڑے ہو کر ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ میرا اور میرے سوٹ کیس کا استقبال کیا مگر مسکراہٹ کی اس دل آویزی کے ساتھ ساتھ اس میں سفاکی بھی چھپی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا کہ فی الحال یو نیورسٹی کے کسی بھی ہوٹل میں میرے لیے جگہ خالی نہیں ہے۔ پھر میرے ہاتھ میں ایک لسٹ چھانے ہوئے گویا ہوئیں۔

یہ یو نیورسٹی کے نزدیک ان بچہوں کی لسٹ ہے جہاں آپ کو بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کی سہولت مل سکتی ہے۔ آپ چند دن ان میں سے کسی جگہ گزاریں۔ جیسے ہی کسی ہوٹل میں جگہ کا بندوبست ہوگا ہم آپ کو مطلع کر دیں گے۔"

رخصت کرنے سے پہلے انہوں نے مجھے ایک اور دل آویز مسکراہٹ سے نوازا لیکن ان کی مسکراہٹ کی دل آویزی میرے دکھ کا دوا نہ تھی۔ مجھے ایک دفعہ اور اپنے سوٹ کیس کو ڈھونڈنا پڑا۔ میں نے باہر آکر ٹیکسی روکی اور بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ہوٹل کے لیے روانہ ہو گیا۔

یہ عام جسم کا بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ہوٹل نہیں تھا۔ ایک ذاتی رہائش گاہ جس کے کیمپوں نے فائو آف دی کی خاطر اس

جولائی 2014ء

کے دو کمرے ہوئے کے لیے وقت کر دیے تھے۔ کرایہ دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دوبارہ آنکھیں مل کر دیکھا مگر کوئی اتفاق نہ ہوا۔ کرایہ وہی کا وہی رہا صرف ڈیڑھ پاؤنڈ۔ شامیت۔ میں نے فوراً ہی بھرنی۔ خاتون خانہ مجھے کمرے تک چھوڑنے آئیں۔ دوا پر بگے ہوئے ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ”جب آپ کو گرم ہوا کی ضرورت محسوس ہو تو اس میز پر سے کڈال دیں۔ گرم ہوا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جتنی دیر سکچلن رہے گا گرم ہوا بھی چلتی رہے گی۔ ادھر تک کی مدت ختم ادھر گرم ہوا کا سلسلہ بند۔“ دو دروازے سے باہر جانے لگیں مگر رک کر کہنے لگیں۔ ”پانچ بیس کا سکسوٹے سے پیلے ڈال دینا۔ پانچ بیس صبح پانچ بجے ڈال دینا۔ کام چل جائے گا۔“

تجربہ کار مہینہ تھا مگر ہر مہینہ میں سردی شروع ہو جاتی تھی۔ داخلہ اور عارضی رہائش کا بندوبست ہو چکا تھا۔ اب صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ جا کر کورس اور پڑھائی کی تفصیل معلوم کرنا باقی تھا۔ یہ کام مکمل کیا جائے گا۔ فی الحال باہر چل کر شہر گھوما جائے۔ رات کا کھانا کھایا جائے۔ شہر سے واپس آ کر میں نے میٹر میں پانچ بیس کا سکڈالا اور بیس تانی۔ خواب میں میں نے تو رات واپس پہنچ چکا تھا۔ دوسرا مہینہ تھا۔ سخت برقیاری ہو رہی تھی، میں باہر سڑک پر اس برقیاری میں گھر چکا تھا۔ سردی کی شدت سے میرا مارا بدن کچھ بڑا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھلی گئی۔ میٹر میں ڈالے ہوئے پانچ بیس کی مدت کب کی ختم ہو چکی تھی۔ گرم ہوا کا سلسلہ کب کا منقطع ہو چکا تھا۔ کمرے میں خشک کاراں تھا۔ میرا سارا بدن کچھ بڑا تھا۔ میں ہٹ کر کے میٹر سے باہر نکلا۔ میٹر میں پانچ بیس کا سکڈالا۔ گرم ہوا کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ میں واپس میٹر میں دیکھ گیا۔ صبح ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے ڈیپارٹمنٹ جانے کے لیے چل پڑا۔ برطانیہ کا تعلیمی نظام امریکا کے تعلیمی نظام سے قدرے مختلف ہے۔ ہمارے اپنے تعلیمی نظام کی بنیاد بھی برطانوی نظام تعلیمی پر مبنی ہے۔ ہر مہینہ میں امریکا کی طرح سبجکٹس اور مائٹرز مضامین کا فیصلہ نہیں ہے۔ یہاں پر مجھے ذاتی طور پر کسی کورس کا انتخاب نہیں کرنا تھا (جس طرح میں نے آج کی یونیورسٹی میں کیا تھا اور اس انتخاب کے سلسلے میں اپنے ایڈوائزر کو فلک کاف تجویز لگنے اور ان سوچے کا دلچسپ موقع فراہم کیا

تھا) ہر مہینہ میں M.S.C کے کورس کے سارے مضامین یونیورسٹی خود سے کرتی تھی سوائے چند ایک کے کہ پانچ ایسے اختیاری مضامین تھے جن میں سے طالب علم کسی تین کا انتخاب کر سکتا تھا۔ آج جس کا دن تھا میرے دن سے باقاعدہ کلاسیں شروع ہو جائیں گی۔ آج کلاس کا پہلا دن تھا۔ ہم جماعتوں کا دور پڑھانے والوں کا تعارف ہوا۔ ترکی، ہندوستان، برطانیہ اور امریکا سمیت سات ملکوں کے کل اٹھارہ طلباء تھے۔ پاکستانی صرف میری واحد ذات تھی۔ کورس کے انتظام پر پروفیسر بولر تھے۔ ایک امریکی مہمان پروفیسر بھی تھے جو ہر طرف سے ”D“ سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کا نام تھا ڈی، ڈی، ڈی۔ میگو۔ طلبائے ان کو پیار سے ”ڈیڈ ڈک“ کہتے تھے۔ ”پکارنا شروع کر دیا تھا۔

ملک کا دن تھا۔ میں کلاس روم سے باہر نکلا تو ڈیپارٹمنٹ کی سیکریٹری سے ملے بغیر ہو گئی۔ ”مسٹر ڈاکٹر! اس نے مجھے مخاطب کیا۔“ ”مئی فرمائیے!“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے پاس ہاؤسنگ کی سیکریٹری کا فون آیا تھا۔ آپ اس سے جا کر مل لیں۔“ ”میں سیم“ میں ہاؤسنگ کے دفتر پہنچ گیا۔ اسی دن آدھ سکرانٹ نے میرا استقبال کیا۔ یا خدا! کیا یہ لڑکی چوبیس گھنٹے صرف سکرانٹ رہتی ہے! اگر یہ پاکستان میں ہوتی تو ہر فوٹہ پیسٹ بنانے والی مینجی کے اشتہاروں کی جان ہوتی۔ موتی جیسے دانت۔ اس نے مجھے خوشخبری سنائی ”آپ کے لیے کورن کلوڈز میں رہائش کا بندوبست ہو گیا۔ آپ کرایہ جمع کروا کر اپنے کمرے کی چابی لے سکتے ہیں۔“ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ روز رات کو اور اس سے بدتر کرفر کے وقت گرم ہوا کے لیے پانچ بیس ڈالنے سے نجات مل جائے گی۔ کورن کلوڈز اور بذات خود ہر مہینہ یونیورسٹی بھی انجکشن کے محکمے میں واقع ہیں۔ یہ وہی محلہ ہے جہاں انجکشن کا مشہور اسپتالیم ہے جہاں ایک وقت میں ہزار ہا شائقین کرکٹ کے ٹیکٹل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کورن کلوڈز یونیورسٹی کی حدود سے باہر چھوٹے میٹر پر واقع ہے۔ وہاں جانے کے لیے بس استعمال کرنا پڑے گی۔ میں نے خاتون خانہ کا گھر پر ادا کیا۔ ”بیڈ اینڈ بریک فاسٹ“ کو خیر باد کہا اور اپنے ”جیتے“ سوٹ کیس سمیت کورن کلوڈز میں

دیکھنا کے قلعے کو فتح کرنے کے بعد انتظامات مکمل کر کے محمد بن قاسم 94ھ میں برہمن آباد پہنچا تو بے شک مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ محمد بن قاسم نے جنگ کرنے سے پہلے اہل شہر کو اطلاع دینی کی درخواست دے کر اطمینان قبول کر لیا۔ صورت دیگر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب محمد بن قاسم کو کوئی جواب نہ ملا تو اس نے حملہ کر دیا۔ بے شک کی فوج قلعہ بند ہو کر لڑ رہی تھی۔ اس لیے کوئی فیصلہ کن سرکردہ نہ ہو سکا۔ اسی اثنا میں بے شک جو شہر سے باہر تھا ہاتھ دھو کر کھانے کے ساتھ آگیا لیکن مسلم سپاہ نے اسے برہمن آباد میں داخل نہ ہونے دیا۔ چنانچہ اس نے وہیں ٹھہر کر مسلمان فوج کی رسد کے راستے روک لیے اور ہر طرف سے ہاتھ بندھ کر قلعہ کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار ہاتھ دھو کر قلعہ کے مشورے سے محمد بن قاسم نے ایک فوج بے شک کے مقابلے کے لیے بھی روانہ کر دی۔ بے شک کے پاس قوت کم تھی اس لیے اس نے رات چھوڑ دیا اور اپنے بھائی کو کوئی کوانا قائم مقام کر کے شہر کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی فوج اور شہر کے لوگ بے شک کے قلعہ کا مقابلہ کرتے رہے لیکن جب محاصرے نے بہت طویل پکڑا تو وہ شہر اگلے اور چلے گئے محمد بن قاسم سے جانے اور بے شک پاپا محمد بن قاسم کی طرف سے جب ان پر حملہ ہو گا وہ معمولی سی مزاحمت کریں گے اور اس کے بعد شہر کا دروازہ کھول دیں گے اور یہی ہوا۔

انتہاس: قاری ہندو راز و فہمندی سیانہ

اسکاٹ لینڈ کا اپنا پاؤنڈ کا سکڈالا ہوتا تھا۔ چند سال قبل تک یہ اپنے لوٹ بھی الگ چھاپا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے اب بھی چھاپے ہوں۔ چھاپے ہوں یا نہ چھاپے ہوں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے غرض تھی تو صرف اپنی پڑھائی سے تھی جو کہ معمول کے مطابق شروع ہو چکی تھی۔ خدا کرے جلد ختم ہو۔ میرے کورس میں بے شمار مضامین تھے۔ پروفیشنل انجینئرنگ شماریات، فائنل ایس، پرنسپل آف انجینئرنگ، پلانٹ لے آؤٹ، آرکوکٹس ڈیزائن وغیرہ شامل تھے۔ یونیورسٹی دو سال کا کورس ایک سال میں کروا دی گئی۔ دن رات پڑھائی میں ہی گزر جاتے۔ صبح آٹھ بجے سے شام تک کلاسیں۔ پھر لائبریری، پھر رات کو گھر واپس آ کر پڑھائی۔ تین مہینے میں ہی دماغ کا کچھو کچھ گیا۔ اس کو آرام کی ضرورت تھی۔ کرسس کا بیگم شروع ہو چکا تھا۔ کرسس اب مغربی دنیا میں ایک مذہبی تہوار نہیں رہا ہے۔ اب اس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تعلق صرف داہنی سائی رہ گیا ہے۔ کرسس کا تہوار اب ایک تجارتی فوٹو پرستی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جس کے تحت اور ملکی دولوں پہلو ہیں۔ لیکن میرا مقصد اس بحث کا آغاز کرنا نہیں ہے۔ میں صرف یہ دہرانا چاہتا ہوں کہ کرسس کے تہوار کی چیمپینوں نے مجھے اپنے دماغ کو آرام دینے کا موقع فراہم کر دیا۔ کرسس کے موقع پر ہر طرح کے تجارتی پروموشن کی

بہرہ رہ ہوتی ہے۔ ہر طرح کے سبل گتے ہیں۔ ان ہی پر موشن میں پہنچنے اور بھی شامل ہوتے ہیں۔ خاص طور سے تعلیمی اداروں میں طلباء کے لیے۔ ہماری یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ گلف میں بھی طرح طرح کے سیکٹنگ ٹور کے اشتہار لگے ہوئے تھے سیکٹنگ کے علاوہ اسٹوڈنٹ ڈسکاؤنٹ پر ٹکٹ بھی خریدے جاسکتے تھے۔ ہر طرح کے سیکٹنگ دیکھنے کے بعد میں نے اطمینان جانے کا فیصلہ کیا اور میڈرڈ کے لیے اسٹوڈنٹ ڈسکاؤنٹ والا ٹکٹ خرید لیا۔ ان ٹکٹوں میں عمر کی بھی قید ہوتی ہے۔ اس سال میرے لیے اس ٹکٹ سے فائدہ اٹھانے کا آخری موقع تھا۔ اگلے سال میں عمر کی اس حد کو پار کر چکا ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میرے رب نے اپنی رحمت سے میرے لیے ایسا نیک دوست فرما دیا ہے کہ چند سال بعد میں دنیا کے گرد لاکھوں میل کا سرکاری اور ذاتی سفر بالکل مفت یا صرف دس فیصد کرایہ ادا کر کے کروں گا۔ کلام پاک کی یہ بات بھی حق ثابت ہو چکی تھی کہ ”جو تم نہیں جانتے وہ جانتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے۔“

میڈرڈ ان پورٹ پر سسٹم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں ہوئی ایک کرنے والے دفتر گیا تو پتا چلا کہ وہ لوگ صرف بڑے ہوٹلوں کی جنگ کرتے ہیں جن کا خرچہ ایک طالب علم کی پہنچ سے باہر ہے۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے آئیے یہ مشورہ دیا کہ میں مرکز شہر چلا جاؤں وہاں میرے مطلب کے کئی ہوٹل ہیں۔ لیکن نہ گھنٹہ گھنٹہ جاسے کی کوکر کرس کا رش ہے۔ مرکز شہر پہنچ کر تین چار جگہ جھانکنے کے بعد ایک مناسب کمرال گیا۔ کھانے کا بندوبست بھی تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں شہر گھومنے نکل گیا۔ وہاں آکر سو گیا کہ رات میں اطمینان کا مشہور زمانہ ٹیکسٹو ڈانس دیکھنے جانا تھا۔ ٹیکسٹو ڈانس میں چار عناصر شامل ہوتے ہیں۔ گانا، گاندار، رقص اور تالیاں۔ اس کا اجرا انڈس کے علاقے سے ہوا تھا۔ اطمینان کے جنوب میں واقع ہے۔ ٹیکسٹو رومانی خاندان بدوشوں کے طرز رقص اور موسیقی سے بھی متاثر ہے۔

رقص گاہ لوگوں سے سمجھا کچھ بھری ہوئی تھی جس میں تقریباً سب کے سب سیار تھے۔ زیادہ تر امریکی اسٹار کا پردہ اٹھا تو ایک مرد اور ایک عورت اٹھارہ کے ہندسے کی شکل میں کھڑے دکھائی دیئے۔ مرد نے چنٹ ٹرٹ کے اوپر سیاہ واسٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر کالے رنگ کی فلیٹ ہیٹ اور پیروں میں کالے ہی رنگ کے نہایت عمدہ جوتے کے چمڑے

کے چمکتے ہوئے جوتے جن کے کمرے اور انڈیاں خاص طریقے سے بنائی جاتی ہیں کہ ان سے ٹیپ ڈانس کے موسیقی اثرات پیدا کئے جاسکتے۔ وہ ڈانس ہاتھ سینے پر باندھے سیدھانے، مذاہب طرف کو کیے اور کی طرف دھجھکا ہوا رقص کے ٹیکسٹو رقص کا مخصوص لباس زیب تن کر کے تھا جس کا کھیر پیچھے آتے آتے اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ بالکل آٹھ کا ہندسہ دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ ہر پانچواں کرب تک ہم کا ٹر - اسپیئر لیٹن۔

اس رقص کو الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے۔ صرف اتنا بتانا ضروری ہے کہ خاص خاص موقعوں پر رقص اپنے جوتوں کی اینڈیوں اور ٹوڈوں کو ایک خاص انداز سے فرش پر ہچا کر ٹیپ ڈانس کا وہ ساہا بانہا ہے کہ آدی سمجھ ہو جائے۔ جب یہ ٹیپ ڈانس اپنے شروع پر پہنچتا تو لوگوں کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ زور دار تالیاں ہچا کر رقص اور رقص کو خراج تحسین نہ پیش کریں۔ رقص بھی ٹیپ ڈانس میں شامل ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ہاتھوں میں ہندسے ہوئے پیسوں کی شکل کے ہاجوں سے ٹیپ کی موسیقی کا اثر پیدا کرتی۔ یہ سلسلہ آدھی رات کے بعد تک جاری رہا۔

انڈس کا ٹیکسٹو ڈانس تو دیکھ لیا تھا لیکن انڈس کی سرزمین دیکھنا ہنوز باقی تھا۔ اطمینان آنے کے لیے کسی شہر کے بجائے صرف ڈسکاؤنٹ ٹکٹ لینے کا حکم بھی انڈس کی سرزمین کا دیار ہی تھا لیکن جتنے سیکٹنگ ٹور تھے ان میں سے کسی ایک میں بھی انڈس کا علاقہ شامل نہیں تھا۔ میڈرڈ سے انڈس کے لیے مجھے ٹرین سے سفر کرنا ہوا۔

انڈس کے تین بڑے شہر گرینڈ (خرنٹ) کوڈوہا (قرطبہ) اور سویل ایک ٹکٹوں کی شکل میں نقشے پر ابھرتے ہیں۔ میڈرڈ کے تقریباً سیدھ میں جنوب کے رخ خرنٹ مغرب میں سویل واقع ہیں۔

قرطبہ میں چینی بھی قابل دیدہ جگہیں ہیں ان میں شاید سب سے زیادہ مشہور اور دیدنی مسجد قرطبہ ہے۔ عمارت 600ء میں بطور سینٹ وینسٹ چرچ بنائی گئی تھی۔ پھر مسلمانوں کے دور حکومت میں اس جگہ کو چرچ اور مسجد کے لیے آدھا آدھا تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے بعد 784ء میں خلیفہ عبدالرحمن اول نے چرچ والا حصہ خرید کر اس پر رسی جگہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ مسجد کا قریباً دو سو سال چلتا رہا اور 987ء میں مکمل قرار پایا۔ 1236ء میں مسلمانوں کی

گت کے بعد یہ جگہ واپس عیسائیوں کے پاس چلی گئی۔ قرطبہ کے بعد خرنٹ کا قصد تھا۔ خرنٹ کا انفرادی دنیا میں مشہور ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے ایک پورا باب درکار ہوگا۔ خرنٹ سے سویل ملکہ وہاں سے واپس ٹرڈ۔ سیدھ جانے کے لیے سویل سے جو ٹرین چلتی ہے وہ براست قرطبہ جاتی ہے۔ ان دونوں اس سفر کے لیے چھ گھنٹے لگتے تھے لیکن اب اس لائن پر تیز رفتار ٹرین AVE چلتی گئی ہے جس کی وجہ سے اب یہ فاصلہ ڈھائی گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ اگر اطمینان کی حکومت اپنی ریل کے نظام ہمارے وزیر ریل کے حوالے کر دے تو وہ یقیناً وقت کی بچت کے نامور سے اطمینان والوں کو نجات دلا دیا۔

اٹمین کا سفر بغیر مل قایت دیکھنے تکمیل تصور کیا جاتا ہے۔ میں اپنے سفر کا مکمل نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میڈرڈ پہنچ کر میں نے مل قایت کا نظارہ کیا اور اگلے روز واپس لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔

اٹمین سے واپس آکر روز کا پرانا معمول شروع ہو چکا تھا۔ ہر روز صبح سویرے اٹھ کر تیار ہونا۔ بس چڑنا اور یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو جانا لیکن ایک صبح جب ہم لوگوں نے یونیورسٹی جانے کے لیے اپنے قلیت کا بیرونی دروازہ کھولا تو دروازہ پار کرتا ناممکن معلوم ہوا۔ دروازے کے سامنے کوئی دو ڈھائی سو دو سو دو ڈھائی سو بیس بیسوں تک رکھی ہوئی تھیں۔ ان یونکوں کو ہٹا کر راست بنانے میں چند روز میں منٹ لگ گئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

چند دن بعد شام کے وقت قلیت کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے پانچ انگریز لڑکیوں کو کھڑے ہوئے پایا۔ ان میں سے ایک کے علاوہ تین قبول صورت تھیں اور پانچویں کا شمار حسینوں میں کیا جاسکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا ان سب نے باجماعت با آواز بلند اعلان کیا ”ہم معافی مانگتے آئے ہیں۔“

زندگی میں پہلا اتفاق تھا کہ پانچ خوبرو انگریز لڑکیاں مجھ سے معافی مانگ رہی تھیں۔ میں نے خطا معلوم کیے بغیر ہی ان سب کو دل و جان سے کئی کئی مرتبہ معاف کر دیا۔ میرے پیچھے میرا آئرش سا بھائی ایون اور اسکاٹش سا بھائی جیری آگئے تھے۔ وہ میری طرح رقیق القلب واقع تھے۔ انہوں نے ان لڑکیوں سے معافی کی وجہ جانی چاہی۔ لڑکیوں نے جواب میں اندر آنے کی اجازت

چاہی۔ یہ ان کی دوسری مہربانی تھی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم اپنے باورچی خانہ لٹا لٹا کے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد ان میں سے ایک لڑکی نے انکشاف کیا۔ ”آپ لوگوں کے قلیت کے دروازے کے آگے وہ دودھ کی خالی بوتلیں ہم لوگوں نے رکھی ہیں۔“

انگلتان میں ایک رواج تھا، یہاں اب بھی ہو کر وہاں پر دودھ بیچنے والے دودھ کی ایک لڑکی سر بند بوتلیں گھر گھر پہنچاتے تھے۔ یہ سہولت کرنل ٹیڈز میں بھی موجود تھی۔ ہر قلیت کے لوگوں کو چھٹی دودھ کی بوتلیں چاہئے ہوتی تھیں ہر رات دودھ والا انہیں گاڑی میں لا کر مقررہ بوتلیں قلیت کے دروازہ کے آگے رکھ جاتا تھا۔ استعمال کے بعد خالی بوتلیں رات کے وقت دروازے کے باہر رکھ دی جاتی تھیں جن کو وہ دودھ والا واپس لے جاتا تھا۔

اعتراض جرم کے بعد ان لڑکیوں نے اپنے اس کارنامے کا حکم بیان کیا ”در اصل ہمارے حصے کی جو دودھ کی بوتلیں تھیں ان میں چار دن پہلے کسی نے ٹیلا رنگ گھول دیا تھا۔ ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ آپ لوگوں کی شرارت ہے۔ مگر یہ حرکت سامنے والے قلیت کے لڑکوں نے کی تھی۔ ہم اپنی حرکت پر شرمندہ ہیں۔“

شرمندگی کی کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ صراحتاً ہوا کہ میں ان لڑکوں کے قلیت میں جا کر ان کا شکر یہ ادا کروں کہ ان کی بدولت یہ پانچوں لڑکیاں ہر قلیت کے سامنے سے دودھ کی خالی بوتلیں ڈھونڈ سکیں گی۔ میں اور ان خالی بوتلیوں کو ہمارے قلیت کے دروازے کے آگے جاتی رہیں اور پھر اس کمر تو رحمت کے بعد ہم لوگوں کو اپنی معافی سے بھی مستغنی کیا۔

خدا خدا کر کے جون کا میٹا آیا۔ امتحان ہو گئے۔ دن رات کی تھکانے والی پرانی سے تھکتی ملی۔ اب صرف پروڈیکٹ پر کام کرنا باقی تھا۔ اس کی رپورٹ اگلے تین مہینے میں مکمل کر کے داخل کرنی تھی۔

برمنگھم کے آس پاس تقریباً پچیس میل کے علاقے میں چھ صنعتیں ہیں، شاید برطانیہ کے کسی دوسرے حصے میں نہ ہوں۔ مغربی دنیا میں صنعت اور یونیورسٹیاں ایک دوسرے کی بہت معاونت کرتی ہیں۔ صنعت چھ سافٹوئیر کرتی ہے جسے استعمال کر کے یونیورسٹی ریسرچ اور ٹیچر پر وڈیکٹ پر کام کرتی ہے اور پھر اسے صنعت اپنے استعمال میں لا کر منافع کماتی ہے۔ برمنگھم کے آس پاس کی صنعتیں برمنگھم

یوٹورنٹی کی ریسرچ اور پروڈیکٹ سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں اور یوٹورنٹی ان کے پیسے ہے۔

پروڈکشن انجینئرنگ کے شعبے کا زور عملی جتنوں میں تھا۔ اس لیے ہر مہتمم یوٹورنٹی کے اس شعبہ کا زیادہ تر کام ریسرچ کی بجائے پروڈیکٹ کی فصل میں ہوتا تھا۔ ہر سال کئی پروڈیکٹ دیے جاتے تھے اور طالب علموں کو موقع ملتا تھا کہ وہ اپنی پسند کے پروڈیکٹ پر کام کریں۔ میں نے جو پروڈیکٹ چنا تھا اس کے انچارج ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ڈاکٹر ہے۔ جی۔ کوکس تھے۔ اس پروڈیکٹ میں پروڈکشن انجینئرنگ اور کوئٹنگ کا مہتمم تھا۔ اس پروڈیکٹ سے غیر متعلق ایک واسطے کا ذکر ضروری ہے۔

جہاز رانی کی صنعت سے متعلق لندن سے ایک رسالہ تھا جس کا نام ہے فلائیٹ انٹر نیٹل جو اس صنعت سے تعلق رکھنے والوں میں بہت مقبول ہے اور پیارے صرف "فلائیٹ" نکارا جاتا ہے۔ چور چوری سے جاتا ہے لیکن میرا پیمبر سے نہیں۔ گوکہ پچھلے تین سال سے میرا جہاز رانی سے کوئی براہ راست واسطہ نہیں تھا لیکن میں "فلائیٹ" کا مطالعہ پابندی سے کرتا تھا کہ اس میں صنعت سے متعلق ہر طرح کی معلومات ہوتی تھیں۔

"فلائیٹ" کی ایک اور خصوصیت تھی۔ زیادہ تر لوگ اس کا مطالعہ اس کے پچھلے تین چار سطحوں سے شروع کرتے تھے۔ اس طرز مطالعہ کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ یہ کہ ان لوگوں کو پروڈکٹوں کے اشتہار ہوا کرتے تھے۔ مجھے مطالعہ کے اس طریق کار سے بچا اور اتفاق تھا۔

میں نے فلائیٹ کا تازہ شمارہ لے کر اس کو حسب معمول آخری صفحے پر چھاندر دیا۔ ایک ہی صفحہ کھولا تھا کہ مطلع نظر۔ سامنے تھا۔ دنیا کی ایر لائن کو ایسے ایو پاس انجینئر کی فوری ضرورت تھی جس کے پاس یونیک B-707 کا تجربہ ہو۔ انا حاکم کیا چاہے دو اکھیں۔ میں نے اسی دن درخواست لکھ کر رسالے میں دیے گئے پتے پر روانہ کر دی۔ تین دن کے بعد جواب بھی موصول ہو گیا۔ انٹرویو کے لیے لندن جانا تھا۔

دس ماہ قبل جب میں نے پڑھائی شروع کرنے کی غرض سے لندن سے ہر مہتمم کا سفر کیا تھا تو میں نے ریل گاڑی کو ترجیح دی تھی۔ لیکن آج انٹرویو کے لیے ہر مہتمم سے لندن جانے کے لیے ریل گاڑی سے سفر کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہ میری شان کے خلاف تھا۔ اس لیے

کہ اب میں ایک استعمال شدہ آسٹن مٹی کا مالک بن چکا تھا۔ یہ گاڑی بھی ایک طرح سے میرے پروڈیکٹ کے پیش میرے ہاتھ لگی تھی۔

میرا پروڈیکٹ ہر مہتمم سے تقریباً تیس میل آگے ایک کھنی وکن اینڈ چل کے ساتھ تھا جو بھاری قسم کے مینٹیل اور ہائیڈرولک پریس بناتے تھے جن پر چھوٹے بڑے ہر قسم کے پڑے ڈھالے جاسکتے ہیں۔

مجھے وہاں بیٹھے میں صرف تین یا چار دن جانا پڑتا تھا باقی دنوں میں یوٹورنٹی میں کام مکمل کیا کرتا تھا۔ آنے جانے کا مسئلہ تھا۔ پہلے مجھے کرن کلوز سے بس کے ذریعہ مرکز شہر جانا پڑتا تھا وہاں سے دوسری بس کے ذریعے وکن اینڈ چل کی ٹیکسٹی۔ میرا زیادہ تر کام ان کے پروڈکشن ٹیمر کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ جب اس کو میرے آنے جانے کے مسئلہ کا پتا چلا تو ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "میں فرانچائز کے مسئلہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں مگر تم کو پہلے اپنی مدد آپ کرنا پڑے گی۔"

"وہ کیسے؟" میں نے تفصیل معلوم کرنا چاہا۔ "اگر تم اپنی گاڑی کا بندوبست کر سکو تو میں تمہیں ہر مہینے میں پاؤنڈ پندرہول مٹی کے طور پر دے سکتا ہوں۔"

ان دنوں میں پاؤنڈ خاصی مقبول رقم ہوا کرتی تھی۔ میں نے دھڑلے ڈھانچہ کر لیک چار یا پانچ سال پرانی آسٹن مٹی میں دو سو پاؤنڈ سک رائج الوقت حکومت برطانیہ میں خرید لیا۔ رنگ سرخ، بھت کالی، ہر طرح کی سڑک پر دوڑنے والی۔ میں نے اس کو لندن کے رخ پر موڑ دیا۔

M-1 پر دوڑا دیا۔ کینیڈا اچھوڑنے کے بعد آج میں کھلی دلف موزوے پر گاڑی چلا رہا تھا۔ برطانیہ کی موزوے M-1 کینیڈا کی ہائی وے 401 کے مقابلے کی تھی مگر میری آسٹن مٹی امریکا کینیڈا کی گاڑیوں کی ٹکڑی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی گوکہ آسٹن مٹی چلانے کا اپنا حزمہ تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد میں لندن میں تھا۔

انٹرویو کے لیے میں کچیں امیدوار تھے۔ میرا فہر بار ہوا یا تیر ہوا تھا۔ انٹرویو لینے والوں میں ایک دنیا کے باشندے تھے جن کا تعلق شعبہ موشین (ایسٹنٹ) سے تھا۔ دوسرے صاحب فرانسسی تھے ان کا تعلق انجینئرنگ کے شعبہ سے تھا۔ انہوں نے مجھ سے ملے تین سوال B-707 کی ایو پاس کے بارے میں پوچھے

ہر اسے زمین سماجی سے کچھ کسر پر کرنے لگے۔ کسر پھر تمام کو کھینچ کر مجھ سے کہنے لگے۔ "یہ تو کڑی تمہاری ہوئی۔ تحصیل تم کو میرے سماجی بتائیں گے۔" سامی نے اپنی ٹوٹی ہوئی انگریزی میں مجھے تفصیل سے آگاہ کیا۔ خواہ ساڑھے چار ہزار پاؤنڈ سالانہ۔ ساتھ میں رہنے کے لیے کھر اور نوکر کا رالاؤس اور اگر کار کردگی ٹھیک رہی تو چھ مہینے بعد ان کو اس اضافہ۔ مگر شرط یہ ہے کہ مجھے تین مہینے کے اندر اندر دیا جانا ہوگا۔ مجھے ہاں یا نہ ہاں جواب تین دن کے اندر اندر دینا ہوگا۔

یہ میرے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف تین سال بعد جہاز کی طرف لوٹنے کا موقع ہاتھ آیا تھا جس کے ساتھ ساتھ ایک لالچ اور بھی تھی۔ افریخ میں وقت گزارنے کا موقع۔ اب تک میں ایشیا، یورپ اور امریکا کے ہر انگوٹوں میں رہ چکا تھا۔ محوم چکا تھا۔ تو کڑی کر چکا تھا لیکن برا مہتمم افریخ ہنوز برنہاں تھا۔ ڈی ڈارک کوئٹ افریخ میں رہنے کی کشش متا طیس بن کر مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ دوسری طرف دو مہینے بعد میں اپنا پروڈیکٹ مکمل کر کے M-Sc کی ڈگری حاصل کر سکتا تھا۔ دہائی MSC کی ڈگری جس کے لیے میں نے بی آئی اے کو خرید لیا تھا اور ترک وطن کر کے کینیڈا میں ملکیت کی ڈگری کی تھی۔ مجھے تین دن میں طے کرنا تھا کہ ان دونوں میں سے کون سی چیز میرے لیے زیادہ پرکشش ہے۔ رات میں ہر مہتمم لوٹ آیا۔

دوسرے دن صبح میں اپنے انجی خیالات میں غلطیاں اچھاں ڈپارٹمنٹ پہنچا تو پروفیسر بولیسر سے ڈبھیل ہو گئی۔ میرا تذبذب شاید میرے چہرے سے عیاں تھا۔ پروفیسر اٹھ کھڑے ہو چھا۔ "خیر یہ کیا ہوا؟ کن سوچوں میں گھوٹے ہو؟"

میں نے سارا ماجرا ان کو سنایا۔ ان کو فیصلہ سناتے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ "تمہاری جہازوں سے دلچسپی اپنی چکر جہازوں ان کپٹینوں میں تو کڑی ملتا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ ایر زبیا کوئی دنیا کی واحد ایر لائن نہیں ہے۔ ایر لائن کا کام بین الاقوامی کام ہے اس میں کسی ملک کی کوئی قید نہیں ہے۔ تم کو کم از کم دنیا کی ستر اسی جہازوں ان کپٹینوں میں تو کڑی کرنے کا موقع مل سکتا ہے مگر ایم ایس کی ڈگری تم کو صرف ایک جگہ سے مل سکتی ہے۔ اگر تم سننے یہ دو مہینے مکمل کر کے اپنی ڈگری نہیں حاصل کی تو تم

ساری زندگی بچھتاؤ گے۔" اس سے زیادہ کچھ مشورہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے زمین ایر لائن کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

لندن سے واپس آتے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا ہوگا کہ ایک خوشگوار واردات ہوئی۔ ہمارے پڑوسی کی لڑکیوں نے ایک وفد بھر ہمارے قلیت کے دوراز سے پر دھک دی۔ اب کے وہ ایک نرالی اور انتہائی دل خوش کن فرمائش کے ساتھ وارد ہوئی تھیں۔

"ہم آپ کے قلیت میں رہنا چاہتے ہیں۔" نیکی اور پوچھ بچھ ایم کو شادی مرگ ہو جاتا لیکن اس میں کچھ تو کہیں تھیں۔

یوٹورنٹی کا اصول یہ تھا کہ انڈر گریجویٹ طلبہ کو سالانہ امتحانوں کے بعد اپنے قلیت خالی کرنا پڑتے تھے۔ مگر بھیت طلبہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ اپنے قلیت گریجویٹ کی چھٹیوں کے دوران بھی استعمال کر سکتے تھے۔ یہ سہولت اس لیے دی گئی تھی کہ گریجویٹ طلبہ کی اکثریت گریجویٹ کی چھٹیوں کے دوران اپنی ریسرچ کو اپنے پروڈیکٹ پر کام کرنا ہوتا تھا۔

ہمارے پڑوسی کی لڑکیاں چنگ انڈر گریجویٹ کلاسوں میں تھیں۔ ان کو اپنا قلیت خالی کرنا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اگر ہمارے قلیت میں کوئی کمرے خالی ہوں تو وہ ان کا کرایہ ادا کر کے ان میں مقیم ہو جائیں۔ یہ معاملہ ذرا میز حاق تھا۔ اس لیے کہ ہاؤسنگ کے شعبہ کو کسی نے یہ پٹی پڑھادی تھی کہ یوٹورنٹی کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے دلوں میں تو رہ سکتے ہیں مگر ایک دوسرے کے قلیت میں نہیں رہ سکتے حالانکہ قلیت دلوں کے مقابلے میں خاصے پڑے ہوتے ہیں۔ ذاتی طور پر ہم لوگوں کو یوٹورنٹی کی اس پالیسی سے اختلاف تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس صرف دو کمرے تھے اور لڑکیاں چار تھیں۔ ایک کمرہ ان خروشاہی کا خالی ہوا تھا کہ یہ وہ ان نے یوٹورنٹی کے نزدیک ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا اور دوسرا کمرہ چڑا تھا جو اپنے کھر چائے تھے کہ ان کو کوئی پروڈیکٹ یا ریسرچ نہیں کرنا تھی۔ رچہ ڈاکٹر سرسری طور پر کرنا ان کے کردار کے ساتھ زیادتی ہوئی کہ ان میں دو بہت بڑی خوبیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کینیڈا کی درکار مشرکی کے کچھ کی طرح کچے گھرا شای انگریز تھے وہ ان کی نگاہ میں ہر شے رائج آج بھی

زعمہ تھا۔ زعمہ اس لیے تھا کہ وہ ان کے ذہن میں پوری طرح سے محفوظ تھا۔ یہ نامکن تھا کہ چوڑی زندگی میں برٹش راج کا سورج کسی طور ڈوب سکے۔ ایک دن کہنے لگے کیونرم بہت اچھا نظام ہے اس کو ساری دنیا میں ہونا چاہئے۔ صرف انگلستان کے لیے ناموزوں ہے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ اگر کیونرم باقی ساری دنیا پہ چھا گیا تو ”برٹش راج“ کہاں سانس لے گا۔

ان کی دوسری خوبی وہ تھی جو زیادہ تر انگریزوں میں پائی جاتی ہے۔ سنجوہ ہم لوگ زیادہ تر کھانا پختہ دینی کے کہنے لڑیاں میں ہی کھالیا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی فلیٹ میں بھی پکالیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر لٹا فکرم پڑ گئے۔ رچرڈ نے کمال مہربانی سے ایک لٹاڑ حنایت کیا۔ جب ہم لوگ کھانا کھا کر فارغ ہو گئے تو رچرڈ نے مجھے اور ایشین کو مخاطب کیا۔ ”میں نے تین لٹاڑ نوٹس کے خریدے تھے۔ اس طرح ایک لٹاڑ تین نوٹس کا پڑا“ پھر وہ اس حساب کتاب کے اصل مقصد کی طرف آئے ”اس ایک لٹاڑ کو ہم تین لوگوں نے کھالیا۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک کے حصے میں ایک ایک نوٹس کا لٹاڑ آیا۔“ پھر رچرڈ نے مطالبہ کیا۔ ”اب تم دونوں مجھے ایک ایک نوٹس ادا کرو۔“ اور وہ ایک ایک نوٹس انہوں نے لے کر چھوڑا۔

میں نے چاہا کہ ان کو یاد دلا دوں کہ برٹش راج کی سربراہ کے تاج میں جو کوہ نور میرا جوا ہوا ہے وہ مسروقہ ہے جو ان کے خاندان والوں نے ہم سے چھ لیا تھا۔ لڑکیاں ہمارے جواب کی منتظر تھیں۔ یونیورسٹی کی پالیسی اور کروں کی قلت کی قباحتیں ان کو بتا دی گئیں۔ نوٹوں کو جھک کر ادا ہے یا بازی سے پوئیں۔ ”یونیورسٹی والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ دو کمرے کافی ہیں۔ ہم اپنی چٹھیاں منانے کے بعد چند مہینوں میں واپس آ جائیں گے۔ ہمیں صرف ایک مینیا فلیٹ میں رہنا ہے۔ اگلے سال کی تیاری کے لیے۔“

بہار صبر کے مہینے میں ہی ہمارے فلیٹ میں اتر آئی تھی۔ تین لڑکیاں چٹھیاں منا کر واپس آ چکی تھیں۔ جب ان میں سے کوئی کوئی دور سے گزرتی تو خوشبو کی پٹینیں ایسے اٹھیں جیسے صراخوں میں ہولے سے چلے باؤم اور دل چاہتا کہ ”بھینے رہیں انھیں جاناں کیسے ہوئے۔“

مگر تصور جاناں کا ظلم جلد نوٹ جاتا اور خیالوں

میں جاناں کی بجائے ڈاکٹر بے بی کوئس کا چہرہ منع اپنی تماشہ خشک سالی کے ذہن میں رہا تھا۔ اس ”خشک“ نام ان کی ”سالی“ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ساری خشکی خود ان کی اپنی ذات کی مرہون منت تھی۔ خیال رہے کہ ڈاکٹر کوئس میرے پروجیکٹ کے انچارج تھے۔ ان کی یاد میں جاں تھی۔

دشمن جاں اس لحاظ سے کہ ان کے یاد آتے ہی میری تماشہ چوہہ جو کہ جاناں پر ہوتی چاہیے تھی، پروجیکٹ پر مرکوز ہو جاتی۔

میرے کنفیڈ اداہی کے ٹکٹ کی مدت ختم ہونے والی تھی۔ اس کے علاوہ جب بھی ہنگی ہوتی جاری تھی اور میری کوشش تھی کہ اپنا پروجیکٹ اگلے دو ہفتے میں یعنی وقت مقرر سے دو ہفتے پہلے ہی ختم کر کے لوٹن جانے والے جاہ سوار ہو جاؤں۔ میری کوشش اپنی جگہ مگر وہی ہوتا ہے جو منتظر خدا ہوتا ہے۔

میں اپنے حساب پروجیکٹ رپورٹ مکمل کر کے ڈاکٹر کوئس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہانی تو رقت آج ہے۔ مختصر احوال یہ ہے کہ انہوں نے میری رپورٹ کو ”جنگل سے پکڑا۔ کہ یہ اتنی ہی ختم تھی کہ ان کی جنگلی میں آگئی۔ خشونت سے اس پر سرسری نظر ڈالی پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”آج تک اس ڈپارٹمنٹ میں کسی بھی طالب علم کو اس کی پروجیکٹ رپورٹ کے ناقص کی بنا پر فیل نہیں کیا گیا ہے۔“

یہ تو دل خوش کن اطلاع تھی۔ دھماکا اس اطلاع کے بعد ہوا۔ ”لیکن دنیا میں ہر چیز کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پروجیکٹ رپورٹ کی بناء پر فیل کیے جانے والے پہلے طالب علم کا اعزاز تم کو حاصل ہو۔“ پھر آخری جملہ ”پروجیکٹ رپورٹ دوبارہ لکھ کر لاؤ۔“

میں نے جو وقت سے دو ہفتے پہلے رپورٹ مکمل کر کے کا خواب دیکھا تھا وہ ڈاکٹر کوئس کی نظر ہو گیا۔ میں نے رپورٹ تو دوبارہ لکھی مگر اس کو ڈاکٹر کوئس کو بخش نہیں دے کی بجائے ان کی نیکر بیڑی کے حوالے کیا۔ کم از کم وہ لگے فیل کرنے کا اختیار تو نہیں دیتی تھی۔ اب میں نورونو واپس جاسکتا تھا۔ براستہ ڈور و غیرہ۔ اپنے ٹکٹ کی مدت ہونے سے قبل تین وقت پر ہی تھی۔

(جاری ہے)

سیل نمبر 14

امجد رئیس

وہ انتہائی خطرناک مجرم تھا، دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ وہ ابہنی کجروی کی وجہ سے قتل جیسا جرم کیا کرتا تھا۔ ایسے خطرناک مجرم کو عدالت نے ثبوت کی عدم موجودگی پر رہا کر دیا تو نتیجہ کیا نکلا؟

مغرب کے سب لاکھام معاشرے کی ایک جھلک



سیل نمبر 14 کا فولادی دروازہ کھولا جا رہا تھا۔ گاؤڑ کی الگیاں بھلے پر بھی ہوئی تھیں وہ نروس دکھائی دے رہے تھے۔ یا بکوسے ڈوری انڈر پیناڑوں میں موجود رہا تو جیل کا مقرر تھا۔ سیل نمبر 14 میں دنیا کی تاریخ کا بیسیک ترین قیدی بنگلہ دیش سے قیدی نہیں درندہ کہتا چاہیے۔ اس کا پورا نام بیڑو الووڑو پوڑو تھا۔ لو پوڑو جی امریکا میں ”انڈریز کا مہریت“ کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کا نام خوف و دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ سیل نمبر 14 کا دروازہ کھل گیا۔ بیڑو اس قدر قابلِ فطرت تھا کہ جیل کے قیدیوں یا گاؤڑوں سے جس کو بھی موقع ملتا وہ بیڑو کو یا تو زعمہ جلا دیتے یا پھر اس کے اعضا کاٹ کر اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

پیڑ روٹو لوز پوز، اس وقت تک جن سو وٹیز اس کے قتل کا اعتراف کر چکا تھا۔ دنیا میں اس کی شناخت سب سے بڑے "سیکس گز" کی تھی۔ پیڑ روٹو میں نہ ہوتا تو حوام اس کے بدن کا ایک ایک ریڑھ توج کے لے جاتے۔ پیڑ روٹو نے غرت، خوف، دہشت اور بھیا تک ترین جرائم کی تاریخ رقم کی تھی۔

یہ بھی درندہ پورے تین سال تک دندا تا رہا۔ وہ اوسطاً ایک ہفتے میں دو سے تین دو وٹیز اس کو کھاتا اور بے رحمی کرنے کے بعد کھل کر دیتا۔

روٹو کی ٹیل، اٹھارہ کے پہاڑوں میں تین ہزار میٹر کی بلندی پر تھی۔ صرف ایسا لوٹس اس نے پولیس کی رہنمائی 53 خیر قبروں تک کی۔ اس انسان نما درندے نے یہاں جن لڑکیوں کو اپنی حیوانی ہوس کا نشانہ بنایا۔ ان کی عمریں محض آٹھ سے بارہ برس تھیں۔

پیڑ روٹو نے اٹھائیس مزید قبروں کی نشاندہی کی لیکن پولیس کو وہاں کچھ نہیں ملا۔ کیونکہ جنگی آوارہ جانو رقیبیں کھود چکے تھے۔ کچھ قبروں کے پارے میں اس نے خیراتی سائیس کا خالہ دیا۔ وہاں لائیں کٹریت کا حصہ بھی چھل گیا۔

☆☆☆☆

اپنے اعترافی بیان کے مطابق پیڑ روٹو نے صرف ایک سو ڈور میں 110 لڑکیوں کی جان لی۔ پڑوسی ملک کولمبیا میں 100 مصوم لڑکیاں اس کی خوفناک درندگی کی بجائے چڑھ گئیں۔ پورے میں اس نے مزید 100 سے زائد لڑکیوں کو چھڑا ڈالا۔

ایسا تو جیل کے ڈائریکٹر وکٹر ویگولای کیون کا کہنا تھا "پیڑ روٹو نے جتنے اعترافات کیے ہیں اس کے بعد یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مقتولین کی تعداد درحقیقت نامعلوم ہے اور جن سے سوال کرتی ہے۔ یہ امر ناقابل یقین ہے کہ وہ اتنے طویل عرصے تک اتنے بھیا تک خون خرابے کے باوجود کبھی آزادانہ کارروائیاں کرتا رہا۔ اس جیسے مجرم کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی سزا ایسا دشمن ہوئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ختم کیا جاسکتا ہے اور بس۔ اسے کسی بھی طریقے سے مارا جائے، اس کے جرائم کے مقابلے میں یہ کم سے کم سزا ہوگی۔

"تعداد 300 سے زیادہ اس لیے ہے کہ شروع میں قاتل تعاون کر رہا تھا۔ ہمیں قبروں اور لاشوں تک پہنچا رہا تھا۔ پھر اس کا ذہن بدل گیا۔ اس نے تعاون اچانک ختم

کر دیا۔ وکٹر ویگولای کیون نے بتایا۔

پیڑ روٹو کا سلیب نمبر 14 دراصل عورتوں کے سیکشن میں تھا۔ محض اس لیے کہ اسے دوسرے قیدی مردوں کے قبضہ و غصب سے محفوظ رکھا جاسکے۔ دو مین سیکشن کی قیدی عورتیں اس لیے محفوظ تھیں کہ لڑکی پیڑ روٹو کو بہت بری طرح پائید کیا گیا تھا۔ سلیب نمبر 14 پر جن گاڑا ہر وقت مسلا رہے تھے اور تین رات میں آجاتے تھے۔ کھانے کے لیے بھی سلیب کھولنے کی اجازت ملتی پڑتی تھی۔ اس وقت سب کا روٹی کا تعداد پڑھا دی جاتی۔ عورتوں کے سیکشن میں قیدی اس لیے بھی محفوظ تھیں کہ پیڑ روٹو کی ہنسی کے روی صرف کم سن لڑکیوں تک محدود تھی۔

☆☆☆☆

کم سن لڑکیوں کا قاتل جس خاندان سے تعلق رکھتا تھا وہاں سلیب نمبر 13 پہنچے تھے۔ پیڑ روٹو کا سب سناواں تھا۔ اس کی ماں کولمبیا کے ایک چھوٹے سے ٹاؤن ٹویمیا میں طوائف تھی۔ پیڑ روٹو جب آٹھ برس کا ہوا تو اس سے سڑکوں پر آوارگی کے لیے چھوڑ دی۔ اس عمر میں بھی وہ جانور تھا اور چھوٹی بچوں تک سے دست درازی کرتے میں کوئی خاص نہیں محسوس کرتے تھا جس کے باعث اسے گھر سے بھٹل کر دیا گیا۔

وہ ایک مرتد سڑک پر بھوکا پیاسا دور ہا تھا تو کسی اجنبی نے اسے چٹا ہالیا۔ وہ ابھی بھی شیطانی حوصلے کا مالک تھا۔ بعد ازاں اس نے پیڑ روٹو کے ساتھ غیر فطری فعل کیا۔ اس واقعہ نے اس کی نفسیات پر ایسی ضرب لگائی جو جبرانی میں چھید گیوں میں وصل کر اسے درندگی کے راستے پر لے گئی۔ مستزاد یہ کہ اس کا خاندانی پس منظر بھی مکروہ تھا۔

لیکن اس کی بگ روی نے جو شدت اختیار کی وہ بے انتہا ہولناک تھی۔ نہ صرف اس پر "اٹھارہ کے مغرب" کا لیبل چسپاں ہو گیا، بلکہ اس کا نام تاریخ کے بدترین، قاتل نفرت قاتلوں کی فہرست میں درج ہو گیا۔

پیڑ روٹو کے ساتھ کچھ مین میں جو زیادتی ہوئی، اس سے بند بچکوں پر سونے کا خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا۔ اس نے پولیس کو بتایا۔ "میں بازاروں کی سڑکیوں اور عمارتوں کے محروم پر سو جاتا تھا۔"

یوگوتا میں ایک امریکی جہلی نے لاوارث بچوں کے لیے فلاحی کام شروع کیا تو پیڑ روٹو کولمبیا کے قیدیوں کے اسکول میں داخل کر دیا۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو ایک منجر کے ہمراہ اسکول سے رقم چرا کر بھاگ نکلا۔

منجر ایک درمیانی عمر کی عورت تھی اور اپنی شیطانی

خواہشات کی تکمیل چاہتی تھی۔

اتحادہ سال کی عمر میں اس نے کار چرائی اور کولمبیا سے نکلے ہوئے پکڑا گیا۔ پیڑ روٹو ٹیل ہوئی۔ ٹیل میں دوسرے دن ہی وہ جہاد قیدیوں کے سب سے بڑا ہوا۔ کچھ کی مکروہ کہانی پھر دہرائی گئی۔ پیڑ روٹو اب بچہ نہیں تھا۔ اس واقعے نے اسے غصہ ناک کر دیا۔ پیڑ روٹو نے وحشیانہ انداز میں جادو کو نشانہ بنایا۔

اس نے تین قیدیوں کو کھانے لگا دیا اور پھر چھپتا چھپتا جان بچا کر نکل گیا۔ ذاتی دفاع کی بنیاد پر اس کی سزا میں صرف دو برس کا اضافہ کیا گیا۔

جب پیڑ روٹو ٹیل سے رہا ہوا تو اس وقت تک وہ تمام برائیوں سے نہ صرف آگاہ ہو چکا تھا بلکہ ان کا ذائقہ بھی چکھ چکا تھا۔ اس کے جیل کے ایام کی تکمیل اس قدر مکروہ ہے کہ اسے خیر میں لانا ممکن نہیں۔

☆☆☆☆

"پہری مصومیت آٹھ برس کی عمر میں بنا ہوئی تھی۔"

اس نے پولیس کو بتایا۔ دراصل جب پیڑ روٹو لیکن اسکول سے رقم چوری کر کے منجر کے ساتھ فرار ہوا تھا تو جب سے ہی اسے عورتوں سے نفرت ہوئی تھی۔ جس کا بدلہ اس نے کم سن و مصوم لڑکیوں سے لیا۔

1978ء تک وہ "پڑ" کی 100 سے زیادہ لڑکیوں کی بے رحمی کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ ان میں زیادہ لڑکیاں پورے شمالی علاقے میں موجود "آپا کوچو" نامی انڈین قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں یا پھر دیگر انڈین قبائل سے تھیں۔

اس کے جرائم کی پاداش اس وقت روشنی میں آئے جب وہ نو سال لڑکی کو ساتھ لے جا رہا تھا اور "آپا کوچو" قبیلے کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ انہوں نے اسے برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا پھر ایک گھر سے گڑھے میں قید کر دیا۔ وہ اسے زندہ دفن کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک امریکن مشنری نے اس کی زندگی بچائی۔

امر بچتا اسے جب میں بٹھا کر پولیس پوسٹ تک لے گئے۔ چند روز میں اسے ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اس وقت پولیس متحول انڈین لڑکیوں کے معاملے میں الجھتا نہیں چاہتی تھی۔ بعد ازاں جب محل حقائق سامنے آئے شروع ہوئے تو باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہوا۔

سرحد پار انکو سے ڈور میں غارت گری کا بازار گرم

فہ

وہ زمین جو غیر مسلموں سے لڑے بغیر حاصل ہو۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب قبیلہ بونٹسیر کو رسول اکرم کے عزم سے مدد لینے کے لالہ دیا گیا تو ان کی زمینیں مسلمانوں کے ہاتھ میں آئیں اور رسول اکرم نے خاص حالات کی بنا پر ان زمینوں کو مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اس طرح خیبر اور دکن کے بیویوں کے زمین ہاتھ آئے پر اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ شہر کے لوگوں سے جو زمین نے میں ملی ہے وہ رسول خدا، اہل بیت، قبیحوں و مساکین اور ابن اسمیل کا حصہ ہے۔ اس طرح زمین کو مال تقسیم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب دوسرے ممالک فتح ہوئے تو صحابہؓ کے مشورے سے ان علاقوں پر بھی نے کا ہی اطلاق کیا گیا، تاکہ اس کی آمدنی عام مسلمانوں کے کام آئے۔ یہ زمین بھائے مسلمانوں کے مقامی لوگوں کو کاشتکاری کے لیے دے دی جاتی تھی۔ آگے چل کر خراج، جزیہ اور اسی طرح کے دوسرے ٹیکس بھی نے میں شامل کر لیے گئے۔

فیاض علی

1895-1959ء

پاکستان کے سابق انارنی جنرل اور ناول نگار۔ نقیض آباد (پوٹی) میں پیدا ہوئے۔ مسلم پرنسپل ملی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ لاکھ ڈگری لینے کے بعد فیض آباد میں وکالت شروع کر دی لیکن کچھ عرصے بعد کلکتہ چلے گئے۔ 1946ء میں یوپی اسمبلی کے رکن بنے۔ آج اور آزادی کے بعد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہاں ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران ہی انہوں نے چھ ماہ تک بائیکوٹ کے بیج کی حیثیت میں بھی کام کیا۔ فروری 1950ء میں جب پاکستان کے پہلے ایڈووکیٹ جنرل محمد وسیم وفات پا گئے۔ تو یہ عہدہ فیاض علی کو تفویض ہوا۔ 1956ء میں انہیں انارنی جنرل مقرر کیا گیا۔

مرسلہ: اوقاف عطاری، حیدرآباد

ہوا۔ ”مجھے اٹکے ڈور کی لڑکیاں پسند آئیں۔“ اس نے پولیس کو بتایا۔ ”وہ قابلِ بھروسہ اور زیادہ معصوم ہوتی ہیں۔ وہ کوئین لڑکیوں کی مانند اجنبیوں پر شک نہیں کرتیں۔“

”میں لڑکیوں کو منتخب کرتے وقت خاص قسم کی معصومیت کو دیکھتا تھا۔“ نشانہ بنانے کے بعد میں گلا گھونٹ دیتا۔ انہیں مرتاد دیکھتا رہے لیے غیر معمولی بیان کا باعث تھا۔ میں مرتی ہوئی لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتا رہتا جب تک آنکھیں بے نور نہ ہوجاتیں۔ لڑکیوں نے حراست بھی نہیں کی۔ ان کو حراست کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ لڑکی کو دفنانے کے بعد میں اگلے شکار کے لیے نکل جاتا۔ میں نے بھی اپنے شکار گورنٹ میں ہلاک نہیں کیا۔ کیونکہ میں دن کی روشنی میں انہیں مرتاد دیکھنے میں لطف محسوس کرتا تھا۔“

☆☆☆

تین ممالک کی پولیس آپس میں تعاون کر رہی تھی۔ تاہم انہیں اب بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی ”ماس کلاٹر“ (Mass killer) کو گھوم رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا واسطہ کسی مظلوم بزرگ زمین اداکار سے ہے جو لڑکیوں کو اغوا کر کے بطور ملازم فراہم کر رہا ہے اور انہیں قید کر رہی ہے۔

اپریل 1980ء میں ایمانوئل قریب ایک دریا نے چار لڑکیوں کی لاشوں کو اٹھا۔ عوام نے پولیس سے رابطہ کیا اور قاتل کی تلاش شروع ہوئی۔ تاہم کوئی کامیابی نہیں ملی۔

چند روز بعد کارلینا راموت پودا کی بارہ سالہ لڑکی غائب ہوئی۔ پودا، پلازار روز مارکیٹ میں کام کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کی بیٹی ماریا آس پاس نہیں ہے۔ وہ وہاں ان کی مائیں پلازار میں ماریا کو آواز دیتا ہوا دھڑکتا تھا۔ اچانک اس کی نظر پلازار سے باہر گئی وہ کسی اجنبی کا ہاتھ پکڑے جا رہی تھی۔

پودا، باہر کی جانب پکا اور پیڑ روک جالیا۔ پیڑ رو تاکہانی اقامت سے گھبرا کر گر پڑا تھا۔ پودا مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ آقا خان لوگ جمع ہو گئے اور پیڑ رو کو چھاپ لیا۔ اس نے بہت ہاتھ چرماسے ملکہ کی لوگوں کو ڈھکی کر ڈالا تاہم عوام خست مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے سفاک قاتل کو بے دست و پا کر دیا۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی تھی جو جلد ہی جانے وقوع پر پہنچی۔ ماریا باپ سے ملنے رو رہی تھی۔

نیل میں جب پیڑ رو ٹرک کا شکر تھا تو پولیس نے جھانسنے سے اعترافی بیانات حاصل کر لیے اس کے نیل میں

ایک پادری کو بھی بند کر دیا گیا۔ جس کا نام پاسٹر وگاڈو یا گوڈینو تھا۔ پاسٹر وگے قیدی کا روپ بھارت ہوا تھا۔ سلاخوں کے پیچھے دونوں کی دوستی ایک مہینے میں برداں چڑھ گئی۔ جو کہ اس نے پاسٹر وگاڈو کو بتایا اس کی مدد سے پولیس نے بر آسانی اعترافی بیانات حاصل کر لیے۔

ستم خرمی دیکھتے کہ وہ اٹکے ڈور میں پکڑا گیا، وہیں مقدمہ چلا۔ جہاں مر قید کا مطلب زیادہ سے زیادہ سولہ سال قید بھی تیرا بیٹھ رہے تو اس میں بھی نری کی مہاکتی تھی۔ گویا وہ 1990ء میں آزاد ہو جاتا۔ اگر فرد جرم کو لپیٹا میں ماحول ہوتی تو قید روزمرہ کی قید سے آزاد ہو جاتا۔ کیونکہ وہاں کے قانون کے مطابق اسے سیدھا قاتلنگ اسکواڈ کے حوالے کیا جاتا۔

☆☆☆

BBC کے مطابق اٹکے ڈور کی حکومت نے اسے 1980ء میں گرفتار کیا۔ 1998ء کے اواخر میں ہاکر کے کولمبیا ڈی پورٹ کر دیا۔ ایک انٹرویو میں پیڑ وگے خود کو ”مین آف پتھری“ قرار دیا۔

دوسری ڈاکو معری رپورٹ کے مطابق اسے 1994ء اگست کے مہینے میں کولمبیا کے حوالے کیا گیا۔ جہاں اسے باطل قرار دے کر اسپتال بھیج دیا گیا۔ چند برس بعد اس وحشی کو صحت مند سمجھ کر نفسیاتی اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

طرف شاہ شخص 150 اڑکی ضمانت پر اس مغرب کو پھر آباد یوں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اسپتال سے فارغ ہو کر وہ غائب ہو گیا۔

2002ء میں پھر قتل کی اطلاع آئی اور کولمبیا کی حکومت نے انٹرنیٹ سے رابطہ کیا۔

آخری اطلاعات تک وہ اٹکے ڈور کی قید میں تھا۔ اسے رہائی کی امید تھی۔ تاہم رہائی کے بعد وہ وچ وادہ کولمبیا کی حکومتوں کو مطلوب تھا۔

یاد رہے کہ مطابق کسی کو... پتا نہیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ پیڑ وگے کو ”کینگ مشین بھی کہا جاتا تھا۔“

بہر حال زندہ ہے یا مردہ۔ جاننا غیر یز ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش 5 اگست 1948ء ہے۔

پیڑ وگے کو لوڈ لوپ۔ تاریخ کے بدترین قاتلوں میں نمبر فہرست ہے۔

ترکی نمی نم

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو سر سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کننا ہے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم پونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب سفر یوائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں۔ ویسی کچھ سفر رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی پندرہویں کڑی

کو غور سے دیکھتے ہیں کہ آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے جو کچھ میرے اندر نظر کی کمزوری کا سبب بن جاتی ہے۔

”بس بس۔ رہتے دیکھتے اپنی پارسی۔“ بت صاحب

جنگ ناراض ہو گئے تھے۔ ”آپ تو یورپ میں ان چیزوں کو دیکھتے ہی نہیں۔ سڑکوں پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں۔“

ہم نے بات کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر دل دینا ضروری سمجھا۔ ”دیکھتے، پردیس میں اس طرح لڑنا بھگونا مناسب نہیں ہے۔ یہ سارے مجھڑے آپ پاکستان جا کر کر لیجئے گا۔“

”مگر پاکستان میں تو لڑنے بھگڑنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہاں تو ہمارے بہت اچھے تعلقات رہتے ہیں۔“

”کیونکہ وہاں ہمیں نہیں ہوتی۔“ ہم نے بھی غمرہ چست کر دیا۔

مرزا صاحب آگے تھے۔ بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو پیدل ہی چلنا چاہئے۔ یہ بحث تو شاید رات تک جاری رہے گی۔“

مگر ٹیکسی رکی نہیں ٹیکسی کے نہ رکنے کی ہر قہری کرہٹ صاحب گھبراہٹ میں یہ دیکھنا بھول گئے تھے کہ ٹیکسی کے ایک کونے میں ایک بزرگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔

خان صاحب نے کہا۔ ”بت صاحب۔ یورپ میں محکم پھر کر آپ کی آنکھیں کمزور ہو رہی ہیں؟“

”یہ کیا بات کر دی آپ نے؟“ بت صاحب نے غصے میں کہا۔ ”میرے بھائی یورپ میں پھرنے سے اگر آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں تو اس وقت یورپ کی سیاحت کرنے والے سب کے سب اندھے ہو چکے ہوتے یا آنکھوں پر موٹی موٹی پٹی لگاتے پھرتے۔“

”بت صاحب۔ جذباتی نہ ہوں۔ بات کو سمجھا کریں بلکہ اس کی گہرائی میں جایا کریں۔“

”آپ تو بات سمجھ گئے ہیں اور اس کی گہرائی میں بھی اتر چکے ہیں۔ آپ ہی یہ معاملہ کر دیں۔“

”سیر می کی بات ہے، آپ یہیوں کو ان کے مختصر بابوں



بٹ صاحب نے فوراً سامنے سے گزرنے والی ایک دوسری ٹیکسی کو پکارا۔ "ڈولماس۔"

یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ ٹیکسی فوراً رکنگ ہو گئی۔

ہم سب نے حیران ہو کر بٹ صاحب کی طرف دیکھا۔ "بٹ صاحب آپ نے کیا جادو کر دیا کہ ٹیکسی والا آپ کی بے مٹی پکار سن کر رکنگ کر گیا؟"

"جاہلو! تم لوگوں میں سے کسی نے یہ سنا ہے کہ بٹ صاحب نے یہ ٹیکسی کو ڈولماس ہی کہتے ہیں۔"

"آپ کو اتنی جلدی تری زبان میں کس نے باہر کر دیا؟"

یہ "انسان کسی ملک میں جاتا ہے تو صرف یادگاروں اور عجوبوں کو ہی نہیں دیکھتا بلکہ وہاں کا ماحول، طہر طریقے اور لوگوں کے رہن کن اور بول چال پر بھی غور کرتا ہے۔ تحقیق کرتا ہے۔ اور اپنی معلومات اور قابلیت میں اضافہ کرتا ہے۔ آپ لوگوں نے بھی اتنی بلوط کا نام سنا ہے؟"

"ابن بلوط؟" خان صاحب نے دہرایا۔

"وہ کوئی طوطا نہیں تھا۔ انسان تھا اور بہت بڑا سیاح تھا۔"

اس نے ساری دنیا کی سیاحت کی تھی اور ہر ملک کے بارے میں معلومات کی جیسے جڑاؤ آپ جیسے لوگوں کے کام آتی ہیں۔"

"اچھا تو آپ ابن بلوط بننا چاہتے ہیں۔"

"بنا نہیں چاہتے۔ بن گئے ہیں۔ پاکستان واپس جا کر میں بھی ابن بلوط کی طرح اپنے تجربات اور مشاہدات لکھوں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ دنیا کیسے ہے اور ہر ملک کے لوگ کیسے ہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور کافی دیر سے منتظر تھا کہ ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی منزل تک جائیں مگر یہاں تو بٹ صاحب خیالی پلاؤ پکارتے ہیں مصروف تھے۔

بالآخر ٹیکسی ڈرائیور نے ہم سب کو طلب کیا "ہیلو سیر۔"

ہم سب اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بیٹھے نہیں پڑی تب یاد آیا کہ ہم نے ٹیکسی والے کو تری زبان میں آواز دے کر روکا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ ہم لوگ تری زبان جانتے ہیں۔

بٹ صاحب نے فوراً وضاحت کر دی۔ "برادر من تری نمی دافتم۔ آپ انگریزی ٹیکسی والے کی کچھ نہیں سمجھتے کیا۔"

بٹ صاحب نے انگریزی میں پوچھا۔ "ہیو سیک انکس۔"

وہ کوئی خوش مزاج آدمی تھا۔ بولا۔ "تو دافتم۔"

مرزا شرف نے اس کو سمجھایا کہ ہم پرانے تاریخی حمام دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس نے فوراً ٹیکسی سے باہر آکر دروازہ کھول دیا اور بہت ڈرامائی انداز میں اشارے سے کہا۔ "تشریف رکھئے۔"

ہم سب ٹیکسی میں بیٹھ کر تاریخی حماموں کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ٹیکسی ڈرائیور بار بار دہراتا رہا۔ "کی دافتم نمی دافتم۔"

"کیا کر رہا ہے؟"

"بھئی ایک غمزدہ سنا ہے تو اس کو یاد کر رہا ہے۔"

چومٹ نمی دافتم کی گردان کرنے کے بعد شاہی اس کو خیال آیا کہ وہ اپنے مسافروں کو اہمیت نہیں دے رہا۔ اس لیے دریافت کیا "ویریر کی کم؟" مطلب یہ کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔

خان صاحب نے بتایا۔ "پاکستان۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے خوش ہو کر ہم لوگوں کو دیکھا۔ "پاکستان؟"

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ اس نے ٹیکسی سڑک کے ایک جانب روک دی اور ٹیکسی سے نکل کر دونوں ہاتھوں پھیلا کر کہا۔ "خوش آمدید۔ پاکستان کا رویش" مطلب یہ کہ پاکستان ہمارا دوست ہے۔

"کی سی بات کہنے کے لیے ٹیکسی سڑک پر روکنے کی ضرورت تھی؟" بٹ صاحب نے اعتراض کیا۔

"بٹ صاحب۔ آپ کے جسم کا بالائی حصہ کھلا ہے اسے بھی وہ اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہے اور ہم لوگوں سے ملنا چاہتا ہے۔"

بٹ صاحب اگلے سٹاپ پر بیٹھے تھے فوراً ٹیکسی سے اتر کر انہوں نے "مرحبا" کر کے ٹیکسی ڈرائیور کو گلے لگایا اور بات چیت کرنے لگے۔ ہم سب بھی ٹیکسی سے اتر کر باری باری گلے لگنے لگے۔

بٹ صاحب بولے۔ "کتنا اچھا دستور ہے۔ مگر صرف مردوں کے لیے ہی کیوں؟"

"آپ کا مطلب ہے کہ جو خاتون آپ سے ملے وہ بھی آپ کے گال چومے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "شکر ہے کہ ٹیکسی والا اردو نہیں جانتا ورنہ ہم پاکستان کے بارے میں یہ کیا سوچتا کہ اس کی گدی ذہنیت ہے۔ تم پاکستان کو بدنام کر دو گے۔"

ٹیکسی والا دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اس لیے ہم لوگ بھی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی والا بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کا خوش مزاج شرف نے اس کو سمجھایا کہ ہم پرانے تاریخی حمام دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہم نے سر ہلا کر ان کو کہہ دیا۔ اس نے فوراً سٹاپ چلا دیا۔ تری ہو سکتی تھی، مگر تو ہر گاہ ایک ہی طرح کا گلہ تھا۔ تریوں کو شاید ایک ہی وجہ نہ تھی بلکہ اس کی باریکیاں وہ ہم سے زیادہ سمجھتے ہوں گے۔ جیسے ہمارے بچے کے گم ہونے کی ہم ہی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی فیرنگی سے تو اس کو بھی وہ ایک ہی جیسے لگس گئے؟"

اسٹیشن میں ٹیکسی کا طریقہ یہ ہے کہ عموماً چار مسافر ایک وقت ٹیکسی میں سوار ہوجاتے ہیں۔ جن کی منزل ایک ہوتی ہے یا پھر انہیں اسی راستے میں اتر جانا ہے۔ ٹیکسی والا ہر ایک سے طے کر لیتا ہے کہ کون کونسی ٹیکسی طلب کرتا ہے۔ مگر کے مطابق جو رقم بنتی ہے وہی چاروں مسافروں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ یہی یہ معلوم کر کے لاہور کا پرانا روڈ یاد آ گیا۔ اس زمانے میں رکشا ٹیکسی تو تھی نہیں۔ سوز کاریں بھی پرانے نام ہی تھیں اس لیے تاکہ شہر میں واحد سواری کا ذریعہ ٹیکسی۔ ٹیکسی چوک پر انگوں کا لالہ تھا جہاں تاکنے والے ڈاکٹر ایڑیاں لگاتے رہتے تھے۔

"بھائی کو باری بھی۔ دو آئے سواری بھی۔"

تاکنے میں اس کے صرف ایک مسافر تھا۔ ٹیکسی پھیلائے بیٹھا ہوا کچھ کہنے کے دو کوئی خوشحال یا امیر آدمی ہے۔ ورنہ تاکنے میں چار سواریاں بیٹھا کرتی تھیں۔ تاکنا اگرچہ سواری کا واحد ذریعہ تھا لیکن پھر بھی مال روڈ پر تاک جھانپنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ تاکہ مال روڈ کو پورے رستے تھا۔ اس لیے عام طور پر تاکتے جیتے خوشحال لوگ بھی مال روڈ کے پاس آکر تاکتے سے اتر جاتے تھے اور جہاں جانا ہوتا تھا وہاں پیدل ہی پہنچتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ مال روڈ کی فٹ پاتھوں پر پیدل چلنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

ہم لوگوں کو یہ اطلاع مرزا شرف نے پہلی ہی دے دی تھی لیکن ہم تو جاری افراہمے اس لیے پوری ٹیکسی لیا کرتے تھے۔

ٹیکسی والا ہم سے پوچھ رہا تھا کہ آپ لوگوں کو کہاں جانا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس شخص کے انگریزی سوچتا رہا پھر دریافت کیا "ہیو سیر گوا؟" یعنی کہاں جانا ہے۔ جن ملکوں میں انگریزی نہیں بولی جاتی وہاں اسی قسم کی انگریزی سے کام چلایا جاتا ہے۔ ہمیں کئی ملکوں کا تجربہ تھا اس لیے ہم سب کو اس کا مطلب اور مفہوم سمجھ لیا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں ایک بحث شروع ہوئی۔ ہر ایک کی رائے الگ تھی بالآخر مرزا شرف کا عقائد مشورہ کام آیا اور ہم سب نے آجوں فوکس آرتھوڈاکس چچ کا نام بتا دیا۔ (نوٹ) اگر تانوں کے تعلق میں لفظی ہوتو معذرت۔ اس لیے کہ تریوں کا طرز اداس کی اور نام مختلف ہوتے ہیں جنہیں یاد رکھنا دشوار ہے) یہی ایک پرانا تاریخی چچ ہے اور قدیم طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ مرزا شرف اس چچ کے

بارے میں معلومات فراہم کرنا چاہتے تھے لیکن بٹ صاحب نے کہا "تقدیر مختصر یہ کہ یہ ایک پرانا چچ ہے۔ کئی زمانے میں یہاں عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔"

"بٹ صاحب۔ نماز صرف مسلمان پڑھتے ہیں۔ عیسائی عبادت کرتے ہیں یا پادری کے سامنے اٹھ کر گناہ کر کے اپنے تمام گناہ معاف کرا لیتے ہیں۔"

بٹ صاحب بولے "سواری۔ میرا بھی مطلب تھا۔ ویسے خان صاحب عیسائیوں کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ پادری کے سامنے پروں کے پیچھے بیٹھ کر اپنے تمام گناہوں کی تفصیل بیان کر دیتے ہیں اور پادری صاحب دعا پڑھنے کے بعد کہتے ہیں۔ آرام سے گھر جاؤ تمہارے سامنے کچھ گناہ معاف ہو گئے۔ اب تم بے غمری سے آجیہ جتنے گناہ گناہ کر سکتے ہو۔ جب گناہوں کا پورہ جڑ جائے تو اگر معاف کر لیا گیا تو گناہ نہیں ہے۔"

"ٹیکس ہے۔ مگر مجھے آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ اس طرح تو ہر ایک کو گناہ کرنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اسی لیے تو یہ لوگ باور پڑا آدمی ہوتے ہیں۔ بہر حال یہاں کوڑے ہو کر پتہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس چچ دیکھ لیا۔ سب آگے چلے۔ چچ دیکھنا ویسے بھی گناہ ہے۔"

"آپ جتنی کب سے بن گئے۔ بلاوجہ لوگوں کا ایمان خراب کرنے کے لیے۔"

"بھائی۔ جتنی تو آپ بھی نہیں ہیں مگر فوسے مقبول کی طرح دیتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔ ناراض نہ ہوں۔ چچ تو دیکھ لیا۔ اب آگے چلے ہیں۔"

"آپ شاید بھول گئے ہیں کہ ٹیکسی ہم نے ابھی تک چھوڑی نہیں ہے۔ وہ بے چارہ شریف آدمی ہمارا انتظار کر رہا ہوگا بلکہ سوچتا ہوگا کہ کس میرا کرایہ نہ کر بھاگ ہی نہ جائیں۔"

ہم سب دوبارہ ٹیکسی والے کے پاس گئے اور اس سے پوچھا۔ "پادری؟"

اسی انگریزی تو وہ جانتا تھا۔ فوراً ٹیکسی سے اتر کر میری رقم بتائی۔ کرایہ وصول کرنے کے بعد اس نے دوبارہ ہم سب کو گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ ہم سب کے گال چومے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہاتھ ملاتے اور رخصت ہو گیا۔

ٹیکسی کے رخصت ہونے کے بعد ہم لوگ آگے بڑھے۔ راستے میں ایک اور تاریخی عمارت نظر آئی جس کا نام بہت مشکل تھا اس لیے ہم کو نہیں رہا لیکن اس سے کچھ واسطے پرائیویٹ صحن کی خوبصورت مسجد دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ یہ

مسجد باسٹورس کے کنارے واقع ہے۔ کچھ قاصلے پر ساحل پر
 سیاحوں کا جھوم دور ہی سے نظر آگیا۔ یہاں سردی کے ساتھ
 ساتھ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش
 شروع ہوئی مگر یہاں کے شوق اور جوش و خروش میں کوئی کمی
 نہیں آئی۔ ساحل پر ریستوران بھی ہیں۔ ان ریستورانوں میں
 خاص طور پر ترکی کھانے تیار کئے جاتے ہیں جو سیاحوں کی دلچسپی
 کا ذریعہ ہیں۔ ”جوکم“ یہاں کی سوغات ہیں۔ یہ مٹھا گوشت
 ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو پھنسی نہیں آئی۔
 بٹ صاحب نے فقرہ کہا۔ ”زندگی میں پہلی بار گوشت
 کی سویت ڈش کھائی ہے۔“
 یہاں عجیب بات یہ ہے کہ قہودہ سخت کڑوا ہوتا ہے۔ یہ
 گاڑھا ہوتا ہے اور چٹکی اور دودھ کے پھیلا کر پیا جاتا ہے۔ عرب
 میں بھی یہی روایع ہے۔ اس قدر کڑوا کہ ہر کسے حلق سے اتارنا
 مشکل ہے۔ لیکن ترک بڑے حسد سے لے کر بے قہودہ پیتے ہیں۔
 قافلہ بھی کہا ہوں کہ ایک قسم ہے۔ ترکی میں کی قسم کے کباب
 ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کا حوالہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ
 فروٹ کا کب نیل بھی تیار کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح
 ٹوٹی فروٹنی آئس کریم ہوتی ہے یہی نوعیت کی مٹھائی ہے جس
 میں مختلف قسم کے پھلوں کو کھس کر دیا جاتا ہے۔ صرف اس میں
 آئس کریم نہیں ہوتی۔ سمندر پر چلنے والے بادل سے محسوس ہورہے
 تھے۔ حالانکہ یہ کبر تھا۔ سامنے باسٹورس کا ٹیٹر آ رہا تھا جس
 کی وجہ سے ماحول کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ باسٹورس
 کا پہلا استقبال کے معرکی اور مشرقی حصوں کو ملتا ہے۔ جس پر
 سے دن میں کئی بار گندہ ہوتا ہے لیکن اگر ساحل پر سے دیکھو تو یہ
 ایک حسین منظر ہے جس میں درجائی کے ساتھ ساتھ ایک مروجہ
 کن کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ ہم لوگوں نے ایک ریستوران
 میں بیٹھ کر یہ سب چیزیں دیکھیں۔ بٹ صاحب کے مشورے پر
 ہر ایک نے ایک ٹی ڈش کا آرڈر دیا اور سب چیزوں کا حذر
 چکھا۔ ایک اور مہر ترک وٹیر سفید ابھر تھی گلے میں ڈالے یہ
 دریافت کرنے آیا کہ کیا ہم قہودہ چنا پسند کریں گے۔ خان
 صاحب نے کہا۔ ”خدا کے لیے قہودہ نہ چاہو۔ بہت مہربانی ہوگی،
 اردو کا یہ فقرہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو مرزا اشرف نے ترکی
 زبان میں اس کو بتایا کہ شرب ہم قہودہ نہیں پیتے۔
 وہ یہ سن کر حیران رہ گیا۔“ آپ لوگ قہودہ نہیں پیتے۔ اس
 کے بغیر تو کھانا بھسم ہوتا ہے نہ ہی کھانے کا لطف آتا ہے۔“
 بٹ صاحب بولے۔ ”ہمارے حصے کا قہودہ ہم اپنی کر لطف
 اٹھالیں۔“

کچھ قاصلے پر بلرز پارک ہے۔ یہ قہوڑی اونچائی پر ہے
 اور صرف باغ بہت خوبصورت ہے بلکہ یہاں سے دور دور
 تک کا نظارہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس پارک کو دیکھ کر اسلام آباد کا منظر
 بڑیاں یاد آ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک خوبصورت اور سرسبز پارک ہے
 اور یہاں سے اسلام آباد کا منظر بہت خوشنما لگتا ہے۔
 اس پارک میں ہم نے پہلی بار آوارہ کتوں کو دیکھا۔ آوارہ
 اس لیے کہ ان کی ڈوری کسی کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اس سے زیادہ
 خطرناک بات یہ تھی کہ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی انہوں نے ہمیں
 شروع کر دیا۔ ہم نے بہت جلد ہی ان کی نظر ان پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ
 انہوں نے اور زیادہ جادو ماندار بھونکا شروع کر دیا۔
 خان صاحب نے کہا۔ ”بھائی یہ استقبال کے کئے ہیں۔
 ہمیں کچھ نہیں سمجھتے۔“
 بٹ صاحب کتوں سے بہت ڈرتے ہیں، کہتے گئے
 ”میں تو کسی درخت پر چڑھ جاتا ہوں۔“
 ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب فکر نہ کیجئے جو ہم سب کا حال
 ہوگا وہی آپ کا ہوگا۔ آپ نے سنا تو ہوگا کہ ٹائٹل بھاری نے
 لکھا ہے کہ بھونکے ہوئے کتے کا کٹہ نہیں ہیں۔“
 ”تی ہاں۔ اور انہوں نے یہ بھی تو لکھا ہے کہ کچھ پانچویں
 کھونکے والا کتب بھونکا بند کرے اور کاٹا شروع کر دے۔“
 شکر ہے کہ ہم غرضت ان بھونکے ہوئے کتوں کو چھوڑ کر
 آگے نکل گئے۔ انہوں نے کچھ دور تو ہمارا پیچھا کیا مگر پھر ہمیں
 ہو کر ان کی ٹوٹی وانہیں چلی گئی۔ ہم اس بات پر حیران تھے کہ
 استقبال میں ہم نے کسی جگہ آوارہ کتوں کی ٹوٹی نہیں دیکھی تھی۔
 کتوں سے جان چھوٹی تو بلرز پارک کا منظر دیکھ کر ایمان
 تازہ ہو گیا۔ اس قدر خوبصورت پہول مختلف کھیلوں میں اور
 ترتیب کے ساتھ لگائے گئے تھے کہ کئی خوش ہو گیا۔ چھوٹوں کے
 اپنے بہت سے رنگ تھے کہ لگتا تھا رنگوں کا مقابلہ ہورہا ہے۔
 بٹ صاحب نے ایک جگہ جھک کر مختلف پہولوں کو سمجھا۔
 ”بٹ صاحب۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“
 ”دیکھتے نہیں کہ میں پہولوں کی خوشبو سمجھ رہا ہوں۔
 اگر بڑوں کے پہولوں میں تو خوشبو نہیں ہوتی مگر اب معلوم ہوا
 کہ بڑی کے پہولوں میں بھی خوشبو نہیں ہے۔“
 ”یہ بھی مغربی اثرات ہیں۔ جب انسانوں نے مغربی لباس
 اپنایا تو پہولوں کو بھی اپنے مغربی لباس کا اثر لینے کا حق ہے۔“
 ”اب ہم کہاں جائیں گے؟“ بٹ صاحب نے مرزا اشرف
 سے اس طرح دریافت کیا جیسے شاگرد استاد سے کوئی سوال کرتا ہے۔
 کسی اور جگہ جانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ بارش ایک

بارش شروع ہو گئی تھی۔
 میرا خیال ہے ہم کوکٹن تھی اسٹریٹ جانا چاہیے۔“
 ”وہاں ہم کیا کریں گے؟“
 ”یہ استقبال کی ایک فیشن پہول مڑک ہے جہاں بڑے
 بڑے اسٹور اور سٹے سٹے فیشن دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بعض جگہ تو
 وقفے وقفے سے فیشن پر پڑ بھی ہوتی رہتی ہے۔ دراصل یہ
 اسٹریٹ کے لیے بہت موزوں جگہ۔“
 ”مگر ہم تو امیر نہیں ہیں اور نہ ہی فیشن کے دلدادہ ہیں۔“
 ”ارے چھوڑو۔“ بٹ صاحب نے ان کی بات کاٹ
 دی۔ ”فیشن شو تو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے دیکھنے کے لیے کھٹ
 بھی نہیں لینا پڑتا۔“
 خان صاحب بولے۔ ”بٹ صاحب نے تندرلی میں چوچی
 مروجہ کی بات کی ہے۔ ہم نے آج تک فیشن پر پڑے اور کٹ
 واک کی وی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ یہ تجربہ بھی سہی۔“
 بٹ صاحب ناراض تھے۔ پوچھنے لگے۔ ”میں بھی محض
 کی بات نہیں کرتا۔ آج میں نے چوچی پارسل کی بات کی ہے؟
 اب یہ بھی بتا دیجئے کہ تین پارسل سے کب اور کہاں محض کی
 بات کی گئی۔“
 ”وہ میں بھول گیا۔“
 ہم نے مشورہ دیا کہ یہ بحث تو بول رہا کر بھی ہو سکتی ہے۔
 ہم یہاں پروسیات کے لیے آئے ہیں۔ مگر اب کچھ غور خواہش کی
 طرح قدم قدم پر بحث اور منظر کر رہے ہیں۔ اگر کبھی طریقہ ہا
 تو میں تو بول واپس جا کر آرام کروں گا اور کئی وژن دیکھوں گا۔
 آپ لوگ اپنے مسائل پہولوں پر حل کرتے رہیں۔“
 ہماری طویل دھمکی کا ذکر ثابت ہوئی اور طے پایا کہ اب جگہ
 سے جگہ بحث کرنے سے پرہیز کریں گے۔ بٹ صاحب نے فٹ
 پاتھ پر کڑے ہو کر ہر آنے جانے والی ٹیکسی کو دیکھنے کے لیے ہاتھ
 بلاتا شروع کر دیا۔ جب ٹیکسی قریب سے گزرتی تو وہ ٹیکسی ڈرائیور
 کا کلاب کر کے ”ڈولس ڈولس“ نکالتے تھے۔
 خان صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب۔ پہلے دیکھ تو لیجئے
 کہ ٹیکسی خالی بھی ہے یا نہیں اور دوسری طرف جانے والی ٹیکسی
 کو دیکھنے کی خوش نہ کیجئے۔ یہاں کیلنڈر ٹریک ہے۔“
 بٹ صاحب ناراض ہو گئے۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ
 ٹیکسی کو روکنا بھی ایک مشکل اور ٹیکنیکل کام ہے۔ اب آپ
 کوکٹن کر کے دیکھ لیجئے۔ سویت وٹیر۔“
 خان صاحب نے بڑے شائستہ انداز سے کہا۔ ”شکریہ۔“
 انہوں نے سویت بعد اشارہ کر کے ایک ٹیکسی کو روک لیا۔

ٹیکسی والا خوش لباس اور خوش فعل تو جوان تھا۔ ٹیکسی
 روک کر اس نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا گو یا پوچھ رہا ہو کہ جانا
 کہاں ہے آپ کو؟
 خان صاحب مڑک کا نام بھول گئے تھے۔ بولے ”نکٹنی
 اسٹریٹ۔“
 ٹیکسی ڈرائیور نے بہت شائستگی سے پوچھا۔ ”ہلیز ونس دور۔“
 اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ٹیکسی انگریزی سے بالکل ہی
 بیدل نہیں مگر اپنا مطلب سمجھا دیتا ہے۔
 مرزا اشرف نے کہا ”سوری ہر اور نشان تھی اسٹریٹ۔“
 ڈرائیور نے باہر نکل کر ہر طرف دیکھا۔ ”یو ٹو چی؟“
 مطلب یہ کہ آپ کا سامان کدھر ہے۔ ہم نے اشارہ کر کے بتایا
 ہم لوگ ہی سامان ہیں۔
 اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر ڈرائیور کی اعاز میں چھینے کا
 اشارہ کیا اور ہم سب لوگوں کے چھینے کے بعد مشورہ شروع کرنے
 سے پہلے ہی اس نے دعا پڑھی اور خود اپنے علاوہ ہم سب لوگوں
 پر بھی چھونک ماری۔
 ٹیکسی سامان لگتا ہے۔ خان صاحب نے فقرہ کہا۔ ٹیکسی
 اشارت کرنے سے پہلے اس نے ہم سب کو سکرا کر ج بکھر کہا
 اور گاڑی اشارت کر دی۔
 ہم لوگ جنی مڑکوں سے گزرتے سب کی سب صاف
 ستھری تھیں۔ پرانی ملز کی عمارتوں کے پہلو پہلو ہلے
 عمارتیں بھی تھیں۔ فٹ پاتھ اور کتوں میں سیاحوں اور مقامی لوگوں
 سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر دکان پر جھوم نظر آ رہا تھا۔ دکانیں مختلف
 قسم کی اشیاء سے پر تھیں۔
 ایک موزک سٹے کے بعد ہم نشان تھی اسٹریٹ پر تھے۔ یہ
 مڑک خاصی کشادہ تھی اور یہاں کے شور دم دیکھ کر ہی اعازہ
 ہو جاتا تھا کہ یہ واقعی فیشن کا علاقہ ہے۔ مختلف اقسام کے
 لمبوسات اور سٹے سٹے اعازے کے پکڑے جوتے اور آؤٹس حسن
 کا سامان بڑی خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔
 ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار بھلی کر دی اور پوچھا۔
 ”وٹیر اسٹاپ؟“ ”اتھا تو آپ بھی مجھے بھگے ہوں گے کہ ان کا
 مطلب کیا تھا۔“
 خان صاحب نے ہم سب کی طرف دیکھا اور ڈرائیور
 سے کہا۔ ”تمام۔“ بس یہی روک دیجئے۔ مشورہ ہم لوگ۔
 ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جانب ٹیکسی روک دی اور باہر
 نکل کر کھڑا ہو گیا جوں ہی ہم لوگ باہر نکلے ٹیکسی ڈرائیور نے
 خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”پاکستان؟“

ہم سب نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ اس نے بڑی گرجوئی سے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور گنگے لگا دیا۔

”پاکستان کا دروش“ پاکستان تو ہمارا دوست ہے۔ ہم نے کئی ملکوں کا سفر کیا ہے جن میں مغربی۔ ایشیائی اور مسلم ممالک بھی شامل ہیں لیکن پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے جو محبت ترکی میں دیکھی وہ اور ہمیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ عرب ممالک کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پاکستانی ہو یا ہندوستانی۔ ایشیائی ہو یا افریقی وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہاتھتے ہیں۔ جب ہم کھانا پارہ دیتی تھے تو وہاں کے اہلکاروں کا کرخت اور درشت رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ اگر آج کے چھوٹے دور میں ان کا یہ طرز عمل ہے تو پھر اسلام سے قبل ان کا کیا انداز ہوگا۔ ان ہی بددوشوں کو آغوشِ درویشی اور محبت آمیز رویے نے انہیں دنیا بھر کے لیے ایک مثالی انسان بنادیا۔ رسول اللہ تو اللہ کے آخری نبی تھے۔ ان کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ آغوشِ درویشی، نصیحتوں اور ہدایات کی شکل میں جو پیغام چھوڑ گئے ہیں ہمیں نہ صرف انہیں یاد رکھنا چاہیے بلکہ ان پر پوری طرح عمل بھی کرنا چاہیے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دوسری عبادات کے بارے میں تو ہم سنت نبویؐ کی یا قاعدہ کی سے پیروی کرتے ہیں خصوصاً ان باتوں کے سلسلے میں جو ہمیں اس آئی ہیں لیکن کیا ہم کی زندگی میں بھی آغوشِ درویشی کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب نہیں ہوگا۔

رسول اگر ہم سب کے لیے شہداء والیے کریم اور اللہ کے برگزیدہ بندے نہ ہوتے تو ہم انہیں آتے اور انہوں نے اپنے بارے میں جو خبر کی ہدایات پر نہ صرف عمل کیا بلکہ انہیں ان کے دور دراز علاقوں تک پہنچا دیا۔ ایسے نیک بندے سب بھی موجود ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا پیغام دنیا والوں تک پہنچا رہے ہیں۔ ہم آج دنیا میں بھی سوا رب کے قریب جو مسلمان دیکھتے ہیں انہیں اسلام کی طرف راغب کرنے والی نیکی بزرگ ہستیاں ہیں۔ برصغیر کو دیکھ کر مسلمان اس ملک میں بہت کم تعداد میں آئے تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اسلام ہمارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ اسلام ہندوستان میں جبر اور بڑبڑتی سے نہیں پھیلا۔ نہ ہی مسلمان بادشاہوں نے ایک ہزار سالہ حکومت کے دور میں بھی غیر مسلموں کو مسلمان کرنے کی کوشش کی اور نہ ہندو جبر و کثرت مان چکے تھے ہزاروں کوشش سے مسلمان ہو سکتے تھے اور آج سارا برصغیر مسلمان ہوتا۔ لیکن بادشاہوں کو تو ہمیں اپنی بادشاہت سے غرض تھی۔ انہوں نے ہندوؤں کو ہر طرح کی آزادی دی اور نوازے میں کوئی کنٹرول نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کی

لڑکیوں سے شادیاں کیں اور ان کی یہ لڑکیاں ان کے بعد ان کی جائیداد بن گئیں۔ جو دھماکی اور اکبر کا پڑا شیشا ہند کے تخت پر جلوہ گر ہوا۔ دارالحکومت نہ صرف آدھے سے زیادہ ہندو بن چکا تھا بلکہ ہندو رسم و رواج کو اپنا کر بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ میں شکر گزار ہوتا چاہیے حضرت خواجہ نظام الدین اور ایسا ہی باپا بیچ فرید بخش جیسے اولیائے کرام کا جنہوں نے اپنے طرزِ عمل اور تعلیمات کے ذریعے غیر مسلموں کے دل جیت لیے۔ یہاں تک کہ جو ہندو مسلمان نہ ہوئے وہ بھی ان کے معتقد اور ان کی خوبیوں کے قائل ہیں۔ آج بھی مسلمانوں کی طرح ہندو ان بزرگوں کے مزاروں پر اپنی مین پوری کرنے کی اچھوٹے کر جاتے ہیں۔

ترکی میں بھی اسلام مسلمانوں کے حسن سلوک کی وجہ سے پھیلا۔ ترکوں نے غیر مسلموں پر بھی ظلم نہیں ڈھالتے بلکہ ان کی حفاظت کے لیے سید پرہیز ہے۔ یہ مسلمان اور دوسرے غیر مسلموں کی حکومت کے زمانے میں لوگوں کا مکمل عام کرتے تھے۔ ان کے مگر بارہا جہاں لوٹ لیا کرتے تھے وہی لیے اس زمانے میں یہ مسلمان آباد بھی مسلمانوں کے حسن اخلاق اور مہربانوں کے قائل تھے۔ مسلمانانہ کیفیتیں ہیں کہ دنیا میں سب سے تیز رفتاری سے سفر کرنے والی شے روٹی ہے یا پھر تصویر یا خیال جو کہ روٹی سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہے۔ ابھی آپ لندن میں کھڑے ہیں کہ ایک آپ کا خیال آپ کو امریکا یا ہندوستان لے گیا اور پھر دوسرے لمحے آپ آسٹریلیا پہنچ گئے۔ ہم اپنے بارے میں یہی سوچ کر حیران تھے کہ کیا ایک انتہائی کی کمین اسٹریٹ بھی کریم ہندوستان اور اولیائے کرام تک کیسے پہنچ گئے۔

ایک بٹ صاحب کی آواز نے ہمیں چمکادیا۔ ”بھائی کہاں ہے وہ فیشن اسٹریٹ۔ میں فوری طور پر ترکی کے بدیع فیشن دیکھنا چاہوں گا۔“

مرزا صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب ہم اس وقت جہاں کھڑے ہیں یہ انتہیل کا سب سے زیادہ فیشن زدہ علاقہ ہے۔ اس پاس انھیں دفن ہے کیسے خوبصورت تعلیمات ہے ہوتے ہیں۔“

بٹ صاحب نے کہا۔ ”مرزا صاحب۔ یہ آپ حسن کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ آپ کو تو میں بہت باذوق تھا کہ آپ تو ذوقِ لطیف سے بالکل محروم ہیں۔“

خان صاحب بول پڑے۔ ”بٹ صاحب آپ کو معلوم بھی ہے ذوقِ لطیف کسے کہتے ہیں؟“

بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ اردو کے مشہور شاعر تھے۔ سارے ہندوستان میں ان کی وجہ سے۔ تو ان اور ڈوٹیاں

ان کی فرمائیں گایا کرتیں۔ ان کا مشہور شعر تو میں نے چھٹی جماعت میں پڑھا تھا آج تک مجھے منہ بانی یاد ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ نہ بانی یاد ہے۔“

”شعر ہے۔“ اردو ہے کیا پتہ ہم ہی جانتے ہیں ذوق سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے۔“

خان نے کہا۔ ”بٹ صاحب۔ آج ہم بھی آپ کی چاہلیت کو مان گئے۔ اچھے خاصے شعر کا قہر بنادیا اور حاکم کی ٹوپی محمود کے سر پر رکھ دینا تو آپ کے ہائیں ہاتھ کا کام ہے۔“

”شکر ہے اس تعریف کا۔“ پھر وہ مرزا صاحب سے چلب ہوئے۔ ”مرزا صاحب ہمیں یہاں لا کر ایک احسان کیا ہے تو اور احسان بھی کر دیجئے۔“

”مگر کیسے۔“

”مگر نہیں۔ یہ میری درخواست ہے۔ اب مجھے جلدی ہے کسی اچھے سے فیشن ہاؤس میں لے چلیے جہاں کیٹ واک یا شوپریڈ ہوتی ہے۔“

”مجھے انہوں سے کہ اس کے اوقات مقرر ہیں۔ ابھی ان کا وقت نہیں ہوا۔ آپ فی الحال خوبصورت ملبوسات پہنے ہوئے خوبصورت بنجے دیکھئے۔“

”مرزا صاحب۔ ڈرا سوچے اگر اس پاس فٹ باقیوں اور کالوں پر جتنی جاتی خوبصورت حسیناں نظر آئیں تو میں ان کے جسموں کو دیکھ کر اپنا وقت کیسے ضائع کر سکتا ہوں۔ آپ کو سلطان جوہر کوئی کا وہ حق تو یاد ہوگا کہ میں بت چکا ہوں۔ بت پرست نہیں۔ ان جسموں کو دیکھ کر اپنا ایمان خراب کرنے سے تو بچرے کہ میں چلتی پھرتی جاندار خدا کی قدرت کے نمونے دیکھوں۔“

اس روئے سے گذر کر ہم ساحل کی طرف چل پڑے۔ ترکی میں اول تو ساحلوں کی کثرت ہے۔ قدم قدم پر جس طرف دیکھتے سمندر نظر آ جاتا ہے۔

اس کی ایک بچکانہ ہی بھی ہے کہ ساحلوں پر پرواز کرنے والے سفید بھاق پرندے اڑتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ انہیں گھر سے اور بڑی جہازوں والے دانہ وغیرہ اڑاتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بڑی جہاز کے اس پاس ہی پکڑ پکڑاتے ہیں۔ کئی چوٹی چلتی نظر آ جاتے تو اس کو بھی چھوچھو مار کر اٹھالیتے ہیں۔

اس عرصے میں ہم ساحل سمندر پر پہنچ چکے تھے۔ چند گلابی کی بیجیں دیکھ کر ہم بھی ایک بیج پر بیٹھ گئے۔ سامنے نظر پڑی تو ایسا صحر دیکھا کہ مجھے ہیرو گئے۔ سامنے نیلے سمندر پر کچھ بھائی ہوئی تھی مگر آہستہ آہستہ رتی تھی۔ اس کے پاس

منظر میں شفق کی رنگینا کر تھیں۔ سورج بس غروب ہی ہونے والا تھا۔ ہم اس منظر کو دیکھ کر اس میں کھو گئے۔ ایسا منظر اور ایسا ماحول ہر روز دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہماری خوشی مستی تھی کہ ہم بہت مناسب وقت پر ساحل سمندر پر پہنچ گئے تھے۔ ساحل سمندر کے ریت ستروالوں کی چھائیاں تو ہم کھادی چکے تھے۔ سوچا کہ اب ہوئی واپس جانا چاہیے۔

ہم نے کہا کہ سوں میں تو اس وقت بہت رش ہوگا۔ بٹ صاحب تو ہل ہل پڑے۔ ”بس نہ ہی ڈولماں پہنی تھی۔“

خان صاحب بولے۔ ”بٹ صاحب۔ یہی پیول بھی چلا کیسے تاکہ ہمیں یاد نہ ہو جائیں۔“

”آپ کو پتا نہیں ہے کہ روزانہ جتنی جاگنگ کرتا ہوں؟“

”کتنی؟ میں نے تو کسی کئی جگہ جاتے ہیں دیکھا بالکل نہیں کرتا۔ بلکہ بول کے کہ میں اس بار پھر لگتا ہوں۔“

”یعنی آپ کر کے کے اندر ہی جاگنگ کر لیتے ہیں؟“

”یعنی مطلب تو جاگنگ کرنا ہے۔ فٹ پاتھ پر کرو یا کر کے کے اندر۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں بیٹھ ورتش کرتا ہوں۔ میرا ورڈز کی قسم دیکھ کر اندازہ لگائیے۔“

”ورڈز آپ کہاں کرتے ہیں۔ یاد رہتی خانے میں؟“

”جی نہیں۔ غسل خانے میں۔“ ہمارا غسل خانہ کافی بڑا ہے۔ میں نے ورڈز کرنے کا سارا سامان ہاتھ روم میں رکھ لیا۔ وزن اٹھانے کا رڈ۔ باکسنگ کرنے کے لیے بڑا سا ٹھیلہ جس پر کھولنے مار کر بھرتین باکس بن گیا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک ساٹنگ جو ایک ہی جگہ کھڑی رہتی ہے۔ لیکن میں اس پر کچھ میل ساٹنگ جلا چلتا ہوں اور ہاں۔ میں نے دو مکدر بھی غسل خانے میں رکھ لیے ہیں۔ دس چھوہ مفت تک روزانہ مکدر دھماتا ہوں۔“

خان صاحب نے بہت عجیبی سے پوچھا۔ ”تو پھر آپ غسل کہاں کرتے ہیں۔ اور آپ نے اپنا فیشن کہاں رکھا ہے۔ کیا غسل خانے کے باہر۔“

”خان صاحب۔ یہ باتیں آپ کی کچھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ نے بھی ورڈز کی ہو تو آپ کو پتا چلے کہ کس چیز کا نام ہے۔“

بٹ صاحب تو ڈولماں ڈولماں کہتے رہے مگر سب نے فیصلہ کیا کہ پیول ہی سفر کرنا چاہیے۔

رہائے میں کئی خوبصورت پارک دیکھے۔ ان میں سے ایک پارک میں جتنے میں دو دن موٹائی کا مفت پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ پارک میں ایک ترحیب سے کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ وہاں

چل قدری کرنے والے ایک بزرگ نے بتایا کہ حکومت نے شہر میں جگہ جگہ ایسے مرکز بنا رکھے ہیں جن سے نوجوانوں میں موسیقی کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی گلابی موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان تقریبات میں انتہائی نظم و ضبط دیکھا جاسکتا ہے۔ ذرا سی بھی بدتمیزی یا لڑائی نہیں ہوتی۔

ہم ان کے پاس ہی ایک منچ پر بیٹھ گئے۔ وہ خامسے باتونی تھے لیکن انگریزی کے معاملے میں آٹاڑی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ دن پہلے انہوں نے انگریزی سکھانے والے ایک اسکول میں بھی داخلہ لیا ہے۔

”وہ دن میں آپ نے سنی انگریزی سیکھی ہے؟“
 وہ مسکراتے ہی اسے ٹی کیٹ۔ آرا سے ٹی ریٹ۔ مگر ریٹ اور کیٹ بولتے ہیں۔ مجھے سے غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ بھی سی اسے ٹی ریٹ اور بھی آرا سے ٹی کیٹ کہہ جاتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزی سکھانے کے لیے ملی اور چہا سے کیوں آغاز کرتے ہیں۔“
 ”اس لیے کہ انگلستان میں بلیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اور چہا سے کم ہوتے ہیں اس لیے کہ بلیاں انہیں غم کر دیتی ہیں۔“

بڑے صاحب سے الوداع۔ خدا حافظ کہہ کر آگے چلے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ بارگ کے درمیان میں ایک بہت وسیع جگہ پر ورزش کرنے والی خبیث نظر آئیں۔ یہ سائیکلس حرکت نہیں کرتیں۔ اسی جگہ کھڑے کھڑے آپ کی میل کا سفر کر سکتے ہیں۔ مردوں اور خواتین کی ورزش کے لیے دوسرے آلات بھی موجود تھے۔ یہ سہولت بھی حکومت کی طرف سے فراہم کی گئی ہے۔ ہر شخص پچاس سینٹر اور جتنا سیک تو نہیں جاسکتا کیونکہ اس کی فیس زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے حکومت نے عوام کی سہولت اور تفریح کے لیے یہ بندوبست کیا ہے۔

مرزائے بتایا کہ اسٹیبل میں میٹروپس کی قبیر کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہاں سفر کے نئی ذرائع ہیں۔ مرسیڈز کاریں بھی پولیس کے طور پر چلتی ہیں۔ عام ٹیکسیاں بھی بہت چھلدار اور صاف ستھری ہوتی ہیں۔ ان کی چمک دیکھ کر عین لگتا ہے جیسے ابھی کارڈیلر کی دکان سے نکلی ہیں یہاں سڑکوں پر مٹی کا کوئی نام و نشان تک نہیں ہے۔ بیس اپنی مقررہ لین میں چلتی ہیں۔ ہارن کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

بہت صاحب نے کہا۔ ”میں پاکستان جاتے ہی اپنی کار کا ہارن اٹھا دوں گا۔ نہ ہوگا پاس شینک کی بائسری۔“
 ہم نے کہا۔ ”بہت صاحب پاکستان میں ہارن کے بغیر

کار چلاتا ہی ہاں نہیں ہے۔ ہارن بجانا ہاں ضروری ہے۔ کبھی لٹو کار چلانے والے کو ہارن دینا پڑتا ہے کبھی سڑکوں پر سونپھیل کر پڑنے لگے کہ ہارن بجانا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہارن نہ بجانیں تو پیدل چلنے والا آپ کو راستہ نہیں دیتا۔ آپ کو کسی کوکڑ مار دیں گے یا کوئی دوسرا آپ کو کڑ مار دے گا۔“

اسٹیبل میں ہمیں مونڈ سا ٹیکس لگتی ہی تھی آخر آمیز۔ چند مونڈ سائیکس نظر آئے جو ڈیپوڑی کا فرض ادا کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں لاہور کے مونڈ سائیکس کے قول یاد آئے جنہیں خان صاحب موت کے فرشتے کہتے ہیں۔ یہ ٹیکس کے ہر ضابطے سے بے نیاز ہیں اور مونڈ سائیکس سڑکوں پر پائیے چلاتے ہیں جیسے موت کے توہم میں کرب دکھا رہے ہوں۔ اسٹیبل کی سڑکوں پر ہم کھوتے رہے ہیں۔ ہر جگہ ہم نے اس قوم میں مغربی ملکوں جیسا نظم و ضبط دیکھا۔ ٹریفک کا نظام یہاں ہے کہ سڑک پر کوئی ایک پولیس کا سیاسی نظر نہیں آیا لیکن ٹریفک اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی ٹریفک کا ٹیمپل انہیں ہدایات دے رہا ہے۔ لوگ قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ پولیس والے سڑکوں پر چاہے کھڑے کس شپ کرتے نظر نہیں آتے لیکن وہ پولیس کا رول میں دن رات سڑکوں پر آہستہ رفتار سے کھوتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس کسی قسم کے ہتھیار نہیں ہوتے کیونکہ کوئی پولیس پر حملہ کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ یہاں جہاں ہم رات گئے تو جہاں اور خوب صورت لڑکیوں کو تھا پیدل گزرتے ہوئے دیکھ کر حیران نہیں ہوئے۔ سڑکیں پختہ اور صاف ستھری۔ کسی جگہ تھوڑا تیزی یا ریزے والے وہاں نہیں ہوتے اس لیے ٹریفک تیز رفتاری سے جا روک ٹوک چھا رہی ہے۔ کئی جگہ ہم نے اسکول کے بچوں کو اسکاٹش کی وردیوں میں ٹریفک کنٹرول کرتے دیکھا۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی ان کی ہدایات پر عمل نہ کرے۔ اس طرح لڑکیں ہی میں وہ ٹریفک کے اصولوں اور طور طریقوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ترقی میں نوجوانوں کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا لازمی ہے تاکہ ضرورت کے وقت ساری قوم جنگ میں شریک ہو سکے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ اور جاہل میں کیا فرق ہوتا ہے۔ قوم کو بہت مند رکھنے کے لیے یہ سہولت حکومت کی طرف سے فراہم کی گئی تھی۔ ہر شہر میں اس طرح کے انتظامات موجود ہیں۔

ترکوں کی وطن سے محبت کا اعجازہ کرنا ہو تو بارہو۔ اسکوٹز چاکر وہاں کے متاع و تحفے۔ اس چوک کے نزدیک ہی اتارک میوزیم ہے۔ آپ جاتے ہوں گے کہ ایمرل ہارہو۔

سلطنت عثمانیہ کے دور میں بہت بڑے اور کامیاب بحری امور کے باہر تھے۔ ان کا پورا نام ایمرل حیر الدین ہارہو تھا۔ سلطنت عثمانیہ واحد مسلم مملکت تھی جس نے بحری طاقت کو مضبوط بنانے کی طرف توجہ دی تھی۔ ان کی بحری طاقت اس زمانے میں دوسری مملکتوں کے لیے قابل رشک تھی۔ ترکوں میں یہ غلطی تھی کہ جدید ترین اسلحہ خود بھی بناتے تھے اور جہاں سے بھی دفاعی سامان مل سکتا تھا وہ حاصل کر لیتے تھے۔ اتفاق سے ایک مگر کی کاری کران کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ توپ خانے کا مایر تھا۔ اس نے ترکوں کے لیے ایک بڑے سازش کی ایسی توپ بنائی تھی جس کے گولوں سے مضبوط قلعے کی دیوار میں بھی گدگد پر جاتا تھا۔ اس توپ کی وجہ سے عثمانی فوجوں نے بہت مشکل قلعے فتح کیے کیونکہ اس سازش کی توپ ان کے دشمنوں کے پاس بھی نہ ہوئی۔ ایک زمانے میں مسندوں پر ترکوں کا راج تھا۔ ان کی بری اور بحری طاقت کا مقابلہ دشوار تھا۔ اسٹیبل کی فتح میں سلطان محمد نے دشمن کے مضبوط بحری اقدامات کے باوجود بحری جہازوں سے بھی مدد لی تھی۔ انہوں نے اسٹیبل کی بندرگاہ کے چاروں طرف بحری جہازوں سے ناک بندی کر دی تھی۔ سلطان محمد نے بڑے بڑے درخت کٹوا کر ان کے چوڑے اور مضبوط تنچے بجوائے پھر ان کو چرپی سے چٹا کیا گیا۔ سلطان نے راتوں رات بری راستوں سے ان جہازوں کو پھیل کر یہاں تک کے مضبوط حصار کے اندر بچا دیا۔ کبھی ہوتی تو دشمن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ترکی کے بحری جہاز ان کی مسند کی حد بندی کو عبور کر کے اسٹیبل کے قلعے کی دیواروں کے نزدیک کھڑے ہیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ پائے کہ کتنی بڑی تعداد میں ترکوں کے جہاز ان کے جہازوں کو عبور کر کے فیصل پر گولہ باری کر رہے ہیں کیسے؟ یہ سلطان محمد کا ایسا حیرت انگیز کارنامہ تھا جسے دشمن حل نہ کر سکے۔

اس زمانے میں بحری قوت ایک مضبوط اہمیت رکھتا۔ مسندوں کے ذریعے ہی ہالینڈ، پرتگال اور انگلستان جیسے چھوٹے ملکوں نے دنیا بھر میں اپنی کالونیاں بنائی تھیں۔

افسوس کہ ہندوستان کے نقش بادشاہوں نے کبھی مسندری طاقت بنانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ جب پرتگال اور انگلستان کے تاجروں نے ہندوستان کی بندرگاہوں کو تجارت کے لیے استعمال کرنے کی اجازت طلب کی تو فرار دلی سے دسے دی گئی۔ بعد میں جب مغل سلطنت کو ملکی اور کمزور ہو گئی تو ان ہی بادشاہوں نے ملک پر قبضہ کر لیا اور کئی سو سال تک ہندوستان کو اپنا غلام رکھا۔ یہ مغل بادشاہوں اور وہاں کی بیرونی یا کوٹاہ بنی کہ ہندوستان جیسے ملک پر برطانیہ جیسے کبھی براہ ملک نے اپنا

قلم بنا رکھا۔ ہر اصل مغل شہنشاہوں کی نظر اور خیال کبھی اپنے ملک سے باہر نہیں گیا اور ان کے دانشور وہاں رہنے کے بھی کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دلائی۔

ذکر بارہو۔ اسکوٹز کا تھا۔ بارہو۔ دنیا کے بہترین بحری سالاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دشمن اس سے اتنے خوفزدہ رہتے تھے کہ اس کا نام سن کر ہی شکست تسلیم کر لیتے تھے۔ بارہو۔ اسکوٹز کے نزدیک ہی صحنہ یا شامیہ ہے۔ صرف اس کو دیکھ کر ہی عثمانیہ دور حکومت کی شان و شوکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ترکوں کے قدیم محل، مساجد اور دوسری یادگاریں ان کی عظمت رفتہ کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ جو عرب و اب، اور حسن ان عمارتوں میں نظر آتا ہے۔ اس سے قدیم سلطنت عثمانیہ کی عظمت اور شان و شوکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ترکی میں جابجا میوزیم نظر آتے ہیں۔ جو حقیقی اور پیش بہا چیزوں سے بھرے ہیں۔ توپ کوئی کا ایک پتھر لگا کر ہی عثمانیہ دور کی بے مثال اشیاء اور نوادرات اور عمارت کی شان و شوکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میوزیم میں سرکارو عالم کی یادگار اور غلات راشدہ کے عہد کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اگر شخص توپ کوئی میں محفوظ اشیاء کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے تو دنیا کا دولت مند ترین انسان بھی ان نوادرات کا ایک مختصر حصہ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

اسٹیبل میں آہستہ آہستہ بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ عام ترک سچے مسلمان تھے اور سیکولر ازم سے نفرت کرتے تھے مگر جب وہاں اسلامی جماعت برسر اقتدار آئی تو بہت بدل گیا لیکن یہ مسلمان مگر ان ہمارے ملکی طرح سنگدل نہیں ہیں۔ انہوں نے ہر شخص کو اپنی مرضی کا لباس پہننے اور اپنا طرز زندگی اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تقابلی کے باوجود حکومت نے باج گھروں اور موسیقی پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اس دانش مندی کی وجہ سے ترکی میں ہر مذہب کے لوگ بہترین زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ترک سچے مسلمان ہیں اور بڑی تعداد میں غیر مسلم اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ترکی اب فری مارکیٹ ہے۔ جس کی وجہ سے ترکی کی معیشت نے بہت ترقی کی ہے اور یہ بہت سے یورپی ملکوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ اور خوش حال ہے۔

ایک زمانے میں ترکی کی مساجد میں تالے لگ جاتے تھے جو صرف نماز کے وقت کھولے جاتے تھے۔ اب تمام مساجد کا زمرہ نور مت کر کے آراستہ کر دیا گیا ہے اور انہیں دیکھ کر عین

لکھا ہے جیسے ابھی قہری لگی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رفتہ رفتہ ترکی ایک اسلامی ملک بن جائے گا۔

آج کل ترکی میں صوفی ازم کا بول بالا ہے۔ ترکی کا صوفی رقص یہاں کی ایک قابل دید چیز ہے۔ صوفیوں کا فلسفہ یہ ہے کہ اپنی روح کو اتنا پاکیزہ بناؤ کہ اللہ سے فیصلہ پیدا ہو جائے۔ اللہ صوفیوں کی سرگزشتی طاقت ہے۔ صوفی کا تعلق روح کی ذریعہ اللہ سے ہوتا ہے۔ صوفی ازم کا مرکز توحید ہے۔ درویشوں کا یہ اعتقاد سچا جو کوئی تصور کر دیتا ہے اب حکومت نے ملک کے ہر شہر میں "رقص درویش" کا بندوبست کیا ہے۔ ایک شام ہم لوگوں نے محفل سماع میں شریک ہونے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل والوں سے معلومات حاصل کر کے ہم نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ محفل سماع یہاں اور مقامی لوگوں کے لیے یکساں دھجکی کا حامل ہے۔

سماع کا آغاز ایک مختصر تقریر یا خطبے سے ہوا۔ یہ خطبہ پاشا طبع کے نزدیک ہے۔ یہ عام ساڑھے پانچ سو سال کی تقریر کیے گئے۔ عثمانی عہد میں شاہی خاندان کے افراد یہاں محفل کیا کرتے تھے مگر اب یہ عام درویشوں کے رقص کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ محفل سماع کے آغاز میں خطبہ ہوا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد پانچ درویش اپنے مخصوص لباسوں میں نمودار ہوئے۔ چار درویش نمودار ہوئے۔ انہوں نے میوزک کا آغاز کیا جو چھ ساروں پر مشتمل تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ڈرم ایک خاتون بجا رہی تھی۔ ان چاروں سازندوں کو اپنے فن پر عبور حاصل تھا۔ موسیقی کی سنگت میں سماع کی آواز میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔

جیسے جیسے سازوں کی رفتار تیز ہوئی تھی رقص کرنے والے درویشوں کے رقص میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ وہ بہت چھڑی سے چکر کھاتے تھے۔ یہ سلسلہ چندہ منٹ تک جاری رہا۔ رقص کے دوران میں میوزک روک دیا گیا تھا۔ رقص چھوٹا پھر سازوں کی آواز گونجنے لگی۔ تقریباً چندہ منٹ کے بعد میوزک روک گیا اور دوبارہ رقص شروع ہوا۔ درویشوں کا یہ وارنچ لہاؤ وسیلہ اور نگوں تک بچھا تھا۔ جب وہ چکر کھاتے تھے تو لباس کا پچھلا حیرت انگیز دور کی صورت میں گھومتے لگتا تھا۔ ان لوگوں نے اوپری سرنگ کی ترکی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ درویشوں کا یہ لباس رقص کا یہ انداز اتار کر ڈھانسنے میں ایسا ہی تھا۔ رقص دیکھنے والوں میں مرد اور بچوں میں ملیں خواتین بھی شامل تھیں۔ رقص کا یہ سلسلہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کافی دیر تک جاری رہا۔

خان صاحب نے مزہ مارا شرف سے کہا۔ "اگر ہم ایسا ہی

رقص درویش پاکستان میں بھی شروع کر دیں تو کافی آگاہی مل سکتی ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "مگر ڈرم میں بجاؤں گا۔"

خان صاحب اڑ گئے۔ "اس پر تو میری نظر ہے۔"

دووں حضرات میں یہ بحث جاری رہی کہ ڈرم کون بجانے گا؟

آخر مزہ مارا شرف نے کہا کہ معاملہ رفع کر دیا کہ ہمیں پاکستان میں یہ رقص شروع بھی نہیں ہوا ہے اور آپ ایک دیار تصور پر بھگڑنے لگے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ترک بھی ایک زمانے میں قہر کی فطرت میں رہے تھے اور تلاش ساس کے پہلے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہے تھے۔ سفلت ترکی کا باقی ارطغرل کی اپنے چھوٹے سے قبیلے کا سردار تھا۔ اس معمولی سے خاندان پر دنیا کی ایک عظیم ترین سلطنت کی بادشاہت کیسے لی۔ یہی ایک داستان ہے۔ ترکوں کا کہنا ہے کہ یہ کوئی لوگ کہانی نہیں بلکہ ایک حقیقی اور تاریخی واقعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ترکوں کے جد امجد کا تعلق حضرت نوح کے بیٹے یافث کی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ ایک قبیلہ نوری تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی قبیلے تھے جو مختلف زبانیں بولتے تھے لیکن مشترک زبان ترکی تھی۔ چند قبیلہ جو ترکی زبان بولتے تھے وہ ترک کہلائے۔ اسی طرح جس علاقے میں زیادہ تر ترکی بولی جاتی تھی اس کو ترکستان کا نام دیا گیا۔

ان قبائل کی باقاعدہ فوجی طاقت نہیں تھی کہ وہ کسی بڑی قوت سے جنگ کر سکیں۔ اس لیے روی شہنشاہ اور علاقے پر اپنا تسلیم چلاتے رہے۔ باقاعدہ زمین کے دور حکومت میں قسطنطنیہ مگر عرصے اس کا یہ تخت بھی رہا۔ جب ایک بڑے قبیلے سلاطین نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے رفتہ رفتہ ایک علیحدہ قوت حاصل کر لی۔

جب چنگیز خان اپنی خون آشام فوجوں کے ساتھ چاناق فتح کرتا پھر رہا تھا تو اس نے ترکی میں بھی کافی لوٹ مار کی۔ بہت غم کیے۔ ترک کو کیا دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت تھی اس وقت چنگیز خان کے سیلاب کو نہیں روک سکتی تھی۔ ارطغرل قبیلہ بھی منگولوں کے خوف سے جان بچانے کے لیے بھاگ پھر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ارطغرل کے والد کی وفات کے بعد ارطغرل نے باپ کی جگہ قبیلے کی سرداری سنبھالی۔

سمجھتے ہوئے یہ قبیلہ جانے یا پاں جانے میں سلطان سلجوق کی سلطنت کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ قبیلہ اس وقت چندہ سو افراد پر مشتمل تھا۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل

اللہ نے بالا مال کر دیا تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کا طرز زندگی شاہانہ نہیں تھا۔ وہ احتیاد سے بے کا عادل اور انصاف پسند حکمران تھا۔ اس کی عدالت میں دولت، دروغ اور مذہب کی اہمیت نہیں تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ بلا امتیاز انصاف کرتا تھا جس کی وجہ سے سب اس سے محبت کرتے تھے اور دل سے اس کی عزت کرتے تھے۔

عثمان خان کی ایک غوی بی بی تھی کہ اسے دولت کا لالچ نہ تھا۔ وہ بہت فیاض حکمران تھا۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد فتح میں حاصل ہونے والی دولت کا ایک حصہ غریبوں، یتیموں، بیواؤں کے لیے الگ کر دیتا تھا اور باقی تمام مال تقسیم فوجیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اس لیے مال تقسیم سے حاصل ہونے والی دولت کا ایک چوتھا بھی نہیں رکھتا تھا۔

وہ جس گھر میں رہتا تھا وہ شہر کے ایک عام گھر کی طرح تھا جس میں کوئی قیمتی سامان یا زیورہ نہ تھی نہ وہ اس کے پاس زور و جبر نہیں تھے۔ اس لحاظ سے وہ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کی شجاعت بھی ضرب الشجاعت تھی۔ مذہب کا بھی شیدائی تھا۔ اسے شرف حاصل ہے کہ عثمانی سنبھالنے ہی ایک جامع مسجد تعمیر کروائی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی جامع مسجد ہے۔

عثمان خان نے دس سال تک بروفس کا محاصرہ جاری رکھا اور عہد کیا کہ اس قلعے کو فتح کے بغیر وہ نہیں لے گا۔ بروفس کا محاصرہ جاری تھا کہ عثمان شہید بن گیا۔ اس کو بھجورنا واپس آنا پڑا لیکن اس نے سپہ سالار اور خان کو غم نہ دیا کہ قلعہ فتح کیے بغیر واپس نہ آئے۔

اور خان ایک بہادر فوج کا بہادر سپہ سالار تھا۔ اس نے عثمان کی خواہش پوری کرنے کے لیے جان بازی یہاں تک کر کے قلعے والوں نے شک آ کر ہتھیار ڈال دیے اور بروفس فتح کر لیا گیا۔ جس وقت بروفس کی فتح کی خبر پہنچی عثمان بستر مرگ پر تھا لیکن وہ مرنے سے پہلے کچھ اہم فیصلے کرنا چاہتا تھا۔ اور خان کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے بعد اس نے اس کو وصیت کی کہ سب کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ خوش آنا اور انصاف کے معاملے میں کوئی امتیاز نہ کرنا۔

عثمان کی ایک غوی بی بی تھی کہ اس نے بھی کبھی غیر مسلم کو ذیروقتی مسلمان نہیں بنایا۔ اس نے اپنے حسن سلوک سے اور ترکوں نے اپنے انصاف کے ذریعے عیسائیوں کو مسلمان ہونے پر مائل کیا۔ عیسائی حکومت جنہیں مسلمانوں کے دم و کرم پر چھڑ گئی تھی وہ عالم اور سنگ دل عیسائیوں کے مقابلے میں بہت رحم دل اور انصاف پسند تھے۔ ترک فوجیں غیر مسلموں

تھے۔ ارطغرل کا ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے ترکوں کو ہوا تو پہاڑی کی چوٹی پر سے اس نے دیکھا کہ دو فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ ارطغرل ان میں سے کسی سے بھی واقف نہیں تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر اپنے ساتھیوں سمیت کھڑا دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک فوج کمزور پڑ رہی ہے۔ وہ فوراً چوٹی سے اتر کر کمزور فوج کی حمایت میں لڑنے لگا۔ دوسری فوج اس کا ایک حملے سے گھبرا گئی۔ انہیں یہ بھی خیال آیا کہ شاید ان کے بچہ اور ساتھی آئے والے ہیں۔ اس خیال سے وہ فوج جو غائب نظر آ رہی تھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ طاقت ور فوج تاتاریوں کی تھی اور کمزور فوج سلطان علاؤ الدین سلجوق کی فوج کا ایک چھوٹا ہوا دست تھا۔ سلجوق نے ارطغرل کی اس امداد سے متاثر ہو کر اس کو اپنی فوج میں شامل کر لیا اور یہ خانہ بدوش قبیلہ ایک باقاعدہ اور طاقت ور فوج کا حصہ بن گیا۔ سلطان سلجوق ارطغرل کی بہادری سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔

کچھ عرصے بعد تاتاریوں نے پھر حملہ کیا اور اس جنگ میں سلطان علاؤ الدین سلجوق ہلاک ہو گیا۔ اس کا بیٹا غیاث الدین سلجوق بھی تاتاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان دونوں کی ہلاکت کے بعد حکومت کی ہاک ڈور ارطغرل نے سنبھالی اور اپنی فوج کا نشان سلجوقوں کا ہلالی چھٹا ہی رکھا جو آج بھی ترکوں کے قومی چھٹا کے نشان ہے۔

ارطغرل کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عثمان اس کی جگہ سردار منتخب ہوا۔ عثمان اپنے باپ کی زندگی ہی میں مسلمان ہو چکا تھا مگر ارطغرل سے سزا چھپا تھا۔

یہی وہ عثمان خان ہے جس نے ترکی میں عثمانیہ سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ عثمان خان کی بیوی کرتے ہوئے اس کے قبیلے کے دوسرے لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح عثمان خان کو یہ دیوار اہواز حاصل ہے کہ نہ صرف اس نے دنیا کی ایک بہت وسیع اور طاقت ور سلطنت کی بنیاد ڈالی بلکہ اس کی وجہ سے دیکھنے ہی دیکھنے ہی اسلام ترکی کا قومی مذہب بن گیا۔

شاعر نے کہا ہے کہ "خدا جب حسن دینا چاہتا تھا کہ اسے آتی جاتی ہے۔" اسی طرح قدرت کسی کو سرداری یا بادشاہت کے لیے منتخب کرتی ہے تو اس کو صلاحیتیں اور قابلیت بھی عطا کرتی ہے جو ایک بادشاہ کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ عثمان خان بذات خود ایک بہادر اور بے خوف انسان تھا۔ قدرت نے اس کو قائم و دائم مسلمانوں سے بھی نوازا تھا۔ اس کو امور سلطنت غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ ادا کرنے کی خوبیاں سے بھی

کے جن علاقوں سے گزرتی تھیں وہاں کسی ایک کو بھی ہلاک نہیں کرتی تھیں جبکہ یہاں تو ہمیں خود مفتوحہ علاقوں کے ساتھ جبر اور زیادتی کرتی تھیں۔ یہاں غلام اور سنگ دل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا پرانا دیکھے بغیر سب کو ہلاک کرتے تھے اور معمولی سی خطا پر موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ جو غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تھے ان میں اور پرانے مسلمانوں میں کوئی تفریق نہ تھی۔ وہ آپس میں شادیاں بھی کرتے تھے اور بہت محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ ترکوں کی نئی نسل مختلف اقوام کے افراد پر مشتمل تھی اور حجاز کو خارج زمین میں کرنے کے لیے ترکوں نے اپنے لیے ملٹی کلازا زیادہ پسند کیا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کا آغاز تھا جسے چھ عرصے بعد دنیا کی واحد سر پرانہ کلازا تھا اور تقریباً آدمی دنیا میں دس ہزار چھ سو تھیں ان کی سلطنت پھیلا تھا۔

ساتویں صدی میں نئی آفریقا کی آمد کے ساتھ ہی اسلام کا ظہور ہوا اور دیکھتے دیکھتے اسلام کا غلبہ ہو گیا۔ خالد بن ولید کی قیادت میں عربوں نے بازنطین پر حملہ کیا۔ بازنطینی آئین جنگی اور اچھے سمجھے تھے لیکن جب آرمینا سامنا ہوا تو بازنطینی کو بری طرح شکست ہوئی۔ خالد بن ولید نے جنگ یرموق (اردن) میں بازنطینی فوج کو شکست فاش دی۔ اس طرح بازنطینی سلطنت مستحکم کی عربوں نے انقرہ و اطالیہ اور دوسرے کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ بازنطینی سلطنت دو بڑے وال ہوئی۔

ترکی میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی یہاں غیاب ہب نئی زبان، نیا رسم الخط، نئی رائج ہو گیا۔ سکندر اعظم کے زمانے میں یہاں یونانی تہذیب کا غلبہ تھا اور یونانی زبان بولی جاتی تھی۔ اب اس کی جگہ عربی بولی جانے لگی اور عرب تہذیب و ثقافت کا دور دورہ ہوا۔ بازنطینی دور میں عیسائیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا اور ان سے جزیہ بھی وصول کیا جاتا تھا لیکن مسلمانوں نے یہ سب بھگہ دیل دیا۔ ہر مذہب، نسل اور مذہبی خیالات کے لوگ بہت آرام و سکون سے رہتے تھے۔

ترک کون تھے یہ بتایا جا چکا ہے۔ لفظ ترک 1300ء کی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ ترک دوسرے قبیلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے جن میں منگول بھی تھے۔ چنگیز خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دھاترک اور دھات منگول تھا۔

ترکوں کے بارے میں بہت سی لوگ کہانیاں بھی مشہور ہیں جن سے ترک قوم کی تخلیق کا پتا چلتا ہے۔ ایک داستان میں بتایا گیا ہے کہ پہاڑی علاقے میں چند گھوڑا سوار سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ بچے اور خواتین بھی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کا بھیڑیا اس گروہ کے آگے آگے چل رہا تھا۔ ان کا سامان بھی بچے گاڑیوں اور ٹھروں

پر آ رہا تھا۔ چھ بچے بھی ان کے ساتھ تھے تاکہ رات گزرا کر بندوبست ہو جائے۔ دراصل یہ لوگ خانہ بدوش تھے جو بعد میں ترک قوم کی حیثیت سے دنیا میں جانے گئے۔

ان داستانوں کے مطابق دراصل یہی ترک قوم کا آغاز تھا لیکن اس کہانی میں بھیڑیا کہاں سے آ گیا؟ اس کی ایک انگ کہانی ہے۔ داستان کو سمجھنے میں کوسا ایشیا کی ایک شہزادی جنگل میں چند جانوروں کے ہمراہ سفر کر رہی تھی کہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے انہیں گھیر لیا۔ ایک سیاہ رنگ کا بھیڑیا جو جنگل میں گھوم رہا تھا اس نے جب شہزادی کو ڈاکوؤں کے نرے میں دیکھا تو ڈاکوؤں پر حملہ آور ہو گیا۔ ڈاکوؤں کو دھوکہ دیا کہ شہزادی بھیڑیہ کی گود میں ہے اور بہاوردی سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے بھیڑیہ سے شادی کر لی۔ ان دونوں سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ دو جڑواں بچے تھے۔ یہ بچے ترک کہلائے۔

اس سلسلے میں ایک اور داستان بھی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مادہ بھیڑیہ کو جنگل میں دو چھوٹے جڑواں بچے مل گئے۔ دور دور تک کسی اور کا نام و نشان نہیں تھا۔ مادہ بھیڑیہ ان بچوں پر ترس آ گیا۔ اس نے ان دونوں کو دودھ پلایا اور بہت جوان اور طاقت ور ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھائی نے ایک شہر آباد کیا جس کا نام یرموق رکھا۔ یہاں جب سے ترک بازنطینی کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے لیکن یرموقوں نے اپنے غلبہ پر فخر کرتے تھے اس لیے کہ وہ بھی ترکوں کی طرح بہادر تھے۔

☆ ☆ ☆

مرکزی و قافز کی تکیا انقرہ میں ہیں اس لیے اکثر لوگ مس آکر شام کو واپس استنبول چلے جاتے ہیں۔ انقرہ کے آخری پورٹ کا اپنا حسن ہے جو استنبول اثر بہت سے مختلف ہے۔ ہم نے معلوم کیا کہ محلے میں کم سے کم صرف ضرورت کے مطابق ملے گا جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے اثر پورٹوں جیسا کہ شاپ کا مودہ ہی نہیں۔

خود کار گیت سے باہر نکلے۔ لاؤنج بہت خوبصورت سے سجایا ہوا تھا۔ مسافر بھی صاف ترے اور مذہب تھے۔ مرزا شرف نے کوئی ہوش میں فون کے ذریعے جنگ کر لی تھی۔

انقرہ میں بہت زیادہ ورش نہیں ہوتا۔ یوں سمجھئے کہ اسلام آباد رہنے کے بعد جتنا کم کر لیتے ہوتا تھا وہی نقش یہاں بھی تھا۔ تفریح گاہوں کے مقابلے میں دفاتر یہاں زیادہ ہیں۔ لوگ تیزی سے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے کسی جگہ چھپنے کی جگہ ہو۔ انقرہ خوبصورت شہر ہے۔ کمرشل اسٹور تو ہیں مگر استنبول جیسی چمکیل اور رونق دینے میں نہیں آتی۔

ہمیشہ گہمی گہمی اور چمکیل چمکیل یہاں نظر نہیں آتی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے بکری قزاقوں کا مرکز تھا۔

بٹ صاحب نے کہا۔ ”مرزا صاحب اور سب تو ٹھیک ہے لیکن اب تک یہاں پہاڑیاں نظر نہیں آئیں؟“

مرزا صاحب نے فرمایا۔ ”آپ کو پہاڑیوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟“

”اس لیے کہ دنیا کے ہر بڑے شہر کے بارے میں میں سنا ہے کہ وہاں بہت سی شادیاں ہوئی ہوں۔“

استنبول بھی سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔ ”مرزا صاحب نے بتایا۔“

انگورہ کے ارد گرد بہت سی چھوٹی پہاڑیاں ہیں بلکہ انہیں آپ ٹیلہ کہہ سکتے ہیں۔ انقرہ ان کیوں کے درمیان میں ہے اس لیے یہاں آپ کو ان کے حلقہ نظر نہیں آئیں گے۔ جیسے کہ استنبول کی سڑکوں پر شیب و زلف نظر آتا ہے۔ شہر کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اب پہاڑیوں پر بھی خوبصورت مکانات تعمیر ہونے لگے ہیں۔ رات کو جب روشنیاں ملتی ہیں تو انقرہ زیادہ پرکشش نظر آتا ہے۔ یہاں سفارت خانوں کی بہتات ہے۔ کشادہ صاف سڑکیں، خوبصورت اور بلند عمارتیں اس شہر کی عظمت میں اضافہ کرتی ہیں۔ اس شہر میں اعلیٰ تعلیمی درس گاہیں اور ٹیکنیکل یونیورسٹی بھی ہے۔ شہر میں جگہ جگہ ممتاز ہسپتالوں کے نیچے نصب ہیں۔ ایک چوراہے پر ہم نے دیکھا کہ ایک شاندار عمارت کے سامنے اتنا ترک سیزم ٹیم لیا یا نظر آ رہا ہے۔ اس کا داخل ہونے کا دواڑہ خوبصورت درختوں اور پھولوں کے درمیان میں گھرا ہوا ہے۔ یہ سیزم اس لیے بھی اہم ہے کہ یہاں خاص طور پر اتنا ترک سے متعلق ذاتی اشیاء بچائی گئی ہیں۔ ان کا لباس، ان کے استعمال میں رہنے والی پستول اور بندوقیں، ان کے کل پوت، آفس بیل فریج، ایسا لگتا ہے کہ جیسے۔ ان چیزوں کا مالک ابھی آکر آپ کو خوش آمدید کہے گا۔ یہ سیزم ایک کشادہ چوراہے پر ہے۔ گرہی یہاں برائے نام ہوتی ہے۔ لیکن سڑکیں میں برف باری ہوتی ہے اور سارا شہر سفید برف کی چادر اور ڈھلپٹا ہے۔ مقامی لوگ اور سیاح برف باری کے موسم سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ایک دکان میں ہم کاغذ اور قلم خریدنے گئے۔ اس کی مالک ایک خوش پوش اور خوش شکل خاتون تھیں مگر انگریزی سے نا پلہ۔ مرزا اور خوش آمدید کے بعد مزید بات چیت ممکن نہیں تھی۔ انہوں نے البتہ یہ سن کر خوشی کا اظہار کیا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔

ان کے اس خطاب کے بعد تمام ملک سے ان کے پاس آئے والوں کا تاجا بندہ کیا۔ لڑکیاں اسکی بھی ان سے ملنے آئیں۔ لڑکوں کا مقصد آجیڈو طرز حکومت کے بارے میں مختلف طبقے کے لوگوں سے جاننا یا نقل کرنا تھا۔

انقرہ ہماری صاف تر اور پر سکون شہر ہے۔ استنبول

ہم انہیں ہر طرح سمجھاتے رہے کہ ہمیں قلم اور کاندھ کی ضرورت ہے مگر ہمیں ترکی لفظ معلوم نہ تھا، کافی دیر سوچنے کے بعد ہم نے اپنی جگہ پر اٹھیں تو کھڑے رہ کر دیکھ گئے۔

”قلم؟“ انہوں نے ترکی میں کہا۔

ہم نے اس بات میں سر ہلا دیا مگر کاندھ کی ضرورت کا بھی اظہار کیا۔ وہ فوراً سمجھ گئے اور لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ قیمت ادا کی جو بہت زیادہ نہیں تھی انہوں نے پھر شکریہ ادا کیا۔

بٹ صاحب خاموش نہ رہ سکے، بولے: ”اکیسی خوش شکل اور خوش اخلاق لڑکی، آپ یہاں سے یہ سستی چھڑی کر رہا ہے ہیں کچھ اور بھی لےنا چاہیے۔“

ہم نے کہا: ”آپ کو اتنا لفظ ہے تو کچھ آپ سب بھی خرید لیجئے دیکھتے یہاں کیا کچھ ہے۔ کھولنے، سامان آرائش، خوشبو، وغیرہ وغیرہ۔“ یہ سن کر سب کچھ خریدنے سے ہونے لگے۔

شاہراہ اتاترک پر پارلیمنٹ ہاؤس کے چوک تک کا علاقہ شامل ہے۔ بہت پارکس، سڑک ہے۔ بڑے بڑے شاندار اسٹورز، اسٹیک ہاؤس، سینما گھر، ریستوران یہاں تک کہ مشائی کی دکانیں بھی یہاں نظر آجاتی ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہر قسم کی مغربی مشائی کے ساتھ دیکھی مشائی بھی لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔

فٹ پاٹھوں پر چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں پر مختلف چھوٹی چھوٹی چیزیں اور مصنوعات اور آلات والوں نے روٹی لگا رکھی ہے۔ انہی دکانوں کے اسٹار اور کتا ہیں اور سیکڑیں بھی یہاں مل جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ ہر عمر کے لوگ کتابیں اور رسائل بڑے شوق سے خرید رہے تھے۔

خان صاحب بولے: ”کتابوں کی دکانوں پر اتنا رش؟ ان لوگوں کو پڑھنے کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے۔“

بٹ صاحب بولے: ”خان صاحب، یہ پڑھنے لکھنے لوگوں کا ملک ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا میں پڑھ لکھا نہیں ہوں؟“

”آپ کو بھی پڑھنے لکھنے اور کتابوں کی دکانوں میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”بھائی اسکول، کالج میں جو پڑھ لکھا وہی کافی ہے۔ لکھنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ جب ملک سے باہر ہوتا ہوں تو آپ کی بھائی کو ایک خوب صورت کارڈ بھی لکھ دیتا ہوں۔“

ترکی میں کئی اخبارات اور میگزین شائع ہوتے ہیں مگر یہ سب ترکی زبان میں ہوتے ہیں اور تمام اخبارات استنبول سے شائع ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی کا سفر نامہ بھی ہے۔ دو بھی

استنبول سے شائع ہوتا ہے۔

آجے چل کر ایک طرف سفارت خانوں کا طویل سفر ہے۔ پاکستانی سفارت خانہ بھی اسی علاقے میں ہے۔ یہاں بھی اس کے آگے کا علاقہ فیشن زدہ نوجوانوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ دیگر خانے بھی ہیں۔ یہ قدیم اور جدید کا استخراج ہے۔

خواتین، جدید ترین مغربی انداز کے لباسات میں بڑی بڑی ترک جوڑتیں پرانے انداز کے لباس میں کھوتی نظر آتی ہیں۔ فیشن بھیل خواتین کے ساتھ ایک چھوٹے قد کا فرد

صورت کتا ضرور ہوتا ہے۔ شاہراہ اتاترک کے چوک پر اتاترک کا گھوڑے پر سوار خوب صورت مجسمہ ہے جن کے سر پر دو گھوڑے سوار مجسموں کے جیسے بھی ہیں۔ ترکی کا پرانا پتھر ہاؤس اسی سڑک پر ہے۔ ٹائٹ گلیوں اور شراب خانوں کی کئی ہیں۔

یہ علاقہ سیاحوں کے لیے بہت دلکش یا کھٹ ہے۔ یہاں چھوٹے، سستے ہوٹل اور چھوٹے عمارتیں ہوٹل اسی علاقے میں ہیں جہاں پر ہر قیمت اور کمرے کا ہوٹل مل جاتا ہے۔ یہاں ایک کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ فیشن زدہ خواتین، سگریٹ نوشی کرتی نظر آتی ہیں۔ حیرت ہے کہ سگریٹ نوشی یہاں کوئی پابندی نہیں ہے۔

ترکی میں اتاترک کو بولڈانت کبیر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قاصدے پر اتاترک کا حمار ہے۔ یہاں طرف درختوں کے زاروں سے گھرا ہوا یہ حمار جدید تعمیرات کا بہترین نمونہ ہے اس میں سفید سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ بہت پارک اور خوب صورت لگتا ہے۔ اتاترک کے دست راست اور دوسرے سمت

صحت الوتو کا حمار بھی اس کے پہلو میں ہے۔

دیوے وغیرہ کے نزدیک چلیک باؤک ہے۔ اس پاس کے خوب صورت مناظر دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے کہ آخر ہماری پاکستانی حکومتیں عوام کی بہتوں کو خوش اور آرام کا اتنا خیال کیوں نہیں رکھتیں۔ ترک منگولوں سے رکھتے ہیں۔ خوشنورہ، وحشی درندہ، بھیلوں نے طوفان کی طرح صحرائوں اور پہاڑوں کی خانہ بدوشی کو چھوڑ کر سیلاب کی طرح آدھی دنیا کو بھالے گئے۔ جب چنگیز خان جیسا تین پانچ سال اور خون کا پنا سا انسان کی قوم اس قدر مذہب، عقیدہ، ترقی یافتہ ہو سکتی ہے تو پھر ہماری قوم تو ان سے جدید دنیا کے حالات سے واقف اور تعلیم یافتہ بھی ہیں تو پھر ہمیں ہمسائے اور تہذیب سے بہت تعلیق کیوں ہیں۔

استنبول اور دوسرے شہروں میں ہم نے فریک اس قدر خطر دیکھا کہ رشک آئے گا۔ کیا محال جو سڑک پر کوئی کار والا بہن جائے۔ یہ اخلاقی طور پر بھی برا سمجھا جاتا ہے اور دوسرے کار والے اپنی حیرت سے ہارن بجانے والے گود کھینچتے ہیں کہ وہ خودی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ سڑکوں پر لڑنا جھگڑنا اور تو میں میں ایک واقعہ بھی نظر نہیں آیا۔ کس قسم میں سوار ہوتے ہوئے بھی وقار نہیں ہوتی۔ خاموشی سے قطار بنا کر لوگ سوار ہوتے ہیں لیکن پہلے باہر آنے والے کو راست دیتے ہیں۔ سڑک پر کسی کو بلند آواز سے بکارنا تو دور کی بات ہے کسی تکلیف دہانہ کی زبان سے باتیں کر رہے ہیں۔ بول بٹ صاحب بدلتی بدلتی رہتے ہیں جیسے کسی کے خلاف سازش ہو رہی ہو۔ آخر اس کا کیا سبب ہے۔

ہم نے کہا: ”سبب صرف ایک ہے، اس کا نام چنگیز خان ہے۔“

سب نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا: ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کی ترقی اور تہذیب کا سبب چنگیز خان ہے؟ وہ ایسا جنگی، سنگ دل درندہ؟“

”جی ہاں، جیسے آپ جنگی، ایسا اور درندہ کہہ رہے ہیں وہ ایک بہت اچھا لڑ تھا۔ بہت بہادر، سپہ سالار تھا۔ اس کی جنگی تربیت ملی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ وہ اپنے قبیلے اور قوم سے نفس تھا۔ اس نے کھڑے ہوئے ایک دوسرے کے جانی دشمن نہیں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کر دیا تھا۔ اس کی قاعدہ رعایت اس زمانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔ اپنی بات آپ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔“

ہم نے اسے لیدر ہی اچھی قومیں جانتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو دیکھ لو، ایک دہلے تلے، کمزور انسان گرجاؤں اور ہندوؤں کی مشترک طاقت سے ٹکرائے۔ ان کی حکومت تھا بے چینی مگر قوم کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں اقوام جاتی رہا۔ اس لیے کہ وہ کمرے، بہادر، سپہ سالار اور سپہ باک آدمی تھے۔ اس اکیلے اور دہلے پستے آئی نے دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک بنادیا۔ ان کی دیانت دارانہ دیانت اور قابلیت کا اعتراف ان کے دشمن بھی کرتے تھے۔ ان کا نام ہر قسم کے داغ سے پاک تھا۔ انہوں نے قوم کے دشمنوں کی خاطر اپنی دولت برساتے والی دولت چھوڑ دی۔ قوم سے انہوں نے بھی کچھ نہیں مانگا سوائے جدوجہد اور

طاقت۔ جب وہ دنیا سے گئے تو پناہ سب کو قوم کو دے گئے۔

وہ ایک لیدر تھے جنہوں نے کھڑے ہوئے مسلمانوں کو کروڑوں ہندوؤں اور انگریزوں کی بے پناہ طاقت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔“

ہم جوش میں ہوتے چلے گئے۔ جب ذرا سانس لینے کو رکے تو بٹ صاحب نے کہا: ”آفاق صاحب! ہم یہاں سیر کرنے آئے ہیں لیکن سننے نہیں۔ یہ جو آپ نے بتایا ہے ہم بھی تاریخ اور جغرافیہ جانتے ہیں۔ لیکن میں کاندھ کے جھنڈے لہراتے پھرتے اور دین کے رہے گا پاکستان، لے کر رہے ہیں۔ پاکستان کے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ پاکستان تو ہم نے بنایا ہے۔ آپ بلاوجہ پھر دینے کھڑے ہو گئے۔“

”اچھا بھئی، یہ بحث چھوڑنے اور سوچنے کو کل ہمیں انفر و جانا ہے۔“

”بلاشبہ اس کا نام انفر و رکھ دیا۔“ بٹ صاحب بولے۔ ”انفر و کتنا اچھا اور شگفتا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”جی۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”مگر بٹ صاحب! انفر و کتنا اچھا نام تھا۔ نام لوقہ میں پانی بھرا جاتا ہے۔“

”اس لڑکی کی ذہنی سویرے سویرے ہوتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھوں۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔ اب تک سواری ہے۔“

”تو دوسری بھائی بنا کر پاکستان لے چلو۔“

”تم بٹ میلی کو نہیں جانتے، ایسے معاملوں میں تو سبھی ہو جاتے ہیں۔“

بڑے صاحب سے چاہیاں لے کر ہم نے بتایا کہ ہم کل صبح جا رہے ہیں۔ آپ مل و خیرہ تیار رکھئے گا۔

مرزا شرف کے کمرے میں بیٹھ ہوئی کاغذ کیسے جانیں۔ ہم ریل گاڑی کے حق میں تھے۔ خان صاحب اس کے حامی تھے مگر بٹ صاحب ہوائی جہاز سے جانا پسند کرتے تھے۔ آخر کار فیصلہ ہو گیا کہ بالی اتر جائیں گے۔ مرزا شرف نے فلائٹ کے اوقات دریافت کیے تو دوسری طرف سے جواب ملا۔

”نو پرا بلیم، ہر ایک کھٹے بعد فلائٹ انفر و جاتی ہے۔ آپ جس وقت آئیں گے غریب لیں۔“

دوسرے دن ناشتے کے لیے بٹ صاحب سب سے پہلے کھینچ گئے مگر بہت دیر میں ہوئے جب پتا چلا کہ بیرون آج چٹنی پر ہیں۔

بٹ صاحب نے کہا۔ ”جی چاہتا ہے اس ہوٹل کے در و دیوار سے مل کر دوں۔“

”وہ بہت ہیں کر لیتا، فی الحال ناشتے کا آرڈر تو دیجیے۔“

”ناشتا کیسے کروں گا۔ میرے طبقے سے تو ایک نوالہ بھی نہیں اترے گا۔“

مگر ناشتا شروع ہوا تو بٹ صاحب چار ڈسے اور چار ٹوسٹ کھا گئے پھر چھا۔ ”کوئی سوٹ ڈس ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب بہر کریں باقی دس بارہ اڈے اور ٹوسٹ ہوائی جہاز میں کھا لیتا۔“

بٹ صاحب بادل خواست اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ڈانٹنگ ہال میں ہی ڈولماس، ڈولماس بگھارنے لگے۔

”بٹ صاحب ڈیر میں سے کیسے کدو کھینچ سکے گا۔“

استنبول کے انتر چنسل انٹر پورٹ سے کچھ فاصلے پر انفر و

جانے والا انٹر پورٹ تھا جو سائرس میں لیکن انتہائی نہیں اور چمکا ہوا تھا۔ یہاں استنبول انٹر پورٹ کے مقابلے میں چمک چمک رہی تھی۔

فلائٹ وقت پر رخصت ہو گئی۔ تینش ایئر لائنز کے طیارے بہترین ہیں۔ سروس ایسی تیز کہ ابھی آپ سنے کافی کی پیالی ختم بھی نہیں کی کہ انر ہوئیں پیالی اٹھا کر لے لی۔ لڑکیوں کا لباس مغربی ایئر ہوئیں جیسا تھا۔ صورت فعل ایسی کہ بٹ

صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔

”آفاقی صاحب، دونوں کو اپنی قلموں کے لیے کر لیجیے۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب سارا استنبول چمک چمک کر حسین عورتوں سے لالہ بھرا ہوا ہے۔ ہم کئی لڑکیاں دیکھ کر ہیں گے۔“

مسافروں کو کچھ ٹکٹ دیے گئے۔ اسنے مختصر سفر میں کافی تھا۔ چارہا میں لگا چیسے ابھی بن کر آیا ہے۔ ابھی ہمیں پاس ختم بھی نہیں کیے تھے کہ انفر و پینے کا اعلان ہو گیا۔

”لیجیے، ہم ترکی کے دارالحکومت انفر و چمک گئے۔“

مصطفیٰ کمال کا انفر و میں قومی ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا تھا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کتنی سے سیکور ازم کے قائل ہیں۔

مصطفیٰ کمال پاشائے اقتدار سنبھالنے کے بعد سب مل کر دیکھ دیا اور مذہب کو حکومت اور معاشرے سے جدا کر دیا۔ انہوں نے بڑی سختی سے ملک کو سیکولر بنایا۔ اور

لہاس اور طرز زندگی کو اپنایا۔ اناترک کی وفات کے بعد بھی ملک عرصے تک یہاں سیکولر ازم کا راج رہا لیکن اب تھوڑا سا بد ہو رہی ہیں۔ ترکی کی اکثریت اسلام پسند ہے اور یہ جتناب

ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔

ترکی میں نان گول ہوتے ہیں۔ تھوڑے ہی کی طرح کھڑکیوں کی طرح لیے، یہ لیوٹرے ہوتے ہیں اور کھانوں

انہیں سامان نماش کی طرح لٹکایا جاتا ہے۔ ہم نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ ڈوٹر کباب سے پہلے ملا اور مرچیں لائی گئیں۔ اس کے بعد کھانا آیا تو ایک موٹا نان پلٹ میں رہا

تھا جس پر کباب تھے۔ اس کے اوپر ایک اور نان تھی۔ پانی سے بھنے آدی تھی یہ دو نان اور کباب تھا ختم نہیں کر سکتا۔ یہاں ضائع ہی ہو جاتے۔ ویسے ترکی کے شہروں میں ہر گھر کا کھانا

جاتا ہے۔ ترکی کے مخصوص کھانے بھی بہت لذتہ ہوتے ہیں۔ ہر شہر کے کھانے کی کوشش ہوتی ہے کہ پرانا شہر ضرور دیکھ

اور واپسی ترکی کے پرانے شہروں کا ماحول اور طور طریقے آنا بھی پہلے کی طرح ہیں۔ اس میں چھوٹی دکانیں، بڑی سڑکیں

گھروں کی دیواروں سے دیواریں ملی ہوئی ہیں جن پر کھڑکیاں ہو کر عورتیں گپ شپ کرتی ہیں۔ وہی پرانے لاہور کا فضا

فرق یہ ہے کہ ترکی کے پرانے شہر بہت اچھی حالت میں ہیں۔ نہایت صاف شفاف ہیں۔ کاش کوئی ہمارے پرانے شہر کو دیکھ روپ دے۔

ختم شد

جولائی

منظر اہام

عیسوی سن کے اس اہم مہینے کا تذکرہ جو مشرق میں اُودیتا ہوا آتا ہے۔ چلچلاتی گرمی کے اس مہینے میں بہت سارے اہم واقعات رونما ہوئے مگر یہاں صرف قابل ذکر واقعات مذکور ہیں۔ معلومات میں اضافہ کی خاطر عیسوی سن کے ساتویں مہینے کا تذکرہ

بازوق قارئین کے لیے مختصر خاص

جولائی چارمین اور جولین کیٹڈر کے مطابق سال کا ساتواں مہینا ہے۔ یہ نام مشہور رومی جزل جولیس سیزر کے اعزاز میں رکھا گیا ہے۔ جولیس سیزر ایک افسانوی کردار بن چکا ہے۔ وہ اسی مہینے پیدا ہوا تھا۔

جولائی کا مہینا زمین کے شمالی حصے پر سخت سردی کا دوسرا مہینا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے جنوبی حصے میں شدید گرمی ہوتی ہے۔

یہ مہینا تیز بارشوں اور گرجن چمک کا بھی ہے۔



GIFSDAPRIN

JULY

اب آئیں جولائی کا تاریخ وار جائزہ لیتے ہیں۔
مئی جولائی

مئی جولائی 1939ء میں Emily McCully کی پیدائش ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ مشہور پرنسز لیزلی ڈیانا کی پیدائش بھی اس مئی 1961 میں مئی جولائی کو ہوئی تھی۔ ڈیانا کے باپ کا نام جان اپسٹر تھا۔ یہ حسین شہزادی پوری دنیا میں اپنے ساتھی کاموں کی وجہ سے بے حد ہر دل مزاح تھی۔ اسی سلسلے میں ایک بار پاکستان بھی آئی تھی۔

اگست 1996 میں شہزادہ چارلس سے طلاق ہوگئی تھی اور 31 اگست 1997 میں کار کے ایک الزام کے حادثے میں بری طرح زخمی ہوگئی۔ عیس کے ایک ہاسٹل میں انتقال ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف چھتیس برس تھی۔ اس کی اولادوں میں پرنس ولیم، پرنس ہنری اور ڈیانا فرانس ہیں۔

مئی جولائی کو دنیا بھر میں ہالوم اور ہندوستان میں خاص طور پر ڈاکٹر ڈے منایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ دن ہندوستان کے باکمال فریٹین اور بنگال کے دوسرے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بھوان چندر رائے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بھوان کو 1961 میں بھارت کا سب سے بڑا اعزاز بھارت رتن بھی دیا گیا تھا۔

کینیڈا میں اسی تاریخ کو کینیڈا ڈے مناتے ہیں۔ کیونکہ مئی جولائی کو 1867 میں کینیڈا کی اپنی حکومت وجود میں آئی تھی۔ اسی تاریخ کو اکثر پینٹل جوک ڈے اور پینٹل پرنٹل ورکر ڈے بھی مناتے ہیں۔

مئی جولائی کو مشہور فلم ساز ادارے M.G.M کا بڑا ہوا شہر ٹی مارک کے طور پر رجسٹر ہوا اور اسی تاریخ کو کوکا کولا کی بوش کا ڈیزائن منظور ہوا تھا۔

مئی جولائی 1818 کو مگنری کے سائنس دان Iquaz Semmal کی پیدائش ہوئی۔ یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے پتا چلایا کہ بہت سی چھوٹ کی تھاریاں صرف ہاتھوں کے کندے رہنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اگر ہاتھوں کو کچر طریقے سے دھویا جائے تو ایسی تھاریاں سے بچا جاسکتا ہے۔

1908 میں ایسٹی لاڈو کی پیدائش۔ اس نے ایسٹی لاڈو کا ٹیکس بنایا۔

ماہنامہ سرگشت

پاکستان میں پہلی جولائی 1970 میں وائس چانسلر بنے۔

دو جولائی 1962 میں آرکٹکس میں پہلا دل مارٹ کھولا گیا۔ پاکستان میں 2 جولائی 1972 میں معاہدہ ہوا تھا۔ دو جولائی کو فرانس کے کان کنی کے ایجنٹ مارسل بریڈنڈ کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پہاڑوں کے اندر پیدا ہونے والے بے دروں کا پتا چلایا۔

2 جولائی 1888 میں Soiman Waks امریکی سائنس دان کی پیدائش۔ 1951 میں اس نے فوٹو پرائز حاصل کیا تھا۔

1906 میں کلیئر سائنس دان پائس جیٹ کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ وہ انیمیم کے ہاتھوں میں سے ایک ہے۔ اس نے 1967 میں ٹول پرائز حاصل کیا تھا۔

2 جولائی 1932 میں ڈیو قاسم کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو کھانے پینے کا شوق تھا۔ اسی لیے اس نے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ "ویڈی" کھولا۔ اور اس وقت صرف امریکا بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ویڈی ریسٹورنٹ کی جگہ ہے۔

دو جولائی 1907 کو Enil uaefely نے ایکٹر کنگ کنگ کو Wrappo کرنے کا طریقہ پیش کر دیا تھا۔

دو جولائی 1900 میں پہلے زیپلین (Zeppelin) کی پرواز ہوئی۔ کاؤنٹ فرڈی ہینڈ زپلین نے 1897 سے زپلین کے آئینڈیا پر اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ ایک آرمی ایجنٹ تھا۔

بالآخر 2 جولائی 1900 میں اس نے زپلین جاکر پرواز کا تجربہ کیا جو بہت کامیاب رہا۔ اس تجربے کا نام LZ-3 تھا۔

1914 تک زپلین کو بہت بھتر بنا دیا گیا۔ اس کی رفتار 136 میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ 4250 میٹر کی بلندی تک پرواز کر سکتا تھا اور اس میں ساڑھے چار گھنٹہ پرواز کر دے جانے کی صلاحیت تھی۔

3 جولائی 1979 کو ریڈیو ٹی وی میڈیک ہال رجسٹر ہوا تھا۔

چار جولائی کو امریکا میں یوم آزادی منایا جاتا ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ امریکا میں برطانیہ کی

آبادی تھی۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد امریکا کو آزادی حاصل ہوئی۔

4 جولائی 1776ء میں امریکا برطانیہ سے آزاد ہوا تھا۔ اس لیے یوم آزادی اسی یاد میں منایا جاتا ہے۔

4 جولائی کو کھیل کسٹری بیڈزک ڈے منایا جاتا ہے۔

4 جولائی 1753 فرانس-ہسپانیا فرینچ پارتی کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے نارتھ امریکا میں پہلی بار قہارے سے پرواز کی تھی۔

1810 میں ٹیلر برنم کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے مشہور سرس برنم ٹیلی کی ابتدا کی تھی۔

1883 میں Rube gold burg کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے صحافت کی دنیا میں اپنے سیاسی کارٹون سے پوری دنیا کے اخبارات کو ایک نئی راہ دکھادی۔

4 جولائی 1885 کو ٹولس ٹی بیڈر کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے دنیا بھر کے مشہور ترین فلم ساز ادارے میٹرو گولڈوائن بیڈر کی بنیاد رکھی تھی۔ اس شخص نے پہلی بار دنیا بھر میں اشارہ سسٹم متعارف کروایا تھا۔

ایجاد کے شعبے میں چار جولائی 1933 میں ولیم کولج نے انیمے کے شعبے پیش کر دیا تھا۔ اس شعبے کو کولج محبوب کہتے ہیں۔

پاکستان میں 4 جولائی 1969ء کو پاکستان اور ہندوستان دن کچھ کے نقشے پر متفق ہوئے تھے۔ چار جولائی 1995 کو سندھ کی حکومت نے شام کے چھ اخبارات سے پابندی ختم کی تھی۔

پانچ جولائی 1810 P.T. Burnum کی پیدائش ہوئی تھی۔

کانٹی کٹ میں پیدا ہونے والا برنم ایک انتہائی دلچسپ اور ذہین شخص تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو ملی کوسوٹا بنانے کا چرچا کرتا تھا۔ اس نے بے شمار دولت اپنی ذہانت اور خطرے کی کئی چال چلتے ہوئے حاصل کی۔

صرف بارہ سال کی عمر میں اس نے اپنی ملی زندگی کا آغاز لاری کے ٹکٹ فروخت کرنے سے کیا تھا۔ کچھ بڑا ہوا تو اس کی ملاقات ایک ایسی بڑی عورت سے ہوئی جس کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی عمر ایک سو ستر برس ہے اور وہ چار بج رہی ہے۔

برنم جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کے

باد جو اس نے اس عورت سے ایک معاہدہ کر لیا۔

برنم نے اس عورت کو دیکھنے کے لیے ٹکٹ لگا دیا تھا۔ اس نے اس عورت کی خوب پہچانی کی۔ ٹکٹ اس کو دیکھنے کے لیے آئے گئے۔

برنم نے خوب پیسے کمائے۔ اس کے بعد اس نے دنیا بھر کی فالتو چیزیں بیچ کر کے یہ اعلان کر دیا کہ یہ سب نوادرات ہیں جو اس نے دنیا کے مختلف ملکوں سے حاصل کی ہیں۔ یہ ٹھانٹ بھی بہت کامیاب رہی۔

برنم اسی طرح دولت سینٹا چلا گیا۔ اس نے اپنی سوانح عمری بھی لکھی تھی۔ انوکھی سوانح عمری کی بھی خوب پڑائی ہوئی تھی۔

5 جولائی 1794 کو سلو اسٹر گراہم کی پیدائش ہوئی۔ اس نے گراہم کے کیکر بنایا تھا۔

1891 پانچ جولائی کو جان نارٹروپ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1946 میں ٹول پرائز حاصل کیا تھا۔

5 جولائی 1904 میں جرنی ہالو جسٹ ارنسٹ بیڈر کی پیدائش ہوئی تھی۔

پاکستان میں 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیاء مارشل لا نافذ کیا تھا۔

6 جولائی کو پہلا تصویر پوسٹ کارڈ بنایا گیا تھا۔

6 جولائی 1904 میں البرٹ گودال نے ریلوے سوئچ متعارف کروایا تھا۔

6 جولائی 1884 کو ہارولڈ ڈاکٹر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے ایک گیم کٹرک بروج متعارف کروایا تھا۔

7 جولائی 1989 میں وائر برادرز نے اپنے کروار BAT MAN کو متعارف کروایا تھا۔ یہ کروار فلموں اور کارٹون میں بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اب تک اس کروار پر بہت سی فلمیں بن چکی ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے مغرب میں جینی انسان کی کمی ہوگئی ہے۔ اس لیے اس قسم کے انسان سامنے آتے رہتے ہیں جیسے اسپائیڈر مین اور سپر مین وغیرہ۔

آگرا۔ اس سے بہت نقصان ہوا تھا۔

8 جولائی 1873ء تاریخ ہے جب پہلی بار ایٹم گلوں نام کی ایک خاتون کو پیٹنٹ ملی کا سر براہ بنایا گیا تھا۔ یعنی وہ جس ایجاد کو چاہے منظور یا منظور کر سکتی تھی۔

8 جولائی 1972ء کو پاکستان میں بھی ایک افسوسناک سانحہ ہوا۔ اس تاریخ کو بد قسمتی سے کراچی میں انسانی فسادات پھوٹ پڑے تھے۔

8 جولائی 1986ء کو پشاور ڈرامائی پورٹ کا افتتاح ہوا تھا۔

8 جولائی 1995ء میں واپڈا نے بجلی کے ٹل میں ریکارڈ اضافہ کر دیا۔ یہ اضافہ 14.50 فی صد تھا جس سے لوگ بلایا اٹھے تھے۔

9 جولائی 1802ء میں تھامس ڈارن پورٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے ایک مکمل الیکٹرک موٹر بنائی تھی۔

9 جولائی 1819ء انیس ہویں کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے امریکا کی پہلی سلائی مشین بنائی تھی۔ 9 جولائی 1856ء تکو ایلیسا کی پیدائش۔ اس نے نئی ایجادات کیں جن میں ریڈیو ایکس سے وسیع مٹوب اور ایٹمی فائر مشین ہیں۔

9 جولائی 1911ء جارج آر جی جس نے بیک ہول اور وارم ہول کی اصطلاح دی۔

پاکستان میں 9 جولائی 1948ء کو پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ جاری ہوا۔

9 جولائی 1967ء کو کراچی میں محترمہ فاطمہ جناح کا انتقال ہوا تھا۔

9 جولائی 1968ء کو امریکی فریڈرک شال یا مرنے دتی لیڈر مین حصارف کروایا۔ یعنی جسے یہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکے۔

دس جولائی 1847ء گورچڈ ہونی نے مشہور روٹی پر تنگ پریس حصارف کروایا۔ یہ پر تنگ پریس آج اسی نام سے دنیا کے کئی ممالک میں قائم ہے۔

دس جولائی 1879ء وٹامن اے دریافت کرنے والے پری ٹھوگس کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اب یہ وٹامن ہماری خوراک کا ایک اہم جز بن گیا ہے۔

10 جولائی 1902ء میں جرمن سائنس دان کرٹ آلڈر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے 1950ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

10 جولائی 1920ء امریکی فرسٹ اوپن جیبر لین

کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے پروٹون دریافت کیا اور اس کام پر اسے 1959ء میں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔

دس جولائی 2006ء کو اردو کے مشہور ادیب اور شاعر جناب احمد نعیم قاسمی کا انتقال ہوا تھا۔ قاسمی صاحب کا

نام احمد شاہ اعوان تھا۔ آپ 20 نومبر 1916ء میں خوشاب میں پیدا ہوئے تھے۔ بچے کے لحاظ سے جرئت تھی۔ قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ بے شمار اعزازات حاصل کیے۔ ستارہ امتیاز (1980ء) پرائز آف پرفارمنس (تحفہ حسن کارکردگی) وغیرہ۔

کتابیں۔ شاعری کے مجموعہ جلال و جمال، شعلہ بک، کشت و قاف۔ ان کے چند مشہور افسانے۔ چوپال، گنڈا، سناٹا، کپاس کا پھول، آبلے، طوطو، وغیرہ۔ آپ ان

وغیرہ۔ انتقال لاہور میں دس جولائی 2006ء کو ہوا۔ ان کی وفات پر BBC نے تبصرہ کیا۔ Pakistan literary giant is dead

گیارہ جولائی 1899ء میں E.D. White کی پیدائش ہوئی۔

یہ امریکا کا بہت بڑا ادیب تھا۔ اس نے 1921ء میں گرینچین کی۔ اس سے پہلے ہی اس نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بہت کم عمر سے اس نے امریکی ادب کو کئی خوبصورت کتابیں دیں۔ جن کا شمار کلاسک میں ہونے لگا ہے۔

ایک بار کسی نے اس سے پوچھا۔ ”کیا اس کی کہانیاں حقیقت ہوتی ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں تصوراتی ہوتی ہیں کیونکہ حقیقی زندگی صرف ایک طرح کی ہوتی ہے دھکوں سے بھری ہوئی۔ باقی سب خواب ہوتے ہیں۔“

11 جولائی 1838ء ایک ڈچین اور جدت پسند تاجر جان رانا ٹیکر کی پیدائش۔ اس نے تجارت کے شعبہ میں کئی جدتیں کیں۔ جیسے بجلی یا برقی ڈیپارٹمنٹل اسٹور قائم کیا۔ مختلف اشیاء پر قیمتوں کے ٹیک لگوائے۔ اس نے اسٹور میں

بجلی یا برقی ٹورنٹ بھی قائم کیا۔ گاہکوں کے لیے مٹی بیک گاڑنے کی گاڑی کی اصطلاح بھی اسی نے دی اور اپنے اسٹور کے لیے اختیارات میں اشتہارات شائع کروانے کا سلسلہ شروع کیا۔

گیارہ جولائی 1950ء پاکستان نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جوائن کیا۔ اس بار گیارہ جولائی کو 17 رمضان ہے۔ 17 رمضان کو غزوہ بدر ہوا تھا۔ بدر کے نام

سے دو غزوات کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک ہے بدر اونی اور دوسرا ہے بدر کبریٰ۔ بدر اونی۔ مدینہ میں حضرت زید بن حارثہ کو چھوڑ کر آپ اس غزوے میں تشریف لے گئے تھے۔ بدر کبریٰ اس غزوے میں ایک تخت آپ کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے حج اعلیٰ کی۔ اس غزوے میں فرشتے ساتھ ہوتے تھے (بہ حوالہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا)

گیارہ جولائی 2003ء افکارہ ماہ بند رہنے کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ٹیس سرورس دوبارہ شروع ہوئی تھی۔

بارہ جولائی 1854ء کو جارج ایسٹ مین کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کوڈک کیمرا بنایا تھا۔ اس کے علاوہ فوٹو کرائی کارول بھی بنایا۔

بارہ جولائی 1913ء امریکی فرسٹ جس نے ہائیڈروجن ایٹم میں الیکٹرون کی سرگرمی کا پتا چلایا۔ 1955ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

بارہ جولائی 1730ء میں برطانیہ میں جوسیا ڈوڈ کی پیدائش ہوئی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے جدید برتن سازی شروع کی۔ آج جو آپ گھروں ہولوں اور بازاروں میں جدید ہیم کے خوبصورت برتن دیکھتے ہیں ان کو بنانے کی ابتدا اس نے کی تھی۔

1849ء میں کینیڈا کے فوٹیشن ولیم اوٹلر کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو جدید میڈیسن کا قار کہا جاتا ہے۔

12 جولائی 1959ء کو شکر یہ خانم پاکستان کی پہلی خاتون پائلٹ بنی تھیں۔

چودہ جولائی 1857ء میں فریڈرک ڈانگ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے واشنگ مشین بنائی تھی۔

اسی تاریخ کو 1918ء میں بے نور مشین ایجاد ہوا۔ اس نے ڈیجیٹل کمپیوٹر بنایا۔

چودہ جولائی 1912ء برطانوی سائنس دان جیفری ٹل کیمپن کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اسے جدید کمپیوٹر کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے 1973ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

14 جولائی 1924ء میں اسکاٹی لینڈ کے ڈاکٹر جیمز کی پیدائش۔ اس نے 1988ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

سارہ گوڈی پہلی سیاہ فام خاتون تھی جس نے چودہ

جولائی کو اپنے پروڈکٹ کو پیٹنٹ کروایا۔

پاکستان میں 14 جولائی 1950ء میں قائد اعظم کے گھر وزیر مشین کو قومی ورثہ قرار دیا گیا۔

چودہ جولائی 2005ء میں KPK میں جبہ علی حصارف ہوا۔

15 جولائی 1817ء برطانوی انجینئر جان ٹاڈلر کی پیدائش۔ اس نے لندن میٹرو پولیٹن ریلوے بنایا تھا۔

چندہ جولائی 1954ء میں پہلے بونگ ٹیارے کی پرواز ہوئی تھی۔

چندہ جولائی 1971ء میں پاکستان کے پھول کو پاکستان کا قومی پھول قرار دیا گیا۔

15 جولائی 2001ء میں آگرہ کے مقام پر پرویز مشرف اور وچانچی کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے۔

15 جولائی 1985ء میں Paul Brainard نے پہلا پروگرام AL Dos Page maker حصارف کروایا۔

اس ایجاد سے پیشنگ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔

کتاب کے لے آؤٹ سے لے کر کھراکیم تک یہ ایجاد انقلاب کر کے سامنے رکھ دیتی ہے۔

سولہ جولائی 1969ء میں اپالو گیارہ نے چاند کی طرف پرواز کی۔ انسانی تاریخ کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔

اس مہم کی قیادت ٹیل آرڈ اسٹریٹج نے کی تھی۔ اس کے ساتھ دو اور بھی تھے۔

سولہ جولائی 1704ء جیری ٹوٹی کی پیدائش کی تاریخ۔ اس نے لوم کے لیے مشین بنایا۔ 1801ء جرمن ریاضی دان جولیوس چوکر کی پیدائش۔ جس نے پیکار فارمولہ دیا۔

سولہ جولائی 1888ء میں Frits- Zernike کی پیدائش۔ اس شخص نے Contrast Microscope بنایا تھا۔ جس سے بے رنگ عناصر بھی دکھائی دیں۔ 1953ء میں اس نے نوبل پرائز حاصل کیا۔

سترہ جولائی 1932ء Karla Kaskin کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ کارلائو یارک میں پیدا ہوئی تھی۔

اس کی وفات 20 اگست 2009ء کو میاں میں ہوئی۔ کارلائو بچوں کے ادب کی پاکستانی ماثر کہا جاتا ہے۔ یہ بہت اچھی شاعرہ بھی تھی۔ اس نے تینوں بک ایوارڈز کے علاوہ

14 جولائی 1924ء میں اسکاٹی لینڈ کے ڈاکٹر جیمز کی پیدائش۔ اس نے 1988ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

سارہ گوڈی پہلی سیاہ فام خاتون تھی جس نے چودہ

اور بھی کئی اعزازات حاصل کیے۔ اس نے پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔

سترہ جولائی 1956 میں ڈرنی لینڈ کا افتتاح ہوا تھا۔ ڈرنی لینڈ ایک ایسی فلسفاتی دنیا ہے۔ جہاں جانے والا اپنے آپ کو نہیں اور محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ دولت ڈرنی کے خوبصورت خواب کی خوبصورت تفسیق ہے۔ یہی فورینا میں واقع اس پارک کو دنیا کا پہلا خیم پارک کہا جاسکتا ہے۔ اس میں پورا ایک شہر آباد ہے۔

سترہ جولائی 1957 کو پاکستان میں نگار ایوارڈ کا اجراء ہوا۔

نگار ایوارڈ کو پاکستان کے سب سے بڑے اور مستحضر ایوارڈ کی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستان کی قلم افسر کی ترقی میں نگار ایوارڈ کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ الیاس رشیدی (مرحوم) نے پاکستان کی قلم افسر کی حوصلہ افزائی کے لیے اس ایوارڈ کا اجراء کیا تھا۔ 46 سال باقاعدگی سے دیے جانے والا یہ ایوارڈ کئی برسوں سے قفل کا شکار ہے۔

17 جولائی 1991 کو پاکستان اور چین کے اشتراک سے بنایا ہوا قائد ٹینک سامنے آیا۔ یہ ایک خاص جنگی ٹینک ہے۔ اس کے ڈیزائنر ہیں Norinco Factory چائنا اور روسی انڈسٹریل ٹیکسٹائل اور ٹائٹل والے بھی ہیں۔ اس میں حملہ 3 آدمیوں کا ہوتا ہے۔ اس کا وزن 46 ٹن ہے۔ بلندی 10.7 میٹر۔ چوڑائی 3.50 میٹر۔ بلندی 2.40 میٹر اور اس کی رفتار 72 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ یہ ٹینک ہمارے انجینئر ڈاؤن ماہرین کی دن رات کی کوششوں کا ثمر ہے۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں بھی اس کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا قائد ٹینک ہندوستان کے راجن ٹینک سے کئی زیادہ بہتر ہے۔

18 جولائی کو ڈنمارک کے سائنس دان ونڈرک کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1900 میں پہلی بار نوز حاصل کیا تھا۔ 18 جولائی 1950 کو۔ ایک ایٹمی بائوٹک ٹیز اہالی میں تیار کیا گیا۔

18 جولائی کو۔۔۔۔۔ پاکستان کے صدر نظام اسحاق خان اور وزیر اعظم نواز شریف نے اپنے دفتر چھوڑ دیے۔ یہ واقعہ 1993 کا ہے۔ انجس جولائی 1814 کو اسلحہ ساز Colt کی پیدائش۔

کولٹ ریپلولو اسی کے نام پر ہے۔ 1835 میں جرمن چارلس مایو کی پیدائش۔ اس نے مایو ٹیکنک کا آغاز کیا۔

19 جولائی 2005 پاکستانی حکومت نے پورے ملک میں دہشت گردی کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا۔

اس سال انیس جولائی فتح کی تاریخ ہے۔ یہ اسلامی تاریخ کا وہ بے نظیر واقعہ ہے جس نے اسلام کو ایک ایسا انقلاب دیا کہ پوری دنیا اس کے زیر اثر آگئی۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ ”جب اللہ کی مدد اور (مکہ کی) فتح آپ پہنچے اور وہ آج رہا جس پر چلنے والے ہیں کہ آپ لوگوں کو اللہ کے دین یعنی اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو آپ رب کی تسبیح کریں اور اس سے استغفار کی درخواست کریں۔ وہ بڑا نیک قول کرنے والا ہے۔ (انصاف 3-1)

10 رمضان 8 ہجری کو۔۔۔ جب آپ اور آپ کے تمام ساتھی روزے سے تھے مسلمانوں کی دس ہزار کی فوج مدینے سے نکلی اور عازم مکہ ہوئی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب اسلامی فوج مکہ میں داخل ہوئے والی تھی تو مکہ کے واحد رئیس ابوسفیان نے اسلام کے سامنے سر تسلیم کر دیا۔ اہل مکہ نے کوئی حراست نہیں کی اور یہ لوگ قاتلانہ مکہ میں داخل ہو گئے۔ اس موقع پر یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا وہ بھی مامون ہوگا۔ فتح مکہ کے بعد مکہ کا دروازہ بند کر لے گا۔ وہ بھی محفوظ ہے اور جو مسجد الحرام میں داخل ہوگا وہ بھی مامون ہوگا۔ فتح مکہ کے بعد آپ نے سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ طواف مکمل کرنے کے بعد آپ نے عثمان بن طلحہ سے کعبہ اللہ کی چابی لی اور کعبہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑنے اور کرانے کا حکم دیا۔ اس وقت آپ کے ہمراہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ آپ نے است خود اپنے دست مبارک سے پکڑی پھری سے بتوں کو ٹکراتے جاتے اور یہ ارشاد فرماتے جاتے۔ ”حق آگیا اور باطل مٹ گیا ہے فتح باطل مٹنے کے لیے تھا۔“ اس موقع پر آپ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو انسانیت کا مکمل دستور ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسے خطبہ کی مثال نہیں ملتی۔ یہ موقع تھا جب حضرت بلالؓ نے اذان دی۔ اور خانہ کعبہ میں باجماعت نماز ادا کی گئی۔

جس جولائی تاریخ انسانی میں پہلی بار انسان نے چاند پر پہلا قدم رکھا اپنا لوگیا کہ وہ رویے۔ اسی لیے اس تاریخ کو چاند منایا جاتا ہے اسے مون ڈے کہتے ہیں۔ جس جولائی کو خطرے کا عالمی دن بھی منایا جاتا ہے۔

جس جولائی تاریخ انسانی میں پہلی بار انسان نے چاند پر پہلا قدم رکھا اپنا لوگیا کہ وہ رویے۔ اسی لیے اس تاریخ کو چاند منایا جاتا ہے اسے مون ڈے کہتے ہیں۔ جس جولائی کو خطرے کا عالمی دن بھی منایا جاتا ہے۔

20 جولائی 1947 میں جرمن سائنس دان گروہ سینگ کی پیدائش ہوئی۔ 1986 میں اس نے فوٹیل پر انزلیا۔

20 جولائی 2007 میں چوہدری افتخار وارہ چٹف جیش مقرر ہوئے۔

انیس جولائی کو بیٹیل جنگ فوڈے منایا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ جنگ فوڈ کھاؤ۔ بلکہ اس لیے کہ کھاؤ۔ کھانے کے علاوہ ہر اہم چیزوں کے کھانے کو جنگ فوڈ کہتے ہیں۔

21 جولائی 1875 میں مارک ٹوائس کے مشہور ناول کوکائی رات دیا گیا۔

انیس جولائی 1984 میں امریکا میں انسان ہی کے بنائے ہوئے ایک روبوٹ نے ٹیکسری ورکر کو قتل کر مار دیا تھا۔ 21 جولائی 1810 میں ایک فرانسیسی کیسٹ کی پیدائش۔ اس نے قمری پراپرٹیز پر سرچ کیا تھا۔

21 جولائی 1923 کیسٹن کیسٹ نے مارکس قیودی پیش کی۔ 1992 میں لوٹل انعام سے نوازا گیا۔

22 جولائی 1822 چارچ میڈل کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ یہ جھڑ کا سائنس دان تھا۔ اس نے انسانی ساخت میں اصول وراثت دریافت کیا۔ یعنی ہماری بہت سی عادتیں یا بیماریاں وغیرہ ہمارے بزرگوں کی طرف سے ہم میں منتقل ہوتی ہیں۔

1887 میں جرمنی کے سائنس دان گیتاؤ پرز کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1925 میں فوٹیل پر انز حاصل کیا تھا۔ 1908 میں ایس واطر کی پیدائش۔ یہ ایک اسکول ٹیچر تھے۔ اس نے ایک اصطلاح متعارف کروایا۔ جس کو ہم انٹلیگنٹ کہتے ہیں۔

یعنی ہمارا سماجی اور معاشرتی رویہ۔ عام بول چال میں استعمال کیا جاتا ہے کہ فلاں کے پاس انٹلیگنٹ ہام کی کوئی چیز نہیں ہے یا وہ جاہل ہیں جس کا انٹلیگنٹ کیا ہوتا ہے۔

انیس جولائی 1929 میں رابرٹ ہش کی پیدائش ہوئی 23 جولائی 1827 کو ہالینڈ کے ہائڈراک انجینئر وٹلر کلاٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے رائے ڈیم (ہالینڈ کے ایک شہر) کا واٹر وے بنایا تھا۔

23 جولائی 1898 میں ایلیا کی پیدائش ہوئی جی۔یہ دو باتوں ہے جس نے پہلی بار اٹلانٹک عبور کیا تھا۔

23 جولائی 1904 میں آکس کریم کون متعارف ہوئی۔

پاکستان میں 24 جولائی 1976 میں لاہور اور امرتسر کے درمیان بھوٹا ایکسپریس کا آغاز ہوا۔ 24 جولائی 1952 کو دو ساز۔۔۔ آئس اور یاس فلسطین کو ٹیلیف کی قفل میں لائے تھے۔

25 جولائی اس بار 25 جولائی کو یوم القدس منایا

جائے گئے القدس (بیت المقدس) مسجد اقصیٰ کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک مسجد ہے جس کی بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے عمارت تکمیل تک پہنچائی۔ یہ مسجد شہر یروشلم (فلسطین) میں ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا قبلہ رہا ہے۔ یہ کھر مرے تک مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا۔ لیکن آخرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قتل کے مطابق پھر ہمارا قبلہ کعبہ بن گیا۔ قرآن مجید کے دوسرے پارے سچول میں اس کا ذکر ہے۔

جب آپ صحرا پر تشریف لے گئے تو آپ براق پر سوار ہو کر جبرائیل کے ساتھ پہلے تو مسجد اقصیٰ پہنچے اور وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

سورہ فی اسرائیل کے آغاز میں خدا فرماتا ہے۔ ”وہ خدا پاک ہے جو اپنے بندے (محمد) کو راتوں رات مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا۔ جس کے گرد اگر (دین و دنیا) کی برکتیں دے رکھی ہیں۔ تاکہ ان کو اپنی قدرت کے چند نمونے معائنہ کروا سکیں۔

26 جولائی 1875 کو کارل یونگ کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک قابل ذکر ماہر نفسیات ہے۔

یونگ کے نظریات نے اس علم سے دلچسپی رکھنے والوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ ایک سوئس ماہر نفسیات تھا۔ اس نے مشرقی اور مغربی فلاسفی پر بہت کام کیا ہے۔ اس کے شعبے فلاں کے یکسری۔ آسٹرو لوجی۔ مویتا لوجی آرٹ اور ادب وغیرہ تھے۔ اس کا انتقال 6 جون 1971 میں ہوا تھا۔

26 جولائی 1894 میں برطانوی سائنس نگار رانٹر آلٹروس پنے کی پیدائش ہوئی تھی۔

26 جولائی 1994 میں جوزف گا شین نے نیوی بیگز کا ڈیزائن پیش کر دیا۔

سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

67:67

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش جوتیاں اور نگاہ کی حدود سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک لٹکنارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، سحر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ اس سراب جو آنکھوں کے سامنے دھن و دل کو بھٹکانا ہے، جذبات کو ہمیشہ دہتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین کر لے لے لے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سیرابیوں کے اسے دائروں میں گھوری اور گھورتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنی خیر اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند و سلسوں اور بے مثال ولولوں سے گندمی ایک تہلکہ خیز کہانی



148

ماہنامہ سرگشت

جولائی 2014ء



149

ماہنامہ سرگشت

جولائی 2014ء

میری جینٹ کی آستین سے واکس بم نکالنے کے لیے جوتے کو بھی پشت کرنا پڑتی اور ایسا کرتے ہی ہمارے گھرانہ چوکانا ہو جاتے۔ فی الحال اس مسئلے کا حل مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ افراد غم ہونے سے وہاں روشن ٹارچوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی اور روشنی کم تھی۔ اس کے باوجود ہم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے نکتہ جو جاری رہی۔

”وہ میرے یہاں سیف ہاؤس میں ہیں۔“

”تمہیں یاد ہو پڑا؟“ فشی نے کہا۔

”جب ہمیں بڑے کنوڑی کیا ضرورت ہے اگر وہ کسی سیف میں بھی ہیں تو تم حاصل کر سکتے ہو۔“

”وہ جس سیف میں ہیں یہ انہیں حاصل نہیں کر سکتا۔“ بڑے کنوڑے نے کہا اور نا خوش گوار لہجے میں فشی سے کہا۔ ”تمہیں اپنی زبان بند رکھنا چاہیے جی صرف شبہازی نہیں تمہارے ساتھ موجود لوگ بھی سن رہے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو یہ میرے وقادار ہیں۔“

”جیسے تم میرے وقادار آتے؟“ بڑے کنوڑے نے طعنے کیا۔ ”ان بیروں کے لالچ نے تمہیں غدار پر مجبور کر دیا اسی طرح کوئی اور لالچ تم سے غدار کر سکتا ہے۔“

”میں تمہاری طرح اندھا احتیاط کرنے والا شخص نہیں ہوں۔“ فشی جی نے ساٹ لہجے میں کہا۔ ”میرے آدمی اچھی طرح جانتے ہیں مجھ سے غدار کا کیا انجام ہوگا۔“

”انجام کا خیال کسی کو نہیں روک سکتا۔۔۔۔۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”ورنہ آج دنیا میں اسن ہوتا۔“

”ہائے۔“ اچانک جوتے کہا۔ اس نے دوسری طرف جھکتے ہوئے لکسی آواز نکالی جیسے تے کر رہا ہو۔

”کیا ہوا؟“

”انہوں نے عیث پر ٹوٹ مارا تھا۔“ جوتے نے کراہے ہوئے کہا۔ ”اندر کچھ ہو رہا ہے۔“

میں فشی دل کی طرف گھوما۔ ”تمہارے آدمیوں نے میرے سامنے کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔“

”لڑائی میں ایسا ہوتا ہے۔“ فشی نے پُرودائی سے کہا۔ ”تمہارے ہاتھوں میرے ہی آدمی مارے گئے ہیں۔“

جوتے دوسری طرف ہٹا ہوا تے کرنے کی آواز میں نکال رہا تھا مگر اس کے پشت سے بندھے ہاتھ میری کھائی نکل رہے تھے وہ جب کی زپ تلاش کر رہا تھا اس کی جینٹ کی کھائی پر بھی ایسی زپ تھی اس لیے اسے زیادہ دشواری نہیں تھی آئی۔ اس نے کسی قدر ہاتھ اوپر کر کے زپ کھولی

اور اندر سے واکس بم نکال لیا۔ میں نے بظاہر فشی کو جواب دے کر کہا۔ ”تمہارے آدمی زرخیز ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے تمہیں ان کی پروا نہیں ہوگی میرا برسا بھی جیتی ہے وہ میری مرضی کے بغیر اپنی جگہ نہیں ہلاتے ہیں۔ اگر میں جان نامکوں تو جان بھی دے دیں۔“

فشی دل جی نے اس بے کلی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے اس کے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو جوتے کو اشارہ دے رہا تھا جو اس نے سمجھ لیا اور نکالا ہوا واکس بم مجھے تھا دیا۔ بم جیسے ہی میں ذرا پیچھے ہو گیا تھا۔ اب جوتے بھی سیدھا تھا اور دواور سے ٹک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے فشی کے کم آدمیوں سے خوشی ہوتی لیکن اب میری خواہش تھی کہ کاش وہ سب یہاں ہوتے۔ مگر اکثریت یہاں سے دوسری اور وہ بم کا فائدہ نہیں ہوتے۔ یہاں ہونے کی صورت میں وہ سب نا کارہ ہو جاتے۔ میں نے بم کے فوری استعمال کے بجائے کچھ دیر انتظار کر لینا مناسب سمجھا اور فشی سے پوچھا۔ ”کیسے تمہارا مکمل قبضہ ہو گیا ہے پھر تم نے اپنے آدمیوں کو کہاں بھیجا ہے؟“

”یہاں بڑے کنوڑے کے کچھ وقادار ہیں ان کا مقابلہ ضروری ہے۔“ اس نے کہا۔ یعنی اس کے آدمی اوپر گئے تھے۔

”اس کا مطلب ہے تم سب کو نہیں خرید سکتے۔۔۔۔۔ صرف رامن اور اس جیسے کچھ غیر فروش تمہارے ساتھ شامل ہوئے۔“

”سب کو خریدنے کی ضرورت نہیں تھی میں نے بس کام کے آدمی چنے اور کسی نے بکتے سے انکار نہیں کیا۔“

”دولت چھڑی لکھی ہے۔“ میں نے فشی سے کہا۔ ”مگر کیا رامن بھی دولت کے لالچ میں تمہارے ساتھ آیا ہے؟“

”دولت کے ٹرڈی لگتی ہے۔“ فشی جی نے شانے ہلائے۔

”میرا خیال ہے تم اسے بھی صاف کر دو گے کیونکہ وہ تم سے زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ اگر اس کی نیت خراب ہو گئی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

فشی دل جی نے میری طرف دیکھا۔ ”شبہازی تم کچھ زیادہ ہی نہیں سوچتے ہو؟“

”صرف زیادہ ہی نہیں میں درست سوچتا ہوں۔ اب تک میرے تمام خیالات درست ثابت نہیں ہوئے ہیں

کیا؟“

”کچھ زیادہ ہی درست ثابت ہوئے ہیں۔“ فشی نے پُر خیال انداز میں کہا۔

”فشی میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ تم کسی کو نہیں چھوڑو گے۔ ان سب کو بھی مار دو گے تا کہ کوئی راز دار نہ رہے ورنہ لوگ اس دولت کے لالچ میں تمہارا پیچھا کرتے رہیں گے۔“

”سوچتے رہو ضروری نہیں ہے کہ تمہاری ہر بات درست ثابت ہو۔“

فشی نے مجھے جھٹلا دیا تھا مگر میرا دل کہہ رہا تھا وہ بالآخر بھی کرے گا۔ ورنہ وہ یوں دوسروں کے سامنے یہ راز فاش نہ کرتا۔ اس نے اور بڑے کنوڑے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا کہ جب میرے اوپر کسی جگہ محفوظ تھے تو فشی خود انہیں کیوں حاصل نہیں کر رہا تھا جب کہ وہ اس جگہ سے واقف بھی تھا۔ لہذا کیا وجہ تھی کہ بڑے کنوڑے جیسے میں کرنا ضروری تھا۔ واکس بم فوری استعمال نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے خدشہ تھا فشی کے آدمی پاس ہی ہوں گے۔ وہ فوری آسکتے تھے اور مجھے اوجھڑیوں کو ان جھٹکڑیوں سے آزاد ہونے میں کچھ وقت لگتا۔ اس کے بعد ہم اس قابل ہوتے کہ آنے والوں کا مقابلہ کر سکتے۔ مگر اب فشی نے بتایا تھا کہ اس کے بیشتر آدمی اوپر ٹیکس میں بڑے کنوڑے کے پیچھے کھینچے وقاداروں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے یہ موقع اچھا تھا۔ میری تو خواہش تھی کہ رامن بھی یہاں ہوتا مگر اس کا نہ ہونا بھی اچھا تھا۔ اگر وہ کسی طرح تک لکھا تو ہماری لیے بڑی مشکل کھڑی ہو جاتی۔

کسی قدر غور کرنے کے بعد میں نے واکس بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی پین نکالنے کے پانچ سیکنڈ بعد یہ پھٹ جاتا۔ میں نے جوتے کی طرف دیکھ کر خفیف سا سر ہلایا اس نے جواباً سر کو اتنی ہی جھٹکڑی اس کا مطلب ہے وہ تیار تھا میں نے پین نکالی اور ذہن میں سمجھنے لگا۔ تین تک گئے ہی میں نے حکوم کریم درمیان میں پھینک دیا اور جوتے سے کہا۔ ”سامنے روک لو۔“

میں نے کپتے ہی سامنے روک لی تھی۔ میرے کانوں میں ریڈیو کے اگڑوں پلگ لگے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود صرف چند فٹ کے فاصلے سے بم کی شک دوج نے مجھے دکھایا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے خاصے فاصلے سے سنا تھا اور اس وقت بھی اس کی آواز قابل برداشت نہیں تھی۔ بس یہ کہ

اس نے حواس باختہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت خود پر قابو پانے کے لیے مجھے باقاعدہ جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ٹھوس چیز کانوں کے راستے میرے دماغ میں داخل ہونے کے لیے زور لگا رہی ہو۔ میں ذہن پر گرا گیا تھا اور گول مول ہو کر خود کو آواز سے بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ صرف اضطرابی حرکت تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو میں کانوں پر رکھ کر کسی حد تک فاصلہ سمجھتا۔ میری آنکھیں بھی بند ہو گئی تھیں اور دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پھلانگ تو ڈر رہا ہو گئی ہو۔ جوتے کا مجھے نہیں پتا تھا مگر میرے ذہن پر جیسے دھندلی چھا رہی تھی اور میں اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ آواز رک گئی ہے لیکن دماغ میں اب بھی اس کی گونج تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں نہ ہوں۔ مگر میں اپنی حالت کی پروا کیے بغیر اٹھا اور جوتے سے نزدیک بڑے فشی کے آدمی کی طرف بڑھا۔ وہ اونٹھے منہ بڑا تھا اور سناٹ تھا۔ میں نے اٹا پتھر کر اس کی پیشین ٹوٹیں مگر اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے میں اپنے ہاتھوں کی جھٹکڑی کاٹ سکتا۔ پتھر کر ہاتھ دی جانے والی جھٹکڑی مشیوٹی میں فولادی جھٹکڑی سے کم مضبوط نہیں ہوتی ہے۔ اگر اسے زور لگا کر اتارنے یا توڑنے کی کوشش کی جائے تو یہ اور کھانسیوں میں لڑتی ہے۔ میں دوسرے کی طرف بڑھا مگر اس کے پاس بھی جاتو یا تو ہار دوالی کی چیز نہیں تھی۔ کان ابھی تک سامنے سامنے کر رہے تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی آواز آرہی ہے۔ مگر وہ آواز واضح نہیں تھی۔ فشی دل جی سیف ہاؤس کے فولادی دروازے سے نکلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ملکی تھیں اور ہونٹ لڑ رہے تھے مگر کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔

اصل میں جوتے وقادار تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی بات نہیں سن رہا ہوں تو وہ اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آیا۔ سب کی کار چھڑی رانگوں کے ساتھ جوتے پڑی تھیں۔ اور روشنی حریف محمد ہو گئی تھی۔ میں نے ہاتھیں ایک ایک کر کے بند کرنا شروع کر دیں اور آخری طرف بند کی تھی کہ عقب سے جوتے مجھ سے ٹکرایا۔ میں بھڑک کر پیچھے ہٹا مگر پھر جوتے کی آواز سن کر رک گیا۔ اس کی آواز بھڑک میرے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔ میں فوس کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر الفاظ مجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ پھر جوتے نے میرا ہاتھ پکڑ اور

ہاتھ سے ہتھول چلانے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا نہیں۔ اس پر اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور خود ٹوٹی کراچیک رائل پر مٹی تارچ آن کی۔ پھر اس نے زمین پر بیٹھ کر کسی طرح دونوں ہاتھ کمر اور پیروں سے گزاد کر سامنے کر لیے۔ یہ بہت مشکل کرج تھا اور جیتے چھریوں سے جسم کا آدی ہی دکھاسکتا تھا یہ میرے بس سے باہر تھا۔ پھر وہ مٹی دل جی کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے مٹی کی چپکٹ ٹٹولی اور اس سے ہتھول نکال لیا۔ اس وقت تک دماغ کسی حد تک قابو میں آ گیا تھا۔ میں نے جیتے سے پوچھا۔

”ہتھول کا کیا کرو گے؟“

مجھے اپنی ہی آواز میں اور اپنی محسوس ہوتی تھی لیکن اب یہ کسی حد تک واضح تھی۔ جیتے نے کہا۔ ”اس کی مدد سے آزاد ہوگا۔ آپ گناہ کے انداز میں لیت کر ہاتھ اوپر کرلو۔“ پہلے میں سمجھا نہیں کہ گناہ کے انداز میں لینے سے اس کی کیا مراد ہے لیکن پھر میں سمجھ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ زین پر ٹیک کر دونوں ہاتھ عقب میں ہوا میں بند کر کے۔ جیتے نے تارچ کا رخ اس طرف کیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو مکمل حد تک الگ کیا اور جیتے نے ہتھول کا دست میری کمر پر رکھ کر تال کا رخ اوپر کی طرف کیا اور میرا ہاتھ بچاتے ہوئے جھکڑی پر گنا کر کیا۔ اس کے باوجود کوئی میری ہاتھوں کو چھوٹی زوری اور ایسا لگا جیسے کسی نے دھکی سلاخ سے چھو دیا ہو۔ مگر ساتھ ہی کوئی نے جھکڑی کو کھٹک دیا اور ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ آزاد ہوئے۔ میں تیزی سے اٹھا اور ہاتھوں کی تلاشی لی تو ایک کے پاس چاقو مل گیا۔ اس سے جیتے کی بندھنیں کاٹیں اور تارچ بند کرتے ہوئے نائٹ وین آن کر لیا۔ یہ ابھی تک ہمارے سروں پر تھے اور مٹی کے آدمیوں نے انہیں پاریلو لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پانچ افراد کے پاس پانچ رائلٹیں تھیں۔ ہتھول صرف مٹی کے پاس تھا۔

اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ہر ایک کے پاس رائلٹوں کے اضافی میگزین بھی تھے۔ ہم نے وہ بھی نکال لیے۔ کیونکہ ہم دو تھے اس لیے صرف دو رائلٹیں چھوڑ کر باقی رائلٹوں کے میگزین نکال کر انہیں پیکار کر دیا تھا۔ مٹی کے پانچ آدمی بے ہوش تھے۔ البتہ مٹی کسی قدر ہوش میں تھا۔ مجھے بڑے کٹور اور سادی کا خیال آیا۔ پتا نہیں ان کا کیا حال تھا انہوں نے بھی ہتھیار پر واکس ہم کی آواز کی تھی میں نے بڑے کٹور کو پکارا۔ ”تم میری آواز سن رہے ہو۔ کیا تم ہوش میں ہو؟“

بڑے کٹور کی آواز نہیں آئی تو میں نے سادی کو پکارا۔ ”سادی تم ٹھیک ہو۔۔۔۔۔ میری آواز سن رہی ہو۔“ جواب میں کسی نے شکایت کی ہوئی بہت مددیم آواز نکالی۔ جیتے یوں۔۔۔۔۔“ مجھے بھی آواز سنائی گئی تھی۔ میں نے بے تابی سے کہا۔ ”سادی چلیز اوپن کرلو۔ تم ٹھیک ہو۔۔۔۔۔“

”میں۔۔۔۔۔ ٹھیک۔۔۔۔۔ ہوں۔“ اس بار سادی نے کٹور کی آواز میں کہا۔ ”بڑے بیباک ہوش ہیں وہ مٹی نہیں رہے۔“

”سادی کیا تم دیکھ سکتی ہو۔۔۔۔۔ اندر موجود مٹی کے آدمیوں کا کیا حال ہوا ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہاں سے کیسے دیکھا ہوگا۔“ سادی کا مطلب تھا کہ وہاں اسکرینیں موجود تھیں لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ سیف ہاؤس کے باقی حصوں کو کیسے دیکھا جاسکتا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔

”سادی دور دورے میں کہاں ہے جس سے سیف ہاؤس کا دروازہ کھولا جاتا ہے؟“

ساتھوں کا سامنے ہوا ہوگا۔ سادی اپنا کام کر رہی تھی اور ساتھ ہی بڑے کٹور کو آواز دینے دے رہی تھی۔ جیتے سرنگ کی طرف چلا گیا تھا اگر کوئی اس طرف سے آئے تو ہم کل اڑ وقت خبردار ہو جائیں۔ واکس ہم کو بچنے دس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور ابھی صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے باہر بقیہ روشنی ہو چکی تھی لیکن اب تک کوئی اس طرف نہیں آیا تھا۔

جب تک سادی بڑے کٹور کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ایک پارٹیلی سے مٹی دل جی اور اس کے آدمیوں کی تلاشی لے لوں۔ میں نے یہ کام کیا اور قاعدہ ہوا۔ مٹی کے پاس سے ایک چھپا ہوا ہتھول اور نکل آیا اور وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ مگر اس کی مٹھی آنکھوں میں اب بھی پتلیاں قابو میں نہیں تھیں۔ اسے ہوش میں آنے میں مزید وقت درکار تھا۔ اس کے آدمیوں میں سے دوسرے تھے۔ ان کے کانوں اور ناک سے خون نکل آیا تھا۔ شاید دماغ آواز کی شدت برداشت نہیں کر سکا تھا۔ انہیں مردہ پا کر میرے روٹنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم اس جاہ کا رچر سے صرف اس لیے بچ گئے کہ ہمارے کانوں میں اڑنوں تھے۔ باقی تین مکمل طور پر بے ہوش تھے۔ واکس ہم ان کے درمیان میں پھنسا تھا اور وہ براہ راست نشانہ بنے تھے۔ مٹی تقریباً پارہ تیرہ ٹکڑوں کی دوری پر تھا۔ اس لیے اس کی کپٹ ہو گئی تھی وہ مرا نہیں تھا اور نہ ہی مکمل طور پر بے ہوش ہوا تھا۔

”سادی بڑے کٹور کو ہوش آیا؟“

”نہیں شوشی۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیا ہے، بالکل ریسپانس نہیں دے رہے ہیں۔“ اس نے فکر مندی سے کہا۔ ”کیا میں ریوٹ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کروں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں سے منع کر دیا۔“ پتا نہیں باقی جن کس لیے ہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی جاہ کرنے والا مکمل شروع ہو جائے۔ تم بڑے کٹور کو ہوش میں لانے کی کوشش جاری رکھو اور باقی آدمیوں جس چہر میں ہواں کا دروازہ اسی ریوٹ سے بند ہوتا اور کھلتا ہے۔“

”نہیں یہ تو ہاتھ سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے اس کے اندر سیف جیسا چٹل لگا ہوا ہے۔“ سادی نے بتایا۔

”اندرونی چھپا رہا ہے۔“

”بڑے بیباک کے پاس ایک ہتھول ہے میں نے وہ بھی نکال لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہو۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں سکیں ہوں۔۔۔۔۔ مطلب ان سرنگوں میں ہی ہوں اور تم اطمینان رکھو میں جیسے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

”اس کے برعکس آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں تو مجھے اطمینان ہوگا۔ آپ اب بھی خطرے میں ہیں۔“ سادی نے کہا اور پتلی پار پوچھا۔ ”یہ آواز کیسی تھی خدا کی بناء ایسا لگا جیسے براہ راست دماغ پر آ کر لگی ہو۔ میرے تو ہوش کم ہو گئے تھے۔“

”یہ ایک طرح کا ہم تھا جو پیٹ کر بہت تیز آواز نکالتا ہے۔“

”اوتی دیر تک؟“ سادی کو جواب ہوا تھا۔

”آواز تو پانچ سیکنڈ ہوتی ہے لیکن لگتا ہے کہ نہ جانے کتنی دیر جاری رہی۔“ میں نے کہا۔ ”تم اب خاموش ہو جاؤ اور اگر ناک آف کر سکتی ہو تو اسے آف کر دو لیکن آہستہ آہستہ رکھنا۔“

”میں کوشش کرتی ہوں۔ مجھے اس سسٹم کا زیادہ نہیں پتا ہے۔“

”بڑے کٹور کے پاس ایک واکس کی بھی تھا۔“

”وہ ہے۔“

”میں اسی پر رابطہ کروں گا۔“ میں نے کہا۔ میں نے اپنا واکس کی ٹاکی حاصل کر لیا تھا جس پر بڑے کٹور سے بات کرتا تھا۔ اس نے اس وقت نہیں بتایا تھا کہ یہاں آہستہ سسٹم بھی ہے جس پر وہ براہ راست بات کر سکتا ہے۔ شاید اسی وقت مٹی اور اس کے آدمیوں کو چپک کیا۔ مٹی اب کسی قدر ہوش میں تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ دہشت زدہ نظر آنے لگا کیونکہ میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گت زدہ لمحے میں کہا۔

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کوسرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیس۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واکس کی ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے۔۔۔۔۔“

”کک۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو؟“

مگر اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ ٹھیک سے بات کر سکتا۔ اس کے آدمی ہوشیار ہو جاتے۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ خود بات کر لوں۔ میں نے وہی نامی آن کیا اور بولا۔ "مٹی کے کتو" میری آواز سن رہے ہونا؟ فور سے سنو۔ مٹی میرے قبضے میں ہے اور اگر کسی نے سیف ہاؤس کی طرف آنے کی کوشش کی تو میں اسے مار دوں گا۔"

"شہباز؟ دوسری طرف سے راسن کی آواز آئی۔" تم یہاں سے نکل نہیں سکتے اس لیے بھڑکنا بھڑکنا ڈال دو۔"

"مٹی کے ہوتے ہوئے؟" میں نے طرہ انداز میں کہا۔

"اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں موجود لوگوں کا پاس مٹی نہیں ہے بلکہ میں ہوں اور جو چیز وہ حاصل کرنا چاہتا تھا اب وہی حاصل کر لوں گا۔"

یہ اطلاع تشویشناک تھی کہ راسن نے اتنی دیر میں مٹی کے آدمیوں کو خبر لیا تھا۔ یقیناً اس نے انہیں جیسے کالاج دیا ہوگا۔ یہ ملک ان کے حصے میں بعد میں موت آئی۔ لیکن اس وقت وہ جان بچ کر بھاگ رہے تھے۔ یہ بچاؤ دولت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے دانت پیسے، یہ نہیں دولت میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو مٹی کبھی ہمارے پیچھے نہ آتا۔ نہ راسن اس کے ساتھ مل کر سازش کرتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے اس صورت حال سے نمٹنا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اول تو مجھے تمہاری اس بات کا یقین نہیں ہے۔"

"ایسا کہ تم مٹی کو سرنگ کے موڑ تک بھیج دو میں خود اسے شوٹ کر دوں ہوں جب تمہیں میری بات کا یقین آ جائے گا۔"

"دوسرے تمہاری مجبوری بھی وہی ہے۔ بڑا کنور اور سادی اندر ہیں اور واکس بم نے ان کے بھی ہوش اڑا دیے ہیں۔ وہ جواب نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر تم اس دولت تک کیسے پہنچو گے؟"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" راسن فرمدم ہو گیا۔ "اگر انہیں کچھ ہوا تو وہ دولت بھر کوئی حاصل نہیں کر سکتے گا۔"

"تم سوچ لو اگر تم یا کوئی دوسرا اس طرف آیا تو اسے پہلے مجھ سے نمٹنا پڑے گا۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اگر تم مٹی سے ملے ہوئے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کس شخص کو

دھوکا دیا ہے اور اسے اب تک پتا چل گیا ہوگا۔ یہ ملک تم لوگوں نے یہاں موجود تمام رابطے کاٹ دیے ہیں مگر ہمارے حکومت سے بات کر سکتا ہے اور اس کی بات کوئی نظر انداز نہیں کرے گا۔"

"تم ڈیوڈ شاکی بات کر رہے ہو تو وہ یہاں ہمارے میں اتنی بڑی توپ نہیں ہے۔"

"پھوٹی ہی سہی۔ لیکن ہمارے حکومت کو کنور خاندان کی فکر تو ہوگی اور تم بھول رہے ہو راج کنور بھی اسی کے پاس ہے۔ اگر اس نے راج کنور کو رابطے کی اجازت دی تو تم لوگ بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"مشکل میں تم پڑو گے۔" راسن نے زہر لیے لیے میں کہا۔ "ایک بار تم ہمارے انجینیئروں کے قبضے میں آ گئے تو تمہاری روح بھی ان کے قبضے سے نہیں نکل سکتی گی۔"

"دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا اور وہی نامی آن کر دیا۔ راسن کی بات نے مجھے بھی فکر مند کر دیا تھا۔ جتنا میری بات نے اسے پریشان کیا تھا اتنا ہی اس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ ہم جتنی دیر یہاں رہ سکتے ہیں اس سے لگانا اتنی مشکل ہو جاتا۔ خاص طور سے میرے لیے۔ میں واپس ہال کی طرف آیا۔ گزشتہ رات سے میں نے چند محنت پائی پاترا اور میرا گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ مگر یہاں پانی نہ ملے کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے مٹی کے آدمیوں کو بھی ٹولا تھا لیکن وہ سخت بھی خالی تھے۔ ہماری طرح محل تیار سے نہیں آئے تھے۔ بیڑ کا بیک گرفتاری کے بعد چھین لیا گیا تھا اس میں پانی اور کھانے کا سامان تھا۔ وہ بیگ نہ جانے کہاں تھا۔ مٹی اب ہوش میں تھا۔ میں راسن سے جو شکوک کر رہا تھا اس کا ایک حصہ اس نے بھی سنا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"مٹی جی بازی پلٹ گئی اور تاریخ نے خود کو دہرایا ہے۔ راسن نے تمہارا اتحاد الٹ کر تمہارے آدمیوں کی کمان سنبھال لی ہے اور اب وہ خود ان ہیوں کے پتھر میں ہے۔" مٹی دل جی کے منہ سے راسن کے لیے اگست لگتی تھی مگر میں متاثر نہیں ہوا۔ مجھے شک ہے کہ وہ ڈراما کر رہا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ میں تمہیں سرنگ کے موڑ تک بھیج دوں۔ وہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر کے جوت دے سکتا ہے۔"

"نہیں۔" مٹی خوفزدہ ہو گیا۔ "اس نے جی جی بات کر دی ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔"

"جب تم نے اس پر بھروسہ کیسے کیا؟"

"کیونکہ وہی اندر سے ہماری مدد کر سکتا تھا۔ اس کے بغیر ہم اتنی آسانی سے بیس گارڈز کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

"مٹی میرے قابو میں تھا اس لیے میں اس سے سوالات کر سکتا تھا۔" تم نے ڈیوڈ شاکی رسائی کیسے حاصل کی؟"

"مجھے معلوم تھا کہ وہ عرصے سے یہاں ہے اور اصل میں تمہارے پیچھے آیا ہے۔ جب تم یہاں لائے گئے تھے جب اس نے بڑے کنور سے رابطہ کیا تھا اور میں بھی واقف ہو گیا تھا۔"

"جب تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس کے قبضے میں ہوں۔"

"یہاں بیس میں میرے آدمی تھے، ان سے مجھے معلوم ہو گیا کہ تم واپس آ گئے ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر تم یہاں ہو گے تو صرف ڈیوڈ شا سے رابطہ کر سکتے ہو۔"

"تمہارا اعزازہ غلط ہے میرا اس سے رابطے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اس نے مجھے پکڑ دیا تھا جی خان کی مدد سے۔"

"مگر میرا یہ اندازہ تو درست ثابت ہوا کہ تم ڈیوڈ شا کے پاس ہو۔ اس کے بعد میرا کام آسان ہو گیا۔ میں نے اس سے رابطہ کیا اور اسے ایک آدمی کی ضرورت بھی جو کنور بیس سے واقف ہو۔" مٹی دل جی نے جلدی جلدی کہا۔ "میری بد قسمتی کہ میں سارے پلان سے واقف تھا اور میں کامیاب بھی رہا مگر میرے آدمی تمہاری ٹھیک سے تھائی نہ لے سکے۔"

"درست کہا یہ ان کی نااہلی تھی لیکن اصل میں یہ قدرت کا کھیل ہے، وہ تم جیسے لوگوں کو آزاد چھوڑ دے تو تم اندر کی طرح آس پاس کے لوگوں کو پھاڑ کھاؤ۔" میں نے کہا۔

"مٹی دل جی نے مہری سانس لی۔" مجھے معلوم ہے تم مجھے چھوڑ گئے نہیں، لیکن میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تمہارا اصل دشمن کنور خاندان ہے۔"

"جس کے تم بھی ایک رکن ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ تاؤ کہ راج کنور کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا وہ ڈیوڈ شا کی تحویل میں تھا۔" مٹی نے لٹی میں سر ہلایا۔ "یہ بات تم بھی جانتے ہو۔"

"لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ اب ڈیوڈ شا کی تحویل میں نہیں ہے اس نے اسے چھوڑنے کا کہا تھا۔"

"ہاں لیکن اسے جب لگا چھوڑا گیا تھا۔"

"ایسی چپ تلاش کرنا اور اسے ناکارہ بنانا آج کل بچوں کا کھیل ہے۔" میں نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ راج کنور سے ڈیوڈ شا کی کوئی دلیل ہو چکی تھی اور اسی وجہ سے اس نے اسے چھوڑا ہے۔ ورنہ وہ ہاتھ آئے دشمن کو یوں چھوڑنے کا قائل نہیں ہے۔"

"مٹی جی نے غور کیا۔" تمہارا مطلب ہے ڈیوڈ شا بھی ڈیل کھیل کھیل رہا ہے؟"

"اس کھیل میں سب ہی ڈیل کھلاڑی ہیں۔"

"اب تم کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اگر طبی موت تک زندہ رہنا چاہتے ہو تو کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ میں تمہیں مار دوں۔ اس وقت موت کا فریضہ جسے تم ہم دوست کہتے ہو آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔"

"مٹی کو خبردار کر کے میں سرنگ تک آیا اور سادی کو واکی نامی سے کال کی۔ میں نے ایک خبر دیا جو اصل میں بڑے کنور کے واکی نامی کا خبر تھا۔ سادی نے کال ریسیو کی۔ میں نے پوچھا۔ "بڑے کنور کو ہوش آیا؟"

"نہیں۔ لیکن بیٹے بیٹے لگے ہیں۔"

"کوشش کرتی رہو۔" میں نے کہا۔ "اسے جلد از جلد ہوش میں لاؤ جب ہی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

"شوٹی اگر انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا تو؟" سادی نے پچھلے پوچھا۔

"ریپوٹ کنٹرول اور پستول تمہارے پاس ہے تم مجبور کر سکتی ہو اگر ذرا ہمت کرو تو۔"

"وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔" ٹھیک ہے، میں کوشش کرتی ہوں۔"

"شبابش گزرا تم کر سکتی ہو۔ فروری نہیں ہے تم بڑے کنور کو دھکاؤ۔ اپنی عقل سے کام لو اور اسے راسی کرو۔ اگر دیر ہوئی تو ہمارا اگلا دشمن نہیں رہے گا۔ یہاں ہر طرف دشمن ہیں۔"

"ٹھیک ہے شوٹی میں بھیجی۔"

"واکی نامی بند کر کے میں مٹی دل جی کے پاس آیا۔ اسے نظر نہیں آ رہا تھا مگر میری آہٹ محسوس کر کے وہ جلدی سے بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ "اندر تمہارے کتنے آدمی

”تینا، ایک مر گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
میں نے اس کا واکی ٹاکی آگے بڑھایا۔ ”ان سے
بات کرو اور صورت حال پر سمجھو۔۔۔ پھر کے بارے میں کوئی
اشارہ مت دینا۔“
اس نے سر ہلایا اور واکی ٹاکی کا ایک بٹن
دبایا۔ ”اعد کیا ہو رہا ہے۔“
”ہاں وہ چہر میں ہیں۔“ دوسری طرف سے کہا
گیا۔ ”ہم اسے نہیں کھلا سکتے۔“
”کنور کے آدمیوں کو چپک کر لیا کوئی زندہ تو نہیں
ہے۔“

”دو زخمو تھے ان کی گردن کاٹ دی ہے۔“ دوسری طرف سے فشی کے آدمی نے یوں آرام سے کہا جیسے گردن نہیں کا جرموٹی کاٹنے کی بات کر رہا ہو۔

”گنداپوری طرح ہوشیار ہو۔“ فشی نے کہا اور واک کی ٹاک بند کر دیا۔ میں نے اس سے واپس لے لیا۔ قابو میں آتے ہی فشی پھر سے گرہ مسکین بن گیا تھا۔ اس نے لجاجت سے کہا۔ ”شبابا زبی... اب پیری آپ سے دشمنی نہیں رہی ہے تو کیوں نہ ہم مل کر اپنے دشمنوں کے خلاف لڑیں؟“

فشی کی پٹیشن قابلِ غور تھی۔ بے شک اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کے آدمی بناوٹ کر کے دامن سے مل گئے تھے مگر وہ یہاں کا بھیدی تھا۔ یہاں کے بارے میں جو دجا جانتا تھا وہ شاید دونوں کو تو برا دور ان بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ مگر میں نے فوری ردِ عمل میں دیا۔ میں نے کہا۔ ”فشی تمہیں اب خیال آ رہا ہے کہ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کچھ پر پہلے تم یہ بات بھولے ہوئے تھے۔“

”میں نے پھر بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر دشمنی ہوتی تو پکارتے ہی میرے آدمی تمہیں مار دیتے۔“

یہ بات میرے ذہن میں بھی گئی۔ لیکن اس پر مجھے یقین تھا کہ ششی نے کسی وجہ سے مجھے اور بیوہ کو مارنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ہم سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر یہ فائدہ اس کے ذہن میں نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ ہمیں ایک لمحہ زخم ورنے کی اجازت نہ دیتا۔ فی الحال مجھے آئیڈیا نہیں تھا کہ اس کا مجھ سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے کسی معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑے کور کو میرا خون درکار تھا اور مجھے سادی واپس چاہیے تھی۔ باقی اس جاگیر اور اس کے دولت کے تاج سے سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں

قہا۔ میری بلا سے جو اس پر قابض ہو جاتا اور دوسرے کے ساتھ جو چاہے سلوک کرتا۔ مفتی نے اپنی جال جلی جلی کرداروں پر انگریزوں کو پکڑ لیا۔ اگر میں اس پر استعمال نہ بھی کرتا اس کے خلاف بغاوت ہو چکی تھی۔ مجھے جس اتنا فائدہ ہوا کہ میں ایک صمد و دائرے میں آزاد ہو گیا تو لیکن اس سرگرمی سے آگے نہیں جاسکتا تھا۔ ابھی تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر بڑے سکور نے سیف ہاؤس کھول دیا تو میں سارا تو لے کر یہاں سے کیسے نکلوں گا؟ مجھے اس دولت کا خیال آیا جس کے پیچھے سب آپس میں لڑ رہے تھے۔ میں نے مفتی سے پوچھا۔

”بیرے کہاں ہیں اور انہیں کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟“
 ”وہ اوپر بڑے کنوڑ کے خاص کمرے میں ہیں۔ جو کچھ عرصے پہلے اس کا بیٹروم بھی تھا۔“
 ”مجھے یاد آیا بڑے کنوڑ کا سوچ بچار والا کمرہ جس میں صرف ایک کرسی اور ایک آئینہ ان تھا۔ شمال کی طرف کھڑکی تھی اور اس سے آتی سرد وہاں آئینہ ان کی کرسی کو اٹل کرتی تھیں۔ بعد میں وہ بڑے کنوڑ کا بیٹروم بن گیا تھا۔“ اب وہ بیٹروم نہیں ہے؟“
 ”نہیں اسے دوبارہ وہی حالت میں لایا گیا تھا یہ ان کنوڑ اور تم لوگوں کے جانے کے بعد ہوا تھا۔“
 ”تھیک ہے وہ بیرے وہاں تو انہیں حاصل کرنا کیا مسئلہ ہے۔ مضبوط ترین جھوٹی گاٹا جاسکتا ہے۔ بے شک اس میں وقت لگے گا لیکن وقت تمہارے لیے مسئلہ نہیں تھا۔“
 ”مٹی نے نفی میں سر ہلایا۔“ یہ کام سیف کاٹنے سے نہیں ہو سکتا۔“

”اس کا مطلب ہے تجوری میں کوئی شے ہے۔ کوئی نم ہے؟“

اس نے ایک پارچہ لٹی میں سر ہلایا۔ ”اس میں اندر اسٹورس کی ایک تہ ہے اگر سیف کو غلط نمبر دیا گیا تو اسٹورس جل اٹھے گا اور میرے خاک ہو جائیں گے۔ یہ سب منٹ سے بھی پہلے ہو گا۔ تیز ترین طریقے سے یہی سیف کھولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“

اب میں سمجھ گیا تھا کہ بڑا کنوڑ کیوں لازمی تھا۔
اسنو رس کی آگ بہت شدید ہوتی ہے۔ اے بھابھا بھی ممکن
ہیں ہوتا ہے۔ پیرے اصل میں کاربن کی ایک صورت

جہاں۔ ان میں اور گھٹے کی ترتیب میں کاربن کے تناسب کو فرق نہیں ہوتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ میرے کاربن کا تناسب صورت میں۔ اگر یہ باطل نازل ہوں تو خلاف ہوتے ہیں اور اگر ان میں معمولی کمی دوسرے عنصر کی ملاوٹ ہوتی ہے رنگدار ہوجاتے ہیں۔ آگ انہیں کوسٹلے کی طرح جلا دیتی ہے۔ دنیا کے قیمتی ترین ہیرے کوہ نور جس کی بابت کاغذازہ لگنا شہادت ہے اگر اسے صرف ایک منٹ کے لیے موم جی کی معمولی سی لوپر رکھا جائے تو اس کی بابت ایک روپیہ بھی نہیں رہ جائے گی۔ یہ فریب بڑے کنور نے یقیناً اسی وجہ سے لگایا تھا کہ اگر کوئی تجویز تک رسائی حاصل کر لے اور بغیر دست طریقہ کار کے اسے کھولنے کی کوشش کرے تو اس کے ہاتھ بھی سوائے ہیروئن کی راکھ کے اور کچھ نہ آئے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا۔ لیکن یہ طریقہ دیکھی نہیں ہے۔ کوئی بھی غلط ہمارا اندر موجود دولت کو خاستہ کر سکتا ہے۔“

”شہباز جی آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ یہ جدید ترین سیف ہے۔ اس میں حوازی تین کوڑو ملانے ہاتے ہیں۔ پہلا کوڑو لٹلا مانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن دوسرے اور تیسرے کوڑو میں ایک لفظ یا نمبر لٹلا ملایا تو اندر آگ بھڑک اٹھے گی۔ پہلا کوڑو درست ملانے سے اگلا کوڑو ملانے کا موجب ملے گا ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔“

حشی جی نے ٹھیک کہا تھا۔ میں ان معاملات میں ہانڈی تھا۔ کیونکہ کبھی تجویزوں سے واسطہ نہیں رہا۔ میرے دفتر میں ایک لاکر تھا جس کی چابی زیادہ تر منیر طاہر کے پاس رہا کرتی تھی۔ ادا بینکال اس کی ڈنٹے دلائی تھیں۔ حویلی میں خزاہی ماں جی تھیں۔ ان کے پاس ایک بہت پرانا مضبوط دھاتی ٹرک تھا۔ رقم اور قیمتی اشیا اسی میں ہوتی تھیں۔ ایک بار مقام مکہ والے کن کن کے لیے کہیں مجھے تھے اور ماں جی چابی ٹرک کے اوپر چھوڑ گئی تھیں۔ وہاں آئیں تو وہیں رسکی جی تھیں اور ایک روپیہ بھی غائب نہیں تھا۔ اس وقت بھی حویلی میں تین ملازم چھوڑ گئے تھے۔

اس حقیقت اور اس کا سسٹم جاننے والوں نے ہر پہلو پر
 اور کئی گئی۔ اچانک وادی ٹاکی پر پہنچ ہوئی تو جس اسے
 نشان ہوا سرنگ کے آواز تک آگیا وہاں جیتہ چوہا
 تھا۔ سادی کی کال تھی۔ اس نے کہا۔ ”خوشی بڑے بھیا ہوش
 میں آگئے ہیں۔“
 ”میں کدواں تکراؤ۔“

چند لمبے بعد بڑے کنوڑ کی تحیف آواز آئی۔ ”شہباز یہ کیا تھا؟“

”واکس بم۔“ میں نے بتایا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں جسیں اشارہ نہیں دے سکا۔ ہوں کچھ لو کہ قدرت نے مجھے موقع دیا آزاد ہونے کا۔“

”کیا حالات تمہارے قابو میں ہیں؟“

”کم سے کم سیف ہاؤس کے سامنے کے قوی ہیں۔ اوپر راسن اور اس کے آدمی ہیں۔“

”فشی کہاں ہے؟“

”وہ میری قید میں ہے لیکن اس لحاظ سے بیکار ہے کہ راسن اور اس کے آدمیوں نے بغاوت کر دی ہے۔ وہ اب ان ہیروں کے چکر میں ہیں جن کے لیے فشی نے یہ سارا کھیل کھیلا ہے۔“

”اوہ... اب تم چاہے ہو کہ میں سا دھتا کو لے کر ابڑا جاؤں۔“

”اگر تم اندر رہنا چاہے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن مساوی کو باہر بھیج دو۔ تم جان گئے ہو وہ یہاں نہیں رہے گی اور رہے گی تو مر جائے گی۔ اسے اس کے شوہر کے پاس واپس بھیج دو اس کی خوشی اسی میں ہے۔ میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا تم جو مرضی چاہے کرتے رہنا۔“

”میں ایسا ہی کرتا اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم اسے لے کر یہاں سے نکال سکو گے۔“ اس نے غصی سا فرمایا۔

”لیکن شہباز ان حالات میں مجھے یقین نہیں ہے کہ تم اسے لے کر یہاں سے نکل سکو گے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور صرف دو آدمی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”لیکن سیف ہاؤس میں رہنا بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

”میں اور سادی یہاں محفوظ ہیں اگر تم یہاں سے نکل جاؤ تو میرا وعدہ ہے۔ تیس کا کنٹرول حاصل کرتے ہی میں سادی کو واپس بھیج دوں گا۔“

مجھے تعجب ہوا۔ ”تمہیں ان حالات میں بھی امید ہے کہ تیس کا کنٹرول حاصل کر سکو گے؟“

”تم یا کوئی اور یہاں کے اور میرے معاملات کے بارے میں نہیں جانتا ہے۔ ہاں مجھے یقین ہے اس میں چوتیس گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔“

سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ استاد شاید کسی باہر کی امداد کے مجھ سے پر تھا۔ اب یہ وہ انتظامیہ کی طرف سے آئی یا کسی غلط ذریعے سے دونوں صورتوں میں میں جس میں ہونے کی صورت میں مشکل میں پڑ جاتا۔ مگر یہاں سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بڑے کور سے کہا۔ ”تم باہر نہیں آؤ گے؟“

”ہاں اور تم خود سوچ کر تم وہ آدمی ہمارا کسی طرح وقار کرو گے۔ اگر تم مجھے نظر انداز کر دو جب بھی سادھا تمہاری ذمہ داری ہوگی کیا تم اسے لے کر یہاں سے باہر جا سکتے ہو۔ اول تو عیس سے لکنا ہی مسئلہ ہوگا۔ اگر یہاں سے نکل گئے تو اس علاقے سے کیسے نکلے گے جہاں آنے جانے کے لیے بس چند منٹ کی ہیں۔ کسی کو آرام سے روکا جا سکتا ہے اور اگر یہاں سے نکل گئے تو ادا پارے سے کیسے نکلے گے۔“

”مجھے اللہ پر بھروسہ ہے وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم سادی کو باہر بھیجو۔“

”تم اس کی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔“ بڑے کور نے خبردار کیا۔ ”تم لوگوں کے حق نکلنے کا چانس ایک فیصد بھی نہیں ہے۔“

”میں اس سے بھی کم پر چانس لیتا رہا ہوں۔“ میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے تم سادھا سے بات کرو۔“ بڑے کور نے واکی ٹاکی اس کے حوالے کر دیا۔ اس گفتگو کے دوران میں اپنے ذہن میں کچھ تجزیے جاری رکھے ہوئے تھا۔

راہن اور اس کے ساتھیوں کے یہاں آنا نے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اوپر کا کنٹرول حاصل کر رہے تھے۔ راہن کے ساتھ اس کے اوپر کی کے آواز و بناوٹ آدمی ملا کر دو درجن سے زیادہ افراد ممکن نہیں تھے اور یہ بڑے کور عیس پر مکمل کنٹرول کے لیے کافی تھے۔ انہیں یقیناً حراست کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہوگا اور ان کی توجہ ہر طرف نہیں ہوگی۔ ایسے میں ہمارے پاس چانس تھا کہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا بڑا کور جلد سیف ہاؤس کا دروازہ کھول دے وہ وہ جتنی تاخیر کرتا تھا۔ اسے لیے اتنی ہی مشکل ہوتی۔ کچھ دیر بعد سادی کی آواز آئی۔

”شوٹی میں کیا کروں؟“ وہ روٹھتی ہو رہی تھی۔ ”میں بڑے بھیا کو بھانپ نہیں سکتی اور وہ سب بھی نہیں کر سکتی جو آپ کہہ رہے ہیں۔ شوٹی پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں میرے مندر میں واپس آنا ہوا تو میں واپس آ جاؤں

گئی۔“

”میں تمہیں لینے آیا ہوں اور لے کر جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”بڑے کور سے پوچھو کہ کسی برستے پر یہ یقین سے کہہ رہا ہے کہ وہ جلد عیس کا کنٹرول حاصل کر لے گا۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ خلاف توقع غشی نے کہا اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”یہ سمجھتا ہے کہ اس نے سارے کام چھپا کر کیے ہیں؟“

”اس نے ایک حلقہ بندی دست بنایا ہوا ہے جس میں ہماری آوری کے سابق کمانڈر شامل ہیں وہ یہاں سے بڑے دور ایک جگہ رہتے ہیں۔ یہ انہیں دین میں دو بار مکمل بھیج ہے۔“

”تم سن رہے ہو۔“ میں نے واکی ٹاکی میں کہا۔ ”میں نے اس کا تین آن کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے بڑے کور نے کسی قدر کمزور لہجے میں کہا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اگر تم ان کو مکمل نہ بھیجو؟“

”وہ ایک کھٹے کے اندر یہاں آ جائیں گے اور معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔“

”تم نے آخری بار مکمل کب بھیجا؟“

”رات بارہ بجے۔“

”میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بج کر بارہ منٹ ہو رہے تھے۔“

”یعنی تم اگلا مکمل دوپہر بارہ بجے بھیج گے۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایک بیجے تک آ جائیں گے۔“ بڑے کور نے کہا۔

”وہ بھی نہیں آئیں گے۔“ میں نے غشی کی واکی ٹاکی کی طرف دیکھا۔ ”میں نے ٹھیک کہا تھا غشی کی؟“

”شبہازی ٹھیک کہہ رہے ہیں وہ بھی نہیں آئیں گے۔“ میرے آدمی انہیں راستے میں ترک کی طرف روانہ کر دیں گے۔

”تم نے من لیا۔“ میں نے بڑے کور سے کہا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ غشی کی واکی ٹاکی نے کہا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے وہ بے شک کمانڈر ہوں گے

اور چارہ ترین انتہیادوں سے مسلح ہوں گے لیکن وہ بے نقاب ہو گئے ہیں اور ان کو نشانہ بنانا بہت آسان ہے۔ ایک یا چند ہم ان کو راستے میں ہی منقطع ہستی سے نابود کر دیں گے۔“

میری بات پر بڑے کور کو چپ لگ گئی۔ صاف ظاہر تھا اس کی خوش فہمی ہو ہو گئی تھی۔ میرا اعزاز درست تھا۔ غشی دل جی ایسا بھیجی تھا جو تقریباً اصل مالک جتنا واقف تھا۔ بلکہ مجھے شبہ تھا بعض راز اس کے اپنے ہوں گے اور بڑا کور بھی ان سے ناواقف ہوگا۔ یہ وقت ضرورت غشی جی نے اپنے چہاؤ کے لیے رکھے ہوں گے۔ میں نے بڑے کور سے کہا۔ ”تم نے من لیا اب باہر سے مدد آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ جب بھی کیا تم اندر ہی بیٹھے رہنا چاہتے ہو گے۔“

”مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔“

”سوچ۔“ میں نے بدحرکی سے کہا۔ ”لیکن اتنی دیر مت کرنا کہ پھر کچھ کرنے کے لیے وقت ہی باقی نہ رہے۔“

میں بیٹو کے پاس آیا اور وہی آواز میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”اب تم کیا کہتے ہو؟“

”شوٹی اگر یہ مان جائے تو ابھی نکل سکتا ہے دیر ہوگئی اور اوپر والوں نے انتہیاد وال دینے تو پھر اصرار سے لکنا بہت دشوار ہو جائے گا۔“

”مسئلہ یہ ہے کہ وہ شاید ہی مانے اب ہم کیا کریں اندر گھس نہیں سکتے۔ سادی نرم دل ہے وہ اپنے بھائی کو مجبور نہیں کر پارہی ہے۔“

بیٹو نے کچھ دیر سوچا اور بولا۔ ”شوٹی ہمارا دل کہتا ہے دینی کو لے کر جائے، آگے آپ جھک کر دو۔“

”میں تم کو کیا اپنے کسی ساتھی کو حکم نہیں دے سکتا۔ ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں کہ بڑا کور کیا فیصلہ کرتا ہے اس کے بعد ہم اپنا اندھیل چلے کریں گے۔“

”شوٹی اگر کوئی اس طرف سے آئے تو۔“

”بنا وارنگ شوٹ کر دو، اگر محسوس کرو کہ وہ حملہ کرنے آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کسی بھی حربے کے لیے تیار رہنا۔“ عیس اور اس کے ہم اب ان کے پاس بھی ہوں گے۔ ہمارے پاس بس یہ بالٹیکس اور ہینٹول ہیں۔“

”ہم دونوں سے فٹ سکتا ہے۔“ بیٹو نے سر ہلایا۔

”ہم اس جگہ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ بات غشی جی کہ آگے راہن کے آدمی مورچہ بند ہوں گے اور وہ ہمیں اپنی آسانی سے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”میں خال خال رہوں گا۔“ میں نے کہا اور دوبارہ اوپر کی طرف بڑھا۔

”میں خال خال رہوں گا۔“ میں نے کہا اور دوبارہ اوپر کی طرف بڑھا۔

مجھے اس ہال میں اترنے والے راستے کا خیال آیا جو گریڈز سے چاہ کر کے بند کر دیا تھا۔ میں چلے پر چڑھ کر اوپر آیا۔ آگے یہ ظاہر راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن میں جبکہ کور اور گھس کر آگے بڑھا۔ اس موقع پر نائٹ وچٹن خاص کام آ رہی تھی، جلد میں نے ایک رخسہ تلاش کر لیا جو اوپر تک جا رہا تھا۔ میں ڈرا پیچے آیا اور بیچہ کو آواز دی۔ وہ آیا تو میں نے سرگوشی میں اسے بتایا کہ میں اوپر جانے کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس لیے وہ اب نیچے کا بھی خیال رکھے۔ بیٹو نے سر ہلایا۔ ”ہم دیکھ لے گا۔ پر آپ دیکھ کر جانا ایسا ہو کہ ملتا کرنے والا ہو۔“

”میں خال رکھوں گا۔“ میں نے کہا اور دوبارہ اوپر کی طرف بڑھا۔ بعض جگہ پر لمبا سرک رہا تھا۔ مگر اس میں نیچے حریف غلام نہیں تھا اس لیے کرنے کا خدشہ نہیں تھا۔ میں اس رخسہ تک پہنچا اور دوسری طرف جھانکا مگر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس ایسا ہی آواز آ رہا تھا۔ جگہ بہت تنگی تھی اور اگر آگے راستہ بند تھا تو واپس آنا بھی آسان نہ ہوتا۔ مگر میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ بالکل برعکس تھی غشی جی اسے روشن کرنے کا مطلب تھا کہ اگر سوراخ کے دوسری طرف کوئی موجود ہوا تو اسے اپنی تقریب آوری سے خبردار کرنا۔ اس لیے میں نائٹ وچٹن کے عمل بوقت پر آگے سرکنا رہا۔ یہ بدخبری جتنی جسامت کے آدمی کے لیے چھوٹا تھا۔ بیٹو اس میں آرام سے آ جاتا اور کافی تو ٹھنڈا ہوا جاتا۔ مگر میں کسی کو آگے نہیں کر سکتا تھا یہ کچھ مجھے ہی کرنا تھا۔ اگر یہاں واسطے کا راستہ نکل آتا تو شاید ہماری بچت کی کوئی مکمل نکل آتی۔ مجھے امید تھی کہ اس راستے کو بند پا کر پہلے غشی اور اب راہن کے آدمی یہاں سے ہٹ گئے ہوں گے۔

مگر یہ میرا خیال تھا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس راستے کو صاف کر کے خاموشی سے نیچے آنے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ یہاں جس طرح لمبا سرکنا ہوا تھا خاموشی سے نیچے آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں خود سرک رہا تھا اور اس سے آواز میں پیدا ہو رہی تھی۔ اگر کوئی حد میں ہوتا تو وہ ان آوازوں کو سن لیتا۔ اس لیے میں نے اس حالت میں بھی اپنا بیٹو مل سانسے رکھا تھا۔ میرا اعزاز تھا کہ میں سرکنا ہوا بیٹو کیوں کے اوپر ہی صے تک آ گیا ہوں۔ یہاں سے دایں روم کچھ ہی دور تھا۔ بدبو نے میرے اندازے کی تصدیق کی تھی۔ گریڈز کے فراخ والا نہ استعمال نے دایں روم کی اندرونی ساخت چاہ کر دی تھی اور سیورج لائنیں پھٹ گئی تھیں۔ یہ بدبو ان سے اٹھ

جولائی 2014ء

163

ملہنامہ سرگزشت

جولائی 2014ء

162

ملہنامہ سرگزشت

جولائی 2014ء

162

ملہنامہ سرگزشت

جولائی 2014ء

162

ملہنامہ سرگزشت

رہی تھی۔ بہر حال یہ ناقابلِ برداشت نہیں تھی شاید اس لیے بھی کہ یہ دہشت گردوں کی انتہا تھا۔

راستہ اب بہت تنگ ہو گیا تھا اور میں یہ مشکل ہی آگے بڑھ پا رہا تھا۔ بالآخر میں اس علاقے سے ہٹنے میں کامیاب ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا خانہ تھا۔ میں نے غور کیا تو یہ وہی خانہ محسوس ہوا جس میں خفیہ دروازہ لگا ہوا تھا۔ خفیہ دروازہ کھل کر چاہے ہو چکا تھا اور اس کے بازوؤں کے سسٹم کا آئینہ بھی نکلا تھا۔ یہ جگہ چھپا رہی تھی۔ میں نے مارشل کا ایک گڑا کوشش کر کے پٹایا تو اتنا راستہ بنا کہ میں باہر نکل سکیں۔ دیواریں گرنے سے یہ خانہ آخری طرف سے بھی بند ہو گیا تھا اور اب صرف اس کی چھت کھلی تھی۔ میں نے ایک طرف دیوار پر ہاتھ رکھے اور سر آہستہ سے اوپر کیا۔ دوسری طرف دہشت گردوں کا کھلا حصہ تھا اگرچہ وہاں بھی لمبا بھرا ہوا تھا لیکن یہاں سے بہتر صورت حال تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ساتھ والے کمرے میں بھی آگ بجھا دی گئی تھی۔ آگ جس طرح سے بجڑی تھی اور میں نے پورے کمرے میں لگتی تھی اس کے از خود بجھنے کا امکان کم تھا۔ وہاں بھی نکل چکا تھا۔ میں احتیاط سے اس خستہ حال دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔

دہشت گردوں میں کوئی نہیں تھا اور اگر ابھی خالی تھا۔ میں نے سب سے پہلے پانی کی تلاش کی، اکثر اوقات چاہے ہو گئے تھے لیکن ایک قلعہ ٹھیک مل گیا۔ میں نے اسے کھولا تو سرد شفاف پانی آ رہا تھا۔ میں نے پہلے پکھا اور پھر پی لیا لیکن زیادہ پینے سے گریز کیا۔ وہاں کمرے میں آیا۔ اس کا دروازہ جیلنے سے قفل کیا تھا اور بند تھا۔ میں نے اسے کھول کر باہر بھاٹکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ یہاں بھی تاریکی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ پستول رکھ کر میں نے رائل سنہال لی گئی۔ یہاں کسی لمحے بھی کسی سے سامنا ہو سکتا تھا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ عمارت خالی تھی۔ میں راہداری سے گزر رہا تھا کہ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے اندر کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہ آہٹیں مارتے ہوئے تھے اور اوپری آواز میں کہہ رہے تھے۔ ان کا انداز رازدارانہ نہیں تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا تو وہ لاک نکلا۔ اسی لمحے اندر سے کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔

”دروازہ کھولو۔“ کوئی چلا کر یوں لگا کہ آواز باہر بہت کم آتی تھی۔ ”میں کیوں قید رکھا ہے۔“

”تم لوگ کون ہو؟“ میں نے تالے کے سوراخ پر دونوں ہاتھوں سے چالہ بنا کر رکھا اور اس میں منہ ڈال کر بولا۔

”کیا... کون ہو تم؟“

”میں ان میں سے نہیں ہوں جنہوں نے تمہیں یہاں قید کیا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اب اپنے ہاتھوں میں تالو۔“

”ہم پھیل کے گاؤں پر ہیں۔“

”تمہیں قید کرنے والے کون ہیں۔“

”جو بعد میں آئے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم کتنے لوگ ہو؟“

”ہم پانچ ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ہمارے باقی سارے ساتھی مارے جا چکے ہیں۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اکثر تو ہمارے ہاتھ سے مارے گئے تھے اور باقی قیدیوں کے آدمیوں نے مارے ہوں گے۔ میں نے پوچھا۔ ”تم جانتے ہو بڑا کتور کہاں ہے؟“

”وہ سیف ہاؤس میں جا چکے ہیں۔“

مجھے وہ آدمی باخبر لگا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”تم لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں؟“

”نہیں ہمارے ہتھیار جین لیے گئے تھے۔“

”یہ دروازہ لاک ہے اسے اندر سے نہیں کھولا جا سکتا؟“

اس نے میرے اعتقاد سوال پر افسوس کیا۔ ”اگر کھول سکتے تو ہم یہاں قید ہوتے۔“

”جیسے ہٹ جاؤ۔“ میں نے کہا اور لاک پر پستول کی نال رکھ کر فائر کیا۔ دوسرے فائر پر لاک ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رائل سنہال لی۔ ایک خطرہ تو مجھے اندر والوں سے تھا دوسرا خطرہ یہ تھا کہ اس پاس راسن کے آدمی ہوئے تو وہ فائرنگ کر آجائیں گے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ پانچوں گورے گھر آ گئے۔ انہوں نے خاص گاؤں والی دوری لیکن رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی انہیں کیسے بخش دیا تھا جب کہ وہ خاص گاؤں میں سے تھے۔ میں نے یہی سوال کیا تو مجھ سے بات کرنے والے نے کہا۔ ”ہم کس کا شکار ہو گئے تھے اور جب تک ہوش میں آتے دوسرے آ چکے تھے۔“

بولنے والا آخر جیسا چاہیں برس کا گھٹے ہوئے جسم کا نقشہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے اور تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”رام پال جو کتور... ان میں کچھ پھیل کے لوگ تھے۔“

”ہاتی باہر سے آئے تھے اور وہ پہلے قیدی اور اب راسن کے آدمی ہیں۔ پھیل پر حملہ میں نے کیا لیکن میرا مقصد صرف اپنی بہن کو واپس لے جانا تھا۔ قیدی اور راسن بڑے کتور کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ انہوں نے سارے مواصلاتی رابطے ختم کر دیئے ہیں اور اب باہر سے کوئی مدد نہیں آ سکتی ہے۔“

رام پال غور سے سن رہا تھا۔ ”میں تمہیں جانتا ہوں... میں پھیل کا نائب سیکورٹی انچارج ہوں۔“

”بڑا کتور سیف ہاؤس کے چیمبر میں مقید ہے کیونکہ اس کے ساتھ اندر جانے والے گاؤں میں تین گھنٹہ اور قیدی کے آدمی تھے انہوں نے ہاتی سب کا مار دیا ہے۔“

رام پال کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”ان میں میرا بھائی بھی شامل تھا۔“

”مجھے افسوس ہے لیکن ان میں سے کوئی نہیں بچا میں نے خود سنا تھا جو فائرنگ سے بچ گئے تھے انہیں ذبح کر دیا گیا تھا۔“

کمرے میں روشنی تھی اور وہی روشنی باہر آ رہی تھی لیکن میں نے ٹائٹ ویڈن آف نہیں کیا تھا کیونکہ آگے تاریکی تھی۔ روشنی سے بچنے کے لیے میں ایک طرف ہو گیا تھا۔ رام پال یہ سن کر ہڈیاں ہل گیا۔ ”اگر یہ سچ ہے تو میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”یہ سچ ہے اگر تم میرے ساتھ چلو تو میں بڑے کتور سے تمہاری بات کر سکتا ہوں۔“

”ہم تیار ہیں۔“

”تم اور تمہارے آدمی آگے چلیں گے۔ ابھی میں تم پر احاطہ نہیں کر سکتا جب تک بڑے کتور سے بات نہ کر کے تمہاری قسملی نہ کرادوں۔“

وہ مان گئے اور میرے آگے روانہ ہوئے۔ کیونکہ ان کے پاس ٹائٹ ویڈن نہیں تھا اس لیے ہم نے وہیں سے باہر نکل کر اندر چلی لائیں۔ میں نے وہاں دہشت گردوں کا شہرہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ رام پال خفیہ راستے سے واقف تھا۔ میں نے پہلے انہیں اس راستے کو ذرا وسیع کرنے کو کہا۔ پانچ افراد نے مل کر چند منٹ میں خاصا لمبا نکال لیا اور راستہ چھوڑا ہو گیا اب اس سے آسانی سے گزرا جا سکتا تھا۔ پہلے وہ پانچوں نے مجھے گئے۔ میں نے جت کو آواز دے کر

بتایا کہ پھیل کے پانچ گاؤں پر چھڑے ہیں۔ ان کے بعد میں چھپ گیا اور رام پال کے دہشت گردوں کی پوزیشن سے رابطہ کر لیا۔ بڑے کتور کی آواز سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اوپر کی صورت حال کی رپورٹ دی۔ پھر میں نے اس سے دہشت گردوں کی پوزیشن کے بارے میں پوچھا۔

”اب تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اوپر کیا صورت حال ہے۔ تم جتنی دیر کرو گے یہاں سے لڑنا اتنا ہی دشوار ہوتا جائے گا۔ لیکن اگرچہ میں بھی کوئی نہیں ہے یا پھر چند ایک لوگ ہیں ہم ان کا صفایا کر سکتے ہیں۔ اوپر اس چوہے دان کے مقابلے میں بہتر ہوگا۔“

”ہم اوپر کیسے جا میں گئے تم نے راستہ بتا کر دیا ہے۔“ بڑے کتور نے اس بار اٹھا نہیں کیا۔

”تمہارے آدمیوں نے راستہ کی قدر صاف کر دیا ہے ذرا کوشش کے بعد اس سے گزرا جا سکتا ہے۔ پھر ہم اسے بند کر دیں گے۔“

رام پال قسملی دلی ہی کے پاس بیٹھا اس سے پوچھ چھ کر رہا تھا ان لوگوں کو دیکھ کر قسملی کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ رام پال نے مجھ سے کہا۔ ”یہ غیر ضروری ہے اسے نہیں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔“

”ہونا تو یہی چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ابھی مجھے اس سے کچھ پوچھ کر کرنی ہے اس لیے یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔“

اسی لمحے دہشت گردوں کی پہلی ہوتی۔ دوسری طرف سے بڑے کتور نے کہا۔ ”میں دروازہ کھولنے جا رہا ہوں تم ہوشیار رہو۔“

میں نے اضافی اسلحہ رام پال اور اس کے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان کو میگزین دیئے اور انہوں نے رائل سنہال کوڑ کر لیں۔ پھر سب نے پوزیشن سنہال میں۔ میں نے قسملی کو سامنے کیا اور اس سے کہا۔ ”دروازہ کھلتے جا رہا ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار ڈال کر باہر آ جائیں۔“ میں قسملی کے بالکل پیچھے تھا۔ پھر میں نے دہشت گردوں کی پوزیشن کے بارے میں پوچھا۔

”دروازہ کھول دو اگر تم اور سادہ اندر ہی رہو گے۔“

”میں کھول رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور چند سیکنڈ بعد سیف ہاؤس کے دروازے سے دہشت گردوں کی آواز آئی جیسی خفیہ دروازے کھلتے وقت آتی تھی۔ یہ دروازہ بھی یقیناً بازوؤں کے طریقے سے کھلتا اور بند ہوتا ہوگا۔ کسی اور

طرہ چلتے سے اتنا وزنی دروازہ کنٹرول کرنا آسان نہیں تھا۔ میں اور میرے ساتھی ہوشیار تھے۔ میں نے جیت کو اس جگہ سے دور رکھا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ٹی وی دل جی نے چلا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

”ان کو روکو۔“ میں نے کہا اور بڑے سکون سے کہا۔ ”جلدی کرو۔۔۔ وہ لوگ آ رہے ہیں۔“

اپنی اپنی داستان

بڑے کنور کے ساتھ رام پال دو ساتھیوں کے ساتھ
گیا تھا۔ دو اور مٹی دل جمی بیچے تھے۔ وہ دونوں بیٹو کے ساتھ
تھے۔ میں نے سو راج میں جھانک کر رام پال کو آواز دی۔
"اٹا، اٹا، آؤ، اچھے بیٹے کو لے کر جاؤ گا۔"

بھی۔

”تم دو انیاں لے کر نہیں آئے تھے؟“

”نہیں جلدی میں رہ گئی تھیں۔“

”جب چلو۔“ میں نے کہا اور دونوں غیر مسلح گاؤڑ

سے کہا۔ ”تم کنوڑ کو سنبھالو گے۔ جیت اور سادی کنوڑ کے ساتھ

ہوں گے۔ رام پال تم ایک آدمی کو اور میرے ساتھ چلو۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں راستہ کھینچ کر جانے جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور

رام پال سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس نائٹ وچرن ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“

”تمہیک ہے وہ پکین لو۔ دوسرا تمہارے ساتھ ہوگا

میں اس طور کی لائٹ اڑانی پڑے گی۔“

”وہ کیسے؟“

”اس کی فکر مت کرو۔ کسی کے پاس سکر ہے۔“

سب کے پاس کوئی نہ کوئی سکر تھا۔ میں نے ایک سکر

کمرے کے باب ہولڈر میں لگا کر اوپر سے انری سیورٹ

کر دیا۔ جیسے ہی پتہ پڑا کہ کمرے کے ساتھ راہداری بھی

تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ اس کمرے کی روشنی بند ہو گئی تھی

جس میں یہ پانچوں قید تھے۔ گویا یہ طور یا راہداری بجلی سے

محروم ہو گئی تھی۔ رام پال نے ایک چھوٹی سی نائٹ وچرن

کا ٹکڑا نکال پکین لی۔ یہ بیت ابھی کوئی نہیں تھی کیونکہ تاریکی

میں یہ کسی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھی۔ ہم باہر

نکل آئے۔ میز جیوں تک آئے یہاں بیٹھے کے حصے میں رخ

خان کے آدمی اور مقامی گاؤڑ کی لائیں ایک ڈھیر کی

صورت میں جمع تھیں۔ میں نے رام پال کو اشارہ کیا کہ وہ

میز جیوں کو چمک کرے اور خود میز جیوں کے نیچے سے

گزرے والی راہداری کی طرف بڑھا۔ یہ آگے جا کر بائیں

طرف مڑ رہی تھی۔ اس طرف روشنی تھی۔ میں نے ایک وال

لیپ کو اٹھا کر اس میں سکر رکھ کر بلب لگایا تو یہاں کالہوڑ بھی

آؤ گیا۔

آگے کوئی نہیں تھا۔ میں رک گیا۔ کچھ دیر میں رام پال

بھی اپنے ساتھی کے ہمراہ آ گیا اور ہم اس راہداری کے

کمرے چمک کرنے لگے۔ مگر یہ جگہ مکمل طور پر خالی تھی۔

میں نے رام پال سے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے تو اس نے

مجھے بتایا کہ اس راہداری سے نکلنے کے بعد ہم دائیں طرف

جائیں تو بڑے کنوڑ کے۔۔۔ مخصوص حصے تک پہنچ جائیں

گے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جا کر بڑے کنوڑ کو لے آئے تب

تک میں اس کے ساتھی کے ہمراہ بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔

چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کے آدمی

وہیں پھوڑا اور خود دس قدموں آگے کی طرف بڑھا۔

راہداری آگے جا کر پھر دسوں میں بیٹھ رہی تھی۔ میں نے

جھانک کر بائیں طرف دیکھا وہاں روشنی تھی۔ ہمیں اپنی

طرف جانا تھا۔ میں کوئے پر رک گیا۔ چند منٹ بعد ہم اس

باقی سب کو لے کر آ گیا۔ وہ اور جیت سب کی رہنمائی کرتے

تھے کیونکہ اس تاریکی میں وہی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے ج

سے پوچھا۔

”جب میں بڑے کنوڑ سے بات کر رہا تھا تب تم نے

کہا تھا کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔“

”شولی وہ کم سے کم تین آدمی تھا وہ موٹر تک آیا تھا

جب ہم نے آپ کو خبردار کیا تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور وہاں

نہیں آیا۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ اگر دشمن سرگرمی میں ہمارے پاس

آ گیا تھا تو اس طرح جھلک دکھا کر وہاں جانے کی کیا تھ

تھی۔ اسے حملہ کرنا چاہیے تھا جب کہ وہ جانتا تھا کہ ہم یہاں

محصور ہیں۔ رام پال نے میرے شانے پر ہاتھ

رکھا۔ ”سر ہمیں آگے جانا ہوگا۔۔۔ بڑے کنوڑ کی حالت عجیب

نہیں ہے۔“

میں نے دیکھا وہ یہ مشکل سہارا لیے کھڑا تھا۔ سادی

بہر حال اس کی بہن تھی اور اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ بھی

اس کے پاس تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”چلو لیکن بہت محتاط رہو

ہوگا۔“

میں اور رام پال آگے تھے۔ شٹی ہمارے ساتھ تھ

جب کہ جیت اور رام پال کے دو سب ساتھی عقب میں تھے۔

پشت کی حفاظت کرتے چل رہے تھے کیونکہ دشمن کسی بھی

طرف سے آ سکتا تھا۔ مجھے ذرا خوش بھی نہیں تھی کہ راس نے

اس قمارت کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ لیکن وہ میرے تھے جس

سارے فساد کی جڑ تھے۔ جہاں راہداری محوم رہی تھی

میں نے رام پال سے پوچھا۔ ”بڑے کنوڑ کے حصے تک

جانے کا اور کوئی راستہ ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”صرف یہی ایک راہداری

جاتی ہے۔ اس پر بھی سخت سیکورٹی ہوتی ہے۔ آخری حصے میں

خاندان کا کوئی فرد بھی بغیر اجازت اور چیک کے نہیں جاسکتا۔“

بڑے کنوڑ کو سب سے زیادہ خطرہ خاندان والوں سے

تھی۔ راج کنوڑ اس کا بھائی تھا اور شٹی رشتے دار تھا اور

رام اسے دنیا سے رخصت کر دینا چاہتے تھے۔ میں اور

پال خط قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری

بکلیں کارخ سانس کی طرف تھا اور ہم ایک سینکڑے فوٹس

پر گزرنے کے لیے تیار تھے۔ ایک جگہ دو گاؤڑ کی لائیں

بڑے ہی خون میں غلطان پڑی تھیں۔ ان کے پاس سے گزر

کر ہم اس چھوٹے دائرے نما پال میں داخل ہوئے جس

کے تین اطراف میں کمرے تھے اور ان میں وسط والا کمرہ

بڑے کنوڑ کا خاص کمرہ تھا۔ یہاں بھی شٹی کے آثار تھے اور

پال پال پھر اہوا تھا۔ شاید یہاں بھی جنگ ہوئی تھی۔ وہاں

راشٹی بھی اس لیے سب نے نائٹ وچرن آف کر دیں۔ ابھی

تک ہمیں کہیں حراست کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہم سب

پال میں آگے اور بڑا کنوڑ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا کہ

میں نے اسے روکا۔ ”نہیں پچھلے چمک کرنے دو۔“

رام پال آگے بڑھا تھا کہ جھک ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے

اسے کچھ نظر آیا ہو۔ میں نے تھکی کی اور فوراً ہی مجھے وہ چیز نظر

آئی۔ یہ پال کے تقریباً وسط میں رکھا ایک گھی کے پانچ گلو

کے ابے کے برابر کا ڈاؤنٹا مینٹ بنڈل تھا جس کے ساتھ

ایک سرگرم شلک تھا اور بیڑی سمیت سب واضح تھا۔ میں

پتے کا تھا کہ مجھے راسن کی کمرہ آواز سنائی دی۔ ”نہ۔۔۔ نہ

شہاز۔۔۔ مزید کوئی حرکت مت کرنا ورنہ میں ریموٹ کا بٹن

دباؤں گا اور اس جگہ موجود کوئی فرد زندہ نہیں رہے گا۔ تم

ب میری نظروں میں ہو اس لیے کوئی بھی حرکت نہ

کرے۔“

”تم ٹھوٹ کہہ رہے ہو۔“

”اچھا تمہارے پیچھے موجود فوٹی خانوٹی سے سرگرم رہا

جسے روکا کر مرنا نہیں چاہتے ہو۔“

میں نے مزید فوٹی کو دیکھا تو وہ فوراً ساکت ہو گیا

تھ راسن نے درست کہا تھا۔ ”تم نے اسی لیے اپنے

آدمیوں کی جھلک دکھائی تھی کہ تم اوپر آ جاؤ گے؟“

”ہاں اور تم میری فوٹی پر پورے اثرے۔“ اس نے

”شہاز میں صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔ اپنا تمام

تھ پیچھے بکری میں پھینک دو۔“

میں سرپ و درپ سے کمرے سے گزر رہا تھا۔ ایک

ایک سے نہایت پاتا تو دوسرے میں پھنس جاتا۔ فوٹی کے

تھ میں راسن زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے

اپنا ہاتھ اس سے ہمیں پھانسا اور وہاں آتے پر مجبور کر دیا

جہاں وہ ہمیں اور خاص طور سے بڑے کنوڑ کو دیکھنا چاہتا

تھا۔ یہاں اس نے ہمارے استقبال کے لیے ایک ہم ٹرپ

رکھا تھا اور خود کہیں دور بیٹھ کر وہ لب ہمیں مجبور کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”راسن اگر تم نے اس ہم کو اڑا تو ہم سب مر

جائیں گے پھر تم وہ میرے سر طرح حاصل کرو گے۔“

”ابھی راج کنوڑ ہے۔“ راسن نے بھڑائی سے

کہا۔ ”میں اس کی مدد سے میرے حاصل کر لوں گا۔“

”اسے سیف کا بھی نشان نہیں معلوم ہے۔“

”ایسا ابھی نہیں سکتا ہے۔ راج کنوڑ کو لازمی معلوم ہو

گا اور اگر اسے بھی علم نہیں ہوا تب بھی میں اس سیف کو لے

جاؤں گا اور آج کل دیکھنا لو کی بہت ترقی کر چکی ہے میں

اسے کھلوں گا۔ بہر حال تم سیف اور میری دل میں اپنی

فکر کرو۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں تم میں سے کسی نے ہتھیار

نہیں پیچھے ہیں میں اب دس تک توں گا اور پھر یوم۔ ایک

دو تین چار۔۔۔“

میں نے اپنی رائفل پھینک دی پھر باقی سب نے بھی

میری پیروی کی۔ ہم نے اپنی زور سے جھکی گھسی کہ وہ سرگرمی

ہوئی بکری میں چلی گئیں۔ راسن نے کہا۔ ”پستول بھی نہم

سب کے پاس پستول ہوں گے۔“

”صرف دو پستول ہیں۔“ میں نے کہا اور اپنا پستول

پھینک دیا۔ جیت نے میری تھکی دی۔

”اوکے تم سب سر ہاتھ پر رکھ کر کھنوں کے بل بیٹھ

جاؤ اور اب کسی کے پاس سے پستول یا کوئی بھی ہتھیار نکلاؤ

وہ اسی سے مارا جائے گا۔“

”اوکے۔۔۔ اوکے۔“ میں نے دل ہی دل میں اس

دکار آدمی کو سناتے ہوئے سادی سے کہا۔ ”پستول پھینک دو

کسی کے پاس کوئی جاؤ تو وہ بھی پھینک دو ورنہ اپنی

موت کا خود ڈنڈے دار ہوگا۔“

اس بار سادی نے پستول اور رام پال نے ایک بڑا

فونی جاؤ نکال کر پھینکا تھا۔ یہ شاید اس سے کے پاس رہ گیا

تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سب نے قسم کی

تھیل کی اور سروں پر ہاتھ رکھ کر کھنوں کے بل بیٹھ گئے۔

راسن نے سادی اور بڑے کنوڑ کو بھی رعایت نہیں دی اور

انہیں بھی اسی طرح بیٹھنا پڑا۔ چند منٹ بعد بکری کی طرف

سے چار سب افراد بھاڑ ہوئے اور انہوں نے پال میں

چاروں طرف اس طرح پوزیشن سنبھال لی کہ کوئی فرد یا اس

کی حرکت ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ پھر دو افراد

آئے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ میں پہلے بھی ان لوگوں کو دیکھ چکا تھا۔ آنے والے دونوں سب کی مکمل جانح تلاشی لینے لگے۔ وہ کوئی جگہ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک سادی کی طرف بڑھا تو میں نے کہا۔ "راہن سادی کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے پھر اسے شوٹ کر دیتے ہیں۔" راہن نے سر دھچکے میں جواب دیا تو سادی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے مجبوراً سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے لیکن اپنے آدمیوں سے کہو صرف تلاشی لیں، مجھے مشغول کرنے والا کوئی کام نہ کریں ورنہ ایسا نہ ہو تم ان کی وجہ سے بیروں سے محروم ہو جاؤ۔"

"تم فکر مت کرو وہ صرف تلاشی لیں گے۔"

سادی کی تلاشی لینے والے نے اس کو بھی پوری طرح ٹھوٹا تھا مگر اس کے انداز میں بد معاشی نہیں تھی اور نہ ہی اس نے غیر ضروری طور پر اسے دیر تک چھوڑا۔ اس کے باوجود سادی کے لیے یہ میرا آنا مرحلہ تھا۔ دس منٹ میں یہ مرحلہ بھی مکمل ہو گیا۔ کسی کے پاس سے کچھ نہیں نکلا تھا۔ بڑے کنور کے ذیل چلے جوتے کو بھی اچھی طرح ٹھوٹا گیا تھا۔ اس کی جیتی لکڑی اور باگی دانٹ کے دستے کی بنی چھڑی ایک اچھا ہتھیار ہو سکتی تھی مگر تلاشی لینے والے نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ بڑے کنور کی حالت اسکی نہیں تھی کہ وہ اسے استعمال کر سکتا۔ وہ بے مشکل ٹھنڈوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور اچانک ہی وہ نیچے ٹوٹ چکا۔ سادی نے فکر مندی سے کہا۔ "آپ ٹھیک ہیں؟"

میں نے بلند آواز سے کہا۔ "راہن بڑے کنور کی حالت خراب ہو رہی ہے اسے دوا کی ضرورت ہے جو اس کے کمرے میں ہے۔"

"فکرت کرو یہ میرے کام نہیں۔" راہن نے کہا۔ وہ اپنے طریقہ کار سے بچنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تلاشی لینے کے بعد اس کے آدمی ہمارا اسٹو سیٹ کر لے گئے اور چار سٹا افراد اسی طرح ساکت اور چپکس کھڑے تھے۔ وہ جیلوں کے گاؤڑ زمین سے نہیں تھے بلکہ مٹی کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے اب مٹی کے بجائے راہن کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ اپنے فیصلے پر ذرا بھی شرمسار نہیں تھے۔ ان کے پاس میرا نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ان میں سے کسی نے مٹی سے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ الٹا وہ خود سہا ہوا تھا۔ مٹی ڈالیں آدمی تھا اور یقیناً کسی قدر حوصلہ مند بھی

تھا لیکن حوصلہ بس اس وقت تک تھا جب تک اس کے قابو میں تھے۔ جہاں حالات اس کے قابو میں تھے۔ حوصلہ جواب دے گیا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کی حالت بھیڑ کی سی ہو رہی تھی جس نے قصائی کو دیکھ لیا ہے۔ امید میں ہو کر آج اس کی باری نہیں آئے گی۔

مگر اب وہ پرسکون تھا حالانکہ معاملہ راہن کے میں چلا گیا تھا اور وہ اس کا حریف تھا۔ وہ اسے زندہ چھوڑ سکتا تھا۔ مگر اب مٹی اتنا خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسٹو سیٹ کر جانے والے چند منٹ بعد ہی راہن کے لوٹ آئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوٹ گنا آکر تھا۔ نے ہم کی طرف اس کا رخ کر کے چند منٹ دیا ہے۔ اس کے سر کٹ پر بچنے والی ایل ای ڈیز بند ہو گئیں۔ مگر ڈی ایچ پی وینٹ ہو گیا تھا۔ مگر یہ چند لمبے یہاں سوچو اور بہت بھاری کر دے تھے کیونکہ اس کی گٹھلی سے کوئی اور نہیں جاتا تو ہم چچھٹانے سے پہلے دیا سے رخصت ہو جاتے۔

راہن کے ساتھ چھ افراد تھے اور مزید درجن افراد وہاں بچیوں پر تھے۔ اس نے آتے ہی خوبی نظروں سے مٹی کی کو دیکھا اور نظریہ انداز میں بولا۔ "مٹی بازی الوٹ کی اب یہ میرے ہاتھ میں ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" مٹی لیے پرواہی سے بولا۔ "جی ہاں سکتا ہے ایسا نہ ہو۔"

میرے ساتھ راہن بھی چوٹا تھا۔ راہن نے فرما کہا۔ "تم کیا کہنا چاہے ہو۔"

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔"

"کیوں نہیں تمہیں جلد نہ کچھ دوں۔" راہن نے جیکٹ سے پستول نکال کر اس کا رخ مٹی کی طرف کیا تو وہ اس بار بھی پرسکون رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"مٹھوڑا کہ تم بڑے کنور کی مدد سے بھی سیف نہیں کھلو سکو۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" راہن بولا۔

مٹی نے فحاشت سے اسے دیکھا۔ "تم ایک دھڑکے سرکاری ملازم اگر تمہیں کنور میں اس کا انتظام مل گیا تو تمہیں خود کو کچھ کھنا شروع کر دیا۔ تم ساری عمر بھی یہاں رہو گے۔ جگہ کے بارے میں وہ نہیں جان سکتے جو میں جانتا ہوں۔" اوکے اگر میں تمہارے سر کے سہانے سہنے میں سوراخ کر دوں تو تم یہ کوئی (شاعری) چھوڑ کر یہاں بھاڑ میں بات کرو گے۔"

"اسی طرح بھاڑ میں بات یہ ہے کہ سیف کھولنے کے لیے کسی مین روکار ہوتے ہیں۔ ایک بڑے کنور کے لیے دوسرا سادھنا کے علم میں تھا لیکن بڑے کنور نے اسے حاصل کر لیا۔"

"میرا مٹی مین راج کنور کے پاس ہوگا۔" میں نے "لیکن مٹی نے اسے حاصل کر لیا ہے۔"

مٹی دل جی میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "شہباز جی اس کی ذات پر مجھے کسی شبہ نہیں رہا۔ سبھی وجہ تھی کہ میں اسے ساتھ خوف زدہ تھا کیونکہ تمہارے پاس مجھے زندہ مٹی کی کوئی دیکھ نہیں سوائے اس کے کہ تم بلا وجہ کسی کو نہیں دے رہے ہو۔ اس سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" اس نے پھر فحاشت سے راہن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جگڑ گیا تھا اس نے پھر پستول مٹی کی طرف کیا۔

"اس کے باوجود میں تمہارے سر میں سوراخ کر سکتا ہوں۔"

"اور اس کے بعد ان اہتوں کو کیا جواب دو گے صرف بیروں کے لالچ میں تمہارے جیسے گدھے کے ساتھ شامل ہوئے۔ راہن میرا منصوبہ تھا اور مجھے اس کے ساتھ ایک حصے کا علم ہے۔" مٹی نے ان کی طرف اشارہ کیا اور ان کی بدل کر راہن کے ساتھ مل گئے تھے۔

راہن کے چہرے پر ہلکے آٹا نظر آئے تھے۔ میں ان کی کھال کے ذیل پر حیران تھا۔ اس نے اصل پتا اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ میرے پاس پتا بیکار تھا۔ اس نے راہن کے لیے بجا کر رکھا تھا اور اس نے اس کے سامنے پھینک دیا تھا۔ ساتھ ہی میرے ہاتھ میں مٹی کے ساتھ تھے مگر اب راہن کے ساتھ تھے۔ وہ راہن کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کا انداز اتنا برا تھا کہ راہن ان میں وہ ہشاشمٹا سیاہ مٹی شامل تھا جو مٹی کا کینڈا ان کاٹا تھا اور اس کے آدمیوں کو بھی سٹروں کر رہا تھا۔ اب وہ بھی راہن کے ساتھ تھا اور اس کے آدمی بھی ان کے ساتھ تھے۔ راہن سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مٹی دل جی نے فحاشت کر دیا تھا کہ وہ اب بھی کھیل میں شامل تھا اس سے راہن کو ہوا تھا۔

یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا تھا کہ صورت حال میں ایک تبدیلی سے راہن اپنے لیے شدہ پلان پر عمل کرنے میں تامل نہیں رہا تھا۔ اب اسے مٹی کو بھی شامل کرنا تھا۔ اب

میں سمجھا تھا کہ مٹی اور راہن کیوں مجھے اور سادی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ یہ ظاہر ہم ان کے لیے بیکار تھے اور وہ بیکار چیزیں رکھنے کے بجائے انہیں پہلی فرصت میں ٹھکانے لگانے کے قابل ہیں۔ سادی کے پاس ایک کبھی نہیں تھا اور اگر بڑا کنور آسانی سے نہیں مانتا تو سادی کی مدد سے اس پر دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف میرے ذریعے سادی کو دباؤ میں لایا جاسکتا تھا۔ مگر جیت کی مدد سے مجھ پر دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ مٹی اور راہن اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہماری زندگی کی ذخیرہ پر قرار دی تھی۔ ایک بار سیف کی دولت ان کے ہاتھ میں آ جاتی تو وہ اس ذخیرہ کو ایک بار ہی کھولے کھولے کر سکتے تھے۔

راہن سے بات کر کے مٹی دل جی خاموش کھڑا تھا۔ اس نے پھر کچھ کہنے یا راہن سے سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ضرورت مند راہن تھا وہ نہیں۔ مگر راہن کے ذہن میں اب بھی ابہام تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ امید تھی۔ اس نے مٹی کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہتے ہو کہ میں تم سے وہ کبھی نہیں ٹھوٹا سکتا؟"

"تم ایسا کر سکتے ہو۔ تم میرے جسم کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہو اور میں تشدد برداشت کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اگر تمہیں تشدد کے لیے میرا جسم ہی نہ ملے تو تم کیا کر لو گے؟"

راہن چوٹا۔ "کیا مطلب؟"

"مٹی دل جی نے اپنا منہ کھول کر دکھایا۔" یہ دیکھو میرے منہ میں کیا ہے۔"

میں سمجھا تھا کہ مٹی اور راہن کیوں مجھے اور سادی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ یہ ظاہر ہم ان کے لیے بیکار تھے اور وہ بیکار چیزیں رکھنے کے بجائے انہیں پہلی فرصت میں ٹھکانے لگانے کے قابل ہیں۔ سادی کے پاس ایک کبھی نہیں تھا اور اگر بڑا کنور آسانی سے نہیں مانتا تو سادی کی مدد سے اس پر دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف میرے ذریعے سادی کو دباؤ میں لایا جاسکتا تھا۔ مگر جیت کی مدد سے مجھ پر دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ مٹی اور راہن اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہماری زندگی کی ذخیرہ پر قرار دی تھی۔ ایک بار سیف کی دولت ان کے ہاتھ میں آ جاتی تو وہ اس ذخیرہ کو ایک بار ہی کھولے کھولے کر سکتے تھے۔

راہن سے بات کر کے مٹی دل جی خاموش کھڑا تھا۔ اس نے پھر کچھ کہنے یا راہن سے سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ضرورت مند راہن تھا وہ نہیں۔ مگر راہن کے ذہن میں اب بھی ابہام تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ امید تھی۔ اس نے مٹی کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہتے ہو کہ میں تم سے وہ کبھی نہیں ٹھوٹا سکتا؟"

"تم ایسا کر سکتے ہو۔ تم میرے جسم کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہو اور میں تشدد برداشت کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اگر تمہیں تشدد کے لیے میرا جسم ہی نہ ملے تو تم کیا کر لو گے؟"

راہن چوٹا۔ "کیا مطلب؟"

"مٹی دل جی نے اپنا منہ کھول کر دکھایا۔" یہ دیکھو میرے منہ میں کیا ہے۔"

اس کی زبان پر ایک چھوٹا سا شیشے کا کپسول تھا۔ اس میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ اس نے دکھا کر منہ بند کر لیا اور اسے واپس جیب سے اور گال کے درمیان کر کے بولا۔ "اس میں ساٹا نیلہ ہے۔ دنیا کا خطرناک ترین زہر۔ مجھے بس کپسول تو زندہ ہوگا اور میں ایک سینکڑوں میں مر جاؤں گا۔ پھر تم میری لاش پر تشدد کر کے پوچھتے رہنا۔"

"تم بلیف کر رہے ہو۔" راہن نے بے یقینی سے کہا۔ "اس قدر خطرناک چیز تم منہ میں لیے پھر رہے ہو۔ اگر مٹی سے یہ تمہارے پیٹ میں چلا گیا تو۔"

"میں نے اسے ابھی منہ میں لیا ہے اس سے پہلے یہ میرے لباس میں تھا اور اگر یہ مٹی سے بھی پیٹ میں چلا گیا تب بھی بہت کم امکان ہے یہ اندر نہ لے گا۔ جب تک میں

جولائی 2014

171

ماہنامہ منبرِ گزشتہ

جولائی 2014

170

ماہنامہ منبرِ گزشتہ

اسے چپاؤں کا ٹھکانا میں محفوظ ہوں لیکن اسے چپانے میں
تکینہ کاروں کا حصہ لگے گا۔
”تم جھوٹ بول رہے ہو، کیا جہیں معلوم تھا کہ میں تم
پر قاتلوں کا؟“ رامن بدستور ٹھک میں تھا۔
”نہیں یہ میں نے بڑے وقت کے لیے رکھا ہے۔
میں کام کر رہا تھا تو بڑے کور کے ہاتھ آنے کے بجائے اسے
چپانے کو ترجیح دیتا۔“ مٹی دل جی نے کہا۔ ”غدا اب سے اور
سبک کر مرنے سے بچ رہا ہوں میں اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی
کا خاتمہ کر لیتا۔“
مٹی نے ثابت کر دیا تھا کہ اس نے واقعی ہر پہلو پر نظر
رکھی تھی۔ یہ اسی کا منصوبہ تھا۔ رامن طلحے کے طور پر شامل ہوا
تھا۔ اس کے پاس اب وہی راستے تھے یا تو وہ مٹی کا تعاون
حاصل کر لیتا یا پھر میرے بھول جاتا۔ لیکن اس صورت میں
وہ ان خون خوار لوگوں کو کیا جواب دیتا جو صرف دولت کے
لاالچ میں اس کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ اگر انہیں دولت
نہ ملتی تو وہ رامن کی یونیاں نوچ لیتے۔ اس کے پاس واحد
راستہ مٹی کو ساتھ لانے کا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔
میرے سامنے ایک اور کھیل شروع ہو گیا تھا اور میں اسے
دل چاہے نہیں کہ کتنا تھک گیا۔ اس میں میرے ساتھ سادی
اور جیو کی زندگی بھی داؤ پر لگی تھی۔ ہاں یہ کھیل جتنا الجھنا
تماری زندگی کے امکانات اتنے ہی بڑھ جاتے۔ سادی نے
بڑے کٹور کو سنہال کر اٹھا لیا تھا۔ اس نے رامن سے
کہا۔ ”ان کو دو کی ضرورت ہے۔“
”گرم مت کرو اگر کچھ دیوہ دوا نہ ملی تو یہ میرے کا
نہیں۔“ رامن نے نفرت سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے
بڑے کٹور سے کوئی خاص پر غاش ہو حالانکہ بڑے کٹور نے
ایک بار اسے معاف کیا تھا اور اسے تیس کا انتظام بھی بنایا تھا۔
اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو رامن کو تیس سے لات مار کر نکال
چکا ہوتا۔ اس کے برعکس رامن کے انداز سے لگ رہا تھا کہ
وہ اس کے خلاف کوئی عداوت دباے بیٹھا ہے اور اب اسے
موقع مل رہا تھا۔ گرنے کے بعد بڑے کٹور کا پسر سے ہٹ
گیا تھا اور اس کا چہرہ دلایا تھا جس پر ساپ بھی دھاریاں
تھیں اور وہ خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مٹی
اور رامن کے آدمی اسے دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے
تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ زہر بلا ساپ ہو۔ انہوں
نے ایسا انسان پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ رامن اور مٹی اسے
دیکھتے رہے تھے۔ میں نے رامن سے کہا۔

”تمہارے احساسات اپنی جگہ لیکن اگر یہ سب
ہو گیا یا طبیعت زیادہ خراب ہونے سے بڑے لوگ
کیا تم بھی تیش لینے اس کے پیچھے جاؤ گے۔ تم نے تو
وہاں جانا بھی نہیں ہے۔“
”تم اپنی زبان بند رکھو۔“ رامن نے غصے سے
میں کہا۔ ”ایسا نہ ہو میں پہلے تمہیں زندہ بھیج دوں۔“
”تمہارا ارادہ تو نیکی ہے لیکن ہوتا وہی ہے۔
والے کی مرضی ہو۔“
”ٹھیک ہے اگر اوپر والے کی مرضی یہی ہے کہ
دوا کے مر جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“
”شہزاد جی ٹھیک کہہ رہے ہیں اسے دوا
دو۔“ مٹی دل جی نے کہا۔ ”دیر خطرناک ہو سکتی ہے۔“
”تم اپنا من بند رکھو۔“ رامن اس پر اصرار کرتا
لگا رہا تھا اس غیر متوقع صورت حال نے اس کی قوت پر
متاثر کی تھی۔ وہ سب کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ مٹی
بچنے کے لیے باقی طرف دیکھا۔
”تم اس شخص کے ساتھ مل گئے ہو جس کے ہاتھ
فیصلہ کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔“
”رامن جی اسے دوا لینے دو۔“ سیاہ قلم نے
اس کا لہجہ بغیر کسی جذبے کے تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ
رامن کو پاس نہیں سمجھ رہا ہو۔ بس اس کے ساتھ ہوا
نے اسے بھی خوفناک نظروں سے دیکھا۔
”کونسا مت کرو یہاں پاس میں ہوں۔“
”واقعی۔“ سیاہ قلم کا لہجہ بڑھ گیا۔ ”اگر ہم
ساتھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ آئے تو تم نے خود کو پاس
شروع کر دیا۔“
”میں پاس ہوں۔“ رامن نے کہا اور اس کا ہاتھ
جینٹ کی جیب کی طرف کیا جس میں اس نے ریوٹ
تھا۔ سیاہ قلم نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔
”نہیں رامن جی۔۔۔ ہاتھ اوپر رکھو۔“
”تم فدا داری کر رہے ہو۔“ رامن غرایا جیسے اس کا
ہاتھ رک گیا تھا۔
”میں تمہاری لٹھی ٹھیک کر رہا ہوں۔ دیکھ اس کی
جیب سے ریوٹ نکال لو۔“ بھول جی۔
رامن کے پیچھے کھڑے آدمی نے سیاہ قلم کے
قبیل کی۔ وہ تھلائی لینے والوں میں شامل تھا۔ اس نے
نے رامن کی تھلائی کی تھی۔ پھر سیاہ قلم کے اشارے پر

ہاتھ ساتھ آگڑا ہوا میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس موقع
کے لیے ہمارے ہاں کیے ہیں، ایک ہی صف میں کھڑے ہو
جئے محمود ایاز۔۔۔“
رامن خون کے ٹھکانے کی کردہ گیا۔ میں نے مٹی کی
طرف دیکھا۔ ”یہ تو زنا بخت ہے، تم پڑنے کے لیے شخص ہوا
موقع کے لیے کوئی شخص ہوگا تمہارے ذہن میں۔۔۔؟“
”رنگ بدلتا ہے آسمان کیسے کیسے۔“ مٹی دل جی نے
سکرا کر کہا۔
”پچھلے دن کیا وہ ٹھکانوں میں واقعی کچھ زیادہ ہی بدل
گیا ہے، میری تو عقل خبط ہو کر رہ گئی ہے۔ حالات کے اتنے
تھماؤ پھراؤ میں نے شاید اس پورے عرصے میں نہیں دیکھے
ہوئے ان چند ٹھکانوں میں دیکھے ہیں۔“
”آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا۔“ مٹی دل جی نے
پراس پڑنے سے گئے ہونے کا ثبوت دیا۔ مٹی دل جی میرے
پاس تھا میں نے ذرا جھک کر بھی آواز میں کہا۔
”مٹی جو لوگ بیک اپ ٹیم کی دیکھ بھال کے لیے
گئے ہیں ان کی واپسی کب تک ہوگی۔“
اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”ان کی واپسی
نہیں ہوگی وہ اپنا کام کر کے چلے جائیں گے۔“
”اس کے برعکس میرا خیال ہے وہ یہیں آئیں
گے۔“ میں نے مٹی خیر اعزاز میں کہا۔ ”مٹی یوں خاموش اور
الٹان ہو گیا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔“
سیاہ قلم نے اپنے ایک آدمی کو بھیج کر بڑے کٹور کے
کمرے سے اس کی دوا میں شگوا دی میں اور سادی اب
اسے دوا دے رہی تھی۔ یہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ کناٹا اب
سیاہ قلم کے پاس ہے۔ کم سے کم یہاں موجود باقی افراد اس
کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے مٹی سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“
”اس کا نام بکتو ہے۔“ مٹی دل جی نے کہا۔ ”بھئی کا
مشہور بدعاش ہے۔ باقی سارے آدمی اس کے ہیں۔“
”مٹی دوسرے آدمیوں پر بھی اسی کا ہولڈ ہوگا۔“
”بالکل۔۔۔ سوائے رامن کے چار پانچ آدمیوں
کے۔“
”ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں
دیکھ چکا ہوں یہاں کے گاؤں ٹکے اور اہل ہیں۔“
”مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔“ مٹی دل جی نے کن
انہوں سے رام پال کی طرف دیکھا۔ ”یہاں موجود سارے
گاؤں ایک ہی ٹکے کے اور تقریباً سب آپس میں رشتے دار
کے۔“

ہیں۔ ایک نے دوسرے کو کھوایا اور دوسرے نے تیسرے
کو۔“
”یہ تو اس خلع کی خاص بات ہے۔“ میں نے غصہ
سانس لی۔ ”میرٹ کے بجائے اقربا پروری نے ہمیں ہر
شے میں تان پرورش کر دیا ہے۔“
”بس یہ بھی ایسے ہی گاؤں ہیں جنہیں گن اٹھا کر
قاریب کرنا آتی ہے لیکن جب ان کا واسطہ مٹی مستوں میں
پرورش سے پڑا تو یہ سب ڈھیر ہو گئے۔“
”آدمی تو تمہارے بھی کم پرورش نہیں ہیں انہوں
نے کیسے کرکل کے انتہائی تربیت یافتہ آدمیوں کو آڑا کر رکھ
دیا۔“ میں نے مٹی خیر اعزاز میں کہا۔
”یہ اس طرح کے پرورش ہیں کہ جان لینا اور دینا
دونوں جانتے ہیں۔“ مٹی دل جی نے سر ہلایا۔ ”اسی لیے
کامیاب بن رہے۔“
”لیکن کرکل کے آدمیوں کو تمہارے آدمیوں کی
طرف سے حملے کا خدشہ بھی تو نہیں تھا۔“
”اسی وجہ سے تو آسانی سے مارے گئے۔“ مٹی
بولا۔ ”انہوں نے خاموشی سے کارروائی کی اور تمام اساتذہ
اور میزائل چلانے والوں کو کھانے لگا دیا۔ ان کی جگہ سنہال
کر انہوں نے کارروائی شروع کر دی۔ وہ مہارت میں کرکل
کے آدمیوں سے کم نہیں ہیں۔“
میں نے سر ہلایا۔ ”ان کی مہارت میں نے دیکھی تھی
جب انہوں نے دونوں اے ٹی سی گاڑیاں آڑا دیں۔ میں
خود بھی باران کے ٹکٹے سے بے بال ہال بن گیا۔“
تمہاری یہاں موجودی حیرت انگیز تھی۔ تمہارے
بارے میں یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ تم کسی حادثے کا شکار ہو
گئے ہو یہ خیال کسی کو نہیں تھا کہ تم بڑے کٹور ٹیکس میں پہنچائے
جائے ہو۔“
”بس قسمت کی بات ہے، دو معمولی ملازموں نے
مجھے قاپ کر لیا تھا لیکن کیا رامن نے جیسے میرے بارے میں
بتایا نہیں؟“
”اس سے میرا ربط نہیں تھا۔ میں اسے حملے سے بے
خبر رکھنا چاہتا تھا۔“ مٹی نے رامن کی طرف دیکھا۔
”اس کا مطلب ہے جیسے شروع سے اس نے خدشہ
تھا۔“
”اس جیسے شخص پر اختیار کس طرح کیا جا سکتا
ہے؟“ مٹی دل جی کے لہجے میں پھر ہکارت آئی۔

”یہی خیال اس کا بھی ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اب ایسا لگ رہا ہے کہ جتنوں نے خود سب سنبھال لیا ہے۔“

”یہی خیال اس کا بھی نہیں ہے۔“ منشی نے سرگوشی کی۔

”جب کیا ہوگا؟“

جتنو باہر چلا گیا تھا اور جاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہوشیار کر گیا تھا۔ اس کے آدمی اس کے حکم کے تابع تھے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جتنو کس کے ساتھ ہے اس کا اندازہ مجھے اس سے ہوا کہ جتنو کے بدلتے ہی انہوں نے لمبے بھر میں اس کا ساتھ دیا اور ذرا بھی نہیں ہچکچائے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ راسن کے آدمیوں کو لٹکانے لگے نہ کیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مرکزی جیل کا سامنے والا حصہ تیار ہو گیا تھا تب یہاں آمدورفت کیسے ہو رہی تھی۔ میں نے منشی دل دی سے پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”یہاں ایک راستہ ہے اس سے باہر جاسکتے ہیں۔“

میں نے راسن کی طرف دیکھا۔ ”جیل میں بے شمار عام ملازمین بھی ہیں وہ کہاں ہیں؟“

”ان میں سے کئی مارے گئے ہیں اور باقی بچنے والے جنازہ کی عمارت میں بند کر دیے گئے ہیں۔“ اس نے سب سے پہلے میں کہا۔ ”تم ان کی نہیں اپنی فکر کرو۔“

”مجھے تو تمہاری فکر بھی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

اس دوران میں جتو سرک کر میرے پاس آ گیا تھا اور کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”شوہنی یہ کیا قسم ہے ہر دھنٹ بعد دن بدل جاتا ہے۔“

”یہ زندگی کا ظم ہے۔“

”اب ہم کیا کر سکتے؟“

”دیکھو اور انتظار کرو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے ابھی اور بھی بہت کچھ ہوگا۔“

میں نے جان بوجھ کر ذرا بلند آواز میں کہا تھا اور راسن کے ساتھ منشی جی نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ منشی نے کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”جہیں لفظ نہیں ہوتی ہے کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

جتنو کے آدمی بھی اسی کے علاقے کے تھے۔ لیکن وہ صورت فعل سے پہلے کے ہی کے بجائے ساتھ کے لگ رہے تھے۔ ”ان کا تعلق ساؤتھ سے ہے؟“

منشی نے سر ہلایا۔ ”ہاں یہ اصل میں مدراس سے ہیں۔ ان کی زبان بھی مدراسی ہے۔ مگر بعضی میں ان کا گوشت بہت مضبوط ہے۔“

”بہت اچھا لگا کا وہ شہر ہے جس میں ہر صوبہ کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جیسے پاکستان میں کراچی ہے جس میں ہر صوبہ بلکہ آس پاس کے تمام ملکوں کے لوگ بہت جلدی آباد ہیں پائے جاتے ہیں۔ جتنو کے ساتھی خاموش اور چوکس تھے۔ دوائی لینے کے بعد بڑے سکور کی حالت کچھ تھی اور اب وہ بغیر سہارے کے خود سے کھڑا تھا۔ جتنو جانتے ہوئے ریموٹ کنٹرول بم بھی باہر لے گیا تھا اگرچہ اس کا سرکٹ آف کر دیا گیا تھا لیکن بھر بھی وہ بم تھا ایک گولی اسے اڑا سکتی تھی اور آس پاس موجود کوئی فرد زندہ نہیں بچتا اس لیے اس کا یہاں سے ہٹا دینا ہی مناسب تھا۔ چنگی بات ہے بم کی موجودگی میں میرے اعصاب بھی کشیدہ تھے اور اس کے ہٹائے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ جتنو نہیں جتنو اسے کہاں لے گیا تھا۔ کیونکہ جتنو کے ساتھی معمولی حرکت پر کوئی اعتراض نہیں کر رہے تھے اس لیے سادگی میرے پاس آگئی اس نے سب سے پہلے میں کہا۔

”شوہنی اب کیا ہوگا؟“

”وہی جو اللہ چاہے گا اور جو اللہ کرتا ہے بھرتی کر ہے اب تک اسی نے بھجایا ہے اور آگے بھی دے گا۔“

سادگی نے جھجھکی لی۔ ”شوہنی پہلا دھماکا بہت خوفناک تھا مجھے لگا جیسے پورا جیل گرجا ہے گا۔ عمارت ایسے لرزی تھی۔“

”ہم نے جیڑا ہل مار کر اس عمارت کا سامنے والا حصہ تیار کر دیا تھا دھماکا اسی کا تھا مجھے معلوم تھا کہ تمہارا کمرہ اللہ کی طرف ہے اور تم محفوظ رہو گی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“

”میرے ساتھ جو خدا مانگتا تھا وہ فوراً مجھے لٹال کر بڑے ہیما کے پاس لے گیا۔ تب سے میں ان کے ساتھ تھی۔ پھر اوپر سے قازنگ کی آواز آئی۔ گارڈز اوپر سے اچھڑا دھا کا ہوا تب بڑے ہیما نے سیف ہاؤس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”سادگی تم بڑے سکور پر کس حد تک احتیاط کر رہی ہو؟“

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہائلنگ بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

”اس کے کمرے میں موجود سیف کا ایک کئی پیش تمہارے پاس ہے کیا تم کو یاد ہے؟“

”ہاں یاد ہے کیونکہ میں نے خود لگایا تھا اور بڑے سکور کی ہدایت کے مطابق اسے باہر دروازہ پر کر دیا تھا۔“

”مگر تم نے بڑے سکور کو بتا دیا؟“

”نہیں میں نے تو نہیں بتایا۔“

”لیکن منشی جی کا کہنا ہے کہ اسے معلوم ہے۔“

منشی نے سر ہلایا۔ ”بے لپی تمہارے لباس میں ایک ہلکا سا نمک لگا تھا جب تم باہر گری تھیں تو یہ نمک تمہاری آواز بڑے سکور تک پہنچا رہا تھا۔“

سادگی نے سر وہاں بھری۔ ”گویا میں شروع سے ان لوگوں کے نزدیک نہیں ایسے ہی تھی۔“

”لیکن تم ہمارے لیے ایسی ہی نہیں ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے چاہیے کہ میں کچھ ہوں۔“

”تم کچھ نہیں ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو، بیوہ کی دینی ہو، وسم کی زندگی ہو اور سفیر کی سالی اور کچھ عرصے بعد ایک سنے پانی کی ماما بھی ہو گی۔“

”شوہنی۔“ وہ جھپٹ گئی۔

”ویدی ہم ماموں سے گا۔“ جتو خوش ہو کر بولا۔

”اگر سفیر یہاں ہوتا تو کہتا کہ تم پہلے ہی ماموں سے ہوئے ہو۔“ میں چٹا۔ ہم آج میں بات کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ بات کرتے ہوئے میری نظر بڑے سکور کی طرف گئی تو وہ بھول رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا وہ اچانک لکڑ لکڑایا اور نیچے کرکڑا سا تھا۔ سادگی اس کی طرف چلی۔

”کیا ہوا۔۔۔ بڑے ہیما۔“

میں سادگی کے پیچھے تھا۔ میں نے بڑے سکور کو سیدھا دیکھا تو وہ بے ہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بے ترتیب تھی۔ میں نے بغیر اور دل کی دھڑکن چپک کی تو اسے بھی ٹیر متوازن ہی پایا۔ جتنو کے آدمی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور جب میں نے پلٹ کر منشی کی طرف دیکھا تو اس کے برابر سے راسن کو غائب پایا۔ اسی لمحے جتنو کے آدمیوں نے بھی محسوس کر لیا۔ ایک چٹپٹا۔ ”وہ بھاگ گیا۔۔۔“

”واوا مارا اٹلے گا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”تم تینوں عدل کو مسموم اسے دیکھنا ہوں۔“

وہ باہر نکل گیا اور میں نے منشی سے کہا۔ ”جیل کا لاکر کہاں ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے؟“

”ہاں یاد ہے کیونکہ میں نے خود لگایا تھا اور بڑے سکور کی ہدایت کے مطابق اسے باہر دروازہ پر کر دیا تھا۔“

”مگر تم نے بڑے سکور کو بتا دیا؟“

”نہیں میں نے تو نہیں بتایا۔“

”لیکن منشی جی کا کہنا ہے کہ اسے معلوم ہے۔“

منشی نے سر ہلایا۔ ”بے لپی تمہارے لباس میں ایک ہلکا سا نمک لگا تھا جب تم باہر گری تھیں تو یہ نمک تمہاری آواز بڑے سکور تک پہنچا رہا تھا۔“

سادگی نے سر وہاں بھری۔ ”گویا میں شروع سے ان لوگوں کے نزدیک نہیں ایسے ہی تھی۔“

”لیکن تم ہمارے لیے ایسی ہی نہیں ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے چاہیے کہ میں کچھ ہوں۔“

”تم کچھ نہیں ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو، بیوہ کی دینی ہو، وسم کی زندگی ہو اور سفیر کی سالی اور کچھ عرصے بعد ایک سنے پانی کی ماما بھی ہو گی۔“

”شوہنی۔“ وہ جھپٹ گئی۔

”ویدی ہم ماموں سے گا۔“ جتو خوش ہو کر بولا۔

”اگر سفیر یہاں ہوتا تو کہتا کہ تم پہلے ہی ماموں سے ہوئے ہو۔“ میں چٹا۔ ہم آج میں بات کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ بات کرتے ہوئے میری نظر بڑے سکور کی طرف گئی تو وہ بھول رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا وہ اچانک لکڑ لکڑایا اور نیچے کرکڑا سا تھا۔ سادگی اس کی طرف چلی۔

”کیا ہوا۔۔۔ بڑے ہیما۔“

میں سادگی کے پیچھے تھا۔ میں نے بڑے سکور کو سیدھا دیکھا تو وہ بے ہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بے ترتیب تھی۔ میں نے بغیر اور دل کی دھڑکن چپک کی تو اسے بھی ٹیر متوازن ہی پایا۔ جتنو کے آدمی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور جب میں نے پلٹ کر منشی کی طرف دیکھا تو اس کے برابر سے راسن کو غائب پایا۔ اسی لمحے جتنو کے آدمیوں نے بھی محسوس کر لیا۔ ایک چٹپٹا۔ ”وہ بھاگ گیا۔۔۔“

”واوا مارا اٹلے گا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”تم تینوں عدل کو مسموم اسے دیکھنا ہوں۔“

وہ باہر نکل گیا اور میں نے منشی سے کہا۔ ”جیل کا لاکر کہاں ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے؟“

”ہاں یاد ہے کیونکہ میں نے خود لگایا تھا اور بڑے سکور کی ہدایت کے مطابق اسے باہر دروازہ پر کر دیا تھا۔“

”مگر تم نے بڑے سکور کو بتا دیا؟“

”نہیں میں نے تو نہیں بتایا۔“

”لیکن منشی جی کا کہنا ہے کہ اسے معلوم ہے۔“

منشی نے سر ہلایا۔ ”بے لپی تمہارے لباس میں ایک ہلکا سا نمک لگا تھا جب تم باہر گری تھیں تو یہ نمک تمہاری آواز بڑے سکور تک پہنچا رہا تھا۔“

سادگی نے سر وہاں بھری۔ ”گویا میں شروع سے ان لوگوں کے نزدیک نہیں ایسے ہی تھی۔“

”لیکن تم ہمارے لیے ایسی ہی نہیں ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے چاہیے کہ میں کچھ ہوں۔“

”تم کچھ نہیں ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو، بیوہ کی دینی ہو، وسم کی زندگی ہو اور سفیر کی سالی اور کچھ عرصے بعد ایک سنے پانی کی ماما بھی ہو گی۔“

”شوہنی۔“ وہ جھپٹ گئی۔

”ویدی ہم ماموں سے گا۔“ جتو خوش ہو کر بولا۔

”اگر سفیر یہاں ہوتا تو کہتا کہ تم پہلے ہی ماموں سے ہوئے ہو۔“ میں چٹا۔ ہم آج میں بات کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ بات کرتے ہوئے میری نظر بڑے سکور کی طرف گئی تو وہ بھول رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا وہ اچانک لکڑ لکڑایا اور نیچے کرکڑا سا تھا۔ سادگی اس کی طرف چلی۔

”کیا ہوا۔۔۔ بڑے ہیما۔“

میں سادگی کے پیچھے تھا۔ میں نے بڑے سکور کو سیدھا دیکھا تو وہ بے ہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بے ترتیب تھی۔ میں نے بغیر اور دل کی دھڑکن چپک کی تو اسے بھی ٹیر متوازن ہی پایا۔ جتنو کے آدمی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور جب میں نے پلٹ کر منشی کی طرف دیکھا تو اس کے برابر سے راسن کو غائب پایا۔ اسی لمحے جتنو کے آدمیوں نے بھی محسوس کر لیا۔ ایک چٹپٹا۔ ”وہ بھاگ گیا۔۔۔“

”واوا مارا اٹلے گا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”تم تینوں عدل کو مسموم اسے دیکھنا ہوں۔“

وہ باہر نکل گیا اور میں نے منشی سے کہا۔ ”جیل کا لاکر کہاں ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے؟“

”ہاں یاد ہے کیونکہ میں نے خود لگایا تھا اور بڑے سکور کی ہدایت کے مطابق اسے باہر دروازہ پر کر دیا تھا۔“

”مگر تم نے بڑے سکور کو بتا دیا؟“

”نہیں میں نے تو نہیں بتایا۔“

”لیکن منشی جی کا کہنا ہے کہ اسے معلوم ہے۔“

منشی نے سر ہلایا۔ ”بے لپی تمہارے لباس میں ایک ہلکا سا نمک لگا تھا جب تم باہر گری تھیں تو یہ نمک تمہاری آواز بڑے سکور تک پہنچا رہا تھا۔“

سادگی نے سر وہاں بھری۔ ”گویا میں شروع سے ان لوگوں کے نزدیک نہیں ایسے ہی تھی۔“

”لیکن تم ہمارے لیے ایسی ہی نہیں ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے چاہیے کہ میں کچھ ہوں۔“

”تم کچھ نہیں ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو، بیوہ کی دینی ہو، وسم کی زندگی ہو اور سفیر کی سالی اور کچھ عرصے بعد ایک سنے پانی کی ماما بھی ہو گی۔“

”شوہنی۔“ وہ جھپٹ گئی۔

”ویدی ہم ماموں سے گا۔“ جتو خوش ہو کر بولا۔

”اگر سفیر یہاں ہوتا تو کہتا کہ تم پہلے ہی ماموں سے ہوئے ہو۔“ میں چٹا۔ ہم آج میں بات کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ بات کرتے ہوئے میری نظر بڑے سکور کی طرف گئی تو وہ بھول رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا وہ اچانک لکڑ لکڑایا اور نیچے کرکڑا سا تھا۔ سادگی اس کی طرف چلی۔

”کیا ہوا۔۔۔ بڑے ہیما۔“

”اگر وہ بچ گیا ہے تو جنازہ کی عمارت میں ہوگا۔“ منشی نے کہا۔

”ان لوگوں کو بتاؤ۔۔۔ یہ اپنے استاد سے کہیں ڈاکٹر کو جلدی ملاؤ۔۔۔ ورنہ تم لوگوں کی اتنی جھوٹا اور اتنے لوگوں کا خون رائیگاں جائے گا۔“

منشی نے جتنو کے ایک آدمی سے کہا۔ ”بڑے سکور کی حالت خراب ہے اس کے لیے فوری ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ یہ مر گیا تو میرے کسی کو نہیں میں گے اور جتنو کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

منشی کی بات سن کر اس کے ماتھے پر ٹپٹیں آگئی تھیں۔ لیکن اس نے جتنو کو اطلاع کرنے میں دیر نہیں کی۔ اس نے ویدی ایک چھوٹا ڈاکٹر لگا لیا جیسا میں نے منشی کے پاس دیکھا تھا اور جتنو کو کال کی۔ پہلے اس نے بڑے سکور کی طبیعت خرابی کا بتایا پھر اس نے اطلاع دی کہ راسن افراتفری کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا تھا۔ یہ سن کر جتنو نے اسے یقیناً بے غلط سنا لی تھیں کیونکہ موسم گرم نہ ہونے کے باوجود اس کے سیاہ چہرے پر پینٹا چمکنے لگا تھا۔ وہ ہکا بکا کر اسے بتانے لگا کہ یہ اس کی بھول نہیں تھی۔ پھر اس نے رابطہ کات کرکسی اور کو کال کی کیونکہ کال جاری تھی اور آگے والا بندہ کال ریسپو نہیں کر رہا تھا۔ میری پچھلی جس نے خبردار کیا کہ وہ یہاں سے جانے والے کو کال کر رہا تھا اور وہ کال ریسپو نہیں کر رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ خیریت سے نہیں تھا۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کی اور فوری اس کی اطلاع جتنو کو دی تھی۔ میں نے آہستہ سے جتو سے کہا۔ ”گزشتہ شروع ہو گئی ہے شاید ہمیں موقع ملے ہوشیار رہنا۔“

جتو نے سر ہلایا۔ یہ ظاہر ہم بڑے سکور کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ سادگی ہلکی آواز میں رو رہی تھی لیکن موقع کی مناسبت سے اس نے اپنی آواز کو قدر اوجھ کر لی تھی۔ میں نے جتو سے کہا۔ ”میں بھی ایسی صورت حال میں تم اپنے پاس والے کو دیکھو گے۔ ہتھیار چھیننے سے زیادہ اسے ناکارہ کرنے کی کوشش کرنا اور یہ بھی کہ وہ کھن استعمال نہ کرنے پائے۔“

”ہم سمجھ گیا۔“

”سادگی ایسی کسی صورت حال میں تم اس ستون کے پیچھے ہو جاؤ گی۔“ میں نے ہال کے وسط میں گے آرائشی ستون کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ میری فکر نہ کریں۔“ سادگی نے آنسو صاف

”ہاں یاد ہے کیونکہ میں نے خود لگایا تھا اور بڑے سکور کی ہدایت کے مطابق اسے باہر دروازہ پر کر دیا تھا۔“

”مگر تم نے بڑے سکور کو بتا دیا؟“

”نہیں میں نے تو نہیں بتایا۔“

”لیکن منشی جی کا کہنا ہے کہ اسے معلوم ہے۔“

منشی نے سر ہلایا۔ ”بے لپی تمہارے لباس میں ایک ہلکا سا نمک لگا تھا جب تم باہر گری تھیں تو یہ نمک تمہاری آواز بڑے سکور تک پہنچا رہا تھا۔“

سادگی نے سر وہاں بھری۔ ”گویا میں شروع سے ان لوگوں کے نزدیک نہیں ایسے ہی تھی۔“

”لیکن تم ہمارے لیے ایسی ہی نہیں ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے چاہیے کہ میں کچھ ہوں۔“

”تم کچھ نہیں ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو، بیوہ کی دینی ہو، وسم کی زندگی ہو اور سفیر کی سالی اور کچھ عرصے بعد ایک سنے پانی کی ماما بھی ہو گی۔“

”شوہنی۔“ وہ جھپٹ گئی۔

”ویدی ہم ماموں سے گا۔“ جتو خوش ہو کر بولا۔

”اگر سفیر یہاں ہوتا تو کہتا کہ تم پہلے ہی ماموں سے ہوئے ہو۔“ میں چٹا۔ ہم آج میں بات کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ بات کرتے ہوئے میری نظر بڑے سکور کی طرف گئی تو وہ بھول رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا وہ اچانک لکڑ لکڑایا اور نیچے کرکڑا سا تھا۔ سادگی اس کی طرف چلی۔

”کیا ہوا۔۔۔ بڑے ہیما۔“

میں سادگی کے پیچھے تھا۔ میں نے بڑے سکور کو سیدھا دیکھا تو وہ بے ہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بے ترتیب تھی۔ میں نے بغیر اور دل کی دھڑکن چپک کی تو اسے بھی ٹیر متوازن ہی پایا۔ جتنو کے آدمی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور جب میں نے پلٹ کر منشی کی طرف دیکھا تو اس کے برابر سے راسن کو غائب پایا۔ اسی لمحے جتنو کے آدمیوں نے بھی محسوس کر لیا۔ ایک چٹپٹا۔ ”وہ بھاگ گیا۔۔۔“

”واوا مارا اٹلے گا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”تم تینوں عدل کو مسموم اسے دیکھنا ہوں۔“

وہ باہر نکل گیا اور میں نے منشی سے کہا۔ ”جیل کا لاکر کہاں ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے؟“

کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن پلیز شوٹی کچھ کریں ورنہ اگر ان کا واچل گیا تو ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہم کو خوش کریں گے۔" میں نے کہا اور ہتھ کی طرف دیکھا۔ "لیکن میرے اشارے کے بغیر کچھ مت کرنا چاہے موقع کتنا ہی آسان کیوں نہ لگ رہا ہو۔"

باقی تین پریشان تھے کیونکہ ان کا چوتھا ساتھی نہ تو واپس آیا تھا اور نہ ہی اس نے واک ٹاک پر جواب دیا تھا۔

راہن ایک بار پھر میری سے بچ نکلا تھا اور وہ اس کام کا باہر بھی تھا۔ پھر قسمت بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ مجھے خطرہ تھا کہ راہن نے چوتھے پر قابو پا لیا تھا اور اب وہ سب تھا۔ یہ بات ان تینوں نے بھی محسوس کر لی تھی اور اب ان کی توجہ ہم سے زیادہ گیلری کی طرف تھی۔ مگر ان تینوں میں سے کوئی اس طرف جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ یقیناً خود کو ایک ساتھ زیادہ محفوظ تصور کر رہے تھے۔ کال کرنے والے نے ایک بار پھر واک ٹاک پر چٹو سے رابطہ کیا۔ "دادا کچھ اور لوگ ادھر بھیجیں۔ لگ رہا ہے اس نے کافی کواکیر کر لیا ہے۔"

جواب میں وہ چٹو سے حریفانہ گفتنی سن کر بے مزہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف سے گائیڈ لائن ملتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک طرف کیا اور ہمیں رائفل کی نال پر آگے کیا۔ وہ ہمیں گیلری کے سامنے لے آئے تھے اور خود ہمارے پیچھے تھے۔ فٹنی نے بے چینی سے کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"سوال نہیں۔" واک ٹاک والا غرایا۔ "چل ادھر۔۔۔"

"فٹنی کیسے آدی ہار کے ہیں تم نے جو عزت بھی نہیں کرتے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ فٹنی نے کچھ کہا نہیں۔ اتنا تو میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اگر راہن اس طرف سے حملہ کرتا تو پہلے ہم نشانہ بننے البتہ انہوں نے بڑے کٹورہ کو ایسی جگہ پر سے رہنے دیا تھا جہاں وہ موجود تھا۔ مگر راہن نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور مجھے اس سے اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ بے شک وہ سیاست میں مار کھاتا تھا اور چال نہیں چل سکتا تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ وہ میدان میں کازیرک کھلاڑی تھا۔ یہاں ایک کے مقابلے میں تین تھے اور گیلری میں بیچنے کی صلاحیت کم تھی۔ یہاں وہ آسانی سے مار لیا جاتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کامیاب ہو کیونکہ مجھے سب سے زیادہ خطرہ اسی سے تھا۔ دس منٹ

بعد چٹو اپنے دو آدمیوں اور ایک شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے پاس میڈیکل بیگ ایک اعلان کر رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ چٹو نے اس سے کہا۔ "بڑے کٹورہ کو کچھ... اسے کچھ ہو آؤ کوئی ساتھ ہی بلوک جانے گا۔"

پھر اس نے فٹنی کی طرف دیکھا اور اپنے نائب کو گھورا۔ "اسے یہاں کیوں رکھا ہے؟"

"دادا تم نے کہا تھا۔۔۔"

"باقی سب کے لیے کہا تھا اسے ابھی بچانا ہے۔ ابھی وہ آکر اسے گولی مار جاتا تو سیف تیرا پاپ کھوٹا؟"

اب واک ٹاک والے کو ابھی فٹنی کا احساس ہوا اور اس کے اشارے پر ایک آدمی فٹنی کو ہمارے پاس سے لے گیا۔ میں نے چٹو سے کہا۔ "یہ ہمارا خیال ہے کہ وہ ادھر حملہ کرے گا۔"

"سب ادھر ہے تو وہ پھر کدھر حملہ کرے گا۔" چٹو نے متشورانہ انداز میں کہا۔

"وہاں حملہ کرے گا جہاں تم نے سوچا نہیں ہوگا اور وہ اپنا کام کر جائے گا۔" میں نے اس کا خطرہ نظر انداز کیا۔ "تم جو ہم لے گئے تھے وہ کہاں ہے؟"

"میرے ساتھیوں کے پاس ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"راہن کے ساتھیوں کے ساتھ تم نے کیا کیا؟"

اس نے ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گھری سانس لی۔ "اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھی اس دنیا سے نہ جائیں تو ان سے یوہم سے فوراً دور ہٹ جائیں۔"

اس نے ابھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"ضروری ہے راہن کے پاس اس ہم کا ایک ہی ریہوت ہو تمہارے آدمی نے اس کی تلاش تو نہیں کی تھی۔" چٹو پچھل پڑا تھا اس نے جلدی سے واک ٹاک نال کر ایک خبر دیا۔ "دوسری طرف سے کال ریہوت کی گئی تو چٹو نے کہا۔ "ہم سے دور چلے جاؤ۔ سوال کیوں کرتا ہے کہ۔۔۔"

اسی لمحے دور سے دبا ہوا دھماکہ سنائی دیا اور چٹو واک ٹاک پر چلا تارہ گیا۔ اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا کیونکہ جواب دینے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ چٹو نے واک ٹاک بند دیا اور میری طرف آیا۔ اس نے میری جیکٹ کا لالہ

پکڑا۔ "مجھے کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ میں اسے چاہتا ہوں۔" میں نے آرام سے اپنا کار چھڑایا۔ "میرا خیال ہے کوئی نہیں بچا ہوگا اور اگر کچھ بھی بچا ہوگا تو راہن اسے نہیں چھوڑے گا۔ تم سمجھ لو کہ تمہارے پاس بس یہی پانچ بندے ہیں۔"

چٹو کچھ دیر مجھے گھورا رہا پھر اس نے میرا کار چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر بڑے کٹورہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیگ سے ایک انجکشن نکالا اور سرخ میں بھر کر اسے بڑے کٹورہ کی کس میں انجکٹ کر دیا۔ پھر وہ بھل قیام کر گھڑی دیکھنے لگا۔ دو منٹ بعد اس نے چٹو سے کہا۔ "اب حالت بہتر ہے لیکن انہیں آرام کی ضرورت ہے یہ یہاں پڑے رہے تو ان کی حالت پھر خراب ہو جائے گی۔"

"اسے کمرے میں پہنچا دو۔" چٹو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور وہ بڑے کٹورہ کو لے کر اس کے کمرے میں لے گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر سمیت وہیں رکھا تھا۔ بڑے کٹورہ کو کمرے میں پہنچا کر چٹو میرے پاس آیا۔ "اب تیرا کیا خیال ہے۔۔۔ وہ کیا کرے گا؟"

"میں چوٹی نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہم کے حوالے سے مجھے خیال آیا تھا کہ اس نے انسانی ریہوت بھی رکھا ہوگا۔ اس نے اپنا کام کر لیا ہے۔ ممکن ہے جنازیم میں پکڑا دی ہوں اس کے۔"

چٹو فکر مند ہو گیا۔ اس نے یقیناً دولت کے پتھر میں ٹیک اور کیا تھا لیکن یہ ٹیک اور رانا اس کے گلے پر گیا تھا۔ اس کے سر پر فیصد سماجی موت کی نیند سوچتے تھے اور اب وہ پانچ آدمیوں کے ہمراہ کس طرح یہ دولت حاصل کر سکتا تھا۔ جب کہ ابھی بڑا کٹورہ بے ہوش تھا اور فٹنی کی زبان کھلوانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ کیونکہ وہ زہر بلا پول میں نہ مل سکتا کہ بیضا ہوا تھا اس کے ساتھ زہر دہشت گردی کرنا نہیں تھا۔ ان تمام مراحل سے گزر کر ہی سیف میں موجود دولت تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد یہاں سے نکلنے کا مرحلہ تھا اور یہ بھی آسان نہیں تھا۔ چٹو کے سامنے ڈراؤں ملے تھے کہ وہ خود ہماری طرف سے بہت چوکنہ تھا۔ اس نے آتے ہی سب کو نالٹ کر دیا تھا۔ اب وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں واپس ہال کے وسط میں آنے کی اجازت مل گئی تھی اور دو افراد اب گیلری پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

فٹنی اب بائیں خاموش تھا۔ ایک بار میں نے اسے دیکھا تو وہ غیر محسوس انداز میں کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ

رہا تھا اور سب میں نے وقت دیکھا۔ بارہ بجتے میں دو منٹ تھے۔ مجھے یاد آیا کہ بارہ بجے اگر بڑے کٹورہ کی طرف سے نکل نہ گیا تو اس کا بیگ اب دست کٹورہ کی طرف روانہ ہو جائے گا اور اسے روکنے کے لیے فٹنی کے آدمی راستے میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس دھتے سے فٹنہ کروہ واپس نہیں کی طرف آتے۔ اگر فٹنی نے انکار کیا تھا مگر میں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا مجھے یقین تھا وہ سبکس آئیں گے اور فٹنی کو ان کا ہی انتظار تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ فٹنی دیر میں آتے لیکن اب اس میں بہت زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ راہن اور اب چٹو اس بات سے بے خبر تھے۔ بادی ہال میں تھی۔ میں نے چٹو سے کہا۔ "اسے بڑے کٹورہ کے پاس جانے دو یہ اس کی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔"

"یہ ادھر ہی رہے گی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر موجود ہے۔" چٹو نے صاف انکار کر دیا۔ اسے راہن کی فکر تھی۔ مجھے جواب دے کہ وہ کمرے میں چلا گیا اور میں نے ڈاکٹر سے کہتے سنا۔ "یہ کب تک ہوش میں آئے گا۔"

"کچھ کچھ نہیں سکتے۔۔۔ بڑے کٹورہ کٹورہ اور بوڑھے ہیں۔ پھر بیمار بھی ہیں اس لیے کچھ کہنا۔۔۔" اس کے بعد ڈاکٹر کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو چٹو نے اس کے منہ میں ہسٹول کی نال ڈالی ہوئی تھی اور اس کی کھلی بندھی تھی۔ چٹو نے غرا کر کہا۔

"مجھے کچھ نہیں پڑھا ہوش میں چاہیے۔ ابھی دس منٹ کے اندر اسے ہوش نہیں آیا تو تو ہمیشہ کی نیند سو جانے گا۔ کیا سمجھا؟"

چٹو نے ڈاکٹر کے منہ سے ہسٹول نکالا تو اس کی جان میں جان آئی مگر فوراً ہی جان پر بن گئی تھی کیونکہ چٹو نے اپنے سامنے سے کہا۔ "اگر یہ دس منٹ میں ہوش میں نہ آئے تو اس سالے کو نکال دیا۔"

چٹو میری طرف آیا۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے سادی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تیری کیا تھی ہے؟"

"نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"سنائے تو اسے بچانے اور لے جانے آیا ہے؟"

"ابھی نہیں سمجھو۔" میں نے کہا۔

"جب اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو جا کر اس حرای کو مارو۔"

"راہن کو؟"

"اور کون ہے یہاں... تیرے پاس آدھا گھنٹا ہے۔" جھنجھوڑا۔

میں پریشان ہو گیا۔ "میں کیسے مار سکتا ہوں اور مجھے کیا معلوم کرو کہاں ہے؟"

"نہیں جانتا تو جا کر تلاش کر، اسے بھی تیرے بارے میں نہیں پتا ہوگا۔" اس نے بیروانی سے کہا۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی سے رابطہ کرنے کا سیکڑین الگ کیا اور دونوں چیزیں میری طرف بڑھائیں۔ "یہ لے اور جا کر اسے تلاش کر... آدھا گھنٹا کڑک رہا تو یہ لڑکی زندہ نہیں رہے گی۔"

میں سمجھتا تھا کہ مجھے راسن کے بارے میں بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ یقیناً اسی وجہ سے جھنجھوڑے خردماغ میں یہ خیال آیا تھا۔ "میں اسے بڑے کنور پکس میں اسے کیسے تلاش کر سکتا ہوں؟"

"تیرا کام ہے ویسے بھی تو اس کے بارے میں بہت جانتا ہے۔" جھنجھوڑا لہجہ بڑھاتا ہوا۔

"اس کے بارے میں جانتا ہوں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ ابھی کہاں ہے؟"

"باہر نکلے گا تو جان لے۔ اب جا اور اس کا سر لے آ۔ اگر اس کا سر بیجا نا پاتا ہے۔" اس نے سادی کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔

"ہم بھی ساتھ جائے گا۔" جیتھ نے مداخلت کی۔ "یہ ہمارا بھی دی ہے۔"

"نہیں تم نہیں رہو۔" میں نے غلٹ میں کہا اور اکتھ سے جیتھ کو اشارہ بھی کیا۔ وہ سمجھ کر چپ ہو گیا۔ میں نے جھنجھوڑے رابطہ اور اس کا سیکڑین لے لیا۔ "وہ میرا بھی دشمن ہے اور میں اسے مارنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن تم یہ آدھے تھکے والی شرط مت رکھو۔ اور مجھے ایک واک ٹاک بھی دو میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔ واک ٹاک سے نہیں اطمینان رہے گا کہش نہیں ہوں لیکن بھاگ نہیں ہوں۔"

جھنجھوڑے سوچا اور سر ہلاتے ہوئے ایک واک ٹاک میری طرف بڑھا دیا۔ "ٹھیک ہے پر بھاگنے کی سوچنا بھی مت۔"

"مجھے ایک چاقو بھی چاہیے۔"

بادلی ناخواستہ جھنجھوڑے میرا یہ مطالبہ بھی پورا کیا۔ اس نے ایک آدھی سے چاقو لے کر میرے حوالے کیا۔ میں نے چاقو موڑے میں اڑس لیا اور جھنجھوڑے سے کہا۔ "ہوشیار رہنا تم

بے شک دادا ہو گے مگر وہ بھی بہت خطرناک آدمی ہے۔ راکا ایجنٹ رہ چکا ہے۔"

"اگر وہ یہاں آیا تو جی کر نہیں جائے گا۔"

"اگر وہ یہاں آیا تو منہ اٹھائے نہیں آئے گا۔ وہ ایسے آئے گا جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔" میں نے سیکڑین رابطہ میں لگا کر چاقو اس نے روک دیا۔

"یہاں نہیں... اس گیلری سے نکلنے کے بعد لگاؤ۔"

"اگر وہ گیلری کے باہر موجود ہوا تو میں سیکڑین لگاؤ رہ جاؤں گا اور وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔"

"جب گیلری کے کنارے پہنچ کر گھبراہٹ میں نہیں... کہیں تیرے ذہن میں آتم چھپا کا خیال نہ جائے۔"

"مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا اس لیے زندہ ہوں۔"

میں نے رابطہ ٹھانے سے ناگہانی اور سادی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "حوصلہ رکھنا میں آؤں گا۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "آپ میرا حوصلہ ہیں۔"

"جیتھ تمہارے ساتھ ہے۔ تم سادی کا خیال رکھو گے۔"

"آپ بے فکر رہو۔" جیتھ نے کہا۔

میں جھنجھوڑے سامنے رکھا۔ "دادا تم اگر میرے بارے میں جانتے ہو تو امید ہے تم مجھے اپنا دشمن بنانے سے گریز کرو گے۔"

"اپن کو بھی دشمن پالنے کا شوق نہیں ہے تو جا... اس نے بیروانی سے کہا۔ میں گیلری میں آگے بڑھا اور اس کے سر سے تنک آتے ہوئے رابطہ میں سیکڑین لگا لیا تھا۔ گیلری سے باہر آتے ہی میں نے رابطہ سامنے کر لی تھی۔ یہ خاصا سنی خیر مزہ تھا کیونکہ راسن کی یہاں موجودگی کا بہت زیادہ امکان تھا۔ وہ یہاں سے جا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہاں وہ دولت تھی جس کے پیچھے یہ سب دیوانے ہو رہے تھے۔ میں بتاتا قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہارونج کر میں منٹ ہو چکے تھے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے میں نے کچلے دروازے سے دیکھا کہ ایک چھوٹی لشت گاہ تھی اور اس کی وسطی میز پر تازہ پھل اور پانی موجود تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے رات سے کچھ نہیں کھایا اور پانی بھی کم نصیب ہوا تھا میں نے اندر آ کر دو دو سیب لیے اور پانی کا ایک گلاس پی کر آگے روانہ ہو گیا۔ فی الحال میں سیب نہیں کھا سکتا تھا کیونکہ میری ساری توجہ آس پاس تھی۔ دس منٹ میں

میں نے مرکزی پکس کا یہ سارا حصہ دیکھ لیا۔ راسن یا کوئی دوسرا فرد یہاں نہیں تھا۔ اب مجھے باہر جانا تھا۔ میں نے واک ٹاک پر جھنجھوڑے رابطہ کیا۔

"وہ یہاں پکس میں نہیں ہے میں باہر جا رہا ہوں۔"

میں نے پوچھ کر کچھ باہر جانے والا راستہ بتاؤ۔

جھنجھوڑے مٹی مٹی سے پوچھا اور اس نے بتایا تو مجھے خود بھی یاد آ گیا یہ وہ راستہ تھا جس سے مجھے صوب میں واقع کینک اور جینازیم کی عمارت میں لے جایا جاتا تھا۔ میں

تلف راستوں سے ہوتا ہوا اس دروازے تک آیا۔ اسے ہم سے اڑا دیا گیا تھا اور اس کی پونکھ تنک غائب تھی۔ غالباً یہ لاک تھا اور کھولنے کے بجائے حملہ کرنے والوں نے اڑانا

جناجنا سمجھا۔ میں باہر آیا۔ عمارت کے ساتھ ساتھ پتھروں سے نئی روش گھوم رہی تھی۔ میں اسی کے ساتھ چلا ہوا کونے تک آیا۔ یہاں سے مجھے نیچے واقع کینک پکس کا اوپری حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ کنور پکس ایک بڑی پھاڑی

وہلان پر اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کی مختلف عمارتیں مختلف سطحوں پر ہیں۔ کنور پکس اور اس کے ساتھ کینک اور

جینازیم والی عمارت سب سے اوپر اور بلند ہیں۔ نیچے جاتی اعلان کو مختلف حصوں میں بانٹ کر ہموار کیا گیا تھا لیوں

اپنے قلعے وجود میں آگے جو ایک دوسرے سے دس سے بارہ فٹ بلند تھے۔

اس سے نہ صرف سیکورٹی کی گئی تھی بلکہ اس پرورے پکس میں دل کشی اور خوب صورتی پیدا کی گئی تھی۔ میرے سامنے جینازیم والی عمارت، درختوں کے پار بھی اگر کوئی

اس کی اوپری منزل پر ہوتا تو مجھے دیکھ سکتا تھا۔ یہاں زیادہ اور کمزور سے دہتا مناسب نہیں تھا۔ میں روش سے اتر کر اس کی

طرف بڑھا اور درختوں کی آڑ میں پاس پہنچ گیا۔ یہ غائب عمارت میں کوئی پھل نہیں تھی۔ لیکن کنور پکس کے قریب جانے والے افراد اور ملازمین کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ

واحد عمارت تھی جو میزبانوں سے بچی ہوئی تھی کیونکہ یہ عام استعمال میں نہیں تھی۔ اس کا داخلی دروازہ صحت سلامت تھا۔

میں درختوں کی آڑ میں عمارت کے قریبی حصے میں آیا مگر اس طرف سے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

کڑکیاں جس جن پر گر گئی تھی۔ مجھے آگے سے ہی اندر جانا تھا۔ اس میں رسک تھا کہ راسن نے کوئی ٹریپ لگایا ہو مگر

مجھے دیکھنا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ گھوم کر اگلے حصے میں آیا۔ اس طرف کڑکیوں کے پٹ ٹوٹ کر باہر گرے

ہوئے تھے جیسے اندر کوئی دھماکا ہوا ہو۔ دروازے کا پینٹل گھمایا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور

دروازہ کھلنے ہی جا ہی کا ہمایا یک منظر سامنے آیا تھا۔ وہاں کم سے کم آٹھ دس افراد کی اجڑی ہوئی اور سرخ شدہ لاشیں

نثری ہوئی تھیں۔ ان کے جسموں سے گوشت اور تھوڑے الگ ہو کر یواریوں اور پھتوں پر چپکے ہوئے تھے۔ داخلی ہال

کی حالت بری تھی۔ فرش میں سوراخ ہو گیا تھا۔ کیونکہ جینازیم کی عمارت کے نیچے تھا۔

میں نے خد سے ہاتھ رکھ لیا۔ وہاں پھیلی خون اور گوشت کی بو سے میرا دل ٹھٹھانے لگا تھا۔ اندر آنے پر

اندازہ ہوا کہ لاشوں کی تعداد زیادہ تھی شاید جھنجھوڑے کے باہر موجود سارے آدمی یہیں تھے اور وہ سب دھماکے میں

مارے گئے تھے۔ میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ ایک پستول تھا جو ایک حد دھماکے کے ساتھ تھا۔ ہاتھ کھانی سے الگ

ہو گیا تھا۔ میں نے رابطہ کی نال سے ہاتھ الگ کیا اور پستول اٹھا لیا اس پر کسی قدر خون لگا ہوا تھا اسے ایک طرف

ڈھیر پردے سے صاف کیا اور جینکٹ میں رکھ کر آگے بڑھا۔ میرا اندازہ تھا کہ عام لوگوں کو جینازیم میں قید کیا گیا

ہو گا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں کسی کو قید کیا جا سکتا تھا۔ سبز حصوں سے نیچے آیا تو جینازیم کا فوڈ ایڈ دروازہ کھلا

ہوا تھا اور اندر موت کا سناٹا تھا۔ میرا دل رک سا گیا۔

جہاں زندہ افراد ہوں اور بے شک خاموش ہوں وہاں ایسا سناٹا نہیں ہوتا ہے۔ زندگی انبارا تلاش خود رفتی ہے مگر اس

وقت مجھے لگا وہاں کوئی زندہ فرد نہیں ہے۔ میں نے پچھچھاتے ہوئے جینازیم میں قدم رکھا اور پھر میرے دانت جھجھکے

تھے۔

ایک طرف ڈھیر کی صورت میں کنور پکس کے عام ملازمین کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں مرد و عورت دونوں

تھے۔ ان سب کو سروں میں ایک ایک گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا اور یہ کام یقیناً اندر راسن کا تھا۔ یہ پچاس سے اوپر لوگ تھے۔ انہیں بہ آسانی یہاں قید کیا جا سکتا تھا مگر سفاک

قاتلوں نے انہیں بھی نہیں بخشا تھا۔ کنور پکس کی حد وہیں رہنے والے اکثر ملازمین یہی بچل والے تھے اور انہیں رہائش ملی ہوئی تھی۔ پتا نہیں ان پر کیا گزری تھی؟ شاید انہیں بھی مار دیا گیا تھا۔ دروغے بھی ایسا کھل عام نہیں کرتے ہیں۔ مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون کی جگہ کوئی گرم سیال

دور رہا ہے۔ اگر فکری راسن اور جھنجھوڑا اس وقت میرے سامنے

ہوتے تو میں بے دریغ انہیں قتل کر دیتا۔ میں اوپر آیا۔ کلینک والے جیسے میں وارڈز پتھر سے پانی پی کر اور سر پر ڈال کر میں نے خود کو شفا کیا۔

میں نے خود کو یاد دلایا کہ میری ذلت داری سادی اور بیٹہ کو یہ مخالفت یہاں سے نکال دے جانا تھا۔ اس لیے مجھے اپنی سادی توجہ دانی پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ مجھے دیکھنا تھا کہ جیسے کی حدود میں کیا ہوا تھا اور ابھی کیا ہو رہا تھا۔ میں باہر آیا اور وسطی لان میں گئے سب سے اونچے درخت کی طرف بڑھا۔ یہ کوئی سرو جیسا درخت تھا۔ چھ فٹ کے بعد اس کی دائیں بائیں بے شمار شاخیں نکلی تھیں اور اس کی پلندی کوئی پچاس فٹ تھی۔ میں آرام سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ درخت کے آخری حصے پر آنے کے بعد آس پاس کا منظر صاف نظر آنے لگا مگر جہاں تک نظر جاتی تھی جاتی وہ برادی کے آثار تھے۔ چاہے شدہ گاڑیاں، اسلحہ اور لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میزبانوں اور بھوسوں نے عمارتوں کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ کئی جگہوں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا مگر کوئی زخم یا حرکت کرتی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں تقریباً دس منٹ درخت پر رہا اور میں نے وہی تاریکی پر چٹکناؤں کو اطلاع دی۔

”راہنم نظر نہیں آ رہا ہے میرا خیال ہے وہ جان بچا کر یہاں سے نکل گیا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور اسے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔“ اس نے عیاری سے کہا۔ ”پر تو نے خیال بدل دیا۔۔۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ وہ ابھر ہی ہوگا۔“

میں نے ایک بار پھر خود کو غلامت کی۔ ضرورت سے زیادہ بولنا بعض اوقات بولنی گلتے پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے مجھے ایک موقع بھی ملا تھا۔ کنور جیسے کی تمام کیلیکشن لائیں ہم پہلے ہی جا کر چکے تھے اور ریڈیائی راولپنوں کو جاسر نے روکا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ جاسر سامنے والے حصے میں قید خانے کی عمارت کے پاس کہیں نصب تھا۔ ہمیں جیسے کا پورا انٹینشن تھا اور جاسر کو خاصی پاور ورکار ہوتی ہے۔ اس کا بیڑی یا اس جیسے کسی چیز سے گزرا نہیں ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اتر اور اس طرف روانہ ہو گیا۔ میں مرکزی جیل کے ساتھ سے گزرا اور گھاس کی دو الگ سلخوں والے پتھے میوڑ کیے۔ بلاشبہ سیکورٹی کے لحاظ سے یہاں ہر ممکن خیال رکھا گیا تھا مگر ضرورت پڑنے پر ان میں سے کوئی چیز کام نہیں آتی تھی۔ نہ آدمی نہ اسلحہ اور نہ ہی

ایکسٹرا تک سیکورٹی۔ گزشتہ سڑاڑھے دس گھنٹے کے دوران میں یہاں دو سو کے قریب افراد مارے جا چکے تھے۔ بڑا کنور جیسوں کے زہرے میں تھا اور اس کی وجہ سے سادی اور ہم بھی پھنس چکے تھے۔ وہ سادی کو انوکھا کرنا اور نہ ہمیں یہاں آنا پڑتا۔

قید خانے کی چاب شدہ عمارت کے عقب میں ایک چھوٹی سی عمارت نے میری توجہ حاصل کر لی۔ اس تک پہنچنے کی مولی تار میں جاری تھی۔ اس کے اوپر ایک موٹر گاڑی کھربا لگا ہوا تھا اور قید خانے کی جاسر تھا۔ اس کے سامنے کم کم چار گاڑیوں کی لاشیں موجود تھیں۔ وہ جاسر کے ٹھکانے تھے اور پہلے ان کا خاتمہ کیا گیا تھا۔ میں نے پہلے سن گئی۔ کنکریٹ کا ایک ٹکڑا دیوار پر پھینک کر مارا۔ جب اس کی آواز پر کوئی رنڈل سامنے نہیں آیا تو میں عمارت کی طرف بڑھا۔ ابھی میں نے اندر قدم رکھا تھا کہ دو کی ٹاکی سے سب ابھری ہیں نے جلدی سے نکال کر کال ریسیو کی اور برائی سے بولا۔ ”تم کیوں کال کر رہے ہو اگر راتن آس پاس کہیں ہوا تو وہ سب سن کر ہوشیار ہو جائے گا۔“

”آدھا گھٹنا ہو گیا ہے۔“

”اس وقت کہا تھا پر اب ہے۔ تمہارے پاس آدھا گھنٹہ اور ہے۔ اگر ایک بج کر دس منٹ تک راتن یا اس کی لاش کے ساتھ نہ آئے تو یہ لڑکی اور لڑکا دونوں مارے جا چکے گئے۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میرے اندر جھکی جے گئی۔ میری غیر موجودگی میں کوئی تبدیلی آئی تھی جس کے نتیجے میں جیسوں کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ کیا انہوں نے سینک تک رسائی حاصل کر لی تھی اور یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا جب جیسے اس کی کوئی ذیل ہو جاتی۔ عمارت میں ایک سنسناتی آواز گونج رہی تھی۔ میں سوچتے ہوئے جلدی سے اندر آیا اور جاسر کے کنٹرول روم میں داخل ہوا۔ یہ غائب چھوٹے اور طاقتور جاسر تھا جس نے آس پاس کی موٹر گاڑیوں کی لاشیں ہلاک کر دی ہوں گی۔ اس کا کنٹرول جیل کی پورٹل اور میری کچھ سے بالاتر تھا اس لیے میں نے آسان کام کیا اور سرخ پٹن پٹن کیا جس پر پورا دھکا ہوا تھا۔ اس کے دہانے کی سنسناتی آواز رک گئی۔

اب وہاں سنا تھا۔ ایک اسکرین پر نظر آنے والی لک

کل لائن نیچے آئیں اور پھر ختم ہو گئیں۔ یقیناً جاسر نے کام روک دیا تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور ایک جگہ مجھے یاد سرک پر بیکر بورڈ دکھائی دیا۔ میں نے اس کا پینڈل نیچے کیا تو عمارت کی ساری روشنیاں بجھ گئیں۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام سرک پر بیکر نکال لیے اور انہیں جیب میں ڈال کر عمارت سے باہر آیا تھا کہ مجھے دوبارہ اندر جانا پڑا کیونکہ نزدیک ہی کچھ افراد کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ وہ اس عمارت کے عقب میں تھے۔ میں نے غور کیا۔۔۔ تو ایسا لگا وہ آگے جا رہے تھے۔ میں نے احتیاط سے عمارت کے کونے سے بھاگنا تو کم سے کم چار افراد مجھے ایک گھاس کے پتھے سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔ ان کی پشت میری طرف تھی اور میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ وہ میری جیسے جینٹ اور پلٹ پروف میں تھے۔

کیا وہ ہمارے ساتھی تھے؟ مگر ہمارا کوئی ساتھی آزاد اور زندہ نہیں تھا۔ ان کے غائب ہوتے ہی میں حرکت میں آیا اور گھاس پر چڑھ قدموں سے دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں وہ غائب ہوئے تھے۔ یہاں ایک راداری نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا فرش اور دیواریں پختہ تھیں لیکن چھت نہیں تھی یہ راداری ایک دروازے تک نکلی تھی۔ جس کی دوسری طرف کی اسلخ اس سے پھٹی تھی۔ اس کا دروازہ بھی غائب تھا۔ کسی گریڈ نے اسے اڑا دیا تھا۔ پختہ روش پر ہماری جوتوں کی آواز گونجتی اس لیے مجھے محسوس ہوتا پڑا تھا جب میں دروازے تک آیا تو میں نے ان لوگوں کو گھاس میں غائب ہوتے دیکھا۔ منظر واضح نہیں تھا۔ جب میں نے دیکھا تو آخری آدمی نیچے ہو رہا تھا اور اس باہر بھی اس کی پشت میری طرف تھی اس لیے میں چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ آوازوں سے بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کون تھے؟

آخری آدمی کے غائب ہوتے ہی میں اس جگہ آیا جہاں گھاس کا ایک بڑا سا ٹکڑا الگ ہو کر پڑا تھا یہ ایک چوکور تختہ تھا جس پر مٹی بنا کر گھاس لگائی تھی اور اسے اس چوکور غار پر اس طرح جمایا ہوا تھا کہ وہ باقی گھاس سے الگ نظر نہیں آتا تھا۔ میری معلومات میں خیر سرنگوں کی طرح ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پیچھے جا کر ایک خلا تھا اور یہ ظاہر یہ ایک چھوٹی سرنگ لگ رہی تھی۔ کسی قدر دھچکا ہٹ کے بعد میں نے اندر اترنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے خانے کے کناروں پر اترنا پھر ان پر ہاتھ بنا کر دونوں پاؤں سمیٹ کر اندر گیا۔ میں نے ہاتھوں پر زور دیا کہ پاؤں زور سے نیچے نہ گئیں اور

آواز نہ ہو۔ خلاف توقع فرش پانچ فٹ سے زیادہ نیچے نہیں تھا۔ میں نے جھک کر آگے دیکھا تو سوائے چار کی کے اور کچھ نظر نہیں آیا لیکن جیسے ہی نائٹ ویژن کا بین دیا یا سب نظر آنے لگا۔

یہ ایک مکی سرنگ تھی اس کا فرش اور دیواریں مٹی کی جیسے البتہ چھت پر مٹی روکنے کے لیے لکڑی کے پتھے لگائے گئے تھے۔ سرنگ کا آغاز اسی جگہ سے ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سرنگ جگت میں اور محدود مقصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ مجھے آگے جانا تھا۔ میں نے رائفل سنبھالی اور آگے بڑھا۔ ذرا آگے آیا تو مجھے بہت ہلکی سی گونجتی آواز سنائی دینے لگی جیسے آگے جانے والے بات کر رہے ہوں۔ مگر الفاظ اور لہجہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے بھی یقیناً نائٹ ویژن کا استعمال کیا تھا کیونکہ یہاں ہلکی سی بھی روشنی نہیں جھلک رہی تھی۔ اگر انہوں نے روشنی کی ہوئی تو مجھے بہت واضح دکھائی دیتی۔ ہلکی زمین پر آواز چلنے والے کا امکان کم تھا۔ بس یہ خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی اگر پیچھے دیکھے اور رک جائے تو میں اس کی نظروں میں آسکتا تھا۔ سرنگ سبھی نہیں تھی بلکہ جگہ جگہ سے مڑ رہی تھی بعض جگہوں پر مجھے ٹکریٹ بھی نظر آئی جو کسی عمارت کا زیر زمین حصہ تھی اور شاید اسی وجہ سے سرنگ جگہ جگہ سے مڑ رہی تھی۔

ایک جگہ میں مڑنے لگا تو مشکل سے دس فٹ کے فاصلے پر ایک پختہ دیوار میں خلا نظر آیا تھا اور وہ دیواروں اس میں جا چکے تھے۔ دوسری طرف بھی اندھیرا تھا لیکن جب میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو یہ پختہ سرنگ ثابت ہوئی تھی۔ دیوار کا خفیہ راستہ ایک عمارت کی میزبیلوں سے رابطہ سرنگ میں مکمل رہا تھا اور وہ لوگ مرکزی سرنگ میں جا چکے تھے۔ میں باہر آیا۔ سرنگ کا یہ دروازہ خود کار طریقے سے کھلتے اور بند ہونے والا نہیں تھا بلکہ ایک دو پانی تین فٹ کی سلیب دیوار میں اس طرح نصب تھی کہ یہ ظاہر وہ دیوار کا حصہ تھی جسے فائبر سے اسے تاروں کی مدد سے باہر ہوا تھا لکڑ کی مدد سے ان تاروں کو بہ آسانی کاٹ دیا گیا اور دھکا دینے پر سلیب نکل گئی۔ اسے واپس لگانے کی زحمت نہیں کی گئی تھی جیسے انہوں نے گھاس کا تختہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ گویا انہیں اب اس راستے کو چھاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ سرنگ میں ان کے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔

میں مرکزی سرنگ تک آیا۔ وہ لوگ مرکزی جیل کی طرف جا رہے تھے۔ جب وہ ایک موڑ سے مڑ گئے تو میں اس

جگہ سے نکلا اور ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ اب تک مجھے ان کی
سورخیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ شہر
کے آدھے تھے اور شاید وہی جمعیت تھی۔ بیک اپ ٹیم کو روکنا اور
دفعہ سے رخصت کرنا تھا کہ وہ شہر کے معاملات میں
ثانگہ نہ اڑائیں۔ وہ اپنا کام کر کے آگئے تھے اور انہیں
معلوم تھا کہ انہیں کہاں سے اندر جانا تھا۔ آگے بڑھتے
ہوئے میں خطرہ ہو گیا۔ اگر یہی طرف جا رہے تھے تو
ان کا بچھو اور اس کے آدمیوں سے تصادم لازمی تھا اور اس
تصادم میں نہ جانے کون بچتا ہے اور کون مارا جاتا ہے۔

”کیوں نہیں کر سکتا“ ایک آواز آئی اور پھر خاموشی
 آواز سنائی دی چٹوڑی گراہ بلکہ ڈرنا کے آواز اس سے
 زیادہ نمایاں تھی لیکن مجھے ان دونوں آوازوں سے کوئی
 مطلب نہیں تھا میں تو دوسرے آدمی کی آواز سن کر دنگ رہ گیا
 تھا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس کا لہجہ اور بولنے کا انداز ایسا تھا کہ
 انکوں میں بیچا جا سکتا تھا اور میں تو کان بند کر کے بھی اس
 کی آواز شناخت کر سکتا تھا۔ یعنی آنے والے پیار آدمیوں
 میں ایک فتح خان میں تھا۔ تو کیا میرا انداز وہ غلط ثابت ہوا تھا
 وہ ٹھیک کی دوسری نیم ٹھیک تھی اگر فوراً ہی ٹھیک کی آواز آئی۔

"خان ہم بروقت آئے۔"
 "ہم ہمیشہ بروقت آتا ہے.... پر ابھر شہباز خان نکل
 نہیں آیا رہا ہے۔"
 "اس احمق نے اسے اتھار دے کر درامن کے پیچھے
 بھیجا تھا۔" مفتی نے جگنو کے بارے میں کہا تو مجھے یقین تھا کہ
 وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔
 "خیر کیا... اسے چھوڑنا زائدہ شیر چھوڑنے کے برابر
 ہے۔"
 "یہ اس سے واکی ٹاکی پر رابطہ کر رکھے ہوئے تھا وہ
 پولیس کی حدود میں ہے۔"
 "کدھر ہے اس کا واکاوی ٹاکی۔" فتح خان نے کہا اور
 میں نے نہایت پھرتی سے اپنا واکاوی ٹاکی نکال کر آف کر دی۔
 کچھ دیر بعد فتح خان نے کہا۔ "اس کا واکاوی ٹاکی بند جا رہا
 ہے۔"
 "اسے چھوڑ دو.... بڑا سکور ہوش میں ہے اس سے
 سیف کھلاؤ اور یہاں سے چلو۔"
 "اتنا جلدی کسی بات کا ہے اب ابھر کوئی باقی نہیں
 رہا ہے۔ یا برعکس کسی کو نہیں بتا کہ ابھر کیا دور ہے۔"
 "پولیس کی بلکہ اب تم کا کیا ہو؟"

ڈراپ سٹین

سستی ہوئی آسمانی رات کا سناؤ، شکستہ و غم پختہ قبروں پر کڑوا لے تاکہ اس طرح سرسرا رہا تھا۔ ایک ناگاہی بیانی کی نوست
ہرے قبرستان پر طاری تھی۔ فضا کے ہولناک سناٹے میں ہوا میں لینا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس وقت مطلق اعلا میں
مبارک ہو چکی تھی۔ میرا پر اور جو سر پہاڑ کی طرح جیسے پر و پشت سٹ اٹھی تھی۔ انھیں پھینکی ہوئی رو کی تھی۔ اٹھائے راہبانوں
پہنچ گئی اور سوسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہواؤں کا زور بدلتا چلنے پھرنے لگا۔ میرے سامنے ایک دلدادہ اور ہولناک منظر تھا۔ ایک
خوف ناک چڑیل صریح طرف پرزدہ تھی۔ میں گئی تھی جیسے دوسرے بالکل قریب آ کر۔ بحر میں ایک جھلکے سامنے چلی جگہ سے کھڑی
ہوئی لیکن نہ کر دیا اور رات کو زرافانی فہمیں دیکھنے سے توجہ نہ کر لی۔

پھول غول کی وجہ سے میں مرجھا جاتے ہیں۔ دنیا میں ہر پرہیزگار اور بے جان چیز کے اندر خود ہوتا ہے اور ہر کوئی اپنے اپنے کرتوت سے بدل بھرتا ہے۔ دیکھو کہ اکٹھا کر دیا ہے۔ بعض انسان بہت بے حس ہوتے ہیں کیوں کہ وہ پھول، دھت، پیاز، دہنہ پھول ہوتے ہیں۔ اپنے دکھ کو بھی ظاہر نہیں کرتے اور کچھ لوگ پریم کو بہت جلد دوسروں میں ظاہر کر دیتے ہیں اور جو ایسا کرتے ہیں وہ فائدے میں دیتے ہیں مگر کچھ لوگوں کو کسی سے کچھ کہنے کی عادت ہی نہیں ہوتی۔ ایسے انسانوں کا دکان کے دروازہ کھولنے کی طرح کھانا جاتا ہے جس طرح لکڑی کو دیک بیک چاٹ جائے تو وہ کھول ہی جاتی ہے۔

ایسا ہی انسان کا بھی حال ہے۔ جس طرح درختوں کے سس عمل کے بعد انسان ان تمام چیزوں کو نگھٹتے دے کر اسے ہوجاتا ہے۔

میرا دل رک گیا کیا فتح خان نے جیتہ کو شہوت کر دیا تھا اور میں آؤ سے نکلنے والا تھا کہ اس کی آواز آئی۔ "مکرمات کرو مجھ کو روک دیا ہے بہت یوں ہے تم کو ہم نے والا بندھا چھا نہیں لگتا ہے تم اور چلو تمہارا در سے بات کرے گا۔" مجھے سلی ہوئی اور میں رک گیا تھا۔ فتح خان یا اس کے کسی ساتھی نے جیتہ کا سر بچایا تھا شک کی آواز اسی کی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ فتح خان اسے مارنے کی نکلنے صرف ایک صورت میں کر سکتا تھا جب اسے یقین ہو کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔ فتح خان کی آواز محدود ہو گئی تھی وہ سادی کو بڑے نکور کے پاس لے گیا تھا۔ میں نے گڑی اتار کر اس کا ڈائل باہر نکالا اور ہال کا چھرو دیکھنے کی کوشش کی۔ فتح خان کے دو آدمی مستعدی سے ٹہل رہے تھے اور ان کی نظر اسی طرف تھی۔ میں نے ہاتھ واہیں بچھ لیا۔ گڑی کا ڈائل چھوڑا تھا مگر سیاہ رنگ کا تھا اس لیے نظر آسکتا تھا۔ فتح خان کے ساتھ تین آدمی تھے اور چھواہ خود تھا بیک وقت چھوڑا دیا۔ میں نے ٹھنکا جب کہ وہ مستعد بھی ہوں آسان کام نہیں تھا۔ فتح خان نے مزاحمت کر رہی تھی۔ فتح خان نے کہا۔ "خاموش۔"

خان کے آنے سے مجھے سادی اور بیٹی کی طرف سے اطمینان ہوا تھا۔ اگر اس کی جگہ بخیرہ راسن یا مٹی کا قلاب ہوتا تو میں فکر مند ہی رہتا۔ وہ ان تینوں کی طرح میرا اور میرے ساتھیوں کی جان کا دشمن نہیں تھا۔

میں فی الحال کچھ کرنے سے قاصر تھا اس لیے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ فتح خان اور مٹی نے یہاں ہمیشہ تو نہیں رہتا تھا اور وہ میرے لے کر یہاں سے نکلتے۔ اگر فتح خان میرے ساتھیوں کو قبضے میں رکھنے کا فیصلہ کرتا تب بھی میں انہیں چھڑانے کی پوزیشن میں تھا۔ اس لیے بلاوجہ حماد چھیڑنا مناسب نہیں تھا جب کہ ابھی میرے ان کے ہاتھ نہیں آئے تھے اور ان کے سروں پر ویسے ہی خون سوار تھا۔ اس کا اندازہ مجھے کنور تھیں میں ہونے والی قتل و غارت گری سے ہو گیا تھا۔ فتح خان اس میں براہ راست شامل نہیں تھا اور اس کے چند ساتھی مارے بھی گئے تھے۔ ممکنہ طور پر اس کے دو ساتھی وہی تھے جو سرنگ سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے۔ لیکن فتح خان اور اس کے ساتھی ابھی کنور تھیں کی ایک اپ بیکوری ٹیم کو مار کر آ رہے تھے۔ اس لیے صاف ان کے ہاتھ بھی نہیں تھے۔ ایک بار وہ دولت حاصل کر لیتے تو ان کا جنون خطا پڑ جاتا اور پھر ان سے غمناک آسان ہوتا اس وقت وہ بس بھانسنے کی فکر میں ہوتے۔

میں گیلری کے ساتھ عقب میں بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے راسن کا خوف تھا کہ کبھی وہ مجھے سے نہا جائے۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ کبھی گھاٹ لگا کر میری طرح اندر والوں کا شہر ہوگا۔ پھر بھی خطرہ تو تھا اور اس کے باوجود میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ اگر میں کسی کمرے میں چلا جاتا تو ہال اور بڑے کنور کے کمرے میں ہونے والی کارروائی سے بے خبر ہو جاتا۔ مجھے زیادہ فکر بیچ اور سادی کی تھی۔ وہ دونوں ہال میں تھے اور وہاں فتح خان کے ساتھی تھے۔ میں سادی کے معاملے میں ان لوگوں پر کوئی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ بارہا میں نے دیکھا تھا فتح خان کے ساتھی چھپے ہوئے بد معاش اور بادشاہ ہوتے تھے۔ وہ خود بھی کم نہیں تھا۔ مگر میرے معاملے میں ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ حد یہ کہ جب اس نے سویرا کو جوبلی سے نکالا تب بھی اس کی عزت و احترام کا پورا خیال رکھا تھا۔ مگر یہ خیال اس کے ساتھیوں کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں یہاں سے بٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وقت و وقت سے گزری کے ڈاکس سے ہال

کی گھرائی کر رہا تھا۔ کبھی فتح خان کے دو آدمی نظر آتے اور کبھی تیسرا بھی دکھائی دیتا تھا۔

مگر فتح خان بڑے کنور کے کمرے میں کیا کر رہا تھا اس کا اندازہ کرنا دشوار تھا۔ یقیناً وہ اس سے مذاکرات کر رہا تھا کہ وہ اسے سیف کا کبھی پیشینہ دے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس میں کتنی دیر لگ سکتی تھی اور اگر بڑا کنور آتا جاتا تو سادی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ میری ساری توجہ گیلری اور ہال کی طرف تھی۔ اسی گھرائی کے چکر میں میں اپنے عقب سے غافل ہوا تھا اور اپنا ایک ہاتھ اپنے پیچھے کی کی موجودگی کا احساس ہوا تو دیر ہوئی تھی میں نے محسوس کیا کہ کچن کسی ہتھیار کی نال آکر میرے سر سے لگ گئی اور پھر فتح خان کی آواز آئی۔ "ہاں شہباز خان! پناہ مت۔"

میں دنگ رہ گیا تھا۔ "تم یہاں کیسے آئے؟"

"مجھے باہر سے بوجھ آیا۔ اپنا راکٹل اتار کر مجھے ڈال دو، بالکل آرام سے۔"

میرے پاس عمر کی قہقہے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مختصری مدت میں کبھی اتنی بار میں ہتھیار ڈالتے پر مجبور نہیں ہوا تھا۔ "میرا خیال ہے اس طرف سے آنے کا واحد راستہ یہی ہے۔"

"تمہارے دوسرے کئی خیالوں کی طرح یہ بھی غلط ہے۔"

میں نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ "فتح خان تم نے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے آقا کو بھی دھوکا دیا ہے۔"

"بے شک۔۔۔" اس نے ہلکا جھجک جھجک کر لیا۔ "میروں کے لیے ہم اپنے باپ کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔"

"تم ہم دونوں میں سے کسے اپنا باپ سمجھتے ہو۔"

میں نے اسے اشتعال دلانا چاہا لیکن وہ نوسوزی کی طرح مکار اور سرد مزاج شخص تھا۔ اس نے سکون سے جواب دیا۔

"دونوں کو۔۔۔ اب تم چاقو بھی پیچک دو۔"

اسے معلوم تھا کہ مجھ نے مجھے کون کون سے ہتھیار دیئے تھے۔ میں نے جبکہ کر چاقو بھی نکال کر پیچک دیا۔

"اور کچھ۔۔۔"

"بس اب آگے چلو۔"

میں آگے بڑھا۔ "تم شروع سے مٹی کے ساتھ اس منصوبے میں شامل تھے؟"

"بالکل۔۔۔ مٹی کو یہ آدمی بھی میں نے دیا۔۔۔ اسے کیا

پتا ان چیزوں کا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا مجھے یاد آرہا تھا کہ ان میں سے کچھ آدمی وہ تھے جو تم نے میری پہلی اطلاع یا تراس میری تلاش پر لگائے تھے۔"

"تم ٹھیک بیچنا۔۔۔ وہ چٹو کا گروپ تھا۔ پر اس بار اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا میں نے ٹھیک کر دیا۔"

میں ہال میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس نے کیسے بٹنوں اور اس کے ساتھیوں کا دماغ درست کیا تھا۔ اس نے ان کے سروں میں سوراخ کر دیے تھے۔ وہاں مزید چھ لاشوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "دولت چیز ہی ایسی ہے آدمی کا دماغ خراب کرتی ہے۔"

"میں سب کا دماغ درست کر سکتا ہے۔"

"تم نے جس طرح دوسروں کا دماغ درست کیا ہے اس طرح کوئی تمہارا دماغ بھی درست کر سکتا ہے۔"

"ہمارا قسمت۔" اس نے پیر وانی سے کہا۔ بیچ فرش پر یوں دراز تھا کہ اس کا سر سادی کی گود میں تھا۔ ضرب کی شدت سے سر پیٹ گیا تھا اور خون اگل آیا تھا۔ سادی نے اپنا دغا چھوڑ کر اس کے دھم پر جتنی باندھ دی تھی۔ فتح خان اسے بڑے کنور کے سامنے لے جا رہا تھا مگر پھر کی وجہ سے

اسے نہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے فتح خان کے ساتھ دیکھ کر سادی مایوس ہوئی تھی۔ میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ "تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

"ابھی میں اور بھی اچھا نہیں کرے گا۔" اس نے کہا اور سادی کی طرف دیکھا۔ "اس کا بھائی شرافت سے نہیں مان رہا ہے لیکن میرے کو پہلے چھوڑا تھا۔"

"یہاں سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔"

فتح خان نے دانت دکھائے۔ "یہ کنوروں کا کل ہے جتنا سامنے نظر آئے والا راستہ ہے اس سے زیادہ نو دکھائی دیتے والا راستہ ہے۔"

"سادی کا اب کنور خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تعلق تو ہے۔" فتح خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جیسی تو اس نے اسے یہاں بولایا ہے۔ شہباز اسے لے کر اندر چلو۔" فتح خان نے سادی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جبکہ کر بیچ کو دیکھا۔ اس کی سانس اور نبض ٹھیک تھی۔ مجھے لگا کہ وہ ہوش میں تھا لیکن بے ہوش بنا ہوا تھا۔

"فتح خان اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے اگر اسے کچھ

جولائی 2014 کا پرکشش انداز

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ٹائٹلس



فکر کی منزل اور

مردانہ جبر کی دلچسپ بحث

رنگ کی علامت

آپ طلب

لیے سزاور حلقی دھوپ میں ناامیدی بیروں کی زنجیر ہو تو انسان پانی کی چند بوندوں کے لیے مایہ کے مانند تر پتا ہے۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا دلربا انداز

حساب دوستان

حساب دوستوں کا ہوا تو سونا کی کسی بیڑی کی غلطی کا ساتھ نہیں دیتی ایسا سیتا پوری کے علم سے استثنائی صفحات کی سوغات

ستاروں پر کمنڈ

محبوبین کے فیہ قیام کی کتنی محنتیں اچھے حساب سے کرنا کی آپ جتنی محنت لگاتے ہیں ان کی امداد بہت کم ہوتی ہے۔ طاہر جاوید مغل کا نیا سلسلہ

ماروی

رنگی دل اور سکرانے و ڈھل کا گھر مجھ سے تھا کثرت کا کچھ بھی نہیں

اس دن وہاں سے گزرا ہی تھی محسن الدین نواب کا دلچسپ سلسلہ

ڈاکٹر شہزادہ سید منظور امجد کا شاف ذہن تنویر وادھان مریض کے خانہ سلبر ایڈوکی خوبصورت کہانیاں آپ کی مستطیر

جولائی 2014

”تو تم ہم کو نہیں چھوڑے گا۔ بے شک نہ چھوڑو۔“
 فتح خان نے فراخ ولی سے کہا۔ ”اب چلو اسے لے کر ورنہ میں اپنا آدمی کو بولتا ہوں۔ وہ لے جائے گا۔“
 میں نے سہارا دے کر سادی کو اٹھایا۔ ”فتح خان میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں سادی کو اس معاملے میں ملوث نہ کرو ورنہ اس کے بعد شاید ہمارے درمیان بھی ناؤں ملتی نہیں ہوگی۔“
 فتح خان کے چہرے پر چند لمبے کوٹھکا ہٹ آئی تھی اور پھر اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ ”شہباز خان! میں یہ رسک لے گا۔ اور ہوا دی کے پیر سے سے نہیں زیادہ ہیرا ہے۔“

ہم بڑے کنور والے کمرے میں آئے۔ جہاں دو میسر پر نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر غائبیت تھی لیکن وہ ہوش میں تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر موجود تھا اور اس کے ساتھ ہی مثنیٰ بھی موجود تھا۔ ان سب کی نگرانی کے لیے فتح خان کا ایک آدمی موجود تھا۔ فتح خان کے اشارے پر اس کا آدمی ڈاکٹر کو لے کر کمرے سے چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب فتح خان نے مثنیٰ کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر خوب صورت آتش دان کا ایک انچرا ہوا پتھر دو بار دیا تو یک دم آتش دان دو حصوں میں تقسیم ہوئے لگے۔ یہاں بھی وہی سنسناتی آواز آ رہی تھی جو ہائز رو لک سسٹم کی نشانی ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک بڑے فرنچ کے ساز اور شکل کا سیف تھا۔ اس کے اوپر ہی صے میں شیشے کی اسکرین تھی۔ مثنیٰ نے اس کے نیچے لگے ٹیٹن دیا تو شیشے پر کی بورڈ ابھر آیا۔ یہ تقریباً پورا کی بورڈ تھا اس میں تمام انگریزی کے حروف تہجی اور علامات تھیں۔ ایک طرف چھوٹا نمبر کی پیڈز تھا۔ فتح خان نے بڑے کنور سے کہا۔

”اپنا کبھی نہیں بتاؤ۔“
 مگر بڑا کنور خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ میں نے مشورہ دیا۔ ”بہتر ہے تم بتاؤ کیونکہ فتح خان بہر حال ان لوگوں سے بہتر ہے۔ مگر اسے سزا کی میں کم مت سمجھو۔“
 بڑے کنور نے ٹیٹن پر اشارہ کیا۔ ”شہباز میں ان میں سے کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔“
 ”بات تمہارے اعتماد کی نہیں ہماری مجبوری کی ہے۔ دوسری صورت میں یہ سادی کو نشانہ بنائیں گے کیا تم برداشت کرو گے۔“

کھلی بار بڑے کنور کے چہرے پر اضطراب آیا۔ ”مجھے اب اس دولت کی پروا نہیں ہے لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ہمیں چھوڑ دیں گے؟“
 ”کوئی ضمانت نہیں ہے۔“ فتح خان نے مثنیٰ سے کہا۔ ”پر یہ شہباز خان مجھ کو جانتا ہے۔“
 ”میں نہیں عام معاملات کی حد تک جانتا ہوں لیکن اگر تم نامعلوم مالیت کے پیروں پر قابض ہو گئے تو تمہارا روٹل کیا ہوگا میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“
 ”مجھے تم لوگوں کو مار کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے صرف دو کھٹے چاہیے ہوں گے اور اس کے بعد سارے بھارت کی پولیس اور انجینئریاں بھی مل کر مجھے تلاش نہیں کر سکیں گی۔“

”تم نے مثنیٰ کا ذکر نہیں کیا؟“ میں نے طنز کیا۔
 ”ہم یہاں سے اپنی اپنی راہ لیں گے۔“ فتح خان نے اشارے کیا۔ ”مجھے نہیں معلوم ہے کہاں جانے کا اور اسے نہیں معلوم میں کہاں ہوں گا۔“
 سادی میرے پاس تھی اور کسی ہوتی میرے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ اچانک فتح خان نے پستول کا رخ سادی کی طرف کر دیا اور مساک لیجے میں بولا۔ ”بڑا کنور فیصلہ کرو۔ آ رہا یا نہ۔ ایک جواب دو۔ ہم تین تک گئے گا۔“
 میں نے سادی کو اپنی اوت میں لے لیا۔ ”فتح خان پہلے جیسے مجھے شوشہ کرتا ہوگا۔“
 فتح خان نے سیاہ لیجے میں کہا۔ ”ہم کو معلوم ہے پہلے تم کو مارے گا جب ہی کوئی اس کو لگے گا۔“
 سادی تپ گئی۔ ”میں شوشی۔۔۔“
 ”ایک۔۔۔“ فتح خان نے کہا۔
 ”بیبا۔۔۔ سادی چلائی۔“ اسے بتا دو۔“
 ”دو۔۔۔“ فتح خان نے کہا تو سادی زور لگا کر سامنے آئے گئی مگر میں نے اسے اپنا اوٹ میں رکھا۔
 ”تین۔۔۔“ فتح خان نے کہا تو سادی زور سے چلائی اور مجھے بڑے کنور کی آواز آئی۔
 ”پس۔۔۔ میں تیار ہوں۔“

میں جو کوئی کھانے کے لیے تیار ہو گیا تھا میرا سخت ہوتا جسم نرم ہو گیا۔ بڑا کنور میسر سے اٹھ رہا تھا کہ اچانک جھٹکا کھا کر گرا۔ میں نے اس کے سینے پر چوٹے کو سرخ ہوتے دیکھا۔ اسی لمحے آتش دان کے پاس کھڑے مثنیٰ دل تکی کے سر میں سوراخ ہو گیا۔ اس کا خون اچھل کر سیف پر گیا تھا اور وہ لٹکی طرح محوم گر گیا تھا۔ چونکہ فتح خان اپنی جگہ سے اٹھا اور بیڈ پر گر گیا تھا۔ اس پر چلائی جانے والی کوئی اس

جگہ سے گزری جہاں وہ ایک لمحے پہلے تھا۔ اگلے لمحے وہ بیڈ کے دوسری طرف گر اور اس نے دروازے پر کھڑے راسن پر قاتر جھومک مارا۔ وہ خاموشی سے اندر آیا تھا اور خاموش پستول سے سب کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اسے احمد تھا کہ وہ تینوں کو نشانہ بنائے گا مگر فتح خان نے اس کا احتیاط لگا کر دیا تھا۔ وہ بڑے کنور کو گولی لگتے ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بچا تھا اور اس نے گرتے ہی خود کو سنبھال کر جرابی فائر کیا اور اس بار میں نے راسن کو اپنی گردن تھامے ڈنگا گئے دیکھا۔ کوئی اس کے زخروں سے لڑ گئی تھی۔ یہ سب پانچ سیکنڈ سے بھی پہلے ہو گیا تھا۔

سادی میرے پیچھے تھی اور جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ بدحواس ہو کر پیچھے ہٹی تھی۔ اسی لمحے راج کنور ڈنگا گئے راسن کو دھکیلتا ہوا اندر آیا تو سادی اس کے سامنے تھی اس نے اسے پکڑ کر اپنی ڈھال بنا لیا۔ میں جو راسن کے گرد جانے والے پستول کی طرف جارہا تھا رک گیا۔ راسن اور راج کنور ساتھ ساتھ آئے تھے یعنی ان میں کچھ جڑو تھا لیکن راج کنور نے ایک لحاظ نظر بھی زمین پر ایڑیاں رکھتے راسن کی طرف نہیں ڈالی۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ وہ سادی کو آڑ بنائے سیف کی طرف جارہا تھا۔ اس کی حرکت کے ساتھ ساتھ فتح خان بھی حرکت کر رہا تھا۔ راج کنور کو کسی سے خطرہ تھا کیونکہ وہ مسلح تھا۔ اس نے منظر پر لیجے میں کہا۔
 ”کوئی حرکت نہ کرے ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“
 ”ہم کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ فتح خان نے کہا۔
 ”اگر تم نے پستول کا رخ میرا طرف کیا تو میں ضرور گولی چلاؤں گا۔“

”ایک منٹ راج۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو تمہارے سارے دشمن مارے جا چکے ہیں۔ تم نے اپنے بھائی کو بھی مار دیا۔ لیکن تم جانتے ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں صرف سادی کو یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔“
 ”بکواس مت کرو۔“ اس نے دانت تھیں کر کہا۔ ”میرے سب سے بڑے دشمن اور میری مشکلوں کے ذمے دار تم ہو۔“
 ”یہ غلط ہے میں نے کبھی تم سے دشمنی نہیں کی۔ دشمنی تم لوگوں نے کی اور میں نے ہمیشہ اپنا دفاع کیا۔ سادی کو بھی میں جان کر نہیں لے گیا تھا۔ اسے تم لوگوں کے دشمن قرار دے لے گئے تھے اور میں نے وہاں اس کی جان بچائی تھی۔ اگر قبائلوں کو پتا چل جاتا کہ یہ تمہاری بہن ہے تو تمہاری سادی

کا سیالی ناکامی میں بدل جاتی۔“
 ”میں اب ہونے والی کھل و قنارت گری کا ذمے دار کون ہے تم ہوتا۔“ راج غرایب۔
 ”یہ بھی غلط ہے، میں نے صرف سادی کو واپس لے جانے کا جان بھایا تھا، اسے خونریز تم سب نے ل کر کیا۔ تمہاری یہاں اچانک آمد بتائی ہے کہ تم بھی اس میں شامل تھے۔“
 ”میں نے یہ سب نہیں جانتا تھا۔“
 ”بھئی راسن نے سب سے پہلے بڑے کنور کو شوشہ کیا۔“ میں نے مثنیٰ سے کہا اور ایک نظر سادی کو دیکھا تو دوری تھی۔ اس کی نظریں بڑے کنور پر مرکوز تھیں۔ اس نے کہا۔
 ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ دولت کے لیے اتنے گر جائیں گے۔ اپنے ہی بھائی کو مار دینا گے۔“
 ”بکواس مت کرو۔“ میری مجبوری تھی۔ ”راج کنور نے بے رحمی سے اس کے ہال پکڑ کر بھٹک دیا۔“ تو نے ہماری ہاک کنوا دی۔ پہلے اس کا سرے شادی کی جوا پھوٹ تھا اور پھر ایک سیٹل سے شادی کر لی۔ تجھے مار کر مجھے خوش ہوئی۔“
 ”تمہارا کیا خیال ہے تم فتح جاؤ گے۔“ میں نے کہلیر ہاتھ روتہ روتہ حرکت کر رہا تھا۔
 ”ہاں پہلے میں تجھے ماروں گا۔ یہ تجھے مرنا دیکھ کر ہی اس کے بعد اس کی باری آئے گی۔“ راج کنور کے چہرے اور لیجے کی وحشت پر گزرتے لمحے بڑھ رہی تھی۔
 ”اگر تم نے شہباز کو مارا تو میں تجھے نہیں چھوڑے گا۔“ فتح خان نے اسے لٹکارا۔
 ”فتح خان تم کوئی نہیں چلاؤ گے اس نے سادی کو ڈھال بنایا ہوا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”میں کسی سادی کو نہیں جانتا۔ میں تم کو جانتا ہے۔ شہباز خان میں نے قسم کھائی تھا کہ تم کو اپنے ہاتھ سے مارے گا، پر نہیں مار سکا۔ ہو سکتا ہے کبھی مار دے۔ اس لیے اگر کسی نے تم کو مارا تو میرا رحم اور ہوا رہ جائے گا میں اسے نہیں چھوڑے گا۔“

پرویشن اسی تھی کہ آدمی فٹس بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے فتح خان نے یہ بات نہایت سنجیدگی سے کی تھی۔ میں نے راج کنور پر نظر جمائے ہوئے کہا۔ ”تمہارا شہر۔۔۔ راج کنور تم نے بڑے کنور کو مار دیا ہے سیف کا اولین بھی نہیں اس کے پاس ہے۔“
 ”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”کبھی نہیں پہلے ہی میرے پاس ہے۔“

”اگر اس نے کبھی نیشن بدل دیا ہو؟“ میں بات کو طول دے رہا تھا کہ راج کھور کے سر سے خون اترے۔ ویسے میں نے محسوس کیا تھا کہ راج خان کی دھمکی کے بعد وہ ذرا دھیمہ ہوا تھا اور اس کے چہرے کی وحشت میں کمی آئی تھی۔ کمرے میں تین افراد کی لائیں تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو کتنے عرصے سے مجھ سے دشمنی کرتے چلے آئے تھے۔ بار بار ایسا ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں یا وہ میرے ہاتھوں موت کے وہانے تک آئے لیکن قدرت نے وقت نہیں رکھا تھا اس لیے حق کئے۔ خاص طور سے راجن اتنی بار حق رکھا تھا۔ کم سے کم تین سو اٹھ سو پانچ سو تھے عیا تھا مگر جب قضا آئی تو اچانک ہی مر گیا۔ اسے مرنے میں ایک منٹ کا وقت بھی نہیں لگا تھا اور کئی دل بی تو سیکلڈ میں مر گیا تھا۔ راجن نے عقب سے اس کے سر میں گولی اتار دی تھی۔ بڑے کھور کا کھور اپنے خون میں نہایا ہوا بستر پر گھرا ہوا تھا۔ راج کھور نے ایک نظر اسے دیکھا اور یولا۔

”ایک بار لگ جانے کے بعد صرف کچن کا آدمی آکر کبھی نیشن لوری سیٹ کر سکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تینوں کبھی نیشن لگا کر سیٹ ایک بار کھولا جائے۔“

”دوسرے نفلوں میں یہ سیٹ بہت کم کھلا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”آخری بار چار میٹھے پہلے کھلا تھا۔ جو میرے سووے سے حق جاتے تھے وہ اسی میں رکھ دیے جاتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم دوسرے درجے کے جبر سے فروخت کرتے تھے اور اول درجے کے اس میں رکھتے تھے۔ یہ محفوظ دولت تھی جس کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اس پر کوئی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے بڑے کھور کا کبھی نیشن تمہارے پاس ہے۔“

”اس کا بھی۔“ راج کھور نے سادی کے بکڑے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ کراہی اٹھی۔ اس کے لیے راج کھور کے اعزاز میں بے پناہ نفرت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک لوہے اور پتھر کے بنیاد پر اسے مار سکتا تھا۔ ”سیف کھولنے کے لیے اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”راج تم سب سے بیک وقت نہیں لا سکتے۔“ راج خان نے کہا۔ ”تم شہباز اور اسے مار سکتے ہو لیکن میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔“

راج کھور کے چہرے پر اب ہلکی سیٹ کے آثار تھے۔ راج خان کی دھمکی نے صورت حال بدل دی تھی۔

(جاری ہے)

(قلیل الزمن کماں کا جواب)

فیض صدیقی..... کراچی

وہ کئی کہاں چلی بیگم کی چھاؤں میں
سادگی نے چھوٹا دامن حیات کو
عزت..... کراچی

وہ ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لوں تو خشک پڑ جائے
اگرچہ لاکھ دم شعلہ تن دھلوں
ارباب خان..... کوئٹہ

دابت سبک وہ دوراں ہی نہیں میں
اک سو م کی صورت بھی نہیں ہے مرے دل میں
حیات محمد..... شادی پور

وہ چہرہ ہاتھوں میں لے کر کتاب کی صورت
ہر ایک لفظ ہر اک قص کی ادا دیکھوں
نورین اعظم..... لاہور

وہ آکے خواب میں تسکین بھڑکے تو دے
دے مجھے تجھ دل چال خواب تو دے
نازش مسعود..... اسلام آباد

وہ آئے کا وفا کتنے کیا اعزاز ہے
تم نے کیوں سوئی ہے میرے ٹکڑی وہانی مجھے
(منشی خورشید احمد نول لائن کا جواب)

احمد علی سامر..... میرپور آزاد کشمیر

میر و منید کے لیے ہیں بے شمار نذرانے
تیری یاد آتی تھی آج مجھ کو سمجھانے
(محمد عمران جوانانی کراچی کا جواب)

نواز ملکانی..... سکس

کیوں جنوں بڑھ گیا یوں غم گشت مٹی
دل غالب ہوئے جب سے رنج و غم
راہبہ انجم..... لاہور

یوں چپ ہیں لوگ سن کے میرے غم کی داستان
جیسے یہاں وہن میں کسی کے زباں نہیں
(حسن خان ہنوت کا جواب)

نوشین اعظم..... پشاور

آ رہا ہے مری وحشت پہ شباب
تجھ سے ملنے کے زمانے آئے
(نازش پروین، لاہور کا جواب)

نورین امیر..... واپڑی

اے ساکنان کوچہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشت سر لے
امجد حبیب..... راولپنڈی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
(ایم افضل کرل ناکا کا جواب)

ناصر عباس..... لاہور

ناز و اعزاز دل دکھانے لگے
اب وہ تجھے سمجھ میں آنے لگے
محمد امجد..... فیصل آباد

نہ تو ہے کہیں اور نہ میں ہوں کہیں
یہ سب سلسلے ہیں خیالات کے
عزیز الدین..... لاہور

ناچ رہے صد ہر سلیماں مرے نزدیک
بچیں کے ہونٹوں کا گھٹیا ہے مرے دل کا
نجمہ فردوس..... چارسدہ

نہ ملا گوہر گفتار ہمیں کو نہ ملا
ہم تو ان کوٹھنی گلیوں میں مٹ خوار ہوئے
نصرت جاوید..... کراچی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ گدگد کی قحط بازی وہ سپاہ کی قحط بازی
(منشی محمد عزیز نول لائن کا جواب)



میرے خیال سے اس مزید دریافت کی کمی شخصیت کا نام

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سنسن □ پاکیزہ □ مرکزشت □ بھیجا جائے کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوہن کے حوالہ سے جہاں ممبر 30 جولائی 2014 تک علی گڑھ 104 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 ہارسل کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سنسن ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ مرکزشت

کے حصول میں دقت پیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

قمر عباس 0301-2454188

بدیع الدین سرگوشی منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63/2 ایڈیشن ڈیس بلاک انٹرنیٹ کوآرڈی نیشن کراچی

فون 35895313 فیکس 35802551

جولائی 2014

191

ماہنامہ مرکزشت

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم احقرمہ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعرا لگ کا نقد پر ہے) 65

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

سید احمد چہان۔ لندن
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں
(نثرین عادل کراچی کا جواب)

رانا حبیب الرحمن۔ لاہور
یہ نگاہ شوق کی اقلادی کو ہم آوار کی جھکتے ہیں
عظیم کرتے ہیں اسی نگاہ کی جو کہیں غمہر جائے
نیا زکومو۔ جب

یہ کہانی تمام ہو تو کسی
زندگانی کی شام ہو تو کسی
کنیز قاطر۔ اسلام آباد

یقین آئے کو تو آجائے ان کے حیدر ویاں کا
مگر چشم بد وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
(آفاق علی شاہ کراچی کا جواب)

مرزا ہادی بیگ۔ لطف آباد
میرے بیوں کو گنتے والو جنگ مجھے سکنا کر دو
مگر اٹھائے وہ پہلا پتھر جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو
احمد مجسم۔ شروکت

ملا کرتی تھی جن سے روح کو بالیدگی
وہی قدریں اٹھائے تھے نہ کھدیں طاق نسیاں میں
(ناخان مہاسی لاڈکانہ کا جواب)

فشی مزید۔ لندن
یہ کس نے آ کے مجھے نیند سے جگا دیا ہے
بہن اک رستہ ہے اک آواز ہے اور اک سایہ

اکرم علی بھٹو۔ میر پور خاص
یاد رکھیے مجھے دعاؤں میں
بہن یہی ایتھاس ہے اسے دوست

صفی سلطان۔ حیدر آباد
یہ حوادث کا خلاصہ ہے زمانہ خاتم
غم سے بھڑکے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم
ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال
کریں۔ اگر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے
ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس
اصول کو نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

جولائی 2014

190

نورین مجسم۔ سکھر

یاد آتے ہی تم کو ہم شاید
پیکا پیکا ہے رنگ کاہل کا
احمد حسن۔ ساہیوال

یہ کون اصر سے گزرا میں کبھی حضور تھے
اک موز مز کے جو دیکھا زمانہ تھا
محمد عثمان۔ کوٹ ادو

یہ غم ہے کہ اندھیرے کو روشنی سمجھو
نئے غیب تو گویا روشن کی بات کرو
(گل فرید کوٹکانہ کا جواب)

محمد شری۔ لندن
اسے حسرت دیدار یہ کیا راز ہے آخر
وہ سامنے آتے ہیں تو دیکھا نہیں جاتا
ضمیم اختر نیازی۔ لاہور

ان بہادوں میں یارب کیا ہو گیا
گلی نے پیتا ہے خون سے بھرا بھین
در حسین خان۔ خان پور

اسے آہ میری خاطر وارستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدہ مشکل نہیں رہا
نہدیح۔ چنیوٹ

آ رہا ہے تری دشت پہ شاب
تجھ سے ملنے کے زمانے آئے
نذرت پروین۔ حاصل پور

آئے ہیں جیسے شہر بد کر کے یہ نادان
وہ شعلہ کب رنگ بہن ہے میرے دل میں
(ارشاد خان کوٹکانہ کا جواب)

نصرت محمد۔ کوئٹہ
اب کی بہار میں تو جب ماجرا ہوا
دخول کا بارش ایک ہی شب میں ہوا

احمد وحید۔ کراچی
آئینہ دیکھا تو دل سے یہ صدا آئی نہاں
میر میر ساتھ رہے پھر بھی شام نہ ہوئے

عظیم حسن۔ اسلام آباد
اسے کہہ کر توں سے تیری اپنے پہ خانے میں
چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے

(نوشین مصطفی لاہور کا جواب)

ماہنامہ مرکزشت

علمی آزمائش۔ 104

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت قائد اعظمی اسلامیہ

علمی آزمائش کے اس مندرجہ ذیل کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہانہ سرگزشت، مسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہانہ ہاسکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک سالانہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان تلے مندرجہ انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر ہر مہینے کی نئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو جاننے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوئین پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جولائی 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے متن قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کا سوال

چاند اس میں 1261 ہجری میں پیدا ہوئے۔ صوفی شاعر اور عالم تھے۔ اولیا کرام کے مزاروں کی زیارت کا خاص شوق تھا۔ پورے برصغیر میں پھرا کرتے تھے۔ فریضہ حج کے لیے مکہ بھی گئے۔ چولستان کا علاقہ بہت پسند تھا۔ اپنی تصانیف میں اس نعلیے پر بہت کچھ لکھا۔ اردو، فارسی، پنجابی، سندھی، ہندی اور عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے شاعری میں نئی بحر اور وزن ایجاد کیے۔ امیر بہاولپور کا پورا خاندان ان سے خاصی عقیدت رکھتا تھا۔

علمی آزمائش 101 کا جواب

میر تقی خلیق گرواس پور کے بنالہ میں 12 ستمبر 1905ء میں پیدا ہوئے، پاکستان کے بڑے مصنفین میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے ایک ناول نے تو شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا اور اب ادب کا شہرہ رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف کا یہ ایک ناول ہی انہیں ادب کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

انعام یافتگان

- 1- نصیر الدین شیخ، چنوت
- 2- سیدہ ادیبہ رضوی، جہلم
- 3- اشرف بٹ، لاہور
- 4- وسیم احمد، کراچی
- 5- نیاز حسن خان، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نورین تبسم، نذر حسین، ناصر حسن چنگیزی، قازی شاہ، آصف حسین، شازیہ، بتول، نادیہ، محراب علی، زینب، وسیم زیدی، طوئی حسن، فیاض ملک، صوفی عکلم، دیا حسین، صمدی مصطفیٰ، دعا زہرا، نادر

شاہ طہق اطہر، افتخار حسین زیدی، ذر شاہ، محمد احمد، ذر شاہ علی، نسیم احمد، کائنات، بتول، ذر یاب علی۔ لاہور سے، طہق اسمن قریشی، نیاز سومرو، محمد جلال مصطفیٰ، اسد کھیل، افتخار احمد، نیاز، نوشین ملک، مرزا یوسف، بیگ، احمد یاسین ملک، بیگم منور، ہادیہ، شبنم، شادی، شاہد حسن، محمد یاسین، فراز علی، خالد یونس، اسلام، فیض محمد خان، اختر عباس، قضاحت مرزا، محمد عظیم خان، اشفاق کیانی، جاوید سرکار، یحییٰ برلاس، عبدالملک سید، کائنات مرزا، کوکب منیل، حسین، مرسلین، نادر علی، طوئی مصطفیٰ، پنڈی سے نگار ملک، فتح الدین، قمر عباس، کوکب قادری، نیاز حسین، خضر اسماعیل، رضوان احمد ہاشمی نصرت حسین۔ اسلام آباد سے فتح دین، ناصر اختر ناصر، نیاز الدین، محمد عابد انصاری، نسیم بٹ، نعمان شاہ، انور یوسف زئی۔ مظفر گڑھ سے خاقان خان، جان محمد عباسی، زاہد سولنگی، اختر وحید، ارباز خان، نجم شیرازی۔ حیدر آباد سے عقیل احمد، زیب منصور، فتح الہادی، عاتیت اللہ، آغا ظہیر، ذیشان قریشی، مرزا اسرار بیگ، مرزا اہادی بیگ۔ میرپور خاص سے انعام الحسن، ناصر زید پوری، انصار حسین، احمد صفی، افتخار، امتیاز حسن، جھری اسمولک۔ میرپور آزاد کشمیر سے نیاز بٹ، افتخار احمد محمود نیاز، فتح الہادی، محمد توقیر، ارشد حسین، نسیم الدین، ناصر حسن، خان محمد خان۔ قاسم خان، قمر حسن، قلام حسین، نازش خان۔ کوئٹہ سے شعی چنگیزی، نصرت اللہ، محمد سالکین، وردان قمر، احباب خان۔ چٹائیوں سے شیخ کمال احمد، نعمان سلمان، بشیر احمد، صاحب شیخ، نوید احمد، شیخ پورہ سے نیاز احمد رضوی، سکھلی احمد، نادر شاہ، قلام حسن بٹ۔ مٹان سے احسن خان اپٹہ، طارق حبیب، عرفان سعیدی، فیض سج، جنا اختر، محمد علی مشاہد، شہبازی، آفتاب مقصود، اختر حسین، آفتاب احمد چشتی، انوار علی شاہ، جاوید اقبال، اوصوال، ثروت، ذر، اختر عباس، نسیم اختر، بخت مرزا، مظفر خان، بھیکول، شادی، سید عزیز الدین، محمد احمد، فرید خان، زیب بتول، خالد آراہیں۔ سکینہ نقوی، عظیم بن چشتی۔ بہاولپور سے اطہر یونس، شہناز، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین قاضی، عظیم خان، عباسی، اختر، ناصر حسین، نصیر عباس، عقیل اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، احمد خان، نسیم خان، نسیم اللہ، ارباز خان، نگار افروز، اقبال حسن، نسیم آزاد، ذیشان حیدر، بہاول علی۔ بہاولنگر سے سہیل حسن، قازی اختر، تبسم زہرہ، نیاز احمد، قطب الدین احمد۔ پشاور سے سمندر خان، بشان، نعمان، نعمان، یار علی خان، بشیر خان۔ جہلم سے انور علی شاہ، شہبازی، ابراہیم شاہ، تبسم انور شاہ، یوسف خان، سلمان زیدی، چوہدری نیاز مسلم خان، ماسر قیوم محمد، کوکب گردیزی، شہباز خان، ابراہیم شاہ، تبسم انور شاہ، نگار ملک، فیض الحسن، ظہیر الحسن قریشی، ذیشان نسیم آزاد، کمال حسن، انصار احسن زیدی، نسیم بٹ۔ خان پور سے ارشد کریم، نیاز الدین۔ یاسین فرحت، فراز احسن قادری، خالد بٹ، فیض لاشاری، قیام الدین، نگار مصطفیٰ، میا نوالی سے سہاب خان۔ سکھر سے نواز علی حیدر ملکائی، انجم شیراز، فہد علی، مصطفیٰ نیاز، عباس خان، صمد علی، وحید علی، منیر نسیم۔ ساہیوال سے محمد افضل خان، فضل حق، محمد آمان خان، نصرت علی، عشرت خان، عکمل اللہ، انور خان۔ منڈی بہاؤ الدین سے فرحت خان، زاہد علی، ناصر حسین، فرحت خان، عبدالملک، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفیٰ، ناصر کیانی، سعید احمد، نذر علی۔ رحیم یار خان سے قضاحت خان، نسیم احمد، ارشد محمود، ملک فیروز الدین، محمد سراج الدین، اختر عباس، ایم اے شاہد، نسیم شیرازی، ناصر اسلام، سردار علی منیل، عرفان اختر، نسیم اپٹہ، نبیل ملک، نسیم فروں، ارباب خان، وحید بن، نسیم شاہ، علی عباس، خادم حسین، فیض بلوچ، محمد خواجہ، سید احرام حسین رضوی، زاہد خان۔ مظہر الدین، سید احسن محمود، نعمان بنیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صمد، مریم ریاض، بخار شاہ، عارف سلطان، ابراہیم احمد، مہوش اختر، نوید نسیم، اختر طوری، بخش، محمود اپٹہ، نیاز شاہ، ارباب خان، نسیم الدین حیدر، حویر حسین زیدی، رجب علی مرزا، نادر خان، مرید علی خاگانی، ناصر خان، اسلم خان، نسیم اختر، نیاز علی دستوری۔ سیالکوٹ سے حسن عالم، وردین خان، منیر خان، محمد مظہر، فرحت سمینا، یار علی، کلاہٹ ناؤن سے شعی احتشام علی، راجہ شیخ، سندس امتیاز، سرگودھا سے شاہ ادیس احمد خان، نیاز احمد، منیر خان۔ پارچا پور سے زاہد علی طوری، اظہر بخش، نصرت شاہ، ویدار علی طوری۔ انک سے زہیر اللہ، ثناء جبران، عرفان منور، اور یس علی خان۔

ممالک غیر سے نصیر الدین نصیر (ماچھلیو کے)، نسیم بٹ (جیمنی)، زاہد خان (نمان)، ملک شیر (زاہدان، اے اے ان)، نیاز اعظم جویمپو (فرنگھورت)

پھر وہی غلطی

محترمہ عذرا رسول

سلام تہنیت

زندگی حادثات و واقعات کا مجموعہ ہے۔ زندگی میں بڑے بڑے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر عقل سے کام لیا جائے تو ہر مسئلہ حل ہوتا چلا جاتا ہے جیسے میں نے اپنی پہلی کہ بہکتے قدم کو روک لیا تھا۔

ایمل
(لاہور)

”کیا تاریخ خود کو دہرائے جا رہی ہے؟“ میں نے سوچا اور سہیلی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دینے ہی ستارے چمک رہے تھے جیسے کبھی میری آنکھوں میں چمکتے تھے اور اس کے رخسار پر دینے ہی گلاب مل رہے تھے جیسے کبھی میرے رخساروں پر کھلتے تھے اور چال میں وہی لڑکھاہٹ تھی جو کبھی میری چال میں آئی تھی۔ میں وہی چمکتی چمکتی تھی۔ اس کی وہ بڑا بڑا ادھاکیر چلال تھا۔ چوٹی پنجاب کے ایک چدی پستی دولت مند نواب خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج یا آکسفورڈ جانے کی بجائے یہاں لاہور آگیا تھا۔ وہ جس بھی بے خودی میں پڑا رہا تھا۔ سہیلی بھی اسی میں پڑا رہی تھی۔ اکبر سے اس کی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ اس نے اکبر کو کچھ سے ملوانے اور اس کے بارے میں بتانے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی تھی کیونکہ ہماری کلاس میں ایسی جھجک یا شرم بہت پہلے ترک کی جا چکی تھی۔

اکبر تھا بھی ایسا کہ کوئی لڑکی اس کے سامنے دل پار جانے لگا اور درختی جسم والا اکبر چلال نوایز ادھ کی بجائے کوئی اسپرڈس میں یا فلمی ہیرو لگتا تھا۔ گھنے اور لمبے گھٹکرے والے بال جو شانوں تک آتے تھے۔ کمرے نقوش جن میں بیک وقت کئی کئی کھڑکیاں تھیں اور کھڑکیاں جن میں بیک وقت دیکھا جوجان کئی کئی کھڑکیاں تھیں۔ اسے مجھ سے کیوں ملوایا ہے۔ اگرچہ سہیلی نے کچھ کہا نہیں تھا۔ مگر اس کی

آنکھیں، اس کے رخسار اور اس کی چال چچا چچ کر اس کے دل کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ اکبر کا اس کے ساتھ جو حاکمانہ اعتماد تھا اور وہ اس پر جس طرح کی غیر محسوس گرفت قائم کر چکا تھا۔ وہ اشارہ دے رہی تھی کہ اب ان دونوں کو ایک ہونے سے روکنا بہت مشکل ہے۔ وہ اس کے لیے ہر دھڑا کر دینے کا قزم کر چکے تھے۔ درحقیقت وہ ذہنی طور پر ایک ہو چکے تھے۔ سہیلی صرف اٹھارہ سال کی تھی بلکہ ابھی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے آئرو کا یہ دوسرا سال تھا۔ اکبر اس سے چار سال بڑا تھا اور وہ ماسٹر کر رہا تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد بھی اکبر کئی بار ہمارے پاس آیا۔ کبھی وہ ملنے آتا تھا اور کبھی سہیلی کو ملے جانے کے لیے آتا تھا۔ سہیلی اس سے باہر ملتی تھی اور اس نے بھی یہ بات مجھ سے نہیں چھپائی۔ میں نے بتایا کہ ہماری کلاس میں یہ سب عام سی باتیں ہیں۔ البتہ میں نے سہیلی کو یہ سمجھا دیا تھا کہ عورت محبت ضرور کرے لیکن شادی سے پہلے خود کو مرد کے حوالے نہ کرے ورنہ وہ اس کے لیے بے وقت ہو جاتی ہے۔ کچا چل رہی جاتی ہے جسے سب مہری میں شام سے قند لیا جاتا ہے مگر پھر کچھ کر ایک طرف ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ سہیلی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ اسے بھی اپنی عزت کا احساس تھا۔ اس

کے باوجود میں کسی قدر فکر مند تھی کیونکہ اب معاشرہ بدل گیا ہے۔ پہلے جو اقدار تھے اسے اب بیکار سمجھا جاتا ہے۔ دوسری بات جو میں نے سہیلی کے ذہن میں ڈالی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کم سے کم آئرو مل کرے گی اور اس کے بعد ہی میں اس کی شادی کا فیصلہ کروں گی۔

میں کم عمری کی شادی کے تحت غلاف ہوں۔ جس میں لڑکیوں کو اپنا ہوش نہیں ہوتا ہے وہ شادی کی وقتے داریاں کہاں سے پوری کریں۔ اس عمر میں تو انہیں اپنے اچھے برے کا پتا نہیں ہوتا ہے۔ ابھی اس کا آئرو مل ہونے میں دو سال سے زیادہ کا وقت تھا۔ مگر سہیلی انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں تھی وہ بہت مضطرب تھی اور پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا۔ ایک رات میں اپنے کمرے میں سوئے کی تیاری کر رہی تھی کہ وہ دھتک دے کر اندر آئی وہ

مضطرب سی لگ رہی تھی اور میں اس کی یہ کیفیت خوب پہچانتی تھی۔ جب اسے کوئی بات کہنی ہو اور اسے خطرہ ہو کہ میں منع کر دوں گی تو اس کی حالت ایسی ہی ہوتی تھی۔ وہ آکر کمرے کے کنارے بیٹھتی اور کچھ دیر دونوں ہاتھ آپس میں ملتی رہی۔ میں سکون سے انتظار کر رہی تھی کہ وہ کب ملتی ہے۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”ماما مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟“

”میں سن رہی ہوں۔“

”ماما... وہ... میں اکبر سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ جلد از جلد۔“

☆☆☆☆

”ایمل تم نے قادی حسین شاہ کو دیکھا۔“ مہرین نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں یہ کون ہے؟“ میں نے ریک سے ایک کتاب



اٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آج پروفیسر خزانہ کا بیڑہ آف تھا اور ہم لاہور ہی آگئے تھے۔“

”انگلش ڈیپارٹمنٹ میں آیا ہے۔ لیکن کیا پرستانہ ہے... ایسا بندہ کہ بے خودی کی آدمی لڑکیاں اس کی دلچسپی ہوئی ہیں۔“

پنجاب بے خودی میں ایک سے بڑھ کر ایک بندہ آتا ہے۔ اس لیے مجھے عجیب ہوا۔ ”ایسی کہانیاں ہے اس میں؟“

”تو دیکھو گی تو پتا چلے گا تجھے۔“

میں سال پہلے سو پاس، کیبل ٹی وی اور انٹرنیٹ نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں تبدیلی کی رفتار بہت سست تھی۔ اس وقت ہمارے بڑوں کو لگتا تھا کہ معاشرہ نہیں چالیس سال میں تبدیل ہوا ہے۔ محرم کے بعد تبدیلی کی ایسی رفتار آئی کہ دس سال میں ہر چیز مدد کو گول اور ان کے

روایوں کے سب بدل کر رہ جاتا ہے۔ تبدیلی کا دورانیہ مختصر اور مکرر بہت تیز ہوتی ہے۔ اس وقت مشن بھی برسوں میں بدل جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک ہی سوٹ ہم ٹی وی کی سال پہنچتے تھے اور وہ مشن میں ہوتا تھا۔ اب ہر چند مینیجمنٹ بدل جاتا ہے۔ میرا اصل ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ والدنی وی میں کام کرتے تھے۔ وہ کینٹین تھے مگر ان کے تعلقات سب سے تھے اور اکثر ہمارے گھر نامور اداکارہ ڈرامہ نگار اور پروڈیوسر آتے تھے۔ اب اور آرٹ سے خود بخود تعلق بن گیا تھا۔ انکی بہت تو نہیں تھی۔ لہذا کہتے کہ وہ کسی ڈرامے میں کام دلوا دیں۔ لیکن شوق ضرور تھا کہ کسی ڈرامے میں کام کروں۔ میری دن کا کردار ادا کروں۔

یہ شوق میں نے کالج میں پورا کیا۔ یہاں ڈرامہ اور آرٹ سوسائٹی تھی اور ایک نامور ٹی وی آرٹسٹ اسے پروموت کرتے تھے۔ یہاں میں نے ٹی وی ڈراموں میں حصہ لیا اور میری اداکاری کو سراہا گیا۔ مگر اداکاری سے قطع نظر میرا شوق تعلیم تھی۔ میں نے گریجویٹ میں اردو ادب لیا تھا اور گریجویٹ اتنے اچھے نمبروں سے کیا کہ مجھے آرام سے دیپاب پر یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ والد کی طرف سے تعلیم کے معاملے میں ہم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹیاں جتنا پڑھیں گی وہ پڑھائیں گے۔ اس پر ای نے ہنگامہ کیا وہ چاہتی ہیں کہ دوسری بہنوں کی طرح گریجویٹ کے بعد میری شادی کر دیں۔ مگر اب نے میری خواہش کا احترام کیا۔ میری دونوں بڑی بہنوں نے گریجویٹ کو کافی سمجھا تھا اور ان کا خود آگے بڑھنے کا ارادہ نہیں تھا اس لیے ان کی شادی ہو گئیں۔ میں آگے بڑھنا چاہتی تھی اس لیے مجھے اجازت مل گئی۔

میں نے باہر کے لیے بھی اردو ادب کا انتخاب کیا تھا۔ اس وجہ سے آرٹس اور فائن آرٹس سے خود بہ خود ایک تعلق بن گیا۔ پھر یونیورسٹی کی ڈرامہ سوسائٹی بھی جوائن کر لی۔ اس کے تحت ٹی وی ڈراموں میں حصہ لیا۔ لیکن یہ سب قاریع اوقات کے مشغل تھے تعلیم میری اولین ترجیح تھی اسی بنا پر پہلے سسٹر میں ٹاپ کیا تھا۔ یہ دوسرا سسٹر تھا۔ مجھے ہم خیال لڑکیوں کا ایک گروپ تھا جس میں میں بھی شامل تھی اور یونیورسٹی کی روایت کے برخلاف ہمارے گروپ میں لڑکے نہیں تھے۔ یہاں زیادہ تر گروپ دونوں اصناف پر مشتمل ہوتے ہیں مگر کچھ ان سے ہٹ کر صرف ایک ہی صنف بھی مشتمل ہوتے تھے اور ہمارے گروپ ان میں سے ایک تھا۔

میرے علاوہ میرین، سعدیہ، روشنا، حرا اور بشری تھیں۔ میرے اور میرین کے علاوہ باقی سب دوسرے شعبوں میں تھیں مگر اس سے ہمارے گروپ پر اثر نہیں پڑا تھا۔ ہماری سینگ ایسی تھی کہ باقاعدگی سے کلاسز اینڈ کرنے کے باوجود ہم دن میں ایک پار ضرور مل کر بیٹھتے تھے۔

اس روز اتفاق سے جی بی آف ہونے کی وجہ سے صرف میرین میرے ساتھ تھی اور ہم انٹرویو میں تھے۔ میرین عمار کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں بے توجہی سے سن رہی تھی اصل میں مجھے عمار کا ایک انتخاب مل گیا تھا اور میں اسے دیکھنا چاہتی تھی اس لیے جب میرین کا عمار نامہ زیادہ سی طول پکڑنے لگا تو میں نے ہلکے آکر کہا۔ ”اچھا بابا اسے بھی دیکھ لوں گی ابھی تو مجھے یہ کتاب دیکھنے دو۔“

اس نے ہل کر کہا۔ ”تم تو ہو ہی بد ذوق۔“

”بد ذوق میں ہوں یا تم۔ میں غالب کے لیے آئی ہوں اور تم مجھے عمار حسین شاہ کے قصے سنارہی ہو۔“

”مرضی تمہاری۔“ اس نے کہا اور ریڈر سیکشن کی طرف چلی گئی۔ میں کتاب دیکھ رہی تھی کہ مجھے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں نے ایسے ہی سرسری نظروں سے دیکھا اور پھر دیکھی رہ گئی۔ آج سے پہلے میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ کوئی مرد اتنا حسین ہو سکتا ہے۔ تو بے قصد لڑکیوں کی طرح میں مرد کو ایک مضبوط شخصیت اور محبت کے محرک کے طور پر دیکھ گئی۔ ان کی جسمانی خصوصیات میرے نزدیک اتنی اہم نہیں تھیں۔ مگر یہ شخص جو میرے سامنے کھڑا تھا ایسا نہیں تھا کہ میں اسے نظر انداز کر دیتی۔ موٹی اور مد بھری آنکھیں، جن پر شفاف پتھروں کا غلاف تھا۔ پیوست مروانہ تھی بیویوں۔ ستواں ناک اور بھرے ہونٹوں کے اوپر غناست سے تر آبی موچیں تھیں چونہ بہت بڑی تھیں اور نہ بہت چھوٹی۔ ایسی سرخی بال رنگت جس میں جلد کی صفائی نمایاں ہوتی ہے۔ اسے سرخ و سفید نہیں کہا جاسکتا تھا مگر ایسی دلکش رنگت والی جلد میں نے بہت کم دیکھی تھی۔

مضبوط جسم اور اس سے زیادہ مضبوط چمکانا ہوا ہاتھ کا تاثر۔ اس نے پیٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کا سر قی جسم نمایاں تھا۔ سائیلڈوں سے مختصر بے بال اور بے پٹے اور کسی قدر بکھرے ہوئے تھے مگر یہ بھی ایسے لگ رہے تھے۔

وہ حقیقت وہ ان مردوں میں سے تھا جن کا کچھ بھی برائیاں لگتا ہے۔ مجھے خاصی دیر سے اس کی در لب مسکراہٹ سے احساس ہوا کہ میں اسے ایک ٹک دیکھ چکا رہی تھی۔ یہ احساس ہوتے ہی جھپٹ کی اور جلدی سے رخ پھیر لیا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو ایک مسکون کن مہک چھپے میری سانسوں تک میں اتر گئی تھی۔ یوں لگتا جیسے یہ پر غصہ نہیں اس کی اپنی مہک ہو۔ میں نے پوچھا نہیں، مگر میں نے جان لیا وہ عمار حسین شاہ تھا۔ جس کے بارے میں چند لمحے پہلے میرین مجھے بتا رہی تھی اور مجھے لگا کہ اس نے شاید ہماری گفتگوں کی تھی اور شاید اسی لیے وہ جان بوجھ کر میرے سامنے آیا تھا۔ میرے دماغ میں اسے تباہ کیا کہ میرین کا دعویٰ غلط تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ ٹھیک ہے وہ بہت دلکش آدمی تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں یوں بے خود ہو جاتی۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا کہ اب اس سے سامنا ہوا تو اس کی طرف دیکھوں گی بھی نہیں، اسے نظر انداز کر دوں گی۔ جب میں خود کو سنبھالتی ہوئی میرین کے پاس آئی تو اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”کیا بات ہے کوئی بات دیکھ لیا ہے جو ہوا کیاں اڑ رہی ہیں۔“

”نہیں یا تم مجھے لگ رہا ہے بھوک کی وجہ سے پکڑ آ گیا۔“ میں نے بھانہ بنایا۔ ”مج تاشے کیے بغیر کھل آئی تھی۔“

”تو کینٹین چلے ہیں۔“ میرین فوراً کھڑی ہو گئی۔ ہم کینٹین آئے۔ یہاں کچھ دیر بعد بشری اور حرا بھی آ گئیں۔ ان کے پیچھے سعدیہ اور روشنا بھی چلی آئیں اور گپ شپ میں اگلا پیر یہ بھی کھل گیا مگر یہ اہم نہیں تھا۔ پروفیسر شرافت ادبی تاریخ پر جو کچھ دیتے تھے وہ ویریت سے بھر پور ہوتا تھا اور دوران کلاس اکثر طلباء جھمتے رہتے تھے۔ جب تک گفتگو کا موضوع عمار حسین شاہ نہیں ہوا تھا میں داخل تھی مگر اس کا ذکر آتے ہی میں بے چینی محسوس کرنے لگی۔ وہ سب بھی اس کی تعریف میں نہ تھیں آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں۔ اگرچہ وہ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں مگر نہ جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ جب بشری نے دو تین بار اسے اپنا لہجہ دیا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے کہا۔ ”خدا کے لیے اپنی زمین آسمان کی غلامی بھی مت ملاؤ۔“ ٹھیک ہے خود ہو گا مگر ہمیں کیا؟

”ہائے ہمیں ہی تو سب ہے۔“ حرا نے آکر کہا۔ ”کیا لڑکیوں کا ہی حق ہے کہ لڑکیوں میں خوب صورتی

علاج کرتے پھریں۔ ہم لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہے کہ لڑکیوں کی خوب صورتی دیکھیں یا اس کے بارے میں بات کریں جیسے لڑکے ہمارے بارے میں کرتے ہیں۔“

”حق ہے لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم صنف نازک ہیں اور خوب صورت ہونا ہماری ضرورت ہے۔ ہم حق دار ہیں کہ لڑکے ہماری طرف متوجہ ہوں۔ ہمارا لڑکوں کی طرف متوجہ ہونا ٹھیک نہیں ہے۔“

”یہ پرانی باتیں ہیں اب کون ان کی پرواہ کرتا ہے۔“ حرا نے لاپرواہی سے کہا۔ وہ ہم سب میں بولڈ تھی۔ اسی لمحے میں نے دیکھا ایک میز آگے عمار بیٹھا ہوا تھا اس کی پشت ہماری طرف تھی لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ ان میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں گئی تھی۔ ہم سب اتنی آواز سے ضرور بات کر رہے تھے کہ اس کے کانوں تک ہماری آواز پہنچ گئی ہوگی۔ میں ڈرا بولکائی تھی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اچھا موقع ہے، میں اس تاثر کو زائل کر سکتی تھی جو پہلی ملاقات میں عمار پر آیا ہوگا۔

”بات پرانی اور بچی کی نہیں ہے۔“ میں نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔ ”ہمیں کسی کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر کسی میں کوئی خوبی ہے تو اس کے اپنے لیے ہے ہمارے لیے تو نہیں ہے۔“

”یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ بشری بولی۔ ”لیکن ہم صرف قارا بچائے کر رہے ہیں۔“

”بس تو اسے انجوائے کی حد تک رکھو کسی کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”اب چلو اگلا پیر شروع ہونے میں چند منٹ ہیں۔“

میرین میرے ساتھ آگئی۔ میں عمار کے پاس سے گزری مگر جان بوجھ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اہل بیت مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ میں خوش شکل تھی، بلکہ اب بھی ہوں۔ نسوانی دلکشی تھی اور اوڑھنے پہننے کا سلیقہ تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ لڑکے راہ چلتے میری طرف متوجہ ہوتے ہیں یا میرے آگے پیچھے ہوتے ہوں۔ اس لیے مجھے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ عمار جیسا خوب و مرد میری طرف متوجہ ہوگا۔ دو دن بعد میں لان میں درخت تلے بھی ہوئی ایک سنے ادبی ناول کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوشش

فن لینڈ

شمالی یورپ کی ایک جمہوریہ۔ اس کے شمال میں ناروے۔ مشرق میں روسیہ، ریشن جنوب میں فنلینڈ اور بحیرہ بالٹک اور مغرب میں سویڈن ہے۔ ملک کی مجموعی لمبائی کا تیسرا حصہ دائرہ قطب شمالی کے شمال میں ہے۔ رقبہ 129-130 مربع میل (337032 مربع کلومیٹر) دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر: ہلسنکی زبان: فنلش (سوئیڈش (دونوں سرکاری) مذہب: لوثرنر سنی 97 فیصد۔ مندرجہ ذیل: مارکا (Markkaa) کہلاتا ہے۔ فن لینڈ ساٹھ ہزار چھوٹی سی سرزمین ہے اور یہ تقریباً تمام ملک کے جنوبی حصے میں ہے۔ ملک 70 کا فیصد زمینی رقبہ جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے جس میں فیصد جس میں دلدلیں ہیں۔ ساحلی پٹی لمبی ہے۔ اجماعی شمال میں کم بلند پہاڑیاں ہیں۔ قومی آمدنی کا بیشتر حصہ صنعتوں (کاغذ، کاغذی مصنوعات، تانبے کی صفائی، جہاز رانی، فرنیچر، پارچہ بافی اور کیمیاوی سامان) سے حاصل ہوتا ہے۔ جی، جو، گندم، آلو، چغندر اور رانی کاشت کی جاتی ہے۔ معدنیات میں تانبا، نکل، لوہا، کروم، جست، ہیکم اور کوکالت قابل ذکر ہیں۔ ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج ہے (صدر چھ سال کے لیے انتخابی کان کا 301 ارکان کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے) کاروبار حکومت میں وزیر مقرر اور اس کی کا پینہ صدر کی مدد کرتی ہے۔ ایک ایوانی پارلیمنٹ ایڈس کونٹا (Edus Kunta) 200 ارکان پر مشتمل ہے۔ انھیں بائیں حق رائے دہی کی بنیاد پر، چار سال کے لیے چنا جاتا ہے۔ ملک میں 12 لائسنس یافتہ ہیں، جن پر گورنر حکومت کرتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ان علاقوں میں جواب فن لینڈ میں شامل ہیں، قبضی خطے کے لوگ آباد تھے، جنہیں Lapps کہا جاتا ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں انھیں جنوب اور جنوب مغرب سے آنے والے فن قبیلوں نے شمال کی طرف دھکیل دیا۔ بارہویں صدی میں فن لینڈ کے باشندوں کو سویڈن کے لوگوں نے سکھایا اور سولہویں صدی میں یہ ملک سویڈن کے زیرِ نگیں

ان معنوں میں کہ ادیب حضرت نے اس میں ادب کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اور کہانی کو نظر انداز کیا ہوا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ ہمارے جدید ادب کے پروفیسر اس کی تعریف کر رہے تھے اور آنے والی کلاسز میں اس پر دیکھن ہوئی تھی۔ معاف فریب سے آواز آئی۔
"مشکل ہے نا؟"

میں چونگی مجھے قطعی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ہاں کب آیا اور کتنی دیر سے وہاں موجود تھا۔ میں نے کسی قدر شک لہجے میں پوچھا۔ "ایکسپریس ڈی؟"
وہ دہیں گھاس پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے بولا۔ "میں نے پڑھا ہے اور بہت مشکل سے پڑھا ہے۔"
"آپ تو انکس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں لیکن اردو ادب پڑھنے پر پابندی تو نہیں ہے؟" اس نے کہا۔
"ضرور پڑھیں۔" میں نے کہا اور کتاب بیگ میں رکھ دی۔ میں انھیں ہی کہ اس نے کہا۔
"یہ ضروری تو نہیں ہے کہ مجھے آپ اہمیت نہ دیں وہ

ایک نوابی ریاست بن گیا۔ 1721ء میں روس نے سوہائی بورگ (Viborg) پر قبضہ کر لیا اور 1809ء تک سارا ملک سلطنت روس کے زیرِ اقتدار آ گیا البتہ مقامی لوگوں کو اندرونی خود مختاری حاصل رہی۔ 1899ء میں نازدیدی بکولاس دوم نے یہاں روسیہ پر کفر و روج دینے کی کوشش کی، جس سے فن قوم پرست ہلک اٹھے اور انھوں نے روسیہ گورنر جنرل کو قتل کر دیا۔ 1906ء میں روسیہ حکومت نے فن لینڈ کو چند مراعات دینے کا اعلان کیا اور ملک میں ایک ایوانی پارلیمنٹ قائم کی گئی جس کے ارکان بائیں حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیے گئے۔ 1917ء میں، انقلاب روس کے بعد فن لینڈ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا لیکن ملک کی تقریباً نصف آبادی فن لینڈ کو سوویت یونین میں ضم کرنے اور نصف مکمل آزادی کی حامی تھی۔ اولی الذکر سرخ (ریڈ) اور وائی الذکر سفید (وہائٹ) کہلائے۔ آزادی کے حامیوں نے، جرمن فوج کی مدد سے سرخوں کو چل دیا اور فن لینڈ جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ 1939ء میں سوویت یونین نے مطالبہ کیا کہ فن لینڈ لینن گراڈ کے شمال میں واقع خاکسائے کیریمین میں اپنی قلعہ بندیاں ختم کر دے اور فنلینڈ کے حدود جزیرہ اس کے حوالے کر دے۔ فن لینڈ نے یہ مطالبات مسترد کر دیے جس پر 1940ء میں سوویت یونین کی فوجوں نے اس پر حملہ کر دیا اور شہر ہینگ کے بعد جس میں پہلے پہل سوویت افواج کو بریت اٹھانا پڑی فن لینڈ کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ 1941ء میں نازی جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کیا تو فن لینڈ کی حکومت نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ 1947ء میں جرمنی کے معاہدہ امن کی رو سے فن لینڈ نے حریف علاقے سوویت یونین کے حوالے کر دیے اور تادان جنگ ادا کرنے پر بھی رضامند ہو گیا۔ 1955ء میں فن لینڈ اقوام متحدہ کا رکن بنا اور اس نے غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی۔ 1970ء میں دائیں بازو کی سینٹر پارٹی نے کیونسٹوں کے اشتراک سے حکومت بنائی۔ 1971ء میں کیونسٹ پارٹی حکومت سے ملحدہ ہو گئی۔
مرسلہ: شاہد، لاہور

میں یاد نہیں رہا کہ میں نے اس کے بارے میں اپنی دوستوں سے کیا کہا تھا۔ وہ کیسے مجھ پر عادی ہو گیا، میں نہیں جانتی۔ وہ چرچا جاتا تھا کہ میں نے شادی سے پہلے جسمانی تعلق قائم کرنا چاہتا تو شاید میں یہ بھی مان جاتی مگر اس نے اس کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے اپنا نا چاہتا تھا۔

میرا ماسٹر کا پہلا سال تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ماسٹر مکمل ہونے تک میں گھر والوں سے بات نہیں کر سکتی۔"
"میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"پینز عماد۔" میں بے بسی سے بولی۔ "میں آپ کو لینن دلائی ہوں میرے گھر والے میری مرضی کے بغیر مجھ میں کریں گے۔"

"بات تمہارے گھر والوں کی مرضی کی نہیں ہے۔" وہ اکی انداز میں بولا۔ "بات یہ ہے کہ مجھے تم چاہیے ہو اور میں اس کے لیے کوئی فلڈ طریقہ اختیار کرتا نہیں چاہتا۔"
اس کے انداز میں اپنا ایمنا دیتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ فلڈ

جائے۔ امی میرے لہجے اور الفاظ پر دنگ رہ گئی تھیں۔ انہوں نے کہا۔
 ”ایمل تیرا دامخ تو ٹھیک ہے۔ یہ تو مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہی ہے۔“
 ”امی امی سے اعزازہ لکھیں کہ میں کس قدر سنجیدہ ہوں۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آنے والے دن میرے کمرے میں جو بونچال آپاس کا آپ اعزازہ کر سکتے ہیں۔ ابو بھائی اور بہنیں سب اس سسٹے پر میٹنگ کر رہے تھے اور پھر مجھے مجرم کی طرح طلب کیا گیا۔ کمرے میں بے خوف ہو کر گئی وہاں بھی میں نے عمل کروائی کہا جوامی سے کہا تھا اس پر بھائیوں نے مجھے بارہا بہنوں نے ملاصت کی اور ابو ساکت رہ گئے تھے مگر مجھے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ جب یہ سب ہو گیا اور میں نے سارے ستم برداشت کر لیے تو صرف اتنا کہا۔ ”اگر آپ چاہے ہیں کہ میں کورٹ میرج نہ کروں تو میری بات مان جائیں۔“
 وہ میرے کمرے والے تھے اور مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ خاص طور سے ماں باپ جو اولاد کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ جان گئے کہ میں ایسا ہی کروں گی۔ اس لیے وہ دونوں بعد ابو نے امی سے کہلوا دیا کہ میں عماد حسین سے کہوں کہ وہ رشتہ لے آئے۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے بعد میرا اس کمرے سے اور اس کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ شادی کے بعد میں پھر بھی اس کمرے میں نہیں آؤں گی اور نہ ہی اس کے کسی فرد سے ملوں گی۔ مجھے اس کی فکری پرواہ نہیں تھی۔ میں نے اگلے دن یہ خوش خبری عماد حسین کو سنائی اور اس سے کہا کہ وہ اپنے کمرے والوں کو میرے کمرے بھیجے۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”جس طرح تمہارے کمرے والے شادی کے بعد تم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا اسی طرح میرے کمرے والے بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوں گے۔ میں ان کے علم میں لائے بغیر شادی کروں گا اور تمہارا واسطہ صرف مجھ سے ہوگا۔“
 جب مجھے اپنے کمرے والوں کی پرواہ نہیں تھی تو عماد حسین شام کے کمرے والوں کا خیال کہاں سے ہوتا بلکہ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ میں اور عماد ہوں گے ہماری زندگی میں کوئی تیسرا فرد نہیں ہوگا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”آپ آجائیں۔ میں کمرے والوں سے بات کر لوں گی۔“
 کمرے والے پہلے ہی میرے مستقبل سے لا پرواہ ہو چکے تھے اور وہ میری شادی یوں کرتے جیسے مردہ دفناتے

ہیں۔ اس لیے انہیں کوئی فرض نہیں تھی کہ میرے رشتے کے لیے کون آتا ہے۔ میں نے امی کو بتا دیا کہ صرف عماد شام آئے گا کیونکہ اس کے کمرے والے بھی اس رشتے میں نہیں ہیں۔ امی نے سناٹ لہجے میں کہا۔ ”ہماری بلا سے بھی آئے۔ ایمل یاد رکھنا اب اس کمرے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مجھ لہذا تم ہمارے لیے مریجی ہو اور جو مریجی رہا نہیں آتا ہے۔“
 ”یہ آپ کی مرضی ہوگی۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”اگر آپ میری شادی پر خوش نہیں ہیں تو یہ بھی آپ کی مرضی ہے۔“
 عماد حسین شام آیا تو اس سے صرف امی اور ابو نے ملے۔ یہ کوئی خوشگوار ملاقات نہیں تھی کیونکہ ابو نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ رخصتی کے بعد مجھ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ عماد وہ افراد اور قاضی لے کر آئے اور مجھے تھوڑا بڑھا کر لے جائے۔ عماد کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ شاید میں اس طرح کمرے والوں پر دہلاؤں گا اتنی تو یہ شادی ذرا طریقہ سلیقے سے ہو جاتی۔ اس وقت میں پاگل ہو رہی تھی مجھے سوائے عماد کے کچھ بھائی نہیں رہے رہا تھا۔ میرا ہر صورت اس کی ہو جانا چاہتی تھی۔ جیسی کہ اس کی خواہش تھی۔ ایک ہفتے بعد عماد حسین قاضی اور دو گواہ لائے اور مجھے کمرے کے کپڑوں میں رخصت کرا کے لے گیا۔ اس نے کہا تھا کہ میں اپنے کمرے سے ایک چیز بھی نہ لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ بالکل عام سے لباس میں نکاح کے بعد عماد کے ساتھ آئی۔
 مجھے یہ معلوم تھا کہ عماد لاہور کے ایک پوش ملائے میں شاعر محرم کی کوئی بیوی رہتا ہے لیکن میں نے یہ کوئی بھی دیکھی نہیں تھی۔ جب میں یہاں گاڑی سے اتری تو حیران رہ گئی تھی۔ یہ وہ نکال سے زیادہ بڑی کوئی تھی جس کا طرز تعمیر بتانے کے لیے کافی تھا کہ کسی بہت دوستانہ کی رہائش ہے۔ آگے بہت بڑا اور خوب صورت لان تھا۔ پورے میں گی گاڑیوں کے کمرے ہونے کی منجاش تھی۔ عماد کے پاس دو گاڑیاں تھیں ایک امریکن بیوک اور ایک مرسدیز تھی۔ کیونکہ وہ دونوں گاڑیاں استعمال کرتا تھا۔ کوئی میں ایک خادمہ میری منتظر تھی وہ مجھے اندر لے گئی جہاں دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ مجھے وہاں بتانے آئی تھیں۔ میرے لیے عروسی لباس، پیچدری اور دوسری تمام چیزیں عماد پہلے ہی لے چکا تھا۔ پہلے میں بھائی پھر انہوں نے میرے پالنگ

سے سوار رہے۔ جن کھٹے بعد جب میں نے آئینہ دیکھا تو اس کا منہ نہیں لگی تھی۔ عماد نے دیکھا تو وہ پاگل ہو گیا تھا۔ آنے والے چند دن ایسے گزرے کہ مجھے دوسروں تو بخیر اپنا جوش نہیں رہا تھا۔ مجھے صرف عماد اور اس کا بھائی یاد تھا۔ اپنے کمرے والوں کی یوں لگ رہا تھا کہ میں انہوں نے پہلے ہی مجھ سے تعلق قطع کر لیا تھا۔ اگر میرے کمرے والے رہا یہ خیال تھا بھی تو وہ ان کے اس رویے نے قسم دے دیا تھا۔ چوتھے دن ہم تین مہینوں منانے کے لیے گئے۔ پھر وہ دن تک حسین وادیلوں میں گھومتے رہے۔ اگر کمرے کا خیال نہ ہوتا تو شاید مہینے سے بھی اوپر وہاں رہے۔ ہمیں آکر ہم دونوں چینیوں کا ازالہ کرنے کے لیے شادی کا ابتدائی شمارازہ کیا تھا اور اب ہمیں یونہی شادی کی تھی۔ میرا دوسرا سمسٹر قریب تھا۔ شروع کے کچھ دن صبح صبح گھر سے گھرے۔ جو لوگس رہے تھے انہیں مکمل کرنے کے سسٹم کے بعد چند دن کی چھٹی ملی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب میرے ساتھ رہے گا مگر اس نے بتایا کہ وہ حویلی جا رہا ہے۔
 ”اور میں؟“
 ”تم یہاں رہو گی۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔
 ”اکیلے؟“
 ”نہیں یہ تین ملازم کس لیے ہیں۔“
 کوئی میں ایک چڑکھار، ایک مالی اور باہر کے کام لےنے والا اور ایک ملازمہ تھی۔ مالی اور ملازمہ میاں بیوی تھے۔ ان کو سرورٹ گارڈ یا ہوا تھا۔ چوکیدار کیٹ کے ساتھ گھر کی سی گھڑی میں رہتا تھا۔ ملازمہ اندر کے کاموں کے ساتھ صفائی اور دوسری چیزیں دیکھتی تھی۔ ایک باورچی تھا۔ چینی میں نے اس کی بچھی کر دی۔ کھانا اب میں خود بناتی تھی۔ عماد نے منع کیا تھا کہ میں نے اصرار کیا تو وہ مان گیا کہ اسے میرے ہاتھ کا ڈانڈہ پسند آیا تھا۔ میں بس اس کے سامنے اپنے لیے کھانا بناتی تھی۔ چوکیدار کے لیے کھانا ملازمہ ہی بناتی تھی۔ ویسے بھی ہم کچھ باہر کھاتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ تین وقت کا کھانا ہم کمرے میں کھاتے ہوں۔ تو اگر کوئی کھانے کے دن بھی لازمی کہیں نہ لگتی جاتے تھے۔ یہاں عماد نے کھانا دوست اور جاننے والے تھے۔ جب اس نے ویسے کا تو ان ہی دوستوں اور ان کی ٹیلیفون بولا تھا۔ یہی ہم ان سے ہاں جاتے تھے اور بھی وہ ہمارے ہاں آتے تھے۔ عماد

جدید شادی

جدید دور کی شادی جدید رہنمائی تھیں
 خرقہ دونوں نظریوں خوشی میں پھول گئے
 لیکن بھی ہوئی گھر سے ہی خوشی رخصت
 خیال بعد میں آیا نکاح بھول گئے

شاعر: ظفر کمالی

محلے کی سیاست

ظفر کامیابی قدم چم لے گی
 جو کھی دور پہلے وہ پاس آگئی ہے
 لگے چوٹا ہلدی نہ کیوں روز ان کو
 سیاست محلے کی راس آگئی ہے

شاعر: ظفر کمالی

چلا گیا اور میں اکیلی رہ گئی تھی۔
 تب مجھے پہلی بار سوچنے کا موقع ملا۔ جب تک عماد تھا مجھے اس کے سوا کچھ سوچا ہی نہیں تھا اب وہ نہیں تھا تو مجھے خیال آیا کہ میں اس کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ کون تھے، بہن بھائی کتنے تھے اور وہ کیا کرتے تھے۔ میری معلومات صفر تھی۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ اس کا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک بڑے جاگیردار گھرانے سے تھا۔ یہ اتنے دولت مند تھے کہ عماد کچھ نہیں کرتا تھا اس کے باوجود وہ یوں جیسی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کا ہاتھ اتنا کھلا ہوا تھا کہ بعض اوقات میں اسے روکتی تھی کہ اتنا خرچ نہ کرے۔ مگر وہ لا پرواہی سے کہتا۔ ”کیوں خرچ نہ کروں، مجھے کوئی کمی تو نہیں ہے۔“
 میں جتنا چاہتی خرچ کرتی تھی۔ میرے پرس میں ہزاروں کی رقم بھری رہتی تھی اور اس سے پہلے وہ خرچ ہوتی عماد پر ہم اس میں ڈال دیتا تھا۔ شادی کے بعد ایک بار بھی ایسا موقع نہیں آیا جب مجھے اس سے جب خرچ کے لیے کہنا پڑا ہو۔ عروسی لباس کے ساتھ بہت بھاری اور چمکی چڑوں سے بڑا ہوا سیٹ دیا تھا۔ ایک کلائی کے لیے چوڑیاں تھیں اور دوسری کے لیے ہونے کے کڑے تھے۔ پھر اس نے منہ دکھائی میں منہ کے دانے کے برابر پاؤت بڑی اکھنڈی دی تھی۔ جب ہم تین مہینوں سے واپس آئے تب بھی

اس نے سوئے کا ایک چھوٹا سیٹ اور کی چیزیں دلائی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سوئے کی کوئی نہ کوئی چیز بعد وقت پہنچ رہوں۔ کوئی جتنی شاہانہ تھا اس کا سارا سامان اور آرائش بھی اتنی ہی شاہانہ تھی۔ ایک ایک چیز اپنی جگہ تھی۔ ہر چیز کی باقاعدہ جگہ تھی۔ پوری کوئی گلی میں اسے ہی لگے ہوئے تھے اور اس وقت تک اس کا اتنا مسئلہ نہیں ہوتا تھا اس کے پاس جو کوئی چیز ہر چیز بڑھ چلائی جاتی تھی خود ہی خود خود اشارت ہو جاتا تھا اور اشارت آنے پر خود بند ہو جاتا تھا۔ اگر مالی لحاظ سے دیکھا جائے تو میں اس لحاظ سے بھی خوش قسمت صورت تھی۔ عمارت تو تھیں اور دل پسند محبوب۔ اس سے جہاں کے یہ دن میں نے کیسے گزرا، میں انھوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اگلے سبزی کی چٹاری کر لوں گی مگر جب کتاب کوئی تو مجھے عمارت یاد آتا اس کی باتیں اور اس کی باتیں یاد آتیں۔ میں ایک لفظ نہیں بڑھ سکتی تھی۔ بس اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر میں نے اس کے پس منظر کے بارے میں سوچا۔ مجھے سمجھ ہوا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کا خاندان کیا تھا۔ اس کے خاندان میں کتنے لوگ تھے اور وہ میرے بارے میں جانتے تھے یا نہیں۔ میں نے جتنی بار عمارت سے اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھا وہ اتنی صفائی سے ٹال گیا اور مجھے دوسری باتوں میں لگا دیا کہ مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ یہاں سے بھی بھی اپنے گھر کا لگتا تھا اور اگر کال آتی تو لازماً مدد رسید کرتی تھی۔ اس نے مجھے کال رسید کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ اس لیے میں فون پر رسید بھی نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس کی خوشی کے فون پر رسید بھی نہیں معلوم تھے۔ جب سمجھ ہوا تو میں نے عمارت کی الماری کھول کر دیکھی۔ اس میں اس کے کپڑے اور دوسرا استعمال کا سامان تھا مگر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کے گھر والوں کے بارے میں بتاتی۔ اس کی کوئی ڈائری نہیں تھی اور نہ ہی کوئی بکھٹ لکھا ہوا تھا۔ اس طرح فون کے پاس جو ڈائری رہی تھی اس میں عمارت کے دوستوں اور جاننے والوں کے نمبر تھے مگر اس کے گھر کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس وقت ایسے فون سیٹ نہیں آتے تھے جو میموری رکھتے ہوں اور ان سے ڈائل نمبروں کا پتہ چل جاتے۔ یہ سادہ ڈیجیٹل سیٹ تھا۔ ایک کمر اسٹڈی کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے وہاں ٹھکانا ہی تو ایک دروازے سے کچھ لٹکانے پر آمادہ ہوئے۔ ان میں ان جیکٹس کی نقول تھیں جو عمارت کے نام لکھے گئے تھے اور یہ انھیں خاصی مالیت کے چیک تھے۔

جو مہمان کے ایک بنگ کے تھے۔ چیک پر شاہانہ عمارت کے سامنے تھے۔ یہ عمارت کے والد کا نام تھا۔ عمارت کے گھر کے بارے میں میری معلومات بس اسی حد تک تھیں۔ عمارت چاروں کمرہ کر گیا تھا اور باقی رہ گیا تھا۔ پہلے دن سے چٹائی سے اس کی دایم کی کھینچ تھی۔ اس کے جب پانچواں دن ہوا اور وہ دایم نہیں آیا تو مجھے اس کے چہرے لگے تھے۔ شام تک میں نے روتا روتا کر دیکھا تھا۔ اس کے ایک دوست مسیح الدین کو کال کی۔ "مسیح الدین کی کال آنے کا کہہ کر مجھے تھے مگر اب تک نہیں آئے ہیں۔ میں نے کہتے ہوئے روتا روتا کر دیا۔

"آرام سے بھابھی آرام سے۔۔۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے وہ کسی وجہ سے رک گیا ہوگا۔"

"میرے پاس کوئی کال ٹیکٹ نمبر نہیں ہے، وہ بھی میری پہلی آپ معلوم کر کے مجھے بتائیں وہ کونسا نمبر ہے۔"

"اوکے میں ڈرائی کرتا ہوں۔" مسیح الدین نے کہا اور آدھے گھنٹے بعد اس نے مجھے کال کر کے بتایا کہ خیریت ہے اور وہ حیرت زدہ دونوں بعد آئے گا۔ اب مجھے خبر آنے لگا۔ اس شخص کو احساس ہی نہیں تھا۔ اگر اسے کسی سے دیر ہو رہی تھی تو ایک کال کر کے بتا نہیں سکتا تھا۔ اسے والے دن تک یہ خبر نہ پتا رہا تھا اور جب عمارت کے کمرے میں آیا تو میں پتہ پڑی تھی۔ اسے بے حس اور غرض قرار دیا۔ مجھے میری کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ خاص سے ستارہ باج میں بول بول کر تھک گئی تو اس نے آرام سے کہا۔

"بس یہی بات تھی؟"

"عمار۔" میں چلا گیا تھی۔

"چلاؤ مت۔" اس کا لہجہ سخت اور بیک نہ ہو گیا۔

"کہا ہے وہ کرو۔ تم یہی ہو۔۔۔ یہی بن کر رہو۔"

"میں یہی ہونے کی حیثیت سے چل رہی ہوں۔"

"حیثیت۔" اس نے استہزاء سے انداز میں کہا۔

بھول رہی ہو کہیں یہ حیثیت میں نے دی ہے ورنہ نہ جانتا تھا کہ عمارت کو ایسے ہی حاصل کر لیتا ہے تم کیا کرتی۔"

عمار کہہ کر واش روم میں چلا گیا اور میں نے رو کر دیکھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چند دن پہلے مجھے دل و جان لٹکانے والا کہہ رہا تھا کہ میری جو حیثیت تھی اس کی بخشی ہوئی تھی اور یہ اس کی محبت نہیں حمایت تھی جو میں

ملاتی تھی۔ وہ واش روم سے آیا تو میں نے کہا۔ "عمار۔" اس کا مطلب ہے کہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے سوائے اس کے جو آپ تحقیر کر رہا۔"

"ارو میں ماسٹر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ تم اپنی بات بتاؤ مجھے طریقے سے کہہ سکتی ہو۔" اس نے استہزاء سے انداز میں کہا۔ "تم بتاؤ تو ایسا ہی کچھ لو اور آئندہ میں کہیں جاؤں میری غیر موجودگی میں میرے کسی دوست سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ ہماری بات باہر لکھی جائے۔"

"میں پریشان ہو گئی تھی اس۔۔۔"

"جیسا میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے میری بات کافی اور کمرے سے نکل گیا۔ اس دن کے بعد سے اس کا رویہ ایسا ہوا کہ میں بہت دن تک تو شک میں رہی کہ میں پہلے کوئی خواب دیکھ رہی تھی یا یہ کوئی خواب تھا۔ عمار صرف رات کے وقت میرا ہوتا تھا بلکہ یوں کہتا درست ہوگا کہ میں اس کی ہوتی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے بچتا ہو جاتا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ یوں دھڑکی چلا جاتا اور وہاں سے کہاں جاتا مجھے نہیں معلوم تھا۔ بھی گھر آتا تو شام کے وقت تیار ہو کر نکل جاتا تھا۔ پھر رات گئے آتا اگر میری طلب ہوتی تو پاس آتا تھا ورنہ کمرے کے کمرے میں جاتا۔ مجھے یہ بھی شبہ ہوا کہ شاید اس کا مسیح الدین کو کال کرتا ہوا تھا اور وہ مجھ سے سزا دے رہا تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد مجھے یقین آ گیا تھا کہ یہی اس کا اصل روپ تھا۔ اس سے پہلے جو روپ تھا وہ صرف دکھاوا تھا۔ اسے ایک عورت کی ضرورت تھی جو اس کے گھر میں رہے۔ اس کی خدمت کرے اور اس کی ضروریات پوری کرے۔ اسے میری صورت میں وہ محبت مل گئی تھی یہ اس کی مہربانی نہیں چاہا کی تھی کہ اس نے مجھ سے صرف شادی کے بندھن میں جکڑ لیا تھا بلکہ میری دایم کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے میرے گھر والوں سے کوا دیا تھا۔

جیسے جیسے میں سوچ رہی تھی میری آنکھیں مکمل رہی تھیں اور میں اپنی اصل پر قائم کر رہی تھی۔ ایک شخص کی محبت میں دوانی ہو کر میں نے سامنے نظر آنے والی جھینٹوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ تم خطر لی ہے کہ میری آنکھ خود نہیں مل گئی۔ اگر عمار اپنی اصلیت خود نہ دکھاتا تو شاید اب بھی میری آنکھیں بند رہتی۔ پتا نہیں اس نے اچھا کیا تھا یا برا کہ اتنی جلدی مجھے اصلیت دکھا دی۔ کچھ عرصے تو مجھے دھوکے

میں رکھتا۔ اس کی حقیقت رفتہ رفتہ خود مجھ پر کھلتی تو شاید مجھے اپنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اس وقت محسوس ہوئی تھی۔ میں بیمار پڑ گئی تھی۔ اس نے میرا خیال رکھا تھا۔ باقاعدہ سے ڈاکٹر آکر چیک کرتا تھا اور ملازمہ کی قے داری لگا دی تھی کہ وہ مجھے باقاعدگی سے دوا دے۔ میری خوراک کا خیال رکھے۔ البتہ عمار کا رویہ وہی تھا۔ میں دوپٹے تک یوں خودی نہیں لگتی تھی۔ بیماری سے آتی تو کمزوری نے جکڑ لیا تھا۔ اس روز یوں خودی لگی تو عمار مجھے اتار کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے سب شک اور الگ سا لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ میری آنکھوں پر بندھی عمار کے سحر کی پٹی اتر گئی تھی۔ جس کے پیچھے مجھے کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ میں ان دوستوں سے ملی جن کو نظر انداز کر رہی تھی۔ شاید ان کو بھی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اتفاق سے ہمیں مل بیٹھنے کا موقع ملا اور میرین نے پوچھا۔ "نیکل تجھے کیا ہوا ہے اتنی کمزور دیکھیں ہو رہی ہے؟"

"میاں تجا سوئے کہاں دیتے ہوں گے۔" بشری نے شرارت سے کہا۔ "اس کا خود بھی سوئے کو دل کہاں کرتا ہوگا تو کمزور ہو کر رات بھر جاگ کر۔"

وہ سب ایسی مذاق کرنے لگیں لیکن جب میری آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوئے تو وہ سمجھ رہی تھیں۔ میرین نے مجھے گلے لگا لیا۔ "نیکل کیا ہوا یا کیوں رو رہی ہے ہماری کوئی بات بری لگ گئی ہے کیا؟"

"نہیں تم لوگوں کی کوئی بات بری نہیں لگی۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اپنے افسوس پر رو رہی تھی۔" میرے جھلے پر وہ سراپا سوال من کی تھیں۔ وہ سب بیک وقت بولنے لگیں۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"ہم تو تجھ پر رشک کر رہے ہیں۔"

"خوابوں کا شکار ہو کر گیا۔"

"نیکل تم خوش ہو نا اس شادی سے؟"

"بس چند دن کی خوشی تھی۔" میں نے آنسو صاف کیے۔ "اس کے بعد سب بدل گیا۔"

میں نے ان کو بتایا کہ عمار کس طرح بدلا ہے۔ بلکہ بدلا نہیں ہے اس نے اپنے اوپر جو غلبہ چڑھا رہی تھی وہ اثر لگتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھایا ہے۔ وہ وہ بہ خودی سن رہی تھیں۔ پھر میرین نے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس شخص کو تو نے سب کچھ کر پایا وہ ایسا لگے گا؟"

”سوجا تو میں نے بھی نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے جس کے لیے سب کو چھوڑا وہ میرا نہیں ہے۔“

”وہ تمہارا شوہر ہے۔“ حرا نے یاد دلایا۔

”صرف شوہر ہے۔“ میں تلخ ہوئی۔ ”اس سے اچھا شوہر میرے گھر والے میرے لیے تلاش کر سکتے تھے۔ میں نے حماد سے شادی کی تھی۔ مجھے صرف شوہر نہیں چاہیے۔“

”اب جو ہے تجھے اسی پر گزارا کرنا ہے۔“ مہرین نے مجھے آئینہ دکھایا۔ ”واپس کا دروازہ تو خود بند کر چکی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

اس ملاقات کے دوران میں نے محسوس کیا کہ مہرین کچھ کہنا چاہتی ہے مگر دوسروں کی موجودگی میں جھجک رہی ہے۔ جب ہم اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہے تھے تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے کہا۔ ”بیکل تو اتنے دنوں بعد دیکھیں آئی اس لیے تجھے پتا نہیں ہے شاید۔“

”کیا پتا نہیں ہے؟“ وہ چٹکائی پھر اس نے کہا۔ ”آج کل حماد آئی آر کی ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے، دونوں اکثر ساتھ نظر آتے ہیں اور وہ اس کے ساتھ پورے غور سے آتی جاتی ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”میں آج تم حماد کے ساتھ آئی ہو ورنہ وہی آ رہی تھی۔“

میں کلاس سے فارغ ہو کر حماد کے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے آئی اور پھر میں نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ حماد ایک خوب صورت اور ماڈرن لڑکی کے ساتھ باہر آ رہا تھا۔ لڑکی نے چست جیجر اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ حالانکہ اس وقت ایسے لباس کا رواج نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک چھٹی ہو کر کھڑے تھے۔ وہ پہر میں جب ہم واپس جا رہے تھے تو میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”وہ لڑکی کون تھی جس کے ساتھ آپ ڈیپارٹمنٹ سے آرہے تھے؟“

”تم متاثر کی بات کر رہی ہو۔“ حماد نے مخصوص احتیاط اور لہجہ سے کہا۔ ”وہ آئی آر میں پڑھتی ہے۔“

”تب انکس کے ڈیپارٹمنٹ تک کیسے چلی آئی؟“ میں نے جیسے کچھ میں پوچھا۔

”کیونکہ مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔“ حماد نے جواب دیا۔ ”میرے پاس پوچھنے کے لیے مزید کوئی سوال نہیں رہا۔ میں نے اس کا حوالہ ہی نہیں دے سکتی تھی کہ اس نے پہلے ہی دیا کہ یہ شادی اس کا احسان تھا۔“

”اچھی تو میں بھی گئی تھی۔ تو کیا اس سے شادی کا ارادہ ہے؟“

”ابھی سوچا نہیں ہے لیکن ارادہ ہو بھی سکتا ہے۔“ حماد نے میری طرف دیکھا۔ ”آخر تم سے بھی شادی کی ہے۔“

”جو آپ کا احسان ہے۔“

”میں نے کہا تھا اس شادی کو تو جو چاہے سمجھو۔“

اس وقت مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے پھر مجھے شادی کا حوالہ کیوں دیا ہے۔ اس کی بات کا کیا مطلب تھا کہ اس نے مجھ سے بھی تو شادی کی ہے۔ گناہات ہے کہ مجھے یہ پتا نہ تھا کہ وہ شادی کا حماد کی اور لڑکی میں دل چسپی لے رہا ہے کیونکہ وہ اس سے بڑا دھچکا مجھے پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس کی مجھ سے محبت اور دل پہنچی صرف ایک دھچکا تھی۔ البتہ یہ تھا کہ ذاتی رویے کے علاوہ اس میں اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مگر کے معاملات میرے ہر تھے اور وہ پہلے کی طرح مجھے کھلا خرچ دیتا تھا۔ بلکہ اب اس نے یہ کیا کہ میرا اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا اور اس میں ایک ساتھ ہی ایک لاکھ روپے جمع کرادیے تھے۔ جو اس وقت اپنی خاصی رقم تھی۔ مگر مجھ سے بڑا نہ ہو گیا تھا۔ اپنی مرضی ہوئی تو پاس آتا تھا ورنہ نہیں۔ میرا خیال تھا کہ متاثر سے اس کا اظہار چلے گا۔ مگر چند منٹ بعد مجھے پورے غور سے اس کے معاملات میں اس نے متاثر سے ملنا چھوڑ دیا ہے اور وہ اس کے عکاس باتیں کرتی پھر رہی ہے۔ میں نے حماد سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

”وہ بس ایسے ہی تھی صورت ہی صورت اندر سے خالی تھی۔“ مجھے ایسی لڑکیاں زیادہ دیر پہلے ہی نہیں لگتی ہیں۔“

”اچھا تو اور لڑکیاں بھی ہیں۔“

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم کیا سمجھتی تھو کہ میں تم سے پہلے بھی لگی تھیں اور تمہارے بعد بھی لگی ہوں گی۔“ میں اس کی فطرت سمجھتی تھی وہ کسی ایک پرستار کے رکنے والا شخص نہیں تھا۔ میں اسے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ کوئی بھی کس کے سہارے، اپنے سارے سہارے میں رک کر چلی گئی۔ اب میرے پاس سوائے خاموشی سے

کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ حماد وہی کرتا جو اس کا دل کرتا۔ جیسا کہ اس نے میرے معاملے میں کیا تھا۔ میں تیرے سسٹری تیار کر رہی تھی کہ میری طبیعت خراب ہوئی۔ میں بھی شاید مجھے پہلے خراب ہوئی تھی اسی طرح اب بھی خراب ہوئی تھی۔ مگر ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو اسے معاملہ کچھ اور لگا اور اس نے حماد سے کہا کہ مجھے کسی گائی کو دکھایا جائے۔ حماد ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس نے شے ظاہر کیا کہ میں امید سے ہوں۔ اس نے ٹیسٹ لیا اور اگلے دن تصدیق ہو گئی کہ میں امید سے ہوں۔ یہ خبر سن کر مجھے خوش ہوئی تھی لیکن اتنی نہیں چٹکی ہوئی چاہیے تھے۔ یہ نہیں ہے کہ مجھے بچوں کی خواہش نہیں تھی بلکہ موجودہ صورت حال میں بچے نہیں چاہتی تھی۔ پر یہ خدا کی دین تھی۔

حماد بھی خوش تھا اس نے مجھ سے کہا کہ میں پورے غور سے چٹکی لے لوں۔ تیرا سسٹریسے کراؤ آخری سسٹریسے میں دے لوں مگر میں نے فیصلہ کیا کہ میں آخری سسٹریسے دے لوں گی۔ اس میں سات مہینے رہ گئے تھے۔ اگر میری طبیعت نے اجازت دی تو میں پچھڑوں کی روٹھیں۔ اس لیے میں پورے غور سے چٹکی مانی رہی۔ تیرے سسٹریسے معاملہ سبب رہا تھا۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ میری دوستوں کو بھی علم نہیں تھا حالانکہ وہ کئی بار پوچھ چکی تھیں کہ کیا تمہارا اولاد کا ارادہ نہیں ہے۔ جب میں نے ان کو یہی جواب دیا تھا کہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ پانچویں مہینے میں میرا جسم بھاری ہونے لگا تھا۔ اس سے دو لوگ کھٹک کھٹک میں سے بتا دیا کہ میں امید سے ہوں۔ وہ خوش ہو گئی تھیں۔ میرا خیال رکھنے لگی تھیں۔ یہاں قسمت نے میرا ساتھ دیا اور مجھے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا کہ میں فائل نہ دے پائی۔ فائل کے دو مہینے بعد سٹریسے کی پیدائش ہوئی تھی اور جب پہلی بار اس حوالے سے حماد کا موڈ خراب ہوا کیونکہ اس کی خواہش لڑکے کی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”ہمارے ہاں ہمیشہ پہلے لڑکا ہوتا ہے۔“

”آپ کے ہاں کوئی قسم ہوگا کہ پہلے لڑکا ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے علم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”تو اس مت کرو۔“

”قالا بھی بکواس ہے کہ اولاد مرد کی تقدیر سے ہوتی ہے۔ جب ہی مرد کی کہلاتی ہے۔“

”تم کیا سمجھتی ہو اگر تم بیٹی پیدا کرو گی تو مجھے بیٹا نہیں

ملے گا۔“

”آپ کی تقدیر میں ہوگا تو ضرور ملے گا۔“

”وہ میری تقدیر میں ہے اور مجھے مل چکا ہے۔“ حماد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میں چونک گئی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب واضح ہے ایک تم ہی نہیں ہو جو مجھے اولاد دے سکتی ہو۔“

”میں سن ہو گئی تھی۔“ حماد آپ نے دوسری شادی کی ہوئی ہے؟“

”ہاں لیکن تم سے۔“ وہ خصوصیات اعزاز میں بولا۔ ”بیکل تم میری دوسری بیوی ہو۔ میری پہلی بیوی جو میری کزن بھی ہے جو کئی میں ہے اور میرے دوستوں کی ماں ہے۔“

”آپ نے مجھے یہاں بھی دھوکا دیا ہے؟“ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے پاس ایک سبکی تو تھا ورنہ کیا تھا کہ حماد کسی ایسی ہے تو میرا۔ باہر دوستیاں بھی کرتا ہے جب بھی آتا میرے پاس ہے۔ اس نے مجھ سے یہ انتظار بھی سمجھ لیا تھا۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور میں اس کی دوسری بیوی تھی۔ وہ مجھ سے اپنے گھر والوں کو نہیں پہچانی ہوئی کو چھپاتا تھا مگر آج اس نے خود بتا دیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کے دو بیٹے بھی ہیں۔ اسے میرا طبع برا لگا کہ اولاد مرد کی قسمت سے ہوتی ہے اسی لیے وہ یہ راز کھول گیا۔ اس نے زہر لے لے لے میں کہا۔

”تم جو چاہے سمجھو اور اب تم کو پتا چل گیا کہ میری نہیں ہے تمہاری قسمت ہے۔“ اس نے ایک نظر سٹریسے کو دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ میرے پاس سوائے آنسو بہانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسپتال سے واپس آنے تک میں سوچتی رہی اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ لیکن اس سے

اگے ہونے سے پہلے میں خود کو مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے رزلٹ آتے ہی میں نے ایم ٹی میں داخلہ لیا۔ اس میں یہ آسانی تھی کہ روز جانا نہیں پڑتا تھا اور میں سٹریسے کو بھی دیکھ سکتی تھی۔ دوسرے حماد مجھے جو بتا تھا اب اسے خرچ کرنے کے بجائے میں اپنے اکاؤنٹ میں ڈال رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد میں نے اس سے مطالبہ کیا کہ یہ

کوئی میرے نام کی جائے۔

”کیوں کیا مسئلہ ہے تم روتی ہو؟“

”ہاں لیکن اگر تم اچانک دنیا سے رخصت ہو جاؤ تو تمہارے گھر والے مجھے اور میری بچی کو کھنے مار کر یہاں سے نکال دیں۔ ہاں باپ کے گھر کا دواؤں میں ہمیشہ کے لیے بند کر کے آتی تھی تو کیا میں اور میری بیٹی سڑک پر چا کر بیٹھیں گے؟“

یہ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ میں نے بتایا کہ میرے کے معاملے میں وہ جواب تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”یہ کوئی میں تمہارے نام نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے باپا کے نام پر ہے۔“

”تمہارے گھر والے میرے بارے میں جانتے ہیں۔“

”خاطر ہے ایسا کہیں ہو سکتا ہے کہ وہ لاعلم ہوں لیکن تم میرا مسئلہ ہوان کا کوئی حل نہیں ہے۔“

مجھے خیال آیا کہ وہ کوئی میرے نام کرنا نہیں چاہ رہا ہے اس لیے جھوٹ بولا ہے لیکن ایک سال بعد اس نے اسی علاقے میں ایک نیپا چھوٹی کوئی لے کر وہ سٹیل کے نام کر دی تھی اور اس کے کاغذات میرے حوالے کر دیے۔ ”یہ لو اب مجھے کچھ ہوا بھی تو تم دونوں بے سہارا نہیں ہو گے۔“

یہی نہیں اس نے ایک اکاؤنٹ سٹیل کے نام سے کھولا اور اس میں پانچ لاکھ روپے جمع کرائے تھے اس کے بعد بھی وہ دھنا فوٹا اس میں رقم جمع کرنا رہتا تھا۔ جب میں اس سے الگ ہوئی جب بھی اکاؤنٹ میں رقم آتی رہی۔ ایم فل کے بعد میں نے ایک کرٹر گورنمنٹ کالج میں پچھری آسانی کے لیے اپنا لیا کیا تھا۔ عہدے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سٹیل دو سال کی ہونے والی تھی اب وہ میری فیڈ کے ساتھ اوپر کی غذا بھی پیتی تھی۔ اس کے لیے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی وہ اس مانوس تھی اس لیے میں اسے چھوڑ کر جاسکتی تھی۔ مزید دو سال بعد میری جاب چلی ہوئی اور گھڑا بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اب عہدے سے الگ ہو کر رہ سکتی تھی اور میں نے اس سے قطع کا مطالبہ کر دیا۔ وہ شاید پہلے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ میں نے اپنا بیڈروم سٹیل کی بیدار کش کے بعد ہی الگ کر لیا تھا اور اس کے دروازے اس پر بند تھے۔

جب ہمارے درمیان میاں بیوی والا رشتہ ہی نہیں رہا تھا تو پھر ساتھ رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے میرا مطالبہ مان لیا اور مجھے طلع سے دی میں سٹیل کے نام کی کوئی میں شفت ہو گئی۔ میرے پاس تقریباً میں لاکھ روپے

تھے جو میں نے انھیں لپھاڑ کر دے دیے۔ میری بیوی تو تھی اور پھر عہد سٹیل کے اخراجات کے لیے ماہانہ رقم دیتا تھا اس سے ہمارا گزارا بہت آسانی سے ہو جاتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی لیکن نئی کار بھی لے کر دی تھی۔ مجھے ڈرائیونگ کی بھی مگر سے بہت سہولت ہو گئی۔ جو ملازمہ سٹیل کو سنبھالتی تھی میں اسے ساتھ لے آئی۔ کچھ عرصے بعد اس کی شادی ہوئی تو میاں بیوی دونوں کو کوئی کار ورنٹ کو وارنٹس دیا۔ اس کا میں ایک ہوٹل میں کلک تھا۔ سٹیل اسکول جانے کی عمر کو پہنچی گئی تھی اسے ایک ایسے اسکول میں داخل کر دیا۔ جس کا کافی جانتے ہوئے اسے اسکول چھوڑتی تھی اور وہاں سے ملازمہ اسے لے آتی تھی۔ پھر میں نے اپنی کلاسز کی سٹیف اس طرح کر لی کہ میں ایک بچے تک آف کر جاتی تھی اور جب میں خود سٹیل کو اسکول سے لائے لگی۔ جب تک ملازمہ اسے لاتی رہی، مجھے اطمینان نہیں ہوا تھا۔

جب میں نے عہدے سے قطع مانگی تو میرا خیال تھا کہ وہ مجھے شک کرے گا اور شاید مجھے عدالت سے قطع بھی کر دے لیکن اس نے آسانی سے طلع سے دی۔ پھر سٹیل اور اس کے اخراجات کے حوالے سے بھی مجھے پریشان نہیں کیا۔ کچھ عرصے سے بڑھ کر دیا۔ میری کچھ میں آج تک نہیں آیا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ ایک طرف تو اس نے میری حرمت کا خیال رکھا اور مجھے شادی کر کے عزت سے حاصل کیا، دوسری طرف چھ دنوں میں مجھ سے یوں لاپرواہ ہو گیا جیسے میں کوئی شے تھی جسے اس نے لاکر کوئی میں ہا دیا تھا اور اب اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ ذاتی رو سے بہت گراں اس نے مجھے بھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ میں نے بھی اس کے منہ سے گالی یا تہذیب سے گھرے الفاظ نہیں سنے اور نہ ہی اس نے بھی مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں اس سے ٹوٹی جب بھی وہ ایک حد میں رہ کر جواب دیتا تھا۔ مالی لحاظ سے بھی اس نے بھی پریشان نہیں کیا مجھے ہمیشہ میری توقع سے بڑھ کر دیا۔

اسے مجھ سے محبت نہیں تھی اور نہ ہی میں اپنی جین تھی کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہو جاتا۔ میری کچھ میں اس شادی کی ایک ہی وجہ آتی تھی، میں نے اسے شروع میں نظر انداز کرنے کے وجوہ سے کیے تھے۔ شاید اس کی انا کو نہیں پہنچی تھی اور وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ جب تک اس نے مجھے حاصل نہیں کر لیا اسے جین نہیں آیا۔ میں اس کی محبت نہیں اس کی منہ کی اور جب اس نے اپنی ضد پوری کر لی تو میری کوئی شیت

نہیں رہی۔ اس نے مجھے ایک طرف ڈال دیا۔ اسی لیے جب میں نے اس سے قطع مانگی تو اس نے بتا کر شرط یا مزاحمت کے مجھے طلع سے دی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے مجھ سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ طلع کے شروع دنوں میں میں بہت مضطرب رہی تھی۔ سوچیں میرے ذہن پر وہ رو کر عدا کرتی تھی اور پریشانی کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آتی تھی اس لیے میں فینڈ کی دوائی لے لگی تھی پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس لیے میں نے خود پر قابو پایا اور بالآخر سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ چند مہینے میں زندگی سیٹ ہو گئی اور میں سکون سے اپنے معمولات گزارتی تھی۔

سٹیل چار سال سے اوپر کی تھی جب میں نے عہدے سے قطع لیا۔ وہ باپ کے قریب نہیں تھی لیکن اس سے مانوس ضرور تھی اس لیے جب ہم الگ ہوئے تو وہ کئی دن بے چین رہی تھی اور بار بار مجھ سے پوچھتی رہی تھی کہ ہم واپس اپنے گھر کب جا سکیں گے۔ میں ہمیشہ اسے یہی جواب دیتی کہ اب یہی ہمارا گھر ہے۔ پھر اسے اعزاء ہو گیا کہ اب ہمیں یہیں رہنا ہے تو اسے میری طرح قرار دیا گیا تھا۔ اسکول میں داخل کر لیا تو اسے ہی مصروفیت ملی اور وہ عدا کو تقریباً بھول گئی

تھی۔ پہلے میں دیکھی ہوئی تھی، مگر کے ماحول کی وجہ سے بہت کم بستی سکرانی تھی۔ اب وہ ماحول میں رہا تو میں سٹیل کے ساتھ کھینے اور بیٹنے بولنے لگی تھی وہ اس پر بھی بہت خوش تھی۔ کچھ عرصے میں اس کا پسینہ والوں سے ہمارا ملنا جلنا ہوا تو سٹیل کی کئی سہیلیاں بن گئیں اور اب وہ شام کو ان کے ساتھ کھاتی تھی۔

میں نے اسے عصر سے مغرب کے درمیان باہر جانے اور لڑکیوں کے ساتھ کھینے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد اسے پہلے ایک خاتون قرآن شریف پڑھانے آتی تھی پھر ایک لڑکی ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ شام کے بعد وہ میرے ساتھ ہوتی۔ میں شام کو کھانا بناتی تھی۔ کئی

کانٹینر ریڈی میٹ ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا ملازمہ بناتی تھی۔ یہ بھی سادہ ہوتا تھا البتہ شام کو اور کچھ خاص بنانا ہوتا تو میں خود بناتی تھی۔ کھانے کے بعد ہم لاونج میں بیٹھتے۔ میں اگلے دن پچھڑ کی تیاری کرتی اور وہ اسکول کا ہوم ورک کرتی۔ دس بجے تک ہم سونے کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ اس وقت تک سٹیل بی بی وی آگیا تھا مگر میں نے نہیں لگوایا کیونکہ اس میں سارے ہی اپڈین اور انکس جھلک آتے تھے

جاسوسی ڈائجسٹ

جولائی 2014ء سے سہ ماہی کی اپنی اپنی جاسوسی کے شمارے کی بارہ خوشیوں

آتش زما ● چھ دنوں... پر فریب باتوں اور قتل کی وارداتوں میں ملوث کرداروں کی انجینئری... **امجد رفیس کے قلم سے**

آوارہ گرد ● دیکھ سکتے تھے کہ انہیں کی ایک نئی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنا کار کا معاوضہ تھا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز بھٹائی کی شہریت

جوازی ● احمد اقبال کے شہر کا قلم تھیں ایک جوازی کے سٹیل کے سٹیل کے سٹیل

محبوب کے بالے انداز ● مغربی نیکی کی نیکی انہوں کی دکان اور محبت کی پڑھنا تھا قتل کی شہریت

سزورق کی کھانیاں ● شادی اور تہذیب کی سنگت میں پروان چڑھتی محبت کی زور و آوری

پہلی کھانی ● خوف و وحشت کی دلدل میں وحشت والوں کا المیہ

دوسری کھانی ●

آپ کے تجربے...
ملوث...
اور قتل کی شہریت... کھانیاں

اور وہ بچوں کے لحاظ سے بالکل مناسب نہیں تھے۔ ایشیا سے لی لی وی اور ایس بی این دو کچھ لیتے تھے۔ پالی لی وی کے کچھ ٹیبل جو ایشیا سے آتے تھے۔

لاشوری طور پر میں سٹیل کی وہ پرورش کر رہی تھی جو مجھے لی تھی اور اندر سے میری خواہش تھی کہ وہ میرے نقش قدم پر نہ چلے۔ اس لیے میں نے کمر کا محول بھی ایسا رکھا تھا۔ لیکن میں بھول گئی تھی کہ سوسائٹی کی اپنی تربیت ہوتی ہے۔ آپ جہاں رہتے ہیں اگر وہاں لوگوں سے ملتے ملتے ہیں تو آپ خود بہ خود ان کے معیار اپناتے جاتے ہیں۔ بڑوں کے مقابلے میں بچے کبھی زیادہ اثر قبول کرتے ہیں۔ ایسا ہی سٹیل بھی کر رہی تھی۔ وہ جس اسکول میں پڑھتی تھی وہاں سارے بچے پالی سوسائٹی کے آتے تھے۔ وہ ان میں ملتی تھی اور کھاتی تھی ان کی باتیں سنتی اور انہیں ذہن نشین کرتی تھی۔ اسی طرح اسے کھٹی کے آس پاس بھی پالی سوسائٹی کا محول ملا ہوا تھا تو میری تربیت کے ساتھ ساتھ اس نے یہ سب سیکھا۔ شوری طور پر وہ میری کھٹی تھی جو میں نے اسے سکھایا تھا لیکن لاشوری طور پر وہ سوسائٹی کی تربیت پر عمل کرتی تھی۔ جب وہ ساتویں کلاس میں تھی تو اس نے کھٹی پار ایک لڑکے کو دوست بنایا اور باقاعدہ مجھ سے ملوایا۔

”ماما... میرے دوست انگریز تھے۔“
انگریز تقریباً سٹیل کا ہم عمر اور چھوٹا نظر آنے والا دیکھا جاتا سا لڑکا تھا اس لیے مجھے اس دوستی میں کوئی قیامت نظر نہیں آئی لیکن میں نے بعد میں سٹیل کو سمجھایا کہ وہ اب بڑی ہو رہی ہے اور اسے لڑکوں کے بجائے لڑکیوں کو ہی دوست بنانا چاہیے۔ اس نے فرما دیا وہ داری سے کہا۔ ”ٹھیک ہے ماما اب میں کسی لڑکے کو دوست نہیں بنائوں گی لیکن انگریز تو میرا دوست بن گیا ہے نا۔“
”انگریز اچھا لڑکا ہے مگر آپ اس سے بھی ایک فاصلہ رکھو۔“

سٹیل جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن ابھی میں اسے بہت سی باتیں مل کر سمجھا نہیں سکتی تھی۔ قد کاٹھ اور حسن و کجاش میں وہ باپ پر لگی تھی۔ ابھی سے بہت ہی پیارے نقوش تھے۔ جسم بھرا بھرا تھا اور وہ جولیاں پہنتی اس پر بہت اچھا لگتا تھا۔ میں روز اس کی نظر اتارتی تھی۔ وہ میرے کہنے پر دوپٹے لٹے گی کھٹی اگرچہ انداز لاپرواہانہ ہوتا تھا مگر یہ بھی نصیحت تھا کہ وہ دوپٹے نہ لٹے گی۔ کھٹی مجھے لگتا کہ وہ حرات میں بھی باپ پر لگی ہے۔ اس میں ایک طرح کا احتاد

اور خود پسندی تھی۔ اپنے معاملے میں وہ ذاتی رائے کو اہمیت دیتی تھی۔ اگر میری بات اس کی رائے کے خلاف ہوتی تو وہ یہ مشکل ہی اسے مانگتی تھی مگر ساتھ ہی وہ مجھ سے بحث و مکرر سے کر رہی تھی بالکل اپنے باپ کی طرح اور بعد میں کھٹی اپنی من مانی کر جاتی تھی۔ جیسے جیسے وہ جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی اس میں یہ احساس اور خود پسندی بھی بڑھ رہی تھی۔ میری ترقی ہو گئی تھی اور اب میں سینئر لیجر ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ میں بھی شامل تھی اور کانچ رجسٹرار بھی تھی۔ اس لیے وہ پہر ایک بچے کو بخشی والی رعایت ختم کر دیتی تھی۔ اب میں تین بیٹے باقی اسٹاف کے ساتھ ہی آف کرتی تھی اس لیے سٹیل کے لیے اسکول کی دین لکھوا دی اور وہ دین میں آتے جاتے تھی۔ اس کے بڑے ہونے کے بعد مجھے اس کی اتنی فکر نہیں رہی تھی۔ اسکول دین اسے کھٹی کے دروازے سے لیتی تھی اور وہاں ہی میں دروازے پر اتارتی تھی۔ ملازمہ گھر میں موجود ہوتی تھی۔ جب میں کانچ سے آتی تو وہ اپنے معمولات میں لگی ہوتی اور جب شام کو فارغ ہوتی تو ہم ماں بیٹی ساتھ وقت گزارتے تھے۔

ملاویدھ کی کچھ مہینے بعد ہی وہاں چلا گیا۔ اس کا ماسٹر مکمل ہو گیا تھا اور اس کے بعد وہ سال میں ایک بار آتا جب سٹیل کی سالگرہ ہوتی وہ اس سے ملتا اور اس کے لیے تحفے کا تحفہ لاتا تھا اسے باہر لے جا کر شاپنگ کراچ اور سٹیل دو تین دن اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے خوشی ہوتی تھی کہ سال میں ایک بار کسی اسے باپ کا پیار اور توجہ دیتی تھی۔ میں نے سٹیل کو بھی بتایا کہ اس کے باپ نے اسے سترہ کروڑ کا تھا اس کی طرح جب وہ بڑی ہوئی تو ملاوے بھی اپنے روپے سے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ اسے بیٹی پسند نہیں ہے۔ وہ اس سے بہت زیادہ محبت تو نہیں کرتا تھا لیکن اسے توجہ دیتا اور اس کی فرمائشیں پوری کرتا تھا۔ اب وہ آتا تو میں اس کے اعزاز میں بیٹی کے لیے محبت محسوس کرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی واحد بیٹی تھی۔ پہلی بیوی سے اس کے مزید دو بیٹے ہوئے تھے مگر کوئی بیٹی نہیں تھی۔ شاید اسی وجہ سے اب وہ سٹیل کی طرف زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ وہ سٹیل کے اکاؤنٹ میں چور چور جمع کرتا تھا میں اسے بہت ضرورت کے وقت ہی چھینتی تھی اس لیے وہ رقم مسلسل بڑھتی رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ رقم اس کی اعلیٰ تعلیم اور پھر شادی پر خرچ ہو۔ گزراے کے لیے میری نواہ اور کس لپازٹ سے آنے والی آمدنی کافی تھی۔ میں نے

آمدنی اور اخراجات میں ایک توازن رکھا تھا جس سے مجھے آسانی ہوئی تھی۔
سٹیل جس اسکول میں تھی وہ اسے لیول تک تھا۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے خاصا قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ اب وہ نوجوان لڑکی لگنے لگی تھی۔ اس لیے میں اسے سمجھانے لگی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ میری بات غور سے سنتی تھی اور مجھے یقین دلاتی کہ وہ اس پر عمل کرے گی۔ اب وہ انگریز سے ایک حد میں رہ کر ملتی تھی اور وہ بھی بس باتوں کی حد تک۔ وہ نہ تو اس کے ساتھ کھاتی تھی اور نہ اس کے گھر جاتی تھی۔ اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ سٹیل میری بات سمجھ رہی ہے اور اس کے مطابق عمل کر رہی ہے۔ سولہ سال میں اس نے اے لیول کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور اسی لیے اسے اچھی پونہ دینی میں آسانی سے داخلہ مل گیا جہاں داخلہ آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ یہاں صرف مارکس ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ یہاں داخلے کے لیے مالی طور پر مضبوط ہونا بھی ضروری تھا اور سٹیل کے لیے مخصوص اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ وہ آرام سے ماسٹر تک پڑھ سکتی تھی۔ اس نے بیو مین ریپورس میں بی بی اے آنرز کا انتخاب کیا تھا۔

مگر جب سٹیل نے انگریز کو مجھ سے ملوایا اور اس میں اپنی والہانہ دل نبھائی تو کبھی نہیں چھپایا تو میں پریشان ہو گئی تھی۔ اتفاق سے انگریز کا تعلق بھی جنوبی پنجاب کے ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ وہ بھی تعلیم کے لیے لاہور آیا تھا اور سٹیل کے شے میں تھا۔ ظاہر ہے وہ پہلے سے پڑھ رہا تھا لیکن اس کے اور سٹیل کے درمیان راہ و رہیل حال میں ہی پروان چڑھا تھا۔ سٹیل کو میری طرح قانون آرٹس سے دل چسپی تھی اور اس نے پونہ دینی میں ایک ڈرامے میں کوئی کردار ادا کیا تھا۔ انگریز بھی اس ڈرامے میں شامل تھا اور دونوں میں وہیں سے سٹیل ملاقات ہوئی تھی۔ جب سٹیل معاملہ میرے علم میں لائی وہ دونوں محبت کے تمام مراحل طے کر چکے تھے اور ایک دوسرے کا ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کس حد تک ایک دوسرے کے پاس آچکے تھے۔ اس لیے جب سٹیل نے مجھ سے عمل کر بات کی اور اس نے اقرار کیا کہ انگریز سے محبت کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ جب میں نے ڈھکے پیچھے انداز میں پوچھا کہ اس محبت میں وہ ان حدود کو پار تو نہیں کرتی جن کے بارے میں میں اسے شروع سے سمجھاتی آئی

تھی۔ سٹیل شرم سے سرخ ہو گئی تھی اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ”ماما کبھی باتیں کر رہی ہیں ہم کبھی اکیلے میں نہیں ملے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یہ تم نے اچھا کیا سٹیل روتہ... خیر یہ بتاؤ کہ کیا وہ سمجھ رہے؟“
اس بار سٹیل شرمائی نہیں مگر اس نے زیادہ برا متایا تھا۔ ”ماما وہ سمجھ رہے ہیں تو بات یہاں تک پہنچی ہے۔“

”ابھی تم پڑھ رہی ہو اور آنرز مکمل ہونے میں بھی ڈھائی سال کا وقت ہے۔ اس کے بعد ہی میں تمہاری شادی کا سوچ سکتی ہوں۔“
وہ بے چہن ہو گئی اور اس نے بے ساختہ کہا۔ ”ماما وہ اتنا انتظار نہیں کر سکتا ہے۔“

”کیونکہ اس کی ڈگری مکمل ہونے والی ہے؟“ میں نے پھر کیا۔ ”اسے اپنی تعلیم کی گھر ہے تمہاری تعلیم کی گھر نہیں ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے ماما۔“
”نہی بات ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم جانتی ہو میں تعلیم کو کتنی اہمیت دیتی ہوں۔ اب میرا ارادہ لی انگریز ڈی کرنا ہے۔“

”ماما تعلیم انسان اپنے لیے حاصل کرتا ہے۔“ اس نے دبے لہجے میں کہا۔ ”تو وہ بھی کبھی حاصل کر سکتا ہے آپ نے بھی تو شادی کے بعد ماسٹر مکمل کیا تھا۔“
بات مجھ پر آئی تو میں کھنکھائی۔ سٹیل نے چالاکی سے بات مجھ پر رکھ دی تھی۔ میں نے سٹیل کو کہا۔ ”لیکن اس سے مجھے جو دشواری پیش آئی وہ میں ہی جانتی ہوں، تم میرے پیٹ میں نہیں اور میں نے فائل دیا تھا۔“
”ماما ضروری نہیں ہے جو آپ کے ساتھ ہوا وہی میرے ساتھ بھی ہو۔“ سٹیل کا لہجہ اچانک بدل گیا اور میں اس بدلے ہوئے لہجے کو خوب بیکار رہی تھی۔ کیونکہ کبھی میرا بھی لہجہ اپنے گھر والوں سے ایسا ہی بدل گیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں ان کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ ایک بار میں بہت کر کے اپنے گھر تک گئی تو مجھے پتا چلا کہ ای ایو کا انتقال ہو گیا تھا اور میرے بھائی وہ مگر حج کر گئے جا چکے تھے۔ بہنوں کا پتا تھا مگر میں ان کے سامنے جانے کی بہت نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دھکا دیں گی۔ ماں باپ نہیں رہے تھے جو اولاد کی ملٹی بہر صورت معاف کر

ی دیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ تاریخ پھر دہرائی جائے۔ میں سنبھل کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتی تھی جو میرے گھروالوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اس معاملے کو اس طرح وینڈل نہ کروں جیسے میرے گھروالوں نے کیا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو چنانچہ لیکن پھر بھی یہ بہت جلدی ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ابھی مجھے اس سے ملنے دو۔۔۔ پھر تمہارے باپا بھی نہیں کے اور تم جانتی ہو اصل فیصلہ تو انہوں نے کرتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں میرا فیصلہ اکبر ہے۔“

”ایسا کرو تم اسے یہاں بلاؤ تب تک میں تمہارے باپا سے بھی بات کر سکتی ہوں۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”اب میں اس سے تمہارے نقطہ نظر سے ملوں گی اور بات کروں گی۔ پہلے تو میں اسے تمہارا کوئی کچھ بھیجی تھی۔“

اس کے چہرے پر امید آئی اس نے جتنی لہجے میں کہا۔ ”پلیز بایا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”میں سمجھتی ہوں میری جان، میں نے تمہارے باپا سے پندہ کی شادی کی تھی اس لیے میں تمہاری کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ تم بے فکر ہو، تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔“

سنبھل خوش ہو گئی کہ میں مان رہی تھی۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ صاف لگ رہا تھا وہ وہی غلطی کرنے جا رہی تھی جو میں نے کی تھی اور اس کا انجام وہی ہوتا تھا جو میرا ہوا تھا۔ عہدہ اتنا بڑا کسی لیکن اس نے میرا استحصال یوں نہیں کیا تھا کہ میں کہیں کی نہ رہتی۔ پھر اس نے میرے اور سنبھل کے لیے سب کیا۔ ہماری مالی سیوری کی۔ ضروری نہیں تھا کہ اکبر بھی ایسا ہی لکھا۔ مجھے اس سے سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ سنبھل پر دوبارہ ڈال کر شادی سے پہلے سب کچھ نہ کر گزیرے۔ شاید اس صورت میں وہ پلٹ کر سنبھل کو پوچھتا بھی نہیں اور وہ برباد ہو جاتی۔ اس لیے جہاں میں ایک طرف سنبھل کو دل لاس رہی تھی کہ اس کی خواہش پوری کروں گی دوسری طرف اسے وہ بے لنگھوں میں سمجھا رہی تھی کہ اپنی حرمت کا خیال رکھے۔ کسی کمزور چہ نہ ہائی جسے آ کر اس نے اسے ٹھونڈا یا تو پھر وہ بے وقاحت ہو کر رہ جائے گی۔ وہ بھی سن لیتی اور بھی انتہاں بن جاتی۔

وہ اکبر کو لے کر آئی۔ میں نے اسے ڈنکر پر بلا دیا اور اس دوران میں نے اس سے اس کے ہاتھ میں رکھنے والی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اکبر کو بھی میں نے یہی تاثر دیا کہ وہ مجھے پندہ آیا ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ سنبھل کم سے کم آئز مکمل کر لے اس کے بعد میں اس کی شادی کروں۔ اکبر نے بھی وہی جواب دیا کہ تعلیم تو شادی کے بعد بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ سنبھل نے کون سے گھر کی ڈسٹ داریاں سنبھائی ہیں۔ وہ بڑھ چکی تھی۔ میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ اس شادی کے لیے اس کے باپا کی مرضی ضروری ہے۔ اس پر اکبر کے جوتا اثرات آئے تھے مجھے لگا اسے یہ بات پندہ نہیں آئی ہے اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اسے کنبے کی ضرورت نہیں تھی، سنبھل اس کی مٹی میں بھی۔ دوسری چیز جو میں نے بہت واضح محسوس کی کہ وہ سنبھل سے تنہا نہیں تھا۔ یہ تم نہیں تھی اسے صرف سنبھل کے حسن اور جوانی سے دل چسپی تھی۔

ایک مہینے بعد عہدہ نے آتا تھا کیونکہ سنبھل کی اٹھارویں سالگرہ تھی۔ مگر میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ سنبھل کے پاس اس کا موبائل نمبر تھا۔ میں نے ذرا بھی دیکھا اور نہ کبھی مالا تھا۔ مہینے میں ایک دو بار عہدہ سے کال کر لیتا تھا یا وہ اسے کال کرتی تھی۔ میں نے چپکے سے اس کے موبائل سے عہدہ کا نمبر نکالا اور اگلے دن اسے کال سے کال کی۔ صبح کے بعد یہ میرا اس سے پہلا ان خود رابطہ تھا اس لیے وہ میری آواز سن کر ڈرا حیران ہوا تھا۔ ”ایسل ٹم؟“

”ہاں میں۔۔۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیسی مدد کی۔“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”عہدہ تم چاہتے ہو کہ جو تم نے میرے ساتھ کیا وہی کوئی دوسرا تمہاری جگہ پر کرے؟“

اسے ایک لمحے کو چپ گئی تھی پھر اس نے کہا۔ ”ہوا کیا ہے کل کہ بات کرو۔“

میں نے اسے کل کہ بتایا کہ اس کی بیٹی بھی اسی راوی پر چل گئی ہے جس پر بھی میں چلی تھی۔ اس نے میرے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کیا تھا۔ لیکن اکبر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سنبھل کو صرف مطلب برائی کے لیے استعمال کرے گا اور پھر اسے ایک طرف پیچ کر بھول جائے گا۔ وہ میری طرح مضبوط بھی نہیں تھی اور جتنی بات سے جو میں نے کیا تھا میرے ساتھ اتنا برا بھی نہیں ہوا تھا۔ سنبھل نہیں سن سکی۔ دوسری طرف وہ میری طرح خند پر آ چکی تھی اور کوئی بات

سننے کو تیار نہیں تھی۔ عہدہ نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ ”تم چاہتی ہو کہ میں اس سے بات کروں؟“

”وہ تمہاری نسبت میری زیادہ بڑی ہے لیکن وہ بالکل چار نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس لیے کال کی ہے تم اکبر کے حوالے سے کچھ کرو۔“

”میں کیا کروں؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اسے اکبر جلال کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ ”اس کا تعلق بھی جنوبی پنجاب سے ہے اور بیچ اس کا خاندان بہت معروف ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو اور کوئی ایسا پوائنٹ تلاش کرو جسے سنبھل کے سامنے رکھ کر میں اسے اس غلطی سے باز رکھ سکوں۔ تو سنبھل میری طرح سے اور نہ اکبر تمہاری طرح۔ مجھے ڈر ہے کہ سنبھل سے کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے جس کے بعد وہ ہم سے انھیں ملانے کے قابل بھی نہ رہے۔“

عہدہ دل میں کیا تھا ہی نہ کہا۔ ”تم فکر مت کرو میں مجھ گیا۔ اب میں اسے دیکھ لوں گا۔“

میرا نہیں خیال تھا کہ عہدہ اسے کسی اور طرح سے بھی دیکھے گا۔ دو دن بعد سنبھل گھر میں تھی۔ ایک اس کے کمرے سے روٹنے اور چلانے کی آواز آئی۔ میں بھاگی تو وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ ”سنبھل کیا ہوا خیریت ہے نا۔۔۔ کسی کی کال تھی؟“

”ماما۔۔۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”اکبر کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے وہ اسپتال میں ہے۔“

”اللہ خیر کرے۔“ میں نے کہا اور میرا ذہن فوراً ہی عہدہ کی طرف گیا تھا، اس نے کہا تھا کہ وہ اسے دیکھ لے گا۔ سنبھل نے اسپتال کا بتایا تو میں اسے ساتھ لے کر روانہ ہو گئی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ خود چلی جاتی۔ اسپتال پہنچ کر پتا چلا کہ اکبر ایک مارکیٹ میں اپنی گاڑی سے اترا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی اسے ٹکر مارتی گزرتی۔ یہ حادثہ تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور سر بھی متاثر ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگ کا آپریشن کر دیا گیا تھا۔ وہ خطرے میں نہیں تھا مگر اسے دو ہفتے تک اسپتال میں رکھنا تھا۔ اسے بے ہوش دیکھ کر سنبھل خود بے ہوش ہونے لگی تھی لیکن چکی بات ہے مجھے اطمینان ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام عہدہ نے کر لیا تھا۔ سنبھل کے

بارے میں جان کر وہ بے چین ہو گیا تھا وہ اس کی بیٹی اور اس کی عزت تھی وہ ہرگز پندہ نہیں کرتا کہ کوئی اس کی عزت سے کھیل کر چلا جائے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید اکبر زندہ نہیں ہوگا مگر اس کی حالت دیکھ کر مجھے لگا کہ کوئی امکان عہدہ نے اسے سنبھل سے دور رکھنے کا بندوبست کیا تھا۔

سنبھل آنے کے لیے تیار نہیں تھی، میں اسے یہ مشکل دواہن لائی کیونکہ اس کے گھر والے آنے والے تھے اور سنبھل کا ان کے سامنے آنا مناسب نہیں تھا۔ یہ بات سنبھل بھی سمجھتی تھی کیونکہ اس کے مطابق اکبر اپنے گھر والوں سے چھپ کر اس سے شادی کرتا۔ اس کے خاندان میں باہر شادی کا رواج نہیں تھا۔ بہت مجبوری میں رشتہ کیا جاتا تو صرف ہم ملے خاندان میں اور وہ بھی لڑکی کا رشتہ کیا جاتا تھا، دایمی غیظوں کو وہ گھر بٹھا کر بڑھا کر دیتے تھے مگر ان کا کہیں رشتہ نہیں کرتے تھے۔ اسی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس ذہن کے لوگ ہوں گے۔ میں نے اسی رات جب سنبھل سو گئی تو عہدہ سے رابطہ کیا اور اس سے اکبر کے بارے میں پوچھا تو اس نے اعتراف کر لیا کہ یہ اسی کا کام تھا اور اس نے اکبر کو سنبھل سے دور رکھنے کے لیے کیا تھا۔ کرنے والے پر خوش لوگ تھے ان سے جتنا کہا گیا تھا انہوں نے انتہا کیا تھا۔

”میں مہلت چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا پوائنٹ تلاش کر سکوں جس کا تم نے کیا تھا۔“

”اب مجھے اطمینان ہے سنبھل اس سے محفوظ رہے گی۔“

”تم فکر مت کرو اگر یہ ایسے نہیں مانتا تو دوسرا راستہ بھی ہے۔“ عہدہ کا لہجہ مٹی خیز ہو گیا۔ ”اگر ایک حادثہ اسے ڈنکی کر سکا ہے تو کسی دوسرے حادثے میں وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت بھی ہو سکتا ہے۔“

”نہیں اس کی فوری تدابیر نہ آئے تو بہتر ہے۔“ میں نے گہرا کر کہا تھا۔ ”سنبھل کو لگتا ہو گیا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“

”اسے شک نہیں ہوگا میں جن سے کام لوں گا وہ مکمل کام کرتے ہیں شک مجھے کی گنجائش نہیں چھوڑے۔“

ایک ہفتے بعد اکبر اپنے بچنے پر مکمل ہو گیا مگر وہ ابھی بیلہ پر تھا اور اس کے پاؤں کا زخم سینے میں جا کر ٹھیک ہوتا۔ اگر وہاں اس کے رشتے دار نہ آئے ہوتے تو سنبھل وہاں جانے کے لیے تیار تھی۔ خود اکبر نے اسے روک

دیا کہ وہ نہ آئے ورنہ اس کے گھر والوں کو سنبھل کے بارے میں پتا چلی گیا تو ان کی شادی مشکل ہو جائے گی۔ جب سنبھل مافی تھی۔ وہ چٹاپی سے انتظار کر رہی تھی کہ اکبر کے گھر والے واپس جائیں تو وہ اس کے پاس پہنچ جائے اور میں اسے وہاں اکیلے میں جانے کی اجازت دیتے کو تیار نہیں تھی ساتھ ہی یہ بھی جانتی تھی اسے روکا تو وہ بغاوت پر اتر آئے گی۔ میں شدت سے شکر تھی کہ عمار کچھ معلوم کرے تاکہ میں سنبھل سے اس بارے میں دو ٹوک بات کر سکوں۔ اس حادثے کے تقریباً تین مہینے بعد ایک شام سنبھل نے خوشی سے مجھ سے ہونے بچھے بتایا کہ کل اکبر کے گھر والے واپس چلے جائیں گے اور وہ اس سے مل سکے گی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”ماما میں یونہی دہلی سے اس کے پاس جاؤں گی۔“
”بیٹا یہ مناسب نہیں ہے وہاں اکیلا رہتا ہے۔“
”کیا مناسب ہے اور کیا نہیں۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”یہ میں نہیں جانتی۔ میں کل ضرور جاؤں گی۔“

”تمہیک ہے تم گھر آنا میرے دونوں بھائیوں کے۔“
”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ اکیلے جانے کی اور مجھے اس کے انداز سے خطرے کی بو آ رہی تھی۔ میں نے عمار کو کال کی تو اس نے کہا۔

”میں تمہیں ہی کال کرنے والا تھا۔“
”عمار وہ جانے پر تکی بیٹھی ہے وہ کل جائے گی اس کے پاس۔“

”مجھے معلوم ہے کل اس کے گھر والے جا رہے ہیں۔ وہ وہاں ضرور جائے لیکن ان کے جانے سے پہلے اور اسے تم لے کر جاؤ گی۔“

”اس طرح بات بگڑ جائے گی کیونکہ سنبھل نہیں مانے گی۔“

”یہ تمہارا کام ہے کہ اسے کس طرح تیار کرتی ہو لیکن تم دونوں لازمی کل صبح اس کے بیٹھے پہنچ جاؤ۔ اسی صورت میں سنبھل اس کے چنگل سے نکل سکتی ہے۔“ عمار نے کہا اور پھر اس نے مجھے جو بتایا اسے سن کر میں تیار ہو گئی تھی۔ اگلی صبح جب سنبھل تیار ہو کر ناٹھے کی میز پر آئی تو میں نے اس سے کہا۔ ”سنبھل تم میرے ساتھ چلو گی۔“

”آج آپ مجھے ڈراپ کریں گی۔“ اس نے ہنس کر کہا اس کا اگلا اگلا مسکرا رہا تھا۔ میں نے تردید نہیں کی۔ سنبھل یونہی دہلی پوائنٹ سے جاتی تھی۔ ہم ساتھ روانہ ہوئے لیکن جب یونہی دہلی کے بجائے ڈیفنس کی طرف مڑے جہاں اکبر کا بچھ تھا تو سنبھل چونکی اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”ماما کہاں جا رہی ہیں۔“

”ہم اکبر کے بیٹے کی طرف جا رہے ہیں۔“
”کیوں ماما۔۔۔ وہاں اس کے گھر والے ہوں گے اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو اکبر کے لیے مشکل ہو جائے گی۔“
”تم جانتی ہو وہاں کون ہے؟“

”اکبر کی ماما اس کی چچی اور اس کا بھائی ہے۔“
”نہیں اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں میں تمہیں ان سے ملوانے لے جا رہی ہوں۔“

”ماما واپس چلیں۔“
”سنبھل اگر تم محسوس کرو کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو تمہیں اختیار ہو گا مجھے جو چاہے سزا دے لیکن میں تمہیں وہاں ضرور لے جاؤں گی۔“

سنبھل کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے جس وقت ہم وہاں پہنچے اس وقت اکبر کے گھر والے وہاں سے نکل رہے تھے۔ ٹیٹ کھلا ہوا تھا اس سے پہلے چوکیدار روٹ میں گاڑی اندر لے گئی تھی۔ پورچ میں اکبر سمیت اس کی ماں، بھائی اور چچی تو تھیں لیکن ان کے علاوہ ایک خوب صورت اور کسن لڑکی تھی جس کی گود میں چھوٹے سے بچہ بھی تھا۔ اکبر دھکیل جیڑ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ سنبھل کو دیکھ کر چوڑا اور پھر اس کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا تھا۔ میں نے مجھے اتر کر سنبھل کو بٹھے آنے کو کہا۔ وہ سب جب سے ہمیں دیکھ رہے تھے اور سنبھل اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس کی گود میں بچہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں تمہیں اس سے ملانے لائی ہوں، یہ ہے سزا اکبر جہاں اور یہ جو تم گود میں دیکھ رہی ہو یہ اکبر جہاں کا بیٹا ہے۔“

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“ اکبر کی کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ سنبھل نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا میں سمجھ گئی کہ کیا غیب رہی تھی۔ وہ خاموشی سے واپس کار میں جا بیٹھی۔ میں نے قاتحانہ نظروں سے اکبر جہاں کی طرف دیکھا اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے نکل آئی۔ میں نے اپنی بیٹی کو بچا لیا تھا۔

جس

جناب مدیر محترم
السلام علیکم

دور حاضر کا ایک ایسا بو دیتا ہوا زخم قارئین کے سامنے لارہا ہوں جس کی سزا کو اگر نہ روکا گیا تو سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔ معاشروں کو محفوظ رکھنے کے لیے میں اس تحریر کو پیش کر رہا ہوں تاکہ والدین ہوشیار رہیں اور جوش و جذبات میں ظفر جیسا جرم کوئی اور نہ کر رہیں۔

شاہد صدیقی
(کراچی)



ان میں سے ایک پلاٹ میں نے لے کر اس پر دو بیٹے روضہ کا مکان بنوا لیا تھا۔ میری شادی دس سال پہلے تادی سے ہوئی تھی اور اب ہمارے چار بچے ہیں۔ صبح دفتر جاتے ہوئے میں بچوں کو اسکول چھوڑ کر جاتا ہوں اور چچی کے وقت ظفر انیس اسکول سے لے آتا تھا۔ ظفر کون ہے آپ کو جلد پتا چل جائے گا کیونکہ وہی اس کا مرنے کی کردار نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بھی اس سوسائٹی سے ذرا بہت کر تھی۔ پوری سوسائٹی میں یہ واحد تھی جس کے سارے پلاٹ آباد تھے۔ باقی سوسائٹی میں آبادی تھی مگر بہت سے پلاٹ انہی خالی پڑے تھے۔ یہاں رہنے والے بھی کھاتے پیتے لوگ تھے۔ چھوٹے پلاٹ ہونے کے باوجود غریب خرابیاں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ہے۔ اسکول سوسائٹی کے ساتھ ہی میں روڈ پر ہے۔ پہلے بنے دین سے جاتے تھے لیکن جب سے اسکول دین میں آگ لگنے کے واقعات ہوئے ہیں ہم نے ڈاکٹر دین چھڑوا دی تھی۔

مکلی میں مقول اور مناسب قسم کے لوگ رہتے تھے۔ آپس میں ملنا جلتا تھا اور دھندروں میں ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ میرے گھر کے سامنے ظفر احمد کا گھر تھا۔ ظفر اسٹیٹ ایجنٹ تھا اور خاصا کامیاب اسٹیٹ ایجنٹ تھا۔ اس کی سوسائٹی کے ساتھ ہی انجینی بھی تھی۔ اور وہ زیادہ تر بڑے سودے کرتا تھا۔ ایک ہی سودے میں لاکھوں کما لیتا تھا۔ اس نے بھی یہاں پلاٹ لے کر اس پر یہ خوب صورت مکان بنوایا تھا۔ شادی شدہ تھا۔ مگر وہ سال پہلے اس کی بیوی اپنڈکس پیٹ جانے سے اچانک انتقال کر گئی تھی۔ ظفر کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ بیوی کی واحد نشانی ظفر کی چھ سال کی بیٹی سونیا تھی۔ ظفر کی اس میں جان تھی۔ وہ جوان تھا مگر بے متنیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بڑے جسم اور کمر تھوڑے قد کا لیکن خوش شکل آدمی تھا اگر چاہتا تو اسے دوسری بیوی مل سکتی تھی مگر سونیا کی خاطر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

ظفر احمد سرخ درمیاں قسم کا شخص تھا۔ بیوی کے بعد وہ اکیلا ہی سونیا کی پرورش کر رہا تھا۔ گھر کے کاموں اور سونیا کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ایک اوجیر عورت کو ملازم رکھا تھا جو صفائی سہرائی سے لے کر کھانا بنانے تک سارے کام کرتی تھی۔

سونیا چھ سال کی اور پچھلی کلاس میں تھی۔ وہ بھی اسی اسکول میں تھی جس میں میرے بچے پڑھتے تھے۔ صبح سونیا میرے بچوں کے ساتھ جاتی تھی۔ وہ پھر میں ظفر جا کر سونیا کے ساتھ میرے بچوں کو لے آتا تھا۔ وہ اپنا کام کرتا تھا اس لیے آرام سے آجاتا تھا۔ یوں ہمارے اشتراک سے بچوں کے آنے جانے کا مسئلہ حل ہوا تھا۔ کام سے ظفر کی واپسی تک سونیا ملازمہ رضیہ کے ساتھ رہتی تھی۔

یہ سردیوں کے دن تھے اور سردی بھی بہت شدید قسم کی تھی۔ اس لیے سورج ڈوبنے سے پہلے ہی میں سنا چھا جاتا تھا۔ سردی میں دفتر سے آنے کے بعد باہر نہیں جاتا تھا اور کھانے کے بعد لاؤنج میں چل قدمی کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی میں رات کے کھانے کے بعد لاؤنج میں ٹہل رہا تھا اور بی وی پر۔ خبریں دیکھ رہا تھا۔ ٹاویہ بچوں کو سلا رہی تھی۔ ٹھیک تو بجتے ہی بچے اپنے بستر پر پڑ جاتے

تھے۔ یہ ٹاویہ کا وضع کیا ہوا اصول تھا اور اس معاملے میں وہ آئندہ کوئی رعایت نہیں دیتی تھی حالانکہ وہ ہمارے ساتھ ہی سوئی تھی۔ بیٹوں اور قاطر کا کمر الگ تھا۔ آئندہ کو ٹاویہ نو بچے ساتھ لے جاتی اور سلا کر ہی آتی تھی۔ اچانک کال بیل بجی تو میں چلا۔ اس وقت کون آسکتا ہے؟ میں نے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو مجھے ظفر دکھائی دیا اور پریشان دکھائی دیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ”کیا حال ہیں؟“ خیریت تو ہے نا؟“

”شاہد بھائی سونیا غائب ہے۔“ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

میں چونکا۔ ”غائب ہے؟... کب سے؟“

”پچھلے۔“ اس نے کہا۔ ”میں مغرب سے ذرا پہلے تھا ہوا آیا تھا۔ اس لیے لیٹ گیا اور پھر میری آنکھ لگی۔“ آنکھ کھلی تو سونیا گھر میں نہیں تھی۔ مگر سے باہر تک دیکھ آیا ہوں مگر کبیں ظفر نہیں آئی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ کبیں تمہارے پاس۔“

”سونیا یہاں نہیں آئی، ایک منٹ میں ٹاویہ سے پوچھ کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اندر آیا۔ اس نے آئندہ کو سلا دیا تھا اس لیے جب سونیا کے غائب ہونے کا سنا تو میرے ساتھ ہی چلی آئی۔ اس نے ظفر سے کہا۔

”ظفر بھائی آج سونیا ہمارے پاس نہیں آئی اور مغرب سے بچے بھی اندر ہی ہیں۔“

”میرا خیال ہے دوسرے گھروں میں معلوم کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اندر سے جیکٹ ماہن کر آ گیا۔ اس دوران میں ظفر دوسرے گھروں کے دروازے بجا کر گھر والوں سے سونیا کے بارے میں معلوم کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور کچھ ہی دیر میں سارا معاملہ نکل آیا تھا۔ سونیا کبیں نہیں تھی۔ اتفاق سے مکی میں سارے ہی چلی والے لوگ رہتے تھے۔ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی فرد نکل آیا اور ملے ہوئے لاکر پچھنی کی تلاش کے لیے کیا کیا جائے۔ سب سے پہلے تو مسجد میں اعلان کرانے کا فیصلہ ہوا۔ مسجد کھلتی کے عرفان صاحب مکی میں رہتے تھے، یہ کام انہوں نے اپنے ذمے لیا اور ظفر سے سونیا کا حلیہ اور لباس پوچھ کر پلے گئے۔ اس کے بعد باقی بچے والوں نے سونیا کو اس پاس تلاش کرنے کا سوچا۔ سوسائٹی کے بڑے چالوں میں سے بہت سے خالی پڑے ہوئے تھے اور ان پر جھاڑیاں آگ آئی

تھیں۔ لوگ گھروں سے ٹارچیں اور الٹرنیٹ لائٹس لے آئے اور ان کی مدد سے جھاڑیوں کے درمیان سونیا کو تلاش کرنے لگے۔ میں ظفر کے ساتھ تھا۔ دور دورہ کر سونیا کو پکار رہا تھا۔ اس کی آواز بعض اوقات بھرا جاتی تھی اور قدم ٹھکانے لگتے تھے۔ سونیا اس کی انگوٹی اولاد ہی نہیں اس کی کل کائنات بھی تھی۔ ہم ایک امید کے ساتھ نکلے تھے۔ سوسائٹی بہت بڑی نہیں تھی، اس میں مشکل سے دس بارہ گاہاں اور دو قطار میں تھیں۔ ہم چیل کر تلاش کر رہے تھے۔ پھر فردل رہا اس سے پوچھ رہے تھے۔ مگر نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ حد یہ کہ لوگ سوسائٹی کے میں گیٹ تک پہنچ گئے اور وہاں موجود گاؤں سے بھی پوچھ لیا۔ انہوں نے بتایا کہ اگر گاڑی میں بھی کوئی لے جایا گیا ہے تو وہ کب نہیں سکتے۔ ہاں کوئی بیدل فرد آج کسی جی کو ساتھ لے کر نہیں نکلا ہے۔

”شاہد بھائی۔“ ظفر نے مجھ سے کہا۔ ”اگر اللہ نہ کرے میری سونیا نہ ملے تو مجھے آپ کی مدد چاہیے ہوگی۔“

”ظفر یار کیوں مایوسی کی بات کرتے ہو، سونیا مل جائے گی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ایسا تو نہیں ہے کہ تم سے سونیا کسی چیز کے لیے کہا ہو اور تم نے معذرت کیا ہو وہ خود اپنے چلی ہی ہو۔“

”نہیں شاہد بھائی، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کے اور میں انکار کر دوں۔“ ظفر نے جواہر دیا۔ ”لیکن ہو سکتا ہے وہ مجھے سونیا پر خود چلی ہی ہو۔“

سوسائٹی کی چار دیواری کے باہر جن لوگوں کے پاس میں روڈ پر مل رہے تھے ان میں سے بعض نے ان میں دکائیں بھی دکائی تھیں۔ ہم باہر آئے اور دکائوں سے پوچھنے لگے۔ اگرچہ اس کا امکان کم ہی تھا کہ ایک چھ سال کی بچی یہاں آئے مگر وہ آگهی مکتی تھی۔ سڑک پر جہاں تک دکائیں چلی تھیں ہم نے سونیا کا معلوم کیا اور پھر تاکام لوٹ آئے۔ سوسائٹی میں تلاش کرنے والے بھی تاکام رہے تھے۔ مسجد میں اعلان ہوا۔ اس پر بھی کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس میں ظفر کا موبائل نمبر بھی دیا گیا تھا کہ اگر کوئی سامنے آئے خیر کچھ بتاتا چاہتا ہے تو وہ کال کر کے بتا دے۔ بارہ بجے میں اور مکی کے ایک صاحب رضا بھائی ظفر کو لے کر مقامی قہانے گئے۔ پہلے تو قہانے کے افراد نے کوئی توجہ نہیں دی مگر جب میں نے اپنا تعارف کر دیا تو وہ مستعد ہو گئے۔ فوری ایف آئی آر کالی مکی اور اسی وقت ایک

موبائل ہمارے ساتھ کر دی گئی تھی۔

پولیس والے تک محبت کر رہے۔ سوسائٹی کے کارڈز سے خاص طور سے پوچھ چکے تھی کیونکہ دو کارڈز گیٹ پر ہوتے تھے تو دو سوسائٹی مکی میں محبت کرتے تھے۔ پولیس کا اپنا انداز ہوتا ہے اور سامنے والے کو مشکوک سمجھ کر پوچھ چکے کرتے ہیں۔ پولیس کو ایک گاڑی مشکوک لگا تھا اور وہ اسے ساتھ لے گئے۔ مکی کے لوگوں سے بھی پوچھا تھا مگر ان میں سے کوئی مشکوک نہیں تھا۔ جرج کے قریب میں گھر چلا گیا تھا۔ مشکل سے دو گھنٹے سوچا ہوں گا کہ باہر شور اٹھا۔ ٹاویہ نے مجھے اٹھایا۔ ”شاہد باہر دیکھیں یہ شور کیسا ہے، اللہ خیر کرے۔“

میں باہر آیا تو مکی میں سب ہی لٹے ہوئے تھے اور وہ مکی کے سرے کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے لڑکا۔ سڑک پار بڑے پلاٹ میں جھاڑیاں تھیں اور ان کے نیچے بہت لوگ موجود تھے۔ مجھے ظفر کے چلانے کی آواز آئی، وہ دوھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ میرا دل بٹھ گیا ایسا کہ کوئی ساتھ ہو گیا ہے۔ میں لوگوں کے جھوم کوچر تا ہوا ظفر تک پہنچا تو وہ مکی میں لت پت سونیا کی لاش سینے سے لگے ہوئے تھا۔ لوگ اسے لاش سے الگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لاش زمین میں ڈن تھی کیونکہ وہاں چھوٹا سا گڑھا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ سوسائٹی میں صفائی کرنے والے اور بچرا اٹھانے والے نے اس پلاٹ سے بکرا سمیٹنے ہوئے زمین سے نکلا بچی کا ہاتھ دیکھا اور شور مچانے لگا۔ ہاں کے شور پر گاؤں آگئے۔ آس پاس والوں کو اطلاع ہوئی اور کسی نے ظفر کو بتایا۔ اسی نے آکر زمین سے سونیا کی لاش نکال کر نکالی تھی۔

لاش پر باقاعدہ مٹی بھی نہیں ڈالی گئی تھی۔ چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں اسے ٹھوس کرادے سے چھپانے کے لیے چھٹی مٹی ڈالی گئی تھی اور وہ آسانی سے نکل آئی۔ میں اور دوسرے لوگ ظفر کی جگہیں کر کر آدے ہو گئے تھے اور اسے قایم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے سونیا کی لاش اس سے لی اور میں نے تمام افراد کو ہاں سے ہٹے کو کہا مگر لوگ جانے کو تیار نہیں تھے۔ جب ظفر سے لاش لی تو میں نے ایک ہی نظر میں بہت کچھ لیا تھا اور میرے اندر اندر یہ سرسرایا کہ یہ زیادتی کا کیس ہے۔ میں نے لاش کو وہیں ڈالا جہاں سے ظفر نے اٹھایا تھا اور اسے پیچھے لے

آیا۔ وہ مستقل سک رہا تھا۔ "میری گڑیا... میری گڑیا۔" کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے میں پولیس آگئی اور اس کے ساتھ ہی میڈیا والے بھی آ گئے۔ میں غلغلہ کو اپنے گھر لے آیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس سے بات کرے۔ پولیس کے آنے سے ایک ایسا کام یہ ہوا کہ غیر متعلقہ افراد جو لاش کے تقریباً پاس پہنچ گئے تھے ان کو بھیجے ہٹا دیا۔ ضروری کارروائی کے بعد سونیا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ غلغلہ بھی ساتھ کیا تھا۔ میں گھر آیا تو ادنیٰ وی پر دیکھ رہی تھی جس پر ہنڈلائز چل رہی تھیں جن میں مختلف خبریں دی جارہی تھیں۔ ایک محفل بتا رہا تھا کہ بچی کو اغوا کے بعد زیادتی کا نشانہ بنا کر قتل کیا گیا اور دوسرا محفل اسے اجتماعی زیادتی کا کیس بتا رہا تھا۔ زیادتی کا پتا تو پوسٹ مارٹم سے ہی چلتا لیکن میں نے دیکھا تھا کہ سونیا کے گلے پر نشانے تھے جیسے کسی نے اس کا گلا دیا ہو۔ شاید اسی سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ بچے جاگ گئے تھے اور سبے ہوئے تھے۔ ان کے اسکول کا وقت نکل گیا تھا اور میرے دفتر جانے کا بھی اس لیے میں نے کال کر کے چھٹی کا کہہ دیا اور خود اسپتال روانہ ہو گیا۔ پولیس سرجن نے چند ٹھنڈوں میں پوسٹ مارٹم عمل کر لیا تھا اور اس کی ابتدائی رپورٹ بھی آگئی تھی۔

رپورٹ کے مطابق سونیا کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی اور اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ موت کے وقت کو کم سے کم بارہ گھنٹے گزر چکے تھے گویا اس کے ساتھ جو ہوا تھا وہ شام چھ سے رات آٹھ بجے کے درمیان دو گھنٹے میں ہوا تھا۔ وہ گھر سے نکلی اور اس کے بعد کسی دروازے کے آگے چڑھ گئی۔ اس نے جھانپ لیا تھا۔ لے جا کر اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ شاید سونیا چلائی تھی تو اس نے گھبرا کر اس کا گلا دیا اور جب وہ مر گئی تو اسے چھپانے کے لیے اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ قاتل کا تعلق عیسائی یا سوسائٹی سے ہے۔ باہر سے آکر ایسا کام کرنا ممکن نہیں تھا۔

غلغلہ نے خود پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ اس کی دھماکیوں پر وہ بھی گھبرا رہی تھی۔ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے اور محلے کے کچھ اور لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اسپتال کی طرف سے لاش شام کے وقت ریلیز کی گئی تھی۔ غلغلہ اسے مردہ خانے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ پھر موسمی بہت سرد تھا اس لیے ہم اسے گھر لے آئے۔ امید تھی کہ اس کے روزنامے میں

تک لاش خراب نہیں ہوگی۔ غلغلہ کے اور اس کی مرحوم بیوی کے رشتے دار آگئے تھے اور اب وہ اسے سنبھال رہے تھے۔ اگلے دن صبح دس بجے تھیں تھیں۔ میں دفتر گیا اور دو گھنٹے کی چھٹی لے کر تھیں میں شریک ہوا تھا۔ وہیں میری ملاقات کس کے نقیشتی افسر انسپکٹر ریاض علی شاہ سے ہوئی۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ اچھا پولیس افسر تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "یہ کسی قریبی آدمی کا کام ہے۔ وہ وہیں کھینچ رہا ہے۔ اسے غلغلہ سے کوئی پر خاش بھی یا بچی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوگئی تھی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے دوسری بات قریب قریب لگ رہی ہے کیونکہ غلغلہ بہت ہی عریض و مدجھان جسم کا شخص ہے۔ اس کا کسی سے جھگڑا نہیں ہے۔ مگر کیا کیا جاسکتا ہے۔ آج کل لوگوں میں قوت برداشت یا اکل ختم ہوگئی ہے۔ ذرا سی بات پر دشمنی ہو جاتی ہے۔ نوبت کل تک پہنچ جاتی ہے اس لیے آپ ہر ذرا بولنے سے تقیص کریں۔"

"مجھے آپ کی مدد بھی چاہیے ہوگی؟"

"میں ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے گھنے اور بڑی کا معاملہ ہے۔ آپ مجھ سے رابطہ میں رہیں، میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔"

مجھے واہس دفتر جانا تھا اس لیے میں نے ریاض سے کہا کہ وہ کسی خوش رفت کی صورت میں مجھے آگاہ کرے اور پھر غلغلہ سے مل کر وہاں سے چلا آئے۔ دو دن سے دفتر نہ آنے کی وجہ سے کام بڑھ گیا تھا اور اس وجہ سے میں رات گئے گھر پہنچا۔ نادیر نے بتایا کہ پولیس نے گھلے کے ایک ایک فرار سے بات کی اور اس سے اس کے معمولات کے بارے میں بھی پوچھا۔ جن سے پوچھ بچھ ہوئی تھی وہ سارے مر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس پر کچھ لوگوں کے موذی خراب ہوں گے اور شکنجہ بدچیمیں ہوں گے کہ ان پر شک کیا جا رہا ہے مگر پولیس کی گاڑی شک کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے۔ نہادھو کر کھانا کھا کر میں غلغلہ کے پاس آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اکیلا تھا اور آنے والے سارے رشتے دار جاچکے تھے۔ میں نے پوچھا تو اس نے پٹ پٹ بولنے لگا۔

"میں نے خود ان سے کہہ دیا مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے وہ سب چلے گئے۔"

"تھک چکے ہیں۔ لیکن تم تمہارے ساتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

"آپ ہی لوگوں کا تو سہارا ہے مجھے۔" غلغلہ نے کہا

اور پھر پھوٹ کر رو دیا تھا۔ میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔ چپ کرنا رہا۔ آج کا کھانا ہمارے گھر سے آیا تھا مگر اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو چکر جب اس کے دل کا پوچھ بچھا ہوا تو میں نے دیکھا ہوا کھانا گرم کر کے زبردستی اسے کھلایا۔ پھر چائے کے ساتھ اسے خند کی دو گولیاں دیں اور جب وہ سو گیا تو میں واہس گھر آیا۔ اس کی حالت دیکھ کر دل دکھ رہا تھا اور اس کے دکھ کا کوئی مداوی نہیں تھا۔ وقت ہی اس کے زخم پر مرہم رکھ سکتا تھا۔

اگلے دن اتوار تھا اور میں صبح ہوتے ہی غلغلہ کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ جاگ گیا تھا اور اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ گلے کی خواتین نے مل کر ملے کیا تھا کہ وہ غلغلہ کے گھر میں قرآن خوانی کریں گی۔ انتظام نادیر سے پڑھتا۔ ہم نے ناشتہ ساتھ کیا اور ادنیٰ دور ان میں ریاض آ گیا تھا۔ اس نے رپورٹ دی۔ "سرکل میں نے اس کی کئی چندہ افراد سے پوچھ بچھ کی، یہ سب جوان یا نوجوان ہیں۔ مگر کوئی مشکوک فرد یا بات سامنے نہیں آئی۔ تمام افراد صاف ہیں اور انہوں نے اپنی مصروفیات کی تفصیل بتائی۔ اس کی تصدیق بھی کرائی۔ ان میں سے چار اس وقت یہاں نہیں تھے۔ باقی گیارہ میں سے دو مغرب پڑھنے گئے تو عشا کی نماز تک مسجد میں رہے۔ تین اپنے گھر والوں کے ہمراہ باہر نکلے تھے اور باقی چھ گھر میں رہے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے اب آپ کی تقیص کا دائرہ اس گلی سے باہر جائے گا۔"

"بالکل آج میں اسی لیے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں نے پہلے آپ سے مل لیا مناسب سمجھا۔ آپ جانتے ہیں یہاں آس پاس کون کون رہتا ہے؟"

سونیا کی لاش جس پلاٹ سے ملی تھی اس کے ساتھ والا پلاٹ بھی خالی تھا اور دوسرا ساتھ والا پلاٹ صرف اشرف کے ساتھ تھا۔ اس لائن میں کل دس پلاٹ تھے اور ان میں سے پانچ پر مگر بنے ہوئے تھے۔ یہ سب دولت مند اور اوپر ہی طبقے کے لوگ تھے۔ جن کا ماحول اور ملنا جلتا مٹا ہوتا ہے اس لیے کسی سے میری واقفیت نہیں تھی۔ بس اتنا جانتا تھا کہ فلاں گھر کا مالک فلاں ہے اور اس میں مکین طور پر اتنے افراد رہتے ہیں۔ میں نے ریاض کو یہ ساری معلومات مہیا کر دیں۔ ساتھ ہی اسے مشورہ دیا کہ وہ گاڑوں سے معلوم کرے کیونکہ انہیں سب پتا ہوتا ہے۔ جس گاڑو کو پولیس مشکوک سمجھ کر لے گئی تھی وہ بے قصور پایا گیا تھا۔ ریاض کے

ہاتے کے بعد غلغلہ نے باہی سے کہا۔ "مجھے نہیں لگ رہا جو ناکا قاتل پکڑا جائے گا اور پکڑا بھی گیا تو اسے سزا ہو گی۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم اتنے بائیں کیوں ہو... تھک ہے ہماری پولیس انکی مستعد نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ مجرم پکڑے نہ جائیں۔"

"آپ تھک کھڑے ہیں لیکن ہے پولیس اسے پکڑ لے گی اگر وہ کسی بڑے گھر سے نکل آیا تو قحط جائے گا۔"

"یقیناً رکھو قاتل بچے گا نہیں۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ "اس کا تو مجھے پورا یقین ہے۔ وہ بچے گا نہیں۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی شاخہ ان سے ہو۔"

ریاض علی شاہ شام تک وہیں رہا تھا۔ اس دوران میں وہ صرف کچھ کے لیے گیا تھا اور واہس آیا تھا۔ شام تک اس نے یہاں خام کام کر لیا تھا اور پھر اس نے مجھے رات میں کال کی۔ "سر میں نے ایک مشکوک بندہ چنا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"لاش والے پلاٹ کے دائیں طرف کا پہلا گھر ہے۔ اس کا مالک مراد امروڈیہ ہے۔ وہ زیادہ تر اپنی زمین اور عوی میں ہوتا ہے۔ اس کے دو بیٹے یہاں ہوتے ہیں۔ بڑا بیٹا شہناز مراد شادی شدہ ہے اور یہاں جادل صاف کرنے والی ٹیکسٹری چار رہا ہے۔ اس سے چھوٹا بیٹیر مراد ابھی اسکول میں پڑھ رہا ہے۔"

"آپ کو کس پر شک ہے؟"

"شیر پر۔" ریاض نے کہا۔ "ان کے گھر کا ماحول ٹھیک نہیں ہے۔ ملاقات کے گھر سے میں شراب کی بوتلیں رکھی ہیں۔ دو ملازم ہیں، ایک باہر کے کام کرتا ہے اور کیت پڑھتا ہے دوسرا اندر کے کام کرتا ہے کھانا پکاتا ہے۔"

"شہناز پر کیوں شک نہیں ہے؟"

"سر وہ بیوی کے ساتھ دو دن سے گاؤں گیا ہوا ہے۔ میں نے تصدیق کر لی ہے۔ یہ لڑکا بیٹیر ب سے یہاں اکیلا رہ رہا ہے۔"

"شک کی وجہ؟"

"ایک تو اس نے صاف نہیں بتایا کہ اس روز چھ سے رات آٹھ تک وہ کہاں تھا۔ اس کے ملازموں کا کہنا ہے وہ گھر نہیں تھا۔ مگر اس کی گاڑی گھر میں موجود تھی۔ گاڑی کے اندر وہ نہیں تھا۔ سوسائٹی کے گاؤں نے بھی

اس کی تصدیق کی ہے۔ عرصہ سترہ سے زیادہ نہیں ہے لیکن دیکھنے میں پورا جٹا کٹا مرد لگتا ہے۔ وزن زیادہ ہے۔ دو قدم چل کر اس کا سانس پھول جاتا ہے۔ گاڑی کے بغیر گلی کے کونے تک نہیں جاتا۔

”اس نے کچھ تو بتایا ہوگا؟“
”اس کا کہنا ہے کہ وہ گلیوں میں گھوم رہا تھا اور پارک کی طرف چلا گیا تھا۔“
”اس موسم میں؟“

”بچی تو شک کی بات ہے سر۔۔۔ پھر اس کی شہرت بھی ابھی نہیں ہے۔ کئی بار اس کی گاڑی میں لڑکیاں آئی تھیں اور ایسا بھی ہوا کہ لڑکیاں رات کو آئیں اور یہ انہیں صبح چھوڑنے گیا۔ مختلف اوقات میں گاڑوڑنے اس کے ساتھ مختلف لڑکیوں کو دیکھا ہے۔“
”بندہ مشکوک ہے۔“

”مگر مسئلہ یہ ہے کہ کوئی گواہ نہیں ہے اور نہ ہی دوسری کوئی شہادت ہے سر۔ اگر یہی بندہ ہے تو اسے اپنا کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آپ سمجھ رہے ہیں تاہم یہ بات۔۔۔۔۔؟ ورنہ ڈی این اے ٹیسٹ سے ثابت ہو جاتا کہ قاتل یہی ہے۔“
”میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔“ ہانا پٹی زیادتی سے بخ کی تھی۔

”مٹی گتے اور پھر شاید اس کے باپ کے ہاتھ گتے سے گلے پر فطر پرنٹ بھی نہیں رہے۔ میں ایک چھوٹا سا انگوٹھے کا سر اٹا ہے۔“
”یہ انکشاف تھیں نے کہا۔“ تو اسے سچ کر کے دیکھ لو۔

”وہ تو کر لیں مگر یہ ثبوت کے طور پر پیش نہیں ہو سکے گا۔ جتنے بیچنگ پوائنٹ چاہے ہوتے ہیں اس کے آدمے بھی بیچنگ کے لیے نہیں ملیں گے۔“
”پھر بھی کٹیش آگے بڑھانے کے لیے اتنا بھی کافی ہے۔“

”میں نے نمونہ لے لیا ہے۔ کل تک سچ ہو جائے گا۔“ ریاض نے کہا۔ ”اس نے میرے سامنے گلاس میں پانی بیا تھا جس نے وہ پھیر کر لیا۔“
”یہ تم نے اچھا کیا۔“
”میں کل رابلہ کروں گا۔“

اگلے دن میں نے دفتر سے خود ریاض سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا کہ فطر پرنٹ رپورٹ آگئی تھی اور انگوٹھے کا

نشان سچ کر گیا تھا۔ مگر اسے یہ طور شہادت پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس بنیاد پر وارنٹ لٹوا لے۔ ایک بار بندہ ہاتھ آجائے تو خود بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔

”میں نے مٹی بختری اعزاز میں کہا۔“
”میں ایک بار ہاتھ آجائے۔“ ریاض نے ہانپہ کی۔ ”مگر پارٹی اونچی ہے اور والوں کا دباؤ آئے گا۔“
”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم کام جلدی اور پکا کرنا۔ ایف آئی آر کاٹ کر اسے فوری پیش کر کے رہنما لے لینا۔ اس کے بعد اوپر والے بھی پکے نہیں کر سکیں گے۔“

”آپ بے فکر ہیں میں ایسا ہی کروں گا۔ آج رات وہ حوالہ میں مگر اڑے گا۔“

مجھے بھی ابھی امید تھی۔ میں نے فوری طور پر یہ خبر فطر کو سنائی۔ میں نے یقین سے کہا تھا کہ بشر پکڑا جائے گا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ جس وقت پولیس وارنٹ لے کر بغیر کی کوئی پتلی تو وہ گھر میں نہیں تھا۔ وہ گاڑی لے کر لٹا ہوا تھا۔ پولیس نے دونوں ملازموں کو حراست میں لے کر اپنے بندے وہاں بٹھا دیے تھے تاکہ وہ بغیر کو بغیر وارنٹ کر سکیں پھر ان سے اس کا موہاں نمبر لے کر اسے کال کی مگر اس کا موہاں نمبر بندہ چار ہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کل از وقت خبر ہو گئی تھی اور وہ فرار ہو گیا تھا۔ رات گئے اس کی گاڑی سوسائٹی کے باہر اس حالت میں کھڑی پائی گئی کہ اس کے دروازے ان لاک تھے مگر چابیوں اندر جمبول رہی تھیں۔ اس کے گھر والوں تک خبر پہنچ گئی تھی اور اگلے روز تک مراد اور شہباز آگئے تھے۔ انہوں نے رپورٹ کرائی کہ ان کے بیٹے کو اغوا کیا گیا ہے مگر پولیس کا موقف تھا کہ وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے فرار ہوا ہے۔ گاڑی کا اس طرح پایا جاتا اس کی طرف سے ڈراما تھا کہ یہ تاثر دیا جائے کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔

میں ریاض کی بات سے متفق تھا کہ یہ لوگ مل کر ڈرامہ کر رہے ہیں۔ انہیں خطرہ محسوس ہو گیا تھا کہ بغیر کو گرفتار کر لیا جائے گا اور اسے گرفتاری سے بچانے کے لیے انہوں نے اسے کہیں غائب کر دیا تھا۔ اسی دن پولیس نے ان کے خلیق لوکانوں پر چھاپے مارے تھے۔ مگر بغیر ان میں سے کسی پر نہیں ملا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے گاڑی یا کسی اور جگہ بھیج دیا گیا تھا۔ اس رات جب ریاض نے مجھے کال کی تو اس نے بتایا۔ ”اوپر سے دباؤ آتا شروع ہو گیا ہے۔“

مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ اس معاملے میں زیادہ سرگرمی نہ دکھاؤں۔

”یہ تو ہوتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اپنے جاننے والوں سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بندہ ہاتھ آجائے تو وہ تمہاری بیک کریں گے۔ اب اسے تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔“
”مجھے تو لگ رہا ہے یہ اسے باہر بھجوا دیں گے۔“
”اس کا نام انٹریٹ کنٹرول لسٹ میں شامل نہیں کیا جاسکتا؟“

”ہو سکتا ہے یہ شرط کہ بات میڈیا پر آجائے۔“ ریاض نے کہا۔ ”اوپر والوں نے مجھے اس معاملے کی میڈیا کوریج سے بھی روک دیا ہے۔ یہ کام فطر کر سکتا ہے۔“

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فطر کے گھر پہنچا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور سردی کی وجہ سے سنانا تھا۔ میں نے کال ٹیل بھائی تو خاصی دیر بعد فطر اندر سے لٹا اس کے چہرے پر دھشت تھی۔ غلاب تو قہر وہ مجھے اندر نہیں لے کر گیا۔ اس نے دروازے پر پوچھا۔

”مٹی شاہ بھائی۔ آپ اس وقت؟“
”سوئی میں نے ڈسٹرب کیا۔“ میں نے معذرت کی اور پھر اسے ریاض کی تحقیق اور مشورے سے آگاہ کیا۔ بغیر کے بارے میں اسے پہلے ہی بتا دیا تھا اور اس وقت اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ ”اگر اس معاملے کو میڈیا پر دیا جائے تو بغیر کو ملک سے فرار سے روکا جاسکتا ہے۔“
”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ وہ بولا۔ ”پولیس پکڑ لے تب بھی وہ چھوٹ جائے گا۔“

مجھے فطر سے اسی بات کی توقع تھی۔ وہ جمیلوں اور مشکوں میں پڑنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس قسم کے کیس میں لڑنا پڑنا ہے بہت دھکا خوار ہوتی ہے اس کے بعد کہیں جا کر انصاف ملتا ہے یا اس کی امید بندھتی ہے۔ مگر اس وجہ سے آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا ہے۔ میں نے اسرار کیا۔ ”پارکوش تو کرنی چاہیے۔“

”اچھا۔“ وہ بے دلی سے بولا۔ ”لیکن میرا کوئی میڈیا میں جاسنے والا نہیں ہے۔“
”تم اس کی فکر مت کرو۔۔۔ کل یہاں میڈیا اور کئی تو تنو والے آجائیں گے اور جیس ان سے اکیل کرتی ہے کہ

سو نیا کے قاتل کو ہزاروں لوانے کے لیے تمہاری مدد کریں۔“
”سو نیا کا قاتل۔“ اس کے چہرے پر دھشت بڑھ گئی تھی۔ ”ہاں اسے سزا ہوئی چاہیے۔ ٹھیک ہے آپ کل میڈیا والوں کو بلا لیں۔“ اس نے کہا اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے سسوس ہو رہا تھا۔ اس نے تین دن سے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ سو نیا والے واقعے کے بعد سے شاید اس نے شیوہ بنا تو ایک طرف رہا مگر بھی نہیں دھویا تھا۔ اس کی صورت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ میں وہاں آ گیا۔ میری سرکاری حیثیت کی وجہ سے یہ مناسب نہیں تھا کہ میں سامنے آتا لیکن میں نے ایک جاننے والے صحافی کے توسط سے فطر کے لیے انتظام کر دیا۔ تین چار بڑے چھٹو کے رپورٹرز اس کے گھر آئے تھے۔ میں نے اسے صبح ہی سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ میں پھر دفتر چلا گیا اور وہیں مجھے تاہیہ نے بتایا کہ فطر نے مٹی میں اپنے گیٹ کے سامنے میڈیا والوں سے بات کی تھی۔ وہ کسی کو اندر لے کر نہیں گیا تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بلکہ گلی میں ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ میڈیا نے محلے والوں سے بھی تاثرات لیے تھے اور سب نے زور دیا تھا کہ سو نیا جیس معصوم بچی کے درندہ صفت قاتل کو سزا ہوئی چاہیے۔

میڈیا بغیر کی کوئی بھی پہنچا تھا مگر اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملازمین بھی کوئی بند کر کے چلے گئے تھے۔ مگر اسی شام مراد نے اپنی ڈینٹس والی کوفی پر برس کا فطر نس کی اور الزام لگایا کہ اس کے بیٹے کو اغوا کیا گیا ہے۔ اس کا کچھ بنا

شمارہ جون 2014ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہدایہ قلمی ش۔ تب کا کتاب

ہذا اول: موت و حیات۔ شاہد شعی (فیصل آباد)

ہذا دوم: ان دیکھا سودا۔ اشرف (لاہور)

ہذا سوم: ہم مجرم۔ عزیز مٹی پوری (کراچی)

پہلے نمبر سے اوتھارے لگانے کے لیے آپ جتنی منتخب کیجئے

ہر ایک کے سامنے اس کا حق ہے

نہیں ہے۔ اسے خطرہ ہے کہ اس کے بچے کو قید رکھ کر ان پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ عقد سے کی جی وی نہ کریں۔ پولیس نے بشری کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف اغوا اور قتل کا چالان چس کر کے عدالت سے اس کے وارنٹ گرفتاری حاصل کر لیے تھے۔ دوسری طرف عدالت نے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ مراد نے میڈیا کو بشری کی پیدائش اور دوسرے تعلیمی سرٹیفکیٹس اور کاغذات دکھائے جن کے مطابق وہ سترہ سال اور بیس دن کا تھا یعنی قانونی لحاظ سے ابھی بچہ تھا۔ اس پر ایک رپورٹر نے مافی فیہ انداز میں سوال کیا کہ کیا وہ بچہ آج ابھی بچہ ہی ہے؟ اس پر سب فیس دیے تھے اور مراد چراغ پا ہو گیا۔ اس نے رپورٹر سے بدتمیزی کی اور اس وجہ سے پولیس کا نظر کس پر مرکوز ہو گیا۔

میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ ثبوت اور گواہی نہ ہونے سے بشری کو زندہ رہنا ممکن نہیں۔ صرف اٹھ گھنٹے کا سہرے کا نشان بچہ کر جانا واضح ثبوت نہیں تھا اور پینچنگ پوائنٹس پورے نہ ہونے سے اسے عدالت کی طرف سے یہ طور ثبوت تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس صورت میں بشری مراد کے لیے بہتر بھی تھا کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے اور عدالت کا سامنا کرے مگر شاید وہ ڈر گیا تھا۔

اس دن میں جلدی آگیا تھا اس لیے شام کے وقت ہی ظفر سے ملاقات ہوئی تھی وہ ویسٹ اینڈ میں چھاپا ہوا اور مایوس تھا۔ اس نے سیٹ سے انداز میں بتایا کہ اس نے میڈیا والوں سے کیا کیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم دیکھنا تب بشری پکڑا جائے گا۔“

”وہ نہیں پکڑا جائے گا۔“ ظفر نے یقین سے کہا۔ ہم باہر ہی کھڑے تھے۔ آج بھی ظفر مجھے اندر نہیں لے کر گیا تھا۔

”یار اتنا مایوس نہیں ہوتے ہیں، اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“

میں نے گھر آ کر بتا دیا کہ ظفر کی کیفیت بتائی تو اس نے انکشاف کیا۔ ”اس نے ملازمہ کو بھی لٹال دیا ہے اور اتوار کے دن قرآن خوانی کے بعد سے ہمیں نہیں جا رہا ہیں مگر میں ہوتا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”ملازمہ آج میرے پاس آئی تھی۔ اسے کام کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ماسی لگی ہوئی ہے اس لیے

میں نے معذرت کر لی البتہ کسی کو ضرورت ہوگی تو تہہ دوں گی۔“

”شاید جب ہی وہ تین دن سے مجھے اندر نہیں لے رہا ہے مگر کی حالت اس قابل کیاں ہوگی کہ کسی کو مضائقہ ہے۔“

”آگیا آدھی ہے مگر کہاں گندہ ہو گا۔ ہاں گرد مٹی بیج ہوگی تو وہ چھانڈی جاسکتی ہے۔“ نادپہ نے کہا پھر اسے آواز دے کر آواز دی تو وہ اس کے پاس پہنچی کی بدلت اس کیس کی گورج اور ناک شوشے مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ بشیر کو کچھ کہہ رہے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے سے سزا بھی مشکل سمجھ رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ظفر بھی مایوس تھا۔ اسے پتا تھا کہ ثبوت اور گواہی نہ ہونے سے عدالت سے چھوٹ جانے کا جب ہی وہ پولیس کا نظر کس کے لیے بھی مشکل سے تیار ہوا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ پہلے بیوی مری اور اب اٹھوٹی بیٹی۔ اس کا راول فطری تھا اور اس وقت اس سے بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ تین چار دن بعد اس سے بات کروں گا۔ اسے سمجھاؤں گا کہ عادات زندگی کا حصہ ہیں اور ان کی وجہ سے زندگی کو یوں ترک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال اسے چھینرنا مناسب نہیں تھا۔

اگلے دن دفتر میں کام زیادہ تھا اور پھر ایک میٹنگ آگئی اس کی وجہ سے میں رات خاصی دیر سے واپس آیا تھا۔ گلی میں داخل ہوا تو مجھے ظفر اپنے گیٹ کے سامنے کیاری کی منظر پر پکا نظر آیا۔ اس وقت سردی عروج پر تھی اور وہ یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے ممکن زدہ چٹلون کے ساتھ پوری آستین کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور یہ لباس سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ وہ خلا میں محو رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ سردی تو کیا اسے ساری دنیا کی فکر نہ ہو۔ میں نے گاڑی کنارے پر لگا دی اور اتر کر اس کے پاس آیا۔ مجھے پورے گرم لباس اور جیکٹ میں بھی سردی لگ رہی تھی۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ ”کیا حال ہیں ظفر؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے دیکھی آواز میں کہا۔

”اتنی سردی میں یوں باہر بیٹھے ہو کچھ گرم چہرے لیتے۔“

”مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔“ اس نے بے چینی سے جواب دیا۔ ”گرمی لگ رہی تھی اس لیے باہر آ گیا۔“

”اس موسم میں گرمی؟“ میں نے تشویش سے کہا۔ ”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

”بحری طبیعت بالکل ٹھیک ہے یہ باہر کا موسم کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اصل موسم آدمی کے اندر ہوتا ہے اور میرے اندر اس وقت گرمی کا موسم ہے۔“ اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

”سوری مجھے ذرا کچھ کام ہے۔“

اس سے پہلے میں کچھ کتابوں اور جاکچا تھا اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں گھر آگیا۔ ظفر کا رویہ اب تو کھلا تھا۔ اس نے کسی عجیب فلسفیانہ بات کی تھی حالانکہ وہ اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ میں نے بھی اسے فلسفہ یونے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ بہت سیدھے الفاظ میں بات کرتا تھا۔ بہر حال وہ ایک بڑے سامنے سے گزرا تھا۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے اور یہ سامنے ہی ہوتے ہیں جو انسان کو اندر سے بدل دیتے ہیں۔ ظفر جیسے سیدھے سادے لوگ بھی فلسفہ یونے لگتے ہیں۔ آج سونیا کے دانتے کو پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا مگر کس میں کوئی چیز رفت نہیں ہوئی تھی۔ بشیر بدستور غائب تھا اور اس کے گھر والے دادیلا چارہ رہے تھے کہ اسے غائب کیا گیا ہے۔ مگر ان پر کوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔ ریاض نے بتایا کہ ایک پولیس پارٹی اس کی حویلی بھی مٹی مگر وہ وہاں بھی نہیں ملا۔

میں اگر جلد گھر آ جاؤں تو مغرب اور عشا کی نمازیں سوسائٹی کی مسجد میں پڑھتا ہوں۔ لیکن اس دن عشا بھی نکل گئی تھی۔ اگلے دن میں دفتر سے آ رہا تھا تب مغرب کی آذانیں ہورہی تھیں اور میں نے گاڑی مسجد کے سامنے روک دی۔ جماعت ہونے والی تھی اس لیے جلدی سے وضو کر کے صف میں آگیا۔ سلام اور دعا کے بعد دوسروں سے سلام دعا کی گئی کے کئی افراد نماز کے لیے آئے تھے۔ ہم ایک طرف بیٹھ گئے اور لازمی طور پر گفتگو کا رخ ظفر کی طرف مڑ گیا۔ عرفان صاحب بولے۔ ”مجھے تو بے چارے کی حالت دیکھ کر ترس آتا ہے، کوئی سنبھالنے والا بھی نہیں ہے۔“

”جوان آدمی ہے، یہی کے بعد صرف بیٹی کی خاطر دوسری شادی نہیں کی اور اب بیٹی بھی نہیں رہی۔“ ایک اور صاحب نے کہا۔

”میرا تو خیال ہے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔“ میں نے تجویز پیش کی۔ ”پہلے ظفر کو معمول کی زندگی کی طرف لانا چاہیے اور اس کے بعد ہم اس کی دوسری شادی کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس کی عمر ہی کیا ہے مشکل سے بیستیس سال کا ہے۔ ابھی شادی کر لے گا تو اللہ اور اولاد بھی دے گا۔ اس کا ذمہ نہر جائے گا۔“

”تجویز تو اچھی ہے۔“ عرفان صاحب وازمی پر ہاتھ بھرتے ہوئے بولے۔

”ابھی ہم میں سے ہر ایک دن میں ایک دو بار اسے بیچ کرے اور کچھ نہیں تو سلام کر لے یا نماز کے لیے پٹنے کی دعوت دے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاید صاحب۔“ عرفان صاحب بولے۔ ”میں ابھی عشا کے وقت ظفر کے پاس جاتا ہوں۔ ویسے وہ نماز والا بندہ نہیں ہے، اسے بس جھجھ میں دیکھا ہے لیکن اس وقت اس کا دل بدلا ہوا ہے، شاید اللہ اسی سبب اسے نماز کی ہدایت دے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے دینی زبان میں کہا۔ ”لیکن بہتر ہوگا یہ بات ایسے کریں کہ اسے جبر نہ لگے۔“

”آپ بے فکر ہیں میں بات کر لوں گا۔“ عرفان صاحب نے کہا۔

میں مسجد سے گھر آیا تو نادپہ نے مارکیٹ چلنے کو کہا۔ ”بچوں کی کچھ چیزیں لیتے ہیں۔“

میں نے بیچ کیا اور چائے پی کر بیوی اور آئندہ کو لے کر روات ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ عشا تک واپس آ جائیں گے مگر دیر ہو گئی اور جب ہم مارکیٹ سے واپس آئے تو جماعت ہو چکی تھی۔ اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ عرفان صاحب کی ظفر سے کیا بات ہوئی ہے۔ پھر کچھ محسن بھی تھی اس لیے ظفر کی طرف بھی نہیں گیا۔ گیمیا بات ہے جب سے اس کا رویہ بدلا تھا اور وہ دروازے پر کھڑے کھڑے بات کر رہا تھا، میں اس کی طرف جانے کا سوچ کر ہچکچاتا تھا۔ اس کے انداز سے صاف لگتا تھا کہ وہ زواروی میں بات کر رہا ہے اور اسے میرا آنا اور بات کرنا گراں گزر رہا ہے۔ سونیا کی وفات کے دو دن تک مجھے والوں نے اسے کھانا بھیجا تھا مگر تیسرے دن جب ہمارے برابر والے لٹال صاحب کے گھر سے کھانا بھیجا تو ظفر نے فرے واپس بیچ دی تھی اور ساتھ ہی کھلوایا کہ اب کھانا نہ بھیجا جائے۔ یہ بات مجھے اگلے دن مسجد میں معلوم ہوئی۔ میں مغرب کے بعد گھر آیا تھا اس لیے عشا کی نماز کے لیے گیا تھا۔ وہاں پہلے ہی ظفر پر بات ہو رہی تھی۔ عشا کی جماعت کھڑی ہونے والی تھی اس لیے فی الحال گفتگو چھوڑ دی تھی اور جماعت و نماز کے بعد ہم سب ایک جگہ جمع ہوئے۔ عرفان صاحب بہت سنجیدہ تھے۔ انہوں نے چھوٹے ہی کہا۔

”میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ شخص اتنا بدتمیز اور دکھا کھلے گا۔“

”کیا ہوا؟“

”میں کل گیا تھا اس کے پاس۔ وہ کسی قدر بدتمیز سے بولے۔ پہلے تو دروازہ کھول کر دیکھا۔ میں نے چار پارٹس بھائی تو دروازہ کھولا اور کھولنے ہی بولا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ بہر حال میں نے ضرر ضبط کر کے اس سے سلام دعا کی۔ خیر خیر یہت پہنچی اور پھر لڑاکے لے گیا کہ تو اس نے صاف انکار کر دیا اور بولا۔ ”اس وقت موت کا فرشتہ بھی لینے آئے تو نہ چاؤں۔“

”انتظار اللہ! نماز کے لیے منع کر دیا اور وہ بھی اس اعزاز میں۔“ نعمانی صاحب بولے۔ وہ دیکھ کر آدی تھے اس لیے دین کے معاملے میں ہڈ پانی ہو جاتے تھے۔

میں نے ملاحت سے کہا۔ ”نعمانی صاحب ظفر کی واقعی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا صدمہ بہت بڑا ہے اور ایسے میں آدی کے منہ سے ایسا سیدھا نکل پاتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ عرفان صاحب نے کہا۔ ”مجھے اس وقت ضرر آیا تھا مگر اب خیال آتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی طرح شرمیلی شخصیات سے برداشت کرتے تھے، یہ تو ہمارا مسلمان بھائی اور پردوسی ہے۔“

”ٹھیک ہے آج میں اور سکیل صاحب جائیں گے۔“ نعمانی صاحب بھی نرم پڑ گئے۔ ”میں اپنی سی کوشش تو کرنی چاہیے۔“

”کل میں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میرے ساتھ کوئی اور جاتا چاہے تو تادمے میں جاتے ہوئے اسے بھی بلاؤں گا۔“

”میں چلوں گا۔“ عرفان صاحب بولے۔

”ٹھیک ہے پھر آپ دونوں آکر بتائیے گا کہ آج کیا ہوا۔“ نعمانی صاحب بولے تو ہم سب اٹھ گئے۔ میں گھر آیا اور کھانا کھا کر بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ان کی اسکول رپورٹس دیکھ رہا تھا کہ سکیل صاحب اور نعمانی صاحب آ گئے۔ میں ان کو نشست گاہ میں لے آیا۔ وہ دونوں علیحدہ تھے اور مجھے کچھ کچھ اعزازہ تھا کہ ظفر نے ان کے ساتھ بھی ویسا ہی رویہ رکھا روٹیہ رکھا ہو گا۔ چند منٹ بعد انہوں نے تصدیق کر دی۔ سکیل صاحب نے کہا۔

”اس نے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر لگائی کہ مجھے لگ

”ہوئے لگی تھی۔“

”اور اس نے دروازہ کھول کر کیا کہا؟“

”میں نے اس سے کہا کہ آپ کی طرف سے میں نہیں بولتی؟“

”کیا کہا آپ نے۔“ سکیل صاحب بولے۔ ”اس وقت مجھے بھی ضرر آ گیا تھا۔ مگر اب سوچ رہا ہوں تو اس پر ترس آ رہا ہے۔ آپ نے اس کی حالت نہیں دیکھی۔“

اس پر نعمانی صاحب نے دین کے معاملے سے ایک چھوٹی سی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ظفر جیسے لوگ جو معصیت کے وقت اللہ سے رجوع نہیں کرتے ہیں اللہ ان کو ایسے ہی پریشان حال رکھتا ہے۔ میں ان سے مشکل نہیں تھا مگر میں نے بحث نہیں کی اور پوچھا۔ ”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”ہم نے حال احوال پوچھا تھا۔ پھر اسے کہا کہ وہ اپنی معمول کی زندگی کی طرف واپس آئے۔“ سکیل صاحب بولے۔

”اس نے کیا جواب دیا؟“

”اس نے بدتمیزی سے کہا کہ وہ معمول کے مطابق ہے اور بالکل ٹھیک ہے، اس کی فکر نہ کی جائے اور تیری اسے تنگ کیا جائے۔“ نعمانی صاحب بولے۔

”نہیں سمجھا بات ہوئی؟“

”نعمانی صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے اسے بہت بڑا دھچکا پہنچا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیا سے کٹ کر گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائے۔ جب اس نے عجیب سی بات کی۔“ سکیل صاحب نے کہا۔ ”اس نے کہا اہو آپ شاید یہ کہہ رہے ہیں کہ میں صبح کام پر جاؤں شام کو واپس آؤں اور لوگوں سے کھلوں ملوں یہی ناں؟ ٹھیک ہے تو آپ ایک دن بعد آئیے گا پھر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔“

مجھے بھی یہ بات عجیب سی لگی تھی۔ ایک دن بعد کسی کو اس سے شکایت نہیں رہے گی۔ ایک دن یعنی کل اتوار تک وہ کیا کرتا۔ سکیل صاحب اور نعمانی صاحب کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہوئے تھے۔ تاہم کپ اٹھانے آئی اور مجھے غور و فکر میں دیکھا تو پوچھا میں نے اسے ظفر کی بات بتائی۔ وہ بھی حیران ہوئی گی۔ ”یہ ایک دن والی کیا بات ہوئی؟“

”میں تو میری کچھ میں بھی نہیں آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کل تک وہ کیا کرے گا۔“

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیکس فیس

ٹی وی کی فیکس فیس کو لیں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگ نکھار دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سے حرکت کھینچنے سے گھر سے باہر میں بل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد گھٹنے دھبے اور گردن کی پٹریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ خواجین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے کھاسا سفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ انہیں دور کو کھینچنے کے پھر لیکن فیکس فیس کھانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

www.facebook.com/toptratments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی وی کی گروٹال فیکس ہو میو پیٹک دوا ہے جو محر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل 22 امائناتی جسم میں، سوائٹروپن (نشوونما کا ہارمون) کی بڑھانے والی اضافہ کرتے ہیں جس سے بڑھوں اور ذہان کو توجہ دیتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں تکرر اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

ملک بھر کے ہر ایجنٹ سے ملے بغل سنور، ہومیو پیٹک سنور اور دوا افان پر دستیاب

دشکی صورت میں بلاو 042-35789145&6,0334-4266255

Email: toptratments@gmail.com, Website: www.toptratments.net

II

نادیہ نے سوچ کر پوچھا۔ "سوتلیا کے انتقال کو کتنے دن ہو گئے ہیں۔"

"آج تو دن ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کی لاش نے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔"

"اور وہ کتنے سال کی تھی؟"

"چھ سال کی۔۔۔ دو دن پہلے تو وہ چھ سال کی ہوئی تھی۔"

"تو کیا نظر بھائی اس کا سوگ چھ دن تک منائیں گے۔"

"لیکن آج تو دن سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔"

"ہاں لیکن اس کی تدفین کو تو سات دن ہوئے ہیں اور پھر دو دن لوگ بھی ان کے گھر میں رہے تھے۔ اگر وہ سوتلیا کا سوگ اکیلے میں منانا چاہے ہیں تو ان کو ابھی پانچ دن ملے ہیں اور اس لحاظ سے ایک دن باقی ہے۔"

نادیہ کی سوچ اور منطق نے مجھے حیران کیا تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی اور شاید ابھی نہیں سکتی تھی۔ مگر یہ ایک قیاس تھا اصل حقیقت کا علم نہیں تھا۔ مگر میں نے نادیہ سے اتفاق کیا۔ "ہاں یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ جب ہی اس نے ایک دن بعد معمول پر آنے کی بات کی ہے۔"

"ایک عجیب بات اور میں نے دیکھی۔ آج دن میں کم سے کم وہ بار بار اسی نظر بھائی گھر سے باہر آئے اور کچھ دیر بیٹھے کے بعد اندر چلے گئے۔ بچوں کا کہنا ہے کہ گلی میں بیٹھے ہوئے انہوں نے بھی نظر بھائی کو اسی طرح باہر آکر بیٹھے اور پھر اندر جاتے دیکھا تھا۔"

"آج میں بھی آیا تو وہ باہر مندر پر بیٹھا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بات مارل نہیں لگ رہی۔"

"پلیس نظر بھائی نے ایک دن کی بات کی ہے دیکھتے ہیں کہ وہ اس کے بعد کیا کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے ابھی انہیں جاگیر یا مناسبت نہیں ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ پہلے ہم محلے والوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کوئی مذکورہ نظر کو گھر رہے گا۔ آج نعمانی صاحب اور سکیل صاحب مجھے تھے کل میں اور عرفان صاحب جاتے۔ اب میں ان لوگوں کو کتبہ کروں گا۔ ہم پرسوں دیکھیں گے کہ نظر کیا کرتا ہے۔"

"اگر وہ معمول پر نہیں آئے؟"

"جب ہم دعا ملت کریں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمارا کوئی بڑا آدمی بے حال ہو اور ہم اسے اس کے حال پر

میں ایسی چیزیں ڈکی میں رکھتا ہوں جن سے سیٹ خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ رات کے کھانے کے کچھ دیر بعد میں اٹھا اور باہر آ کر ڈکی سے اٹھتی نکالی۔ سیر حیاں پارکنگ سے اوپر جا رہی تھیں۔ میں وہیں سے ایک ایک کر کے انہیں اوپر لے گیا۔

پھر نیچے آ کر گیت بند کر کے اوپر آیا اور سیر حیاں کے اس سے انہیں اٹھا کر کمرے میں رکھنے لگا۔ جب دوسرا ناز بھی رکھا کر رہا تھا تب میں نے دیکھا نظر چھت پر ٹپکا رہا تھا اور اس وقت بھی اس نے وہی چٹون میں پہن رکھی تھی۔ تو دن میں اس کی شیوہ یہ کہ باقاعدہ ڈاکڑی لگنے لگی تھی اور سر کے بے ترتیب بال ہمارے تھے کہ اس نے نکٹھا کرنے کی زحمت نہیں کی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے وہ بار بار مجھ سے امتحان میں حرکت دے رہا تھا۔ میری چھت پر روشنی نہیں تھی اور اسان پر بھی بس تارے تھے۔ نظر کی چھت پر روشنی تھی اس لیے وہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چار دیواری تک گیا تاکہ دیکھ سکوں کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے اور وہ اس سے کیا کر رہا ہے۔ نزدیک جاتے پر مجھے اس کے ہاتھ میں موجود ہاں نظر آ گیا مگر اس کی حرکت کچھ نہیں آئی تھی۔ وہ بہت مضطرب انداز میں بیٹھے ہوئے یہ حرکت کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک بیٹھے سے رکا اور کچھ دیر اوپر خلا میں ٹھہرتے رہنے کے بعد وہ سیر حیاں سے نیچے چلا گیا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔

میں نیچے آیا اور کچھ دیر بعد میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی۔ ہم لوگوں کو معمولات زندگی نے اس طرح بکڑ رکھا ہے کہ ہمارے آس پاس کچھ ہو رہا ہو تو ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ میں بھی اس معاشرے کا حصہ ہوں اس لیے میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ حالانکہ مجھے خود کرنا چاہیے تھا کہ نظر ایسا کیوں کر رہا ہے؟ ہمارے ہاں صدیات میں لوگ ایسا ہی نہیں دکھاتے ہیں، چاہے ان کی انگریزی اولاد ہی کیوں نہ نہ کر دی جائے۔ اس کا رویہ بہت غیر معمولی تھا۔ اگر ہم خود کرتے تو شاید سمجھتے بھی۔

میں نیچے آیا اور لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ نادیہ بچوں کو سنانے لگی تھی اور وہی دلی چل رہا تھا۔ میری نظر دی پر مرکوز تھی۔ اچانک ہی اس پر سوتلیا کیس سے متعلق خبر آئی۔ شیر کے باپ کو دکھایا جا رہا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ارے خالو۔۔۔ میرا بیٹا مجھ سے تو اسے نہیں کوہ حالت میں پیش کرو۔ خدا رسول بھی اسے

قسم جو میں اس کی بیوی کروں؟ اسے یوں غائب مت کرو۔"

اس کا انداز اتنا دردناک اور بے ساختہ تھا کہ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ بیوٹ نہیں کھڑا ہے۔ اگرچہ میرا جویش ہے اس میں دل کی گواہی مستحکم نہیں ہوتی ہے مگر اس وقت مجھے یقین آ گیا اور پھر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ جی کہہ رہا ہے تو شیر کہاں ہے؟ اس کا جواب میرے ذہن میں آیا تو میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ نادیہ اندر چلی پیش نے اسے نہیں بتایا اور خاموشی سے باہر آیا۔ سردی کی وجہ سے مجھے سب جھنجھٹا اور آج ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی جسم کو کاٹ رہی تھی۔ میں نظریے مکان تک آیا اور بیٹل بھانے جا رہا تھا کہ رک گیا۔ مجھے لگا کہ گیت کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا ہے، میں نے اسے دھکیلا تو وہ کھلا ہوا ملا۔ شاید نظر آنے جانے کے دوران آخری بار اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔ اس کی چھ سال پرانی سوک کار اندر ہی کھڑی تھی۔ میں لاؤنج کے دروازے تک آیا اور اسے دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ بڑے کمرے اور لاؤنج میں روشنیال بند تھیں مگر ایک بیڈروم سے روشنی دکھائی دے رہی تھی اور یہ سوتلیا کا بیڈروم تھا۔ دوسرا بیڈروم بھی تاریک تھا۔ میں دس قدموں آگے آیا۔ اندر جھانکا تو معلوم ہوا روشنی اصل میں واش روم کے کھلے دروازے سے آ رہی تھی۔

میں ذرا آگے آیا تھا کہ دو انسانی پاؤں دکھائی دیے۔ وہ فرش پر پڑے تھے اور فرش پر خون ہی خون تھا۔ پاؤں بھی خون آلود تھے اور ان سے رسیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے میں آگے آ رہا تھا جسم نمایاں ہو رہا تھا اور اس کی جو حالت تھی وہ بیان تو کیا دیکھنے کے لائق بھی نہیں تھی اس کے پاؤں جھجھے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ اندر ہر طرف خون ہی خون اور لٹوڑے ٹکڑے ہوئے تھے۔ بالآخر مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیا اور وہ بھی دیکھنے والا نہیں تھا۔ کروڑوں سال کا پتہ سینہ تار رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ نظر کو بڑھ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنے خون آلود ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔ اس کے سامنے ہاں پڑا ہوا تھا اور فرش پر دانت ٹکڑے ہوئے تھے۔ ان دانتوں کو پلاس سے نکالا گیا تھا۔ اب میں جان گیا تھا کہ نظر چھت پر پلاس سے کس کام کی خیالی مشق کر رہا تھا۔ اس نے میری موجودگی محسوس کر لی اور میری طرف دیکھ لہجہ کہا۔ "آپ نے دیکھا شاید بھائی۔"

"نظر یہ سب تم نے کیا ہے؟" میں نے خط امتحان

میں پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے مجھے لہجے میں اعتراف کیا اور پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس کے لباس پر بھی جاہ خانوں کے دھبے تھے۔ میں بے ساختہ چپکے ہنستے رہا۔ وہ اگر سونیا کے بیٹے پر بیڑہ گیا اور اس کے سر ہانے کیجئے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”میری گڑبگڑ صرف چھ سال کی تھی۔“

اب میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے آخری دن کے حوالے سے کیا کہا تھا۔ تادیب بھری تھی وہ سونیا کے چھ سالوں کے حوالے سے چھ دن تک اس کا سوگ منار ہا تھا مگر وہ یہ چھ دن کسی اور طرح سے گزار رہا تھا۔ میں نے اپنا سونا ہاتھ لگا لگا اور ایبونیٹس سروں کے ایک ادارے کو کال کر کے یہاں ایبونیٹس بھیجے ہوئے تھے۔ ظفر نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس نے توبہ بھی نہیں دی تھی۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ظفر تم نے یہ سب کیسے کیا؟“

”بہت آسانی سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ ہی میری گڑبگڑ کا قاتل ہے۔ یہ جان لینے کے بعد میں گھر میں رک نہ سکا اور گھر سے نکلی کر اس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا پھر جیسے ہی اس کی کار نظر آئی میں نے اسے وہیں روکا اور گن پوائنٹ پر یہاں لے آیا۔“

”تمہارے پاس گن ہے؟“ میں چونکا۔

وہ ہنسا اور اس نے دروازہ کھول کر اس میں رکھا ہوا سیاہ رنگ کا ہینڈل لگا لگا۔ میرے جسم میں سسکی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے ہینڈل الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔ ”کھلو نا ہے۔۔۔ میں سونیا کو مارکیٹ لے کر گیا تھا وہاں اسے پسند آ گیا۔ اس سے پہلے اس نے بھی ایسا کھلو نا نہیں لیا مگر یہ اسے اچھا لگا تھا بالکل اصلی لگ رہا ہے نا۔“

میں حیران رہ گیا۔ دیکھتے میں وہ بالکل اصلی لگ رہا تھا۔ ہاں جب ہاتھ میں پکڑا تب بتا چکا کہ سسکی ہے۔ بلا سسکی کا ہاتھ ہینڈل ہے۔ ظفر مسکرایا۔ ”وہ بھی اصلی سمجھا تھا۔۔۔ اسے بڑے جسم کے مالک کے اندر چڑھا کا سادہ تھا۔ اصل میں وہ مجرم تھا اس لیے بہت ہار گیا۔ میری منت سماجت کرتا رہا کہ اسے شوٹ نہ کروں اور آرام سے میری گاڑی کی ڈکی میں آ گیا اس طرح میں چوکیہ دار کی نظروں سے بچتا ہوا واپس سوسائٹی میں آ گیا۔ میں اسے یہاں لے آیا اور واپس روہم میں ہانچ دیا۔“

میں نے واپس روہم کی طرف دیکھا۔ ”ظفر تم نے یہ سب کیسے کیا۔ میں تمہیں بالکل بھی ایسا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔“

”میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ صرف سونیا کے لیے کیا ہے۔ وہ صرف چھ سال کی تھی۔ اس نے وہاں میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ انسان کیسے درد مند ہوتا ہے۔ اس نے آج تک صرف محبت دیکھی تھی۔ جب اس نے انسان کا یہ روپ دیکھا تو اسے مرتے ہوئے حقیقی تکلیف ہوئی ہوئی۔ شاید جسم سے زیادہ اس کی روح کو تکلیف ہوئی کی۔“

”اس لیے تم نے اسے چھ دن تک یہاں رکھا۔۔۔ اسے چھ دن سے اذیتیں دے رہے تھے۔“

”ہاں میں نے چھ دن سے شروع کیا تھا اور آج آخری دن تھا۔ سونیا کے چھ سال اس کے چھ دن میں چاہتا تھا کہ یہ بھی اتنی ہی تکلیف محسوس کرے جتنی میری بیٹی نے مرتے وقت کی ہوئی۔ شاید بھائی اگر آپ مجھ سے کہیں کہ آپ کے ہاتھ پر چاقو سے معمولی سا کٹ لگا دوں تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا لیکن اس کے ساتھ یہ سب کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ظفر تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ میں پولیس میں نہیں ہوں لیکن میں تو قانون کا محافظ، اس لیے مجبور ہوں میرے دوست۔ میں جنہیں قانون کے نام پر گرفتار کرتا ہوں۔“

جس وقت میں اسے باہر لارہا تھا ایبونیٹس پہنچ گئی تھی۔ میں نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ پولیس کی آمد سے پہلے سارا معاملہ منجمد ہو گیا تھا مگر میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ الیٹ لوگوں نے جبر کے نام مردہ وجود کو ایبونیٹس میں جاتے دیکھا تھا۔ پھر پولیس آکر ظفر کو ساتھ لے گئی۔ اس پر انہماک جس لیے جا اور شک و دقت سات مقدمات بنے تھے۔ جبر خاں کیا تھا مگر ایک ایسی زبردستی جسے موت سے بھی بڑھ کر کہا جا سکتا تھا۔ اس کے چھ دنوں اور ہاتھوں سمیت میں جگہ سے ہڈیاں تو زدی گئی تھیں۔ پیٹ اور سینے پر بے شمار کٹ تھے۔ اسے جلایا گیا تھا۔ اس کے تین دانٹ نکال دیے گئے تھے اور اس کی دونوں آنکھیں چھوڑ دی تھیں۔ زبان کی ٹوک کاٹ دی تھی۔ اس نے ظفر کے سامنے سونیا کے گلے کا اعتراف کیا تھا مگر ثبوت اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے عدالت نے اسے بری کر دیا۔ ظفر نے جو کہا اس کا اعتراف کر لیا اور عدالت نے اسے قیدی سزا سنائی تھی۔ جب اسے عدالت سے لے جایا جا رہا تھا تو وہ بہت خوش تھا۔



در

محترم معراج رسول
السلام علیکم

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ایک احساس ہے جسے ہر ایک کو محسوس کرنا چاہیے۔ بناس کا اپنا ظرف تھا بہو کا اپنا اب فیصلہ آپ کریں کہ ان دونوں میں ظرف کا بڑا کون ٹھہرا۔

صدر الدین امین بھابھانی
”اٹلانڈا، چار جیا“

”بھائی، کریم آباد لے چلو گے؟“

میں شام کے وقت لیاقت آباد نہر مارکیٹ کے قریب اپنے رکشے میں بیٹھا سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ عموماً مجھے سواری کے حصول میں کچھ زیادہ انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی لیکن آس روز میں کافی دیر سے اپنے مخصوص تاکے پر سواری کے انتظار میں کھڑا شیٹے کے پارکینگ دور

خلاؤں میں گھورتا ہوا سوچوں میں گم تھا کہ کچھ آس آواز نے مجھے چمکادیا۔ وہ لہجہ اور آواز جیسا کہ پہلے میں سمجھتا تھا یہ آج سے کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے نیا نیا رکشا چلانا شروع کیا تھا۔ خیر ارادہ تو میرا بچا اور ہی تھا۔ ویسے بھی آس وقت تو میں پڑھ ہی رہا تھا۔ میزک کے امتحانات سر پر تھے۔ ایک روز کچھ ابا کی کمر میں ایسا

رباعی
 اسے رنگ سخن دردی بجائے والو
 پھل غیر کے چیلوں کا اڑانے والو
 ختمیل تو روشنی کی تابکن ہے
 پانی سے چرخوں کو جلانے والو
 شاعر غفر کمالی

درد اٹھا کر وہ بستر سے ہی جاگے۔ اما کی کمر کے درد کا قصہ تو میں ہوش سنبھالتے ہی یاد آیا تھا۔ اما سارا سارا دن رکشا چلا کر جب رات دیر گئے گھر آتے تو جو پہلی بات اُن کی زبان سے نکلتی وہ کمر کے درد کی شکایت ہوتی۔ "ہائے...! شہوت کی ماں... ہائے...! یہ کمر کا درد تو کسی دن میری جان لے کر ہی چھوڑے گا! سارا سارا دن کھڑی کمر رکشا چلا کر تو میری کمر کا حزن جتھ ہو کر رہ گیا ہے۔"

پھر اماں دیر تک اُن کی کمر پر کسی سانی محلہ والی کے ہاتے تیل کی ماسٹ کرتیں۔ اگلے روز وہ صبح صبح اپنی کمر سہلاتے رکشائے کرکل پڑتے از رات دیر گئے پھر درد کی دعا کیاں دیتے واپس آ کر اماں سے باتیں کروا دیتے۔ باتیں سے کچھ آقا تو نہ تھا، ہاں البتہ اتنا اطمینان ضرور ہو جاتا تھا کہ چلو کوئی نہ کوئی علاج تو ہو رہا ہے؟ اماں اکثر اپنی جوبلی بچیلانے آٹھوں میں آنسو لیے ابا کے درد کے درماں کی دعا میں مانتیں۔ لیکن شاید اماں کی دعاؤں میں بھی اُس تیل کی طرح کوئی اثر نہ تھا جس کی نہ جانے کتنی ہی بولتیں وہ ابا کی کمر پر اڑیں جلی تھیں۔

ابا کے بہت سے دوستوں نے انہیں مشورے بھی دیے کہ کسی ایسے ڈاکٹر کو لکھا کر ڈراگ کر علاج کروالو۔ لیکن جس گھر میں کھانے والے سات منہ اور کام کرنے والے صرف دو ہی ہاتھ ہوں وہاں ڈاکٹر اور اُس کی لکھی ہوئی مہنگی دواؤں کا بھلا کیا کام؟

ابا کو اس ہر وقت کے کمر درد نے بے حد چڑچڑایا تھا۔ شاید اس میں اُن کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ جب کوئی تیس تیس سال دن رات بلا تاخیر رکشا کی پھر جیسی سخت سیٹ پر بیٹھ کر کراچی کی ٹونی چھوٹی کھڑے سڑکوں کے جھگے براشت کرتا ہے پھر ٹریک سے فوراً اور دھڑکیں سے آلودہ فضاء میں بارہ بار چودہ چودہ گھنٹے رکشا چلانے کا تو اُس کی کمر اور مزاج کا حشر تو آخری ہونا تھا نہ جانا کا ہوا۔

ابا جیسے ہی گھر میں داخل ہوتے، ہم سب بچے باپ کے ادھر ادھر ہوتے۔ اگر کوئی شامت اعمال کا مارا ابا کے بچے چڑھ کر ابا کو سمجھوتے قیامت ہی آگئی۔ دو چار کمر اسے جانچ کر دیکھ کر دوا کا معمول تھا۔ ہم بچوں کے ساتھ ساتھ اماں کی بھی شامت آتی۔ وہ بے چاری خواہ کتنا ہی اچھا کھانا کھانے نہ پکالے، پکڑے کتنے ہی صاف سترے کیوں نہ دھوئے اور کمر کے کونے کونے کو چھانچ کر کتنا ہی کیوں نہ چکا دے۔ ابا پر کام میں کیڑے نکال نکال کر مٹی کی سائے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ابا کی کمر کا درد بڑھتی کمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا اور مزاج بھی مزید چڑچڑا ہوتا چلا گیا۔

آخر آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ درد رکشائے کرکل تو جاتے لیکن چند ہی منٹوں بعد کمر قاسے ہائے ہائے کرتے واپس چلے آتے۔ اُن کے کمر آتے ہی ہم سب بچے گلی کی راہ لیتے اور جب تک یہ یقین نہ ہو جاتا کہ ابا سو گئے ہیں، کوئی بھی کمر واپس نہ آتا۔ پھر اُس روز تو کچھ ایسا درد اٹھا کہ ابا بیٹھ کے لیے چار پائی کے ہی ہو کر رہ گئے۔ میں گھر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اُس وقت میری عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس تو ضرور رہی ہوگی۔ میرے پیچھے وہ چھوٹے بھائیوں کے علاوہ دو بھینس اور دو گھنٹے۔ اماں نے خود تو کچھ نہ کہا البتہ اُن کے چہرے پر پھیلتے تاریک سائے، آنکھوں میں تیرتی بے جا رگی، کمر کے حالات اور ابا کی مستقل معذوری نے مجھے خود سے ہی رکشے کی پتھریلی سیٹ پر لیٹا اُس وقت سوار ہونے پر مجبور کر دیا، جب میٹرک کے امتحانات میں کوئی چند ماہ روکے تھے۔

سو وہ دن اور آج کا دن، میں رکشا چلا کر اپنے خاندان جس میں ایک عدد بچی اور دو بچوں کا اضافہ ہو چکا ہے، کی کفالت میں مصروف مہل ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میں بھی جب رات دیر گئے گھر نکلتا ہوں تو ابا کی طرح میری بھی کمر میں درد اور دبان پر ہائے ہائے ہی ہوتی ہے۔ سونے پہ سہاگہ کیے کہ میرا مزاج بھی اب کوئی ابا سے کم چڑچڑا نہیں رہ گیا۔ میرے گھر واپس آتے ہی لیکن بھائی اور سہیلے کوئے محمد رسول میں جاؤ سکتے ہیں۔ اماں اور بیوی تو اب جیسے میری کڑوی سیکی اور مٹی کی بالوں کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہ دوں، انہیں تو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ باقی رو گئے ابا تو وہ بے چارے چند سالوں تک چار پائی پر پڑے رہے اور پھر ایک روز

درد اٹھا کر کسی کسی کو شے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ناٹائمنڈ گزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
 پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
 امریکا، نیڈرلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
 بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
 آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ تمام ہی حسابے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ ایک طرف سے اپنے بیان کیلئے بہترین تفریحی ہو سکتا ہے جو دن ملک سے فارغین صرف ویشن یونین یا مٹی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

بلائے شریاس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ ڈیلی کیشنز
 C-63، 11، نیٹیشنل سٹریٹ، لاہور، پاکستان
 فون: 35895313، فیکس: 35802551

تہمت دہری کہ جسے میں آکر اس نے مجھے طلاق دے دی اور کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔
 ”مہربانو کے حالات سے تو میں پہلے ہی سے واقف تھا۔ جو خاتون اسے میرے پاس لے کر آتی تھی۔ اس کی زبان مجھے طلاق ہونے کی جڑ بھی مل گئی۔ کوئی یہ ماہ بعد میں نے مہربانو کے گھر رشتہ بھگایا اور آج ماشاء اللہ مہربانو میری بیوی اور میرے تین بچوں کی ماں ہے۔“ اسلم بڑا جرح پھیل چکی بار کھٹکوں میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔

”ہائی تو پھر تمہارے ساتھ شوہر نے دوسری شادی کی؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”ہاں...!، مجھے طلاق دلا دے تو اس کی ماں نے بڑی محرم دھام کے ساتھ بیٹے کی دوسری شادی کروادی۔ لیکن شادی کے تین سال گزر جانے کے بعد بھی ان کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر وی سیل کھیلنا چاہا۔ لیکن اس بار صاف خود اپنے حال میں آپ پھنس گیا۔“
 ”کیا مطلب؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”میرے ساتھ شوہر کی یہ بی بی اپنی ماں سے بھی زیادہ حیرانگی۔ ایک روز وہ شوہر کو لے کر اپنے سینکے حیدر آباد ایسی گئی کہ پھر مڑ کر واپس ہی نہ آئی۔ بتا ہے کہ وہاں اس کے گھر والوں نے اس کے شوہر کو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروا دیا تھا اور وہ اپنی بوزمی ماں کی روز روز کی شکایوں سے بے زار ہو کر اسے بھول بھال کر بس دھن کا ہورہا۔“

”اور اس کی ماں کا کیا ہوا؟“ میں نے مزید بے تابی سے پوچھا۔

”اپنے بیٹے کی چدائی اور نافرمانی کا اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ بیمار ہو کر اپنے بستر سے جاگلی۔ محلے والے ترس کھا کر کھانا کھلا دیا کرتے۔ ایک روز یہ بات اسلم کو اسی محلہ والی عورت نے بتائی۔ اسلم نے اس کا تذکرہ مجھ سے کیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسلم سے کہا کہ کیا میں کسی روز اس سے جا کر مل سکتی ہوں؟ اسلم بولا تو اسے شرمندہ کرنے کی خاطر وہاں جانا چاہتی ہو لیکن بات یہ تھی کہ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا کہ وہ اس بڑے محالے اور بیماری کی حالت میں بالکل اکیلا رہ گئی ہے۔ یہ سن کر اسلم نے مجھے خوشی خوشی وہاں جانے کی اجازت دے دی اور کچھ رقم بھی دے دی۔ میں جھمکتے کی جھمکتے وہاں جاتی۔ اسے ٹھکانا دے دیا۔ مگر صاف کرتی اور سو دھ مٹ لاکر ڈھیر ساری کھانے کی چیزیں بنا کر واپس چلی آئی۔ پھر چند سالوں بعد اس کا انتقال

ہو گیا۔“

”باقی اس عورت نے اپنے بیٹے سے تم کو بھائی طلاق دلا دی۔“ میں تو اس سے بدلہ لینا چاہیے تھا اور کوئی رشتہ بھی تو باقی نہ رہ گیا تھا جو تم وہاں جا جا کر اس کی خدمتیں کرتی رہیں۔“

”تھا ایک رشتہ...! درد کا رشتہ...!“

”درد کا رشتہ...؟“

”ہاں درد کا رشتہ...! ہمارے درمیان درد کی کا تو رشتہ تھا ہمارا درد ایک ماسی تو تھا! مجھے اس کے کہنے پر اس کے بیٹے نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور وی سیل خوراس کی ارنائوں سے لائی بنو کے کہنے پر اسے چھوڑ کر چلا گیا!“

”اور باقی رہ گئی بات بدلہ لینے کی تو میرے خیال میں یہ اپنے اپنے طرف کی بات ہے۔ جس کا جیسا طرف تو اس نے دی کیا۔“ مہربانو باقی نے جیسے ہی اپنی بات ختم کی اسلم بول پڑا۔

”اس روز میں مہربانو کے گھر سے نکلا تو شام کے سات گھرے ہو چلے تھے۔ دل کچھ بوجھل سا ہورہا تھا۔ مزید سوار پاں اٹھانے کا بالکل بھی بی نہیں چاہ رہا تھا۔ رستے کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ گھر کے تین دروازے پر میرا پانچ سالہ چٹا وحید کھیل رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس نے میرا رخا دیکھا فوراً گھر کی طرف بھاگا۔“

”وحید...! ادھر آ...!“ میں نے اسے بھانستے دیکھ کر حسب معمول زور سے آواز لگائی۔

وحید مڑا اور میرے دھیرے دھیرے میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے خوف نمایاں تھا۔ جب وہ میرے بالکل قریب پہنچا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اسے ڈر تھا کہ روز کی طرح سے خاک آلود کپڑوں کو دیکھ کر میں اس کے گالوں پر زور دار تھپڑیں مار دوں۔ میں اس کی طرف جھکا اور اپنا دانا کیاں ہاتھ کھول کر انہیں اٹھایا۔ میرا ہوا میں اترتا ہوا تھوڑے کچھ اس کی بڑی بڑی آنکھیں میرا گئیں اور اسے خوف کے لرزے لگے...!

میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے خاک آلود لباس کو اچھی طرح سے چھاد کر صاف کر دیا۔ پھر گو میں اٹھا کر اس کے سرخ و سفید چہرے پہاں اب خوف کی جگہ حیرت نے لے لی تھی کو چوتھے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا...!



بدلہ

محترم معراج رسول
آداب

میں پیشے سے وکیل ہوں صبح شام ایسے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ زیر نظر واقعہ بھی حیران کردینے والا ہے۔ یہ عقل سے ماوری واقعہ ہے لیکن گواہ میں خود ہوں۔

محمد ندیم ایڈووکیٹ
(کراچی)

کبھی کبھی پیشہ ورانہ زندگی میں کچھ ایسے واقعات سامنے آ جاتے ہیں کہ سوائے حیران ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔
 ہوا تھا کہ انہوں نے فرمایا۔ ”یہ جو کائنات ہے“ یہ عید کے خلاف میں لپٹی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے گھڑ پر اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگلی طرف موت اس کا انتظار کر رہی ہے یا زندگی یا کچھ اور۔“

”اور یہ جو کچھ اور ہے۔ دراصل یہی کچھ اور ہے۔
خوابوں کا ایک سلسلہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے خواب سے
جاگے تو خواب میں آئے۔ خوابوں کا سرمایہ خواب۔ صرف
حقیقت انھیں ہیں۔ ورنہ ساری دنیا خواب۔“
میں مرشد کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت میری کچھ
میں نہیں آیا تھا کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ کیسے پیچیدہ
کیسے خواب۔

پھر بعد میں میرے ساتھ جو واقعہ ہوا تو پتا چل گیا
کہ یہ دنیا واقعی پیچیدوں کے خلاف میں لپٹی ہوئی ہے۔
میں اپنے بارے میں یہ بتا دوں کہ میں پیچھے کے لحاظ سے
ایک وکیل ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ آپ نے وکیلوں کے بارے میں
بہت کچھ اٹنی سیدھی باتیں سن رکھی ہوں۔ لیکن میں آپ کو
یقین دلا دوں کہ میں ان چند وکیلوں میں سے نہیں ہوں
جو گناہ و گار کو بے گناہ ثابت کر کے اپنی من لپٹے ہیں۔ بلکہ
اگر کوئی واقعی مجرم ہو تو میں اس کا کیس ہی ہاتھ میں نہیں
لیتا۔ اور اگر کوئی بے گناہ ہو تو اس کو اس مصیبت سے
نجات دلانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہوں۔ اور میرا
خدا میرا پورا ساتھ دیتا ہے۔

اس واقعے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مجھے ایک
مفتی کی عیادت کے لیے ایک مضامنی بستی داؤد کوٹھ
جانا پڑ گیا۔

داؤد کوٹھ شہر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ زیادہ سے
زیادہ دس بارہ کلومیٹر۔ لیکن چونکہ وہاں آبادی کا زیادہ دباؤ
نہیں ہے۔ اسی لیے اس کی مرکزی شاہراہ پر ٹریفک بھی بہت
کم ہوا کرتی ہے۔ وہ بتا کہ مفتی اسی کوٹھ میں رہا کرتا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی مرکزی شاہراہ پر ایک طرف
کھڑی کر دی۔ اس کا انجن بند کر دیا اور اسی وقت ایک
پولیس موپائل میری گاڑی کے پاس آ کر رک گئی۔

”اوہو نعم صاحب ہیں۔“ کسی نے موپائل سے
آواز لگائی۔

میں نے موپائل کی طرف دیکھا۔ میرا ایک واقع کار
انجینئر خوب موپائل سے آکر گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ ہم
دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔

”یار! اس طرف کہاں سے آ گئے۔“ عمر نے
پوچھا۔

”بھائی! یہاں عدالت کا ایک کارندہ رہتا ہے،“

رحیم اللہ اس کے بارے میں سنا تھا کہ بہت تیار ہے۔
کو بیٹھے آگیا ہوں۔“

”ہاں ہاں، جانتا ہوں اس کو۔“ عمر نے کہا۔
چارہ واقعی بہت تیار ہے لیکن پہلے ہمارے قاتل سے
ہوتے جائیں۔ آج ہمارے سب انجینئر کے گھر سے گزرتے
کا علم آیا ہے۔“

”نہیں پھر ٹھیک ہے۔ تم پتہ میں رحیم اللہ کو
کراتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم نے گاڑی تو کھڑی کر دی ہے۔“
سامنے والا کار اندر سے ہی کے مکان پر جاتا ہے۔“
میں اسی کے راستے پر چلا ہوا رحیم اللہ کے مکان پر
آ گیا۔ وہ بے چارہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔

”ارے وکیل صاحب! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا
کہ آپ مجھے غریب کو کھینچے آتی دور آ جائیں گے۔“
”کیسی بات کر رہے ہو بھائی۔ کون امیر کون
غریب۔“ میں نے کہا۔ ”میں بھی تمہاری طرح ایک مزدور
ہوں۔ یہ بتاؤ اب کیسے ہو۔“

”اب تو پہلے سے بہت بہتر ہوں وکیل صاحب۔“
اس نے بتایا۔

”نہیں جلدی سے ٹھیک ہو کر اپنا کام شروع کر دو۔“
میں نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یار! ان سے پہلے وغیرہ نکالیں۔“

وہ انکار کرتا رہا۔ لیکن میں نے اس کی جیب میں نوٹ
ڈال دیے۔ کچھ دیر بعد کہ میں اس کے گھر سے باہر آ گیا۔
ابھی اس کے گھر سے کچھ ہی دور چلا ہوں کہ میں نے شور
سنا۔ کچھ لوگ ڈھبے لالچیاں اٹھائے ایک طرف دوڑتے
چارے تھے۔ شاید وہ کسی کا تعاقب کر رہے تھے۔ کیونکہ اسی
قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اس طرف چارہا ہے۔ اور
سے گھیر دے۔“

”وہ اور ہے اس طرف۔“ میں نے خود دیکھا ہے۔“
میں نے ایک بوڑھے کو پکڑ لیا۔ جو بے چارہ اس
دوڑتے ہوئے مجمع کا ساتھ نہیں دے پارہا تھا۔ ”پتا چل گیا
ہاں ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا کوئی پتہ آ گیا ہے؟“

”نہیں صاحب، مگر یہ کوئی اور ہی پتہ ہے۔“
میرے معلوم کرنے پر اس بوڑھے نے جو کچھ بتایا
وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ دو برس پہلے ایک مکمل پوش اس
علاقے میں آیا اور وہ ایک کھیلنے ہوئے بچے کو اپنے ساتھ

لے گیا۔ شام کے وقت اس بچے کی لاش ایک درخت کے
پاس پڑی تھی اور اسے سانپ نے کاٹا تھا۔ اس کے بعد
وہ اگلے سال بھی ایسا ہی ہوا۔ مکمل پوش آیا اور ایک بچے کو
اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کی لاش بھی اسی درخت کے پاس
پڑی تھی اور اس کو بھی سانپ نے کاٹا تھا۔ اس سال بھی وہ
یہاں آیا لیکن بچے کو لے جانے میں ناکام رہا۔ کیونکہ کچھ
لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب سب اس کا پتہ چلا کر رہے
ہیں۔“

تو یہ جی وہ کہانی جو مجھے اس بوڑھے نے بتائی۔ حیرت
انگیز صورت حال تھی۔ سچ حال میں اپنی گاڑی کے پاس آ گیا۔
گاڑی اپنی جگہ موجود تھی۔ ویسے بھی ایسے علاقوں میں گاڑی
وغیرہ کی پھریاں نہیں ہوا کرتیں۔

میں نے اس وقت ایک عورت کو دیکھا جو سڑک سے
کچھ فاصلے پر بڑی بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹھل
رہی تھی۔ میں اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس کے
لباس وغیرہ سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس علاقے کی نہیں
ہو سکتی تھی۔

بہر حال مجھے اس سے کیا تھا۔ میں نے گاڑی
اشارت کر دی۔ وہ گاؤں والے بھی اب دکھائی نہیں دے
رہے تھے جو کسی پر اسرار آدمی کا پیچھا کر رہے تھے۔ نہ جانے
وہ کس طرف نکل گئے ہوں گے۔

وہ صحت کے بعد میں اس علاقے کے قاتل کے ہاتھی
گیا جہاں انجینئر خوب میرے انتظار میں تھا۔ ”آؤ یار، کہاں
رہ گئے تھے۔ تمہارا معلم غلط ہو رہا تھا۔“

”بھائی! ادھر گاؤں والے کسی بندے کو پکڑنے کے
پتہ میں اس کے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔“ میں نے بتایا۔ ”پتا
ہے وہ برسوں ایک بچے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔“

”ہاں یار، سنا تو میں نے بھی ہے۔ اس کی ایف آئی
آ رہی تھی ہوتی ہے۔ آپ رہنے دیں مگر۔ ان علاقوں میں
ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔“

ابھی ہم ملے کھا رہے تھے کہ ایک پولیس والے نے
آ کر بتایا۔ ”بڑی سڑک پر ایک گاڑی والے نے ایک بندے
کو پکڑ لیا ہے۔“

”یہ لو وکیل صاحب، یہی کہانی آگئی۔ تم تو معلم کھاؤ
میں چلا ہوں۔ دیکھوں تو کسی کس نے کس کو مار دیا ہے۔
اگر لپٹا پکڑ ہوا تو مجھے لاش لے کر اپنا پتا چاہنا ہوگا۔“

”تم میری خدمت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”میں معلم کھا کر
نکل رہا ہوں۔“

یہ حوالہ واقعہ تھا جس کی طرف میں نے زیادہ
دھیان نہیں دیا تھا۔ بلکہ اپنی مصروفیات میں اس واقعہ کو بھولنا
چارہ تھا کہ ایک دن دفتر میں ایک عورت مجھ سے ملنے کے
لیے آ گئی۔

وہ ایک خوبصورت جوان عورت تھی۔ لیکن بہت
اواں اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔
”تشریف دیکھیں محترمہ۔“ میں نے سامنے والی کرسی
کی طرف اشارہ کیا۔

وہ شہر یا ادا کر کے بیٹھ گئی۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ
پریمی تھی بھی ہے اور اسے میری بھی آتے ہیں۔ میں اس
کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے زبان
کھولی۔ ”وکیل صاحب! خدا کے لیے میرے شوہر کو
پچالیں۔ میں آپ کی خدمت میں کر آپ کے پاس آئی ہوں۔“
”دیکھیں محترمہ، بچانے والی ذات تو خدا کی ہوتی
ہے۔“ میں نے کہا۔ ”انسان تو صرف کوشش ہی کر سکتا ہے۔“
”اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔“
”تو فرما میں۔ کیا ہوا ہے آپ کے شوہر کے
ساتھ؟“ میں نے پوچھا۔
”انہیں مر ڈر کے ایک کیس میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“
اس نے بتایا۔
”اوہ! یہ تو عجیبہ معاملہ ہے۔ کس کے مر ڈر کا الزام
ہے ان پر۔“
”کچھ کچھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا بتاؤں۔ میں بھی
ان ہی کے ساتھ تھی۔“
”یعنی جس وقت آپ کے شوہر نے کسی کا مر ڈر کیا
اس وقت آپ بھی ان کے ساتھ تھیں۔“
”جی ہاں، اور میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ شاید نے
کسی انسان کو نہیں مارا۔ بلکہ اس نے ایک سانپ کو مارا
تھا۔“ اس نے بتایا۔
”سانپ کو۔“
”جی ہاں۔ خدا گواہ ہے انہوں نے سانپ کو مارا
تھا۔“ اس عورت نے بتایا۔
”محترمہ، بہتر یہی ہے کہ آپ ذرا تفصیل سے
بتائیں کہ ہوا کیا تھا۔“
”ہم دونوں کبھی کبھی شہر سے باہر لانگ ڈرائیو پر نکل

جاتے ہیں۔" اس نے تانا شروع کیا۔ "اس دن بھی ہم شہر سے باہر داؤد کو گھسیٹ کر طرف نکلتے تھے۔"

"داؤد کو گھسیٹ" میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں رحیم اللہ کی عیادت کے لیے گیا تھا۔

"ہم سڑے سڑے سے پہلے جا رہے تھے کہ اچانک سڑک پر ایک سانپ لہرا ہوا دکھائی دے گیا۔ میرے شوہر نے کہا کہ یہ خطرناک سانپ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کو مچل دیا جائے۔ میرے شوہر نے سانپ کو چل دیا۔ لیکن وہ تھپکا ہوا میں سر اٹھیں تو جگہ صرف ڈی ہوا تھا۔ میرے شوہر نے گاڑی روک کر اس کی اوور بارہ مچل دیا۔ اتنی دیر میں پولیس پہنچی گئی اور ہم نے دیکھا کہ سڑک پر سانپ تو نہیں البتہ ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔"

"بہت اچھی ہوئی کہانی ہے۔" میں نے ضروری باتیں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لی تھیں۔ "ٹھیک ہے میں یہ کیس لینے سے پہلے آپ کے شوہر سے ملوں گا۔"

"ضرور۔" اس عورت نے کہا۔ "وہ داؤد کو گھسیٹنے کے لاک اپ میں ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ وہ تھانہ تو میری کا تھا۔ اسی تھانے میں اس دن میں نے طیم کھایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ واقعہ بھی اسی دن کا ہوگا۔ جب میں نے کچھ لوگوں کو ڈھڑے لگائیاں لیے کسی کے تھاقہ قبیل میں جلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

یہ بھی ایک دلچسپ کیس معلوم ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے اس عورت سے کیس لینے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن شرط وہی تھی کہ اگر وہ میری نگاہوں میں مجرم ثابت ہوا تو میں یہ کیس نہیں لڑوں گا۔ وہ کوئی اور دیکھ لے کر۔"

☆ ☆ ☆

میں ایک بار پھر داؤد کو گھسیٹنے کے تھانے میں شوہر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"کمال ہو گیا وکیل صاحب! یہ کیس بھی آپ ہی کے پاس پہنچ گیا۔" اس نے کہا۔

"کیا کروں بھائی، مصیبتیں مجھ ہی کو تلاش کرتی ہوتی آتی ہیں۔"

"ویسے ایک بات بتاؤں۔ مجھے بھی وہ بندہ جھوٹا نہیں معلوم ہوتا۔" شوہر نے کہا۔ "اس کا بیان ہے کہ اس نے کسی بندے کو گھسیٹ کر سانپ کو مارا تھا۔"

"کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب آپ سے ملاقات تو کروانا ہوگی تاہم وکیل صاحب۔" شوہر ہنس پڑا۔ "آپ ویسے تو واپس نہیں جائیں گے۔"

اس عورت کا شوہر شاہد لاک اپ میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو وہ خوش ہو گیا۔ "تمی ہاں، میں نے بھی آپ کا نام سن رکھا ہے۔" اس نے کہا۔ "خدا کے لیے اس مصیبت سے نجات دلوائیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کم بخت سانپ انسان کیسے کھس گیا۔ یا ہو سکتا ہے کہ میں واسے کا بھڑا ہو گیا ہوں۔ وہ انسان ہی ہو۔ بہر حال میری بچھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت میں کچھ نہیں ہوں۔"

"تمیں، آپ وکالت نامہ پر سامن کر رہے۔" میں نے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔ "اس کے بعد دیکھتا ہوں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

شاہد سے سامن کر کے میں شوہر کے پاس واپس آ گیا۔ وہ اس وقت گاؤں کے کسی آدمی سے الگ ہوا تھا۔ وہ اسے ڈانٹ ڈھپ کر رہا تھا۔ "انسان کا بندہ کتن چاہ۔ شرم کر! اتنا کر تیل جو ان ہو کر عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

"صاحب، وہ بھی تو زبان چلاتی ہے۔" اس نے کہا۔

"اوئے مردہ بن۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو اسے مارنا شروع کر دے۔ اب جاگ جا۔ آئندہ کوئی شکایت ملی تو بندہ کر دوں گا۔"

گاؤں والا جان بچا کر بھاگ نکلا۔

اس کے جانے کے بعد شوہر نے کہا۔ "دیکھ لیا وکیل صاحب۔ ان ملاطفت میں دن بھر بھی ہوتا رہتا ہے۔ میں بھی ڈانٹ ڈھپ کر کے بھاگ دیتا ہوں۔"

"چلو، یہ تو تم خدمت طلب کر رہے ہو۔"

"ہاں جی اب تمہیں، کیسا لگا وہ بندہ۔"

"بندہ تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی نگاہوں نے دھوکا ہی کھایا ہو۔ اس نے انسان کو سانپ سمجھ لیا ہو۔"

"کچھ عجیب کہانی ہے وکیل صاحب۔ بندہ بھی بھونچ نہیں معلوم ہوتا۔ دوسری طرف گاؤں والے بھی جھوٹ نہیں بول رہے۔ سب کا کہنا ہے کہ اس نے ایک بندے کو مچل کر مارا تھا اور اپنی گاڑی روک کر بھی کرتا رہا تھا۔"

"پتا نہیں کیا پیید ہے جی۔"

"ہاں، اس سڑے والے کی لاش کہاں ہے۔" میں

نے پوچھا۔

"مردہ خانے میں ہے وکیل صاحب۔ پوسٹ مارم کے لیے جارہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "اب بتائیں، کیا خیال ہے اس کیس کے بارے میں۔"

"کیس تو لڑوں گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ مجھے وہ آدمی بے گناہ معلوم ہو رہا ہے۔"

☆ ☆ ☆

تھانے سے واپسی پر میں نے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ عورت سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے پاس کھڑی ہوئی دکھائی دی۔

وہ ایک جوان عورت تھی۔ اس نے خود کو ایک عداور میں پیٹ رکھا تھا۔ میں اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس کے سر اپنے نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ایک جوان جسم کی عورت ہے۔

وہ ایک درخت کے پاس اکیلی کھڑی۔

میری گاڑی کی آواز سننے ہی وہ تیزی سے سڑک پر آگئی اور کس وقت اس کا چہرہ بھی دکھائی دے گیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی کشش تھی جو بہت کم دکھائی دیتی ہوگی۔

بے اختیار ہو کر میں نے گاڑی کی رفتار بھی کم کر دی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بس تیزی سے سڑک کی طرف آگئی جی اسی تیزی سے واپس بھی چلی گئی۔

میں کچھ دیر وہیں رک کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن دور رشتوں کے درمیان جا کر کہیں کم ہو گئی تھی۔ بہر حال میں نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔

آفس پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے جلدی سے ریسور اٹھالیا۔ دوسری طرف شوہر تھا جو بہت پریشان محسوس ہو رہا تھا۔ "یار وکیل صاحب میرے ساتھ تو ایک عجیب قاتل شاہد ہو گیا۔"

"اب کیا ہو گیا۔"

"اس بندے کی لاش ہی قاتل ہو گئی۔" اس نے بتایا۔ "کیا بتائیں چمک پڑا۔" لاش قاتل ہو گئی۔ کس طرح کہاں سے عجب قاتل ہو گئی۔"

"وکیل صاحب میں خود آپ کے پاس آ رہا ہوں جی۔" اس نے بتایا۔ "آکر ساری کہانی سنائوں گا۔ اس وقت تو میرا دم مار ہی محسوس ہو رہا ہے۔"

میں بہت حیران تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ لاش تو پولیس

نے اپنی کھڑی میں رکھوائی تھی پھر قاتل کیسے ہو گئی۔۔۔۔۔

لاش اگر واقعی قاتل ہو گئی تھی تو بے چارہ شوہر بے پروائی اور غفلت کے الزام میں کچھ سزا کھاتا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد شوہر میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ بہت حواس باختہ ہو رہا تھا۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ دو گلاس پینے کے بعد اس کے اور سامن بھال ہوئے تھے۔

"وکیل صاحب جب کہانی ہے جی۔" اس نے بتایا۔ "پوسٹ مارم کے لیے جب لاش کو کیس سے نکالا گیا تو لاش قاتل تھی اور اس کی جگہ۔" وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"ہاں ہاں تانا، رک کیوں گئے؟"

"وکیل صاحب اس بندے کی لاش کی جگہ ایک سانپ مر رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

"سانپ! میں اچھل ہی پڑا تھا۔" یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"ایسا ہی ہوا ہے جی۔ اس پکڑ میں میری تو نوکری ہی خطرے میں پڑ گئی ہے۔" اس نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہے کہ اس نے سانپ کو مارا تھا۔"

"پتا نہیں کیا پکڑ ہے جی۔ کون ان باتوں کا یقین کرے گا۔"

"شوہر، چلو حافظہ سعید صاحب کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کیوں ہیں۔"

"ایک بہت بڑی روحانی شخصیت۔" میں نے بتایا۔ "حالانکہ آج کے دور میں ہمیں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن واقعات تو ہمارے سامنے ہی تھے۔ ہم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے؟"

☆ ☆ ☆

حافظہ سعید احمد جی محنتوں میں ایک اللہ والے شخص تھے۔ میں اپنی مصروفیات کے باوجود بھی کبھی ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا اور ان کی دعاؤں کے لیے دعا کرتا تھا۔

ان کا کوئی آستانہ وغیرہ نہیں تھا۔ ان کا اپنا کچن و کلا کارو بار تھا جس میں اللہ نے بہت برکت دے رکھی تھی۔ بہت کم لوگ ان کے درجے سے واقف تھے۔ میں بھی ان چند خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔

ہم دونوں جب ان کے پاس پہنچے تو وہ نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔ شوہر تو۔۔۔ دیکھتے ہی ان سے حشر

ہو گیا تھا۔
ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے سعید صاحب کو
ساری کہانی سنادی۔

سعید صاحب یہ سب سن کر بہت بے چین سے ہو گئے
تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر تک نہ
جانے کیا کیا پڑھتے رہے۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر بولے۔
”ہمارے خدا نے اس کائنات میں اتنے عجیب و غریب کچھ
کر انسان کا علم ناقص ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان میں سے ایک
عجیب یہ ہے۔ انتہائی حیرت انگیز عجیب۔ لیکن خدا نے اپنی
مخلوقوں سے یہ بات بھی پرکار کر دیا ہے۔“

”حضرت، کیا تمہارے سب“ میں نے پوچھا۔
”ہاں آپ دونوں حضرات کچھ دیر خاموش بیٹھے
رہیں۔ میں کچھ پڑھا ہوں۔“

ہم دونوں خاموش بیٹھے ان کی طرف دیکھتے رہے۔
انہوں نے پھر آنکھیں بند کر لی ہیں اور زہرا لب کچھ بولنے
چارہ ہے تھے۔

میرا خیال ہے کہ ان کا یہ عمل چند روز میں منٹ جاری
رہا ہوگا کہ دروازہ کھلا اور ایک عورت کمرے میں داخل
ہوئی۔ میں اس عورت کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا تھا۔ یہ
وہی عورت تھی جس کو میں نے گٹھ سے واپس آتے ہوئے
درخت کے پاس دیکھا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ عورت اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا یا
اس کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن خود میری یہ کیفیت تھی کہ میری
دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

اس عورت کے جسم سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ عجیب سی
مسکروں والی خوشبو۔ میرے گھر سے ایسی خوشبو کبھی
نہیں آئی ہوگی۔

وہ کمرے کے وسط میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے
سعید صاحب کی طرف دیکھا۔ ”کیوں بلا یا ہے مجھے۔“
”تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“ سعید صاحب دوسرے
سے بولے۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اپنی منزل کی طرف
جا رہی تھی کہ تم نے راستے سے بلا لیا۔“ اس نے کہا۔
”اور وہ منزل کیا ہے تیری۔“ سعید صاحب نے
پوچھا۔

”وہ آدمی جس نے میرے ساتھ کو مارا ہے۔“ اس
نے بتایا۔ ”اس کی خوشبو پانی ہے میں نے۔“

”لیکن اس نے تو ایک سانپ کو مارا تھا۔“
”وہی تو میرا ساتھی تھا۔“ اس نے کہا۔
”وہ گاؤں کے بچوں کو کیوں مار رہا تھا۔“

”اس لیے کہ گاؤں کے بچوں نے ہمارے دو بچوں کو
چتر مار مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ کیا بچاؤ تھا ہمارے بچوں نے۔
وہ دونوں تو ایک طرف ایک دوسرے سے کھیل رہے تھے۔“
”انہوں نے تو سانپ کچھ مارا ہوگا۔“

”کچھ بھی ہو۔ ہمارے ساتھ یہ علم ہوا تھا۔“ اس نے
کہا۔ ”ہمارے دو بچوں نے بچے مر گئے۔ اس لیے میرا ساتھی
ہر سال اسی تاریخ کو ان بچوں کو مار رہا تھا۔“

”دیکھ“ جو کچھ ہوا لفظ فکری میں ہوا ہے۔ جانے دے
اب اس بات کو۔“
”نہیں“ میں اپنے ساتھی کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ
سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”اور اب میں جا رہی ہوں۔“

پھر وہ اتنی تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی کہ ہم
سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ خود سعید
صاحب بھی گھبرائے ہوئے تھے۔

”اب کیا ہوگا حضرت۔“ میں نے پوچھا۔
”جاؤ جلدی۔ اس آدمی کو بچاؤ اس کی جان خطرے
میں ہے۔“ سعید صاحب نے کہا۔

اتنا سنتے ہی تصویر اور میں نے باہر کی طرف دوڑ
لگا دی۔ ہم اس قاتل کی طرف جا رہے تھے جہاں شاہد کو
لاک میں رکھا گیا تھا۔

لیکن ہمیں بہت دیر ہو چکی تھی۔ شاہد کو کسی سانپ نے
خس لیا تھا اور وہ اتنا زہرا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ زہر
ترپ کر خٹھل ہو گیا تھا۔

تو یہ قاتل پراسرار کیس جس کے کچھ اہم حصے میری
نگاہوں کے سامنے سے بھی گزرے تھے۔۔۔ آج بھی میں
یہ سوچتا ہوں کہ یہ سب آخر کیا تھا۔

کیا کچھ عجیب ایسے ہی ہوتے ہیں جن کی کوئی تشریح
نہیں کی جاسکتی۔ کیا جو کچھ ہمارے سامنے ہے۔ وہ حقیقت
ہے یا جو اس کے پیچھے ہے وہ حقیقت ہے۔

خواب سے جاگتے تو خواب ہی دیکھا۔ خوابوں کا
سرمایہ خواب۔
صرف حقیقت آنکھیں ہیں۔ ورنہ ساری دنیا
خواب۔

●●●



جناب ایڈیٹر سرگزشت
آداب!

یہ کہ کسی اور کسی نہیں میری اپنی روداد ہے۔ ایک مظلوم وہ کس
عورت کے جال میں پھنس کر میں نے بھی بہت کچھ کھو یا پھر بھی
مجھے ہمدردی ہے اس مظلوم عورت سے۔ ایسا کیوں یہ آپ میری
روداد پڑھ کر پتا کر سکتے ہیں۔

نذیم
(راولپنڈی)

میں رک گیا۔ ”جی فرمائیں۔“
”جناب! کیا آپ کسی مفتی سے واقف ہیں؟“ اس
نے پوچھا۔

”مفتی!“
”میرا مطلب ہے کوئی عالم دین جو مجھے صحیح مشورہ
دے سکے۔“ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اس مسجد کے پیش امام صاحب
عالم دین ہیں۔“ میں نے بتایا۔

وہ مجھے محلے کی مسجد کے سامنے والے ایک درخت
کے پاس چپ چاپ کھڑا ہوا دکھائی دیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں
حول صورت اور خوش لباس نظر آیا تھا۔ نہ جانے کیوں
میرا دل چاہا کہ میں اس سے بات کروں۔ لیکن کسی سے گفتگو
کا کوئی جواز تو ہونا چاہیے۔ پھر جب میں اس کے برابر سے
گزرنے لگا تو یہ مشکل اس طرح حل ہو گئی کہ خود اسی نے
مجھے آواز دے کر روک لیا تھا۔ ”بھائی جان! ذرا ایک منٹ
میری بات سن لیں۔“

”ہاں! کی تو۔ لیکن۔۔۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔“ بات یہ ہے کہ میں ان سے مطمئن نہیں ہو سکا ہوں۔ اگر آپ کی نایاب میں کوئی اور ہوں تو پلیز بتادیں۔ میں اس وقت سخت پریشان ہوں۔“

مجھے اس سے بھڑادی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ یقیناً کسی پرانے میں تھا۔ پھر مجھے مولانا قاسمی صاحب کا خیال آ گیا۔ وہ میری جان بچان کے تھے اور میں ان کے بارے میں کبھی شک تھا کہ وہ عالم دین ہیں۔

”کی ہاں! ایک ہیں۔ مولانا قاسمی صاحب۔“ میں نے بتا دیا۔

”وہ کہاں ہیں گے۔“

”رہائے مسجد میں۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت وہ اپنے حجرے میں ہوں گے۔ ان کا حجرہ مسجد کے ساتھ ہی ہے۔“

”پلیز! کیا آپ وہاں تک لے چکیں گے۔ میں اس حجرے میں آیا ہوں اس لیے مجھے نہیں معلوم۔“

”کوئی بات نہیں۔ آئیں چلتے ہیں۔ پیدل ہی کا راستہ ہے۔“

میں اس سے کچھ پریشان چاہ رہا تھا۔ لیکن اس کی تنبیہ کی اور اداسی دیکھ کر میں بھی خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مسجد آگئی۔ قاسمی صاحب اپنے حجرے میں ہی تھے۔

مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ”ارے بھائی! آپ سے تو ملنا ہی نہیں ہوتا۔“ انہوں نے کہا۔

”میں شرمندہ ہوں قاسمی صاحب۔ مجھے فرصت نہیں ملتی۔ ویسے اس وقت میں ان صاحب کو آپ کے پاس لے کر آیا ہوں۔“

”شرور! فرمائیے۔“

میں نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ میں نے سوچا کہ میں حجرے سے باہر چلا جاؤں۔ نہ جانے اس کا کیا مسئلہ ہے۔ میرے سامنے بیان کرنا پسند کرے یا نہ کرے۔

شاید اس نے بھانپ لیا اس لیے جلدی سے بولا۔ ”ارے صاحب! آپ بھی نہیں۔ یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

پھر اس نے بتایا کہ اس کا نام جمیل ہے وہ لاہور سے گرائی آیا ہے۔ کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے ایک مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ دو دن پہلے اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے میں آکر بیوی کو طلاق

دے دی اور اب شرمندہ ہے۔ رجوع کرنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ اس معاشرے میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ روزانہ اس معاملے میں نہ جانے کتنے کتنے غم جو جاری کیے جاتے ہیں۔ عدالتوں میں درجنوں مقدمات چلتے رہتے ہیں۔

مولانا صاحب نے اسے سمجھانا شروع کر دیا تھا۔ ”بھائی! خدایا! اسے قوام ہوتا ہے کہ یہ آنکھوں پر پٹا باندھ دیتا ہے۔ اب تم نے جو کیا ہے۔ اس کی سزا تو ملنی ہے۔“

”کیا وہ بارہ رجوع کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔“

اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ سوائے طلاق کے اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔“

مولانا صاحب نے اسے طلاق کے مسائل سمجھائے۔

”اب ایک سوال اور کرنا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میں شہر میں ہم دونوں تھا ہیں۔ یعنی ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ ایسی صورت میں وہ عدالت کہاں گزرا۔“

”وہ اس وقت کہاں ہے۔“

”اسی مکان میں۔ جو ہم نے کرائے پر لیا ہے۔“

ایسی بیجوری کی صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ دونوں الگ کمروں میں رہیں۔“ مولانا صاحب نے کہا۔ ”کوشش یہ کریں کہ ایک دوسرے کے آنے سامنے نہ آئیں۔“

”کی ہاں! یہ تو ممکن ہے۔“ اس نے کچھ سوچ کر بتایا۔ ”کیونکہ ایک کمر مکان کے گیٹ کے ساتھ ہے۔ میں اس میں رہ سکتا ہوں۔“

”ہاں، تو پھر اسے عدت گزارنے دیں۔ خدا آپ جیسوں کو نیک جزا دے۔“

دوسرے جگہ مولانا صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ میں اس کی تکفیل کو سمجھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اور میں مولانا صاحب کے حجرے سے باہر آ گئے۔ وہ اس وقت بہت اداس ہو رہا تھا۔ شاید شرمندگی کے شدید احساس نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

”اچھا بھائی! مجھے اجازت دیں۔“ میں نے باہر آ کر کہا۔

”شاید اب کچھ نہیں ہو سکا۔“ وہ اپنے آپ سے بولا۔ ”کچھ نہیں ہو سکا۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ پاگل ہو گیا تھا میں۔“

”جمیل صاحب۔“ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔

مجھے اجازت دینا۔“

”پلیز! دو منٹ میرے ساتھ رک جائیں۔“ اس نے اٹھائی۔ ”اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔ میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔“

”میں آپ کی پریشانی سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ایسا کریں! آپ میرے کمر چلیں۔ میں بھی اسی کمرے میں رہتا ہوں۔ کچھ دیر تک کمرے چلے جائیں گے۔“

”نہیک ہے صاحب۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس وقت مجھے واقعی کسی سہارے کی ضرورت ہے۔“

میں اسے اپنے کمرے لے آیا۔ ایک منزل چھوٹا لیکن خوبصورت مکان۔ میں نے یہ مکان بہت شوق سے جو لیا تھا اور اس کی آرائش بہت آرتھک اعزاز میں کی تھی۔ کوئی بھی شخص میرے مکان میں آکر اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے بھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تقریبی

لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

”بہت خوبصورت مکان ہے آپ کا۔“ اس نے کہا۔ ”مکان کی حیثیت یہ بتا رہی ہے کہ آپ اعلیٰ ذوق کے مالک ہیں۔“

”یہ تو ہے۔ لیکن جمیل صاحب! اصل ذوق اسی وقت سامنے آتا ہے جب اس کی ٹھیکل کے لیے میچے بھی ہوں۔“

”یہ بات تو ہے۔“ اس نے تائید کی۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ با شمارا۔“

”ہاں خدا کا شکر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنا بزنس ہے اور وہ ٹھیک ہی چارہا ہے۔ خیر! آپ بتائیں آپ کے ساتھ کیا ہوا۔“

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ظاہر ہے یہ اس کا گھریلو معاملہ تھا اور میں اتفاقاً اس میں الٹو ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کا نام جمیل ہے۔ لاہور سے تعلق ہے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کی پسند تو کچھ اور تھی۔ لیکن والدین نے زبردستی اس کی شادی مدیحہ سے کرادی۔ جس کے بارے میں اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی زبان دراز ثابت ہوگی۔

وہ مدیحہ کو اس لیے لاہور سے کراچی لے آیا تھا کہ شاید یہاں آکر اس کی عادت بدل جائے۔ لیکن اس کی زبان درازی قائم رہی۔ اس کے باوجود وہ مدیحہ سے محبت کرتا رہا اور آج بھی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ گرچہ مجھے

وہ مدیحہ کو اس لیے لاہور سے کراچی لے آیا تھا کہ شاید یہاں آکر اس کی عادت بدل جائے۔ لیکن اس کی زبان درازی قائم رہی۔ اس کے باوجود وہ مدیحہ سے محبت کرتا رہا اور آج بھی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ گرچہ مجھے

وہ مدیحہ کو اس لیے لاہور سے کراچی لے آیا تھا کہ شاید یہاں آکر اس کی عادت بدل جائے۔ لیکن اس کی زبان درازی قائم رہی۔ اس کے باوجود وہ مدیحہ سے محبت کرتا رہا اور آج بھی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ گرچہ مجھے

وہ مدیحہ کو اس لیے لاہور سے کراچی لے آیا تھا کہ شاید یہاں آکر اس کی عادت بدل جائے۔ لیکن اس کی زبان درازی قائم رہی۔ اس کے باوجود وہ مدیحہ سے محبت کرتا رہا اور آج بھی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ گرچہ مجھے

وہ مدیحہ کو اس لیے لاہور سے کراچی لے آیا تھا کہ شاید یہاں آکر اس کی عادت بدل جائے۔ لیکن اس کی زبان درازی قائم رہی۔ اس کے باوجود وہ مدیحہ سے محبت کرتا رہا اور آج بھی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ گرچہ مجھے

میں آکر اسے طلاق دے چکا ہے۔

”جمیل صاحب! کیا ضروری ہے کہ طلاق کے بعد جب وہ دوبارہ آپ کے پاس آئے تو اس کا حرج بدل چکا ہو۔“

”کوئی ضروری نہیں ہے۔ لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں شاید اس کے بغیر وہ نہیں سکوں گا۔ چاہے وہ بھی بھی ہو۔ زندگی بھر اس کی بدحاشی برداشت کرتا رہوں گا۔“ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”ندیم صاحب! محبت تو شاید اسی کا نام ہے نہ کیوں؟“

”ہاں بھائی! محبت اسی کا نام ہے۔“

”آپ کی بیوی بچے کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جمیل صاحب! حالات ایسے رہے کہ میں ابھی تک شادی نہیں کر پایا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”اوہ!“

کچھ دیر بعد وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچھا خاصہ مقول آدمی۔ ذرا سی غلطی نے اس کا کیا حال کر دیا تھا۔

کئی دنوں کے بعد اس سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا۔ ”ندیم صاحب! میں آپ کے پاس آنا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی۔“

”کس بات کی ہمت۔“

”میں خیال آیا کہ آپ پتا نہیں کیا خیال کریں۔“ اس نے کہا۔

”ارے! مجھے کیا خیال کرنا ہے۔ بلکہ مجھے تو خوشی ہوئی۔ چلیں گھر چل کر بیٹھے ہیں۔“

”نہیں! آج آپ میرے غریب خانے پر چلیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ قریب ہی ہے۔“

”چلیں تو پھر آپ ہی کے یہاں چلتے ہیں۔“

اس نے جیسا بتایا تھا اس کا مکان دیکھا تھا۔ اس کا کمرہ گیٹ کے ساتھ ہی بالکل الگ تھلک تھا۔ اندر دو کمرے اور تھے۔

اس کے کمرے کا اٹا بہت مختصر تھا۔

ایک چارپائی، ایک میز دو کرسیاں اور ایک کونے میں رکھا ہوا ایک سوٹ کرسی۔

”نہیں! ندیم صاحب! اسی طرح زندگی گزار رہی

ایک چارپائی، ایک میز دو کرسیاں اور ایک کونے میں رکھا ہوا ایک سوٹ کرسی۔

”نہیں! ندیم صاحب! اسی طرح زندگی گزار رہی

ہے۔ اس نے کہا۔ ”آپ نہیں، میں آپ کے لیے چائے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”ارے نہیں بھائی رہنے دیں۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ پہلی بار آئے ہیں۔ اس طرح تو نہیں چائے دوں گا۔“

”لیکن آپ چائے کا بندوبست کس طرح کریں گے۔“

”وہ۔ وہ بات یہ ہے کہ میں مدیجہ کو آواز دے کر چائے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ وہ میرے سامنے تو نہیں آتی لیکن چائے کی ٹرے لاکر دروازے پر رکھ دیتی ہے۔ اس طرح کم از کم چائے مل جاتی ہے۔“

میں نے اسے پھر دیکھا لیکن اس نے دروازے کے باہر جا کر چائے کے لیے آواز لگا دی تھی۔ ”پلیز، دو کپ چائے بھجوا دیں۔ میرے مہمان آئے ہیں۔“

چائے کا بیل کر وہ کمرے میں آگیا۔ ”ندیم صاحب، میں سو سے لگتا ہوں۔“

”ارے نہیں بھائی، یہ آپ نے کیا تکلف شروع کر دیا۔“

”پلیز، میری خوشی کے لیے۔“ اس نے کہا۔ ”بس دس منٹ میں واپس آتا ہوں۔“

وہ بہت ہی مہمان نواز بات ہو رہا تھا۔ وہ چلا گیا۔ میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ کتابیں بھی کھیں جن سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے۔

اسی دوران دروازے پر دستک کے ساتھ کسی عورت کی آواز آئی۔ ”چائے لے جائیں۔“

میں چونک گیا۔ یہ اس کی ساہتہ بیوی تھی جو چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس نے دوبارہ دستک دی۔ میں نے بلند آواز میں بتایا۔ ”جیل باز ایک گئے ہیں۔“

”اچھا تو آپ لے جائیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے ٹرے لینے کے لیے دروازہ کھول دیا اور میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ گرچہ وہ بہت سادہ لباس میں تھی اس کے ہاؤ جوس اس کی خوبصورتی دیکھنے والی تھی۔ نکلتا ہوا رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ گول چہرہ اور دلکش سراپا۔ بدقسمت تھا جیل جس نے انکی عورت کو طلاق دے کر اپنی زندگی سے الگ کر دیا تھا۔

میں نہ جانے کب تک اسے دیکھتا ہی رہتا۔ اگر اس

کی آواز چلا نہیں دیتی۔ ”یہ لیں، ٹرے لے لیں۔“

میں نے شرمندہ ہو کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لی اور کمرے میں واپس آگیا۔ اس کی ایک جھلک نے مجھے پاگل سا کر دیا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات آنے لگے تھے۔

مجھ کو بعد جیل بھی سو سے لے آیا تھا۔ سو سے کھانے اور چائے پینے کے دوران میں بس ہوں ہاں ہی کرتا رہا تھا۔ کچھ کہتے سنتے کول ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ خود جیل نے میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ ”بس بات ہے ندیم صاحب، آپ کچھ کھوئے کھوئے ہیں۔“

”ارے نہیں، بس یوں ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں آپ کے لیے کوئی ٹیبلٹ لے آؤں۔“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، نہیں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بس اب چائے پی کر گھر حاذق گا۔ کوئی آنے والا ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب، لیکن آپ سے ملاقات ہوتی رہتی چاہیے۔ آپ کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو اتنا سنبھال لیا ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، جب ہی چاہے۔“

گھر آنے کے بعد بھی میں مدیجہ کے تصور سے جان نہیں چھڑا سکا۔ وہ چائے ساچہ و لگا ہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ جیل بے وقوف آدمی تھا۔ اگر مدیجہ زبان دراز بھی تھی تو چارے نری سے اس کی زبان درازی ختم کروائی جاسکتی تھی لیکن اس نے تو طلاق ہی دے دی تھی اور اب بچتا رہا تھا۔

دو چار دنوں کے بعد پھر جیل سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرے گھر آیا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ پریشان اور تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ”ندیم صاحب، میں تو یہ حقائق کر کے بری طرح بچتا رہا ہوں۔ کوئی راستہ مجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”کیا کسی اور سے بھی فتویٰ لیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہی ہاں۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک چٹکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ ”میں نے اس پتھر میں شہر کی تمام مسجدیں اور درے سے چھان لیے ہیں۔ لیکن ہر جگہ سے ایسا سنتے کو ملا ہے کہ میں بغیر حلالہ کے اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔ اب بتائیں، میں کیاں سے اور کس سے اس کا حلالہ کرواؤں۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکتا اس کی آنکھوں میں

”وہ تو تیار ہی نہیں ہے صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ وہ شرمندہ ہے۔ اس نے مجھے کھانا لکھا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ پھر سے میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہے اور اسے اپنے کیسے کی سزا مل چکی ہے۔ اسے احساس ہو گیا ہے کہ بیوی کو کس انداز سے زندگی گزارنا چاہیے۔ اسی نے لکھا ہے کہ میں حلالہ کے لیے کسی سے بات کر لوں کیونکہ اب اس سے برداشت نہیں ہو رہا۔ اور وہ یہ چاہتی ہے کہ عدالت ختم ہوتے ہی یہ کام ہو جائے۔“

”اب عدالت ختم ہونے میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”صرف بیس دن۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کے بعد وہ آزاد ہوگی۔“

”آپ ایک بار اس سے میرے بارے میں پوچھ کر دیکھ لیں۔“ میں نے کہا۔

”پوچھنا کیا ہے ندیم صاحب، وہ بے چاری تو دن گن رہی ہے۔“

پھر اس نے حساب لگا کر تاریخ بتادی کہ اس تاریخ کو خاموشی کے ساتھ اسی گھر میں مدیجہ اور میرا نکاح ہو جائے گا۔ وہ نکاح کے لیے کسی مولوی صاحب کو بھی دعوخط لائے گا۔

چونکہ یہ ایک طے شدہ نکاح ہوگا۔ اسی لیے کسی گواہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

سب کچھ میرے اور اس کے درمیان طے ہو گیا۔

اس نے چاہے کچھ بھی سوچا ہو۔ لیکن میرا ارادہ اب کچھ اور تھا۔ میں اتنی جلدی ایک ہی رات کے بعد اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ میں اس عورت کے ساتھ گزرنے والے کھوں کو طویل دینا چاہتا تھا۔ جتنا بھی ہو سکے۔ یوں کچھ لیں کہ میرے دل میں بے ایمانی آجکی تھی۔

جیل میرا کیا بلکے لیتا۔ تو قانونی اور شرعی طور پر اس عورت کا شوہر ہو چکا ہوں گا۔ اب میری مرضی کہ میں اسے طلاق دوں یا نہ دوں۔

میں پوری کوشش کروں گا کہ ایک ہی رات میں مدیجہ کو اپنے قابو میں کر سکوں۔ ایک دم ہوتی ہے منہ دکھائی کی۔ میں اس میں مدیجہ کو زبردست کا ایک سیٹ دے دوں گا۔ اسے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ اگر وہ میری بیوی نہ رہے تو زندگی بہت خوشگوار گزر سکتی ہے۔

انسان کتنا خود غرض اور تو تا چشم ہوتا ہے۔ اس کا

احساس خود مجھے اپنے خیالات سے دور ہوا تھا۔ لیکن میں اپنی اس خواہش کے سامنے مجبور ہو کر رہ گیا تھا۔

حسن میں کئی طاقت ہوا کرتی ہے۔ یہ طاقت قدموں کو اکٹھا دیتی ہے اور انسان مطمئن ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ جمیل نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا اور میں اسی کے بھروسے کو نہیں ہٹانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے یہیں دن کس طرح گزارے ہوں گے یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں نے منہ دکھائی کی رسم کے لیے ایک چھٹی سیٹ بھی خرید لیا۔ اور یہ تو بہر حال سوچ ہی لیا تھا کہ میں اسے اتنی جلدی طلاق نہیں دوں گا۔

آخر وہ شام بھی آئی تھی جب میں نکاح کے لیے اس گھر میں پہنچا تھا۔ جمیل نے ایک نکاح خواں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا جو اپنے ساتھ دو گواہان کو لے کر آئے تھے۔ جمیل ہی نے چائے اور ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ بیکس ہزار مہر کے عوض یہ نکاح ہو گیا۔

کیا نکاح تھا؟ پتا نہیں ایسے پلاٹنگ لالچوں کی کیا اہمیت ہوا کرتی ہے۔ لیکن مجھے اس وقت یہ سب کہاں سوچنا تھا۔ یہ معاملہ ختم ہوا تو میں مدیکر کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

میں نے دن میں ہی اپنے کمرے کو تھوڑا بہت ڈیکوریت کر دیا تھا۔ مدیکر نے کہ جب بٹا سبک اپ کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اس کے سامنے سونے کا سیٹ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مدیکر یہ کہا جب ساتھ ہے جو ختم ہونے کے لیے بنایا گیا ہے۔“

”کوئی ضروری تو نہیں ہے۔“ اچانک وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا؟“

”ہاں مدیم صاحب۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ ساتھ ایک رات یا ایک ہفتے کا ہو۔ یہ ہمیشہ کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔“

”مدیکر یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ خوش تھی؟ نہیں کبھی خوش نہیں رہی۔ لیکن ہمارے چارہ تھی کیونکہ میرے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔“

”لیکن وہ تو یہ کہہ رہا تھا کہ تم دو بارہ اس کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو رہی ہو۔“

”جھوٹ کہتا ہے وہ۔“ ایسے آدمی کے پاس کون جانا پسند کرے گا جو راسی بات پر بھڑک جاتا ہو۔ خود کچھ نہیں۔ اس نے ذرا سی بات پر مجھے طلاق دے دی تھی اور اب میرا حلالہ کر دیا۔“

”مدیکر تم اس کے پاس نہیں جانا چاہتے۔ یہ تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میری مرضی ہے میں تمہیں طلاق دوں یا نہ دوں۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں مدیم صاحب۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس دن جب میں نے آپ کو کوئی بار دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی کا سچی آپ جیسا ہونا چاہیے تھا۔ اب آپ کی مرضی ہے۔ آپ یا تو طلاق دے کر مجھے اس کے حوالے کر دیں یا پھر ہمیشہ کے لیے مجھے اپنا بنالیں۔“

”مدیکر، میری جان۔“ میں خوشی سے نہال ہوتا چارہ ہوا تھا۔ ”میرے لیے اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہوگی کہ تم مجھے عورت میری زندگی کی سچی بن جائے۔“

”مدیم صاحب، ایک بات بتاؤں۔ آپ سے زیادہ یہ میری خوش تھی ہوگی۔“

”کمال ہے۔ اس نے تمہارے بارے میں یہ کہا تھا کہ تم حدودِ بزرگان دروازہ اور دھسے کی چیز ہو۔ لیکن میں تو تم کو بالکل مختلف پارہا ہوں۔“

”اس کہنے نے بے وجہ طلاق دے دی تھی مدیم صاحب۔ اور اب اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے الزام لگا رہا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

”میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم بزرگوں کی نہیں ہو جیسا تمہارا بارے لیے بتایا گیا تھا۔“

”شکر ہے۔“ وہ مسکادی۔ ”کوئی تو مجھے سمجھنے والا ملا۔“

وہ رات بہت خوبصورت تھی۔

مدیکر میری بیوی بن کر میرے ساتھ تھی۔ اس وقت میں نے اس خیال ہی کو ذہن سے جھٹک دیا تھا کہ نکاح جمیل میرے پاس آنے کا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ نہ جانے کتنی دیر سو رہا تھا۔ آٹھ بجی تو مدیکر بستر پر نہیں تھی۔ البتہ صبح غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں ایک آسودگی اور سرشاری کے عالم میں لیٹا ہوا اس کے بارے میں سوچتا رہا لیکن جب بہت دیر ہونے لگی تو میں نے غسل خانے کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔

میں اندر آ گیا اور کھلا ہوا تھا۔ اس کے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں شاور بند کر کے جلدی سے باہر آ گیا۔

”مدیکر! ہمیں نے اسے آواز دی۔“

پھر احساس ہوا کہ کوئی نہ کوئی گزری ہوگی ہے۔ میری الماری بھی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے الماری دیکھ ڈالی۔ اس میں سے میرے پرائز باغز غائب تھے۔ میں نے پچھلے دنوں بینک سے دو لاکھ روپے نکلائے تھے وہ بھی نہیں تھے۔

میں نے مدیکر کے لیے سونے کا جوینٹ خریدا تھا۔ وہ بھی غائب تھا۔ خدا یا بد کیا مطلب تھا اس کا۔ میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ میرا سارا شہر ہرن ہو چکا تھا۔

پھر میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میری گاڑی موجود تھی اور ان کمپنوں کا گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ گھر پہنچا تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ پتا چلا کہ دونوں سویرے ہی مکان خالی کر گئے تھے اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کہاں گئے ہوں گے۔

میرے خدایا خدایا احمک! اتنا بڑا فراڈ۔ صرف ایک رات کے عوض وہ مجھ سے لاکھوں لے گئی تھی۔ لاکھوں۔ پرائز باغز۔ دو لاکھ کی نقد رقم۔ سونے کا سیٹ۔ کم از کم سات آٹھ لاکھ کی چٹ ہو گئی تھی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ فراڈ اس انداز سے بھی ہو سکتا ہے۔

وہ دونوں تو کسی بھی طور پر کرشل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ۔ مہذب باشعور۔ اور وہ لڑکی مدیکر۔ اتنی خوبصورت۔ اتنی اسرار۔ اور اس کا ایسا کھانا چہرہ۔ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ میں پولیس میں ان کے خلاف رپورٹ کر دیتا لیکن نہ جانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لڑکی کا چہرہ لگا ہوں کے سامنے آ جاتا۔

رپورٹ درج کروانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ لوگ خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گئے ہوں گے۔ ان کی سازش بہت مکمل تھی اور بہت سلیقے سے ترتیب دی گئی تھی۔ شاید اس آدمی جمیل نے بہت دنوں تک میری عمرانی کی ہوگی۔ جب جا کر اس نے یہ ڈراما ترتیب دیا تھا۔ اس کا

مجھ سے ملنا۔ فٹو لینے کے لیے میرے ساتھ جانا۔ مجھے اپنے گھر لے جانا اور سونے لینے کے بہانے گھر سے چلے جانا۔ تاکہ اس دوران وہ لڑکی میرے سامنے آ جائے اور میں اسے دیکھ کر دلچاسپ ہو جاؤں۔

وہ جی ہی اسکی۔

یہ حادثہ ایسا تھا کہ شرمندگی سے میں کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سب میرا ہی مذاق اڑاتے۔ اسی لیے میں خاموشی سے اس نقصان کو پٹی گیا۔ یہ اور بات ہے کہ سینے میں آگ سی لگ رہی تھی۔

پھر ایک دن اچانک وہی لڑکی دکھائی دے گئی۔ وہی مدیکر۔ میں اسے پہچاننے میں لطفی نہیں کر سکتا تھا۔ وہی تھی اور اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

وہ ایک خوش پوش امینی تھا۔ مدیکر اس کے ساتھ ایک دکان سے باہر آ رہی تھی۔ میں نے انہیں دیکھا اور ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ٹھک گئے تھے۔ اس لڑکی کی رنگت اڑ گئی تھی۔ شاید اس نے سوچا نہیں ہوگا کہ کبھی مجھ سے ملے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔

”اوہو! تم نے اب اس بے چارے کو اپنا شکار بنالیا۔“ میں نے کہا۔

”جی۔“ وہ شہنشاہی تھی۔ ”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“

”عالیہ! کون ہے یہ۔“ اس کے ساتھ والے آدمی نے اس سے پوچھا۔

”بہت خوب! تو اب تمہارا نام عالیہ ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہر نئے شوہر کے ساتھ اپنا نام بھی بدل سکتی ہو۔“

”کیا بد تمیزی ہے۔“ وہ آدمی ہنسے سے تقریباً چیخا پڑا تھا۔ ”یہ تم نے میری بیوی کے ساتھ کیا کیا کواں لگا رکھی ہے۔“

”بھائی صاحب! آپ کی بیوی کا اصل چہرہ جب آپ کے سامنے آئے گا تو آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا نام عالیہ نہیں مدیکر ہے اور میں اس کا شوہر ہوں۔ اگر کہیں تو میں نکاح نامہ اور دوسرے کا قذات بھی دکھا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ جب یہ لیمن بنی ہوئی تھی تو میں نے اپنے موبائل سے اس کی تصویریں بھی الماری میں لگا رکھیں تو وہ تصویریں بھی دکھا دوں۔“

”مجھے دکھاؤ۔“ وہ ہنسے سے خرایا۔

میں نے اپنا موبائل اس کے سامنے کر دیا جس میں

اس لڑکی کی کئی تصویریں تھیں۔ میں نے اپنی شادی کی یادگار کے طور پر جو تصویریں چھٹی تھیں وہ اس وقت کام آری تھیں۔ وہ آدی ان تصویروں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ یہ تو واقعی عالیہ کی تصویریں ہیں۔ اس نے کہا۔

”یہ۔ یہ جھوٹ ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں تو اس آدی کو چاہتی تھی نہیں ہوں۔ اس نے نہ جانے کہاں سے میری تصویریں اتاری ہیں۔“

”بھائی صاحب! آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو کلاچ نامہ بھی دکھا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے تو اس کے خلاف ایف آئی آر بھی کھسوا دی ہے۔“ میں نے یوں ہی کہا۔

”عالیہ یہ کیا چکر ہے۔“ وہ آدی بھی اب نروس ہونے لگا تھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ عالیہ نے کہا۔

”اس سے پوچھیں کہ جیل کون ہے۔“

”بھائی صاحب! یہاں کھڑے ہو کر یہ سب باتیں مناسب نہیں ہیں۔“ اس آدی نے کہا۔ ”میں ایک شریف آدی ہوں۔ اس معاشرے میں میری عزت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ سب خاک میں مل جائے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر چلیں۔ میں آپ کو ساری کہانی سناتا ہوں۔“

”میں تو یہ نہیں۔“ لڑکی نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”ہم اس کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ یہ کوئی بلیک میل معلوم ہوتا ہے۔“

”مختصر۔ بلیک میل اس کو کیا جانتا ہے جس کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہو یا جس سے تصویر بہت تعلق رہ چکا ہو۔ کوئی ایسی کیوں بلیک میل کرنے لگا۔“

”ہاں عالیہ! یہ ٹھیک کہتے ہیں۔“ اس آدی نے کہا۔ ”اگر تم بھی ہو تو پھر جیسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں اس آدی پر یس کر دوں گا۔ اس کے ساتھ چل کر اپنی پوزیشن تو کھینچ کر دوں گا۔ ورنہ میں پاگل ہو کر رہ جاؤں گا۔“

”میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ ویسے آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ دوسرا مہینہ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اوغدا! یعنی اس نے مجھ سے نکاح کیا اور میرے پاس سے فرار ہو کر آپ سے شادی کر لی۔“ میں نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ اس لڑکی نے اپنی گردن ہلکا کر لی تھی۔ اس کے ہونٹ کاپٹنے لگے تھے۔ اس کا رنگ اس طرح زرد ہو رہا تھا جیسے ابھی سے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

وہ اس کے باوجود بھی میرے ساتھ چلتا نہیں چلا رہی تھی۔ لیکن اس کا سوچو وہ شوہر اس پر چلنے کے لیے زور دلا رہا تھا۔ بہر حال میں ان دونوں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔

میں نے ان دونوں کو بٹھانے کے بعد اپنے سواٹس کو لگاتے ہوئے کہا۔ ”اب میں پولیس کو بلائے جا رہا ہوں۔ وہی اس معاملے کو ہینڈل کرے گی۔ ایف آئی آر تو درست ہوئی چکی ہے۔“

”میں! پولیس کو نہ بلائیں۔“ لڑکی اچانک بول پڑی۔ ”میں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔“

”عالیہ! اس کے شوہر نے شکست لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔“

”ہاں! سچ ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”چلو! تو میرا متاثر شروع کرو۔“

پھر اس نے جو کچھ بتایا۔ وہ بہت پچھانک تھا۔ جیل واقعی اس کا شوہر تھا اور وہ دونوں لڑکی کی سہیلی کی زندگی گزار رہے تھے۔

جیل ایک جوڑو توڑ والا آدی تھا۔ اس نے اس لڑکی کے کئی شائقین کا رد و خلع ناموں سے بنوا رکھے تھے۔ جبکہ اس کا نام جیل تھا۔

وہ کئی بار جیل سے مدد پر عالیہ اور نہ جانے کیا کیا باتیں چکی تھی۔ طریقہ واردات ایک ہی جیسا تھا۔ کسی ایسے آدی سے اس کی شادی کرانی جانی جو اپنے گھر میں اکیلا ہو۔ ایک رات گزارنے کے بعد صبح اس کے گھر کا صفایا کروا جاتا۔ موجودہ شخص کے ساتھ دو مہینوں تک رکے رہنے کی وجہ یہ تھی کہ تو یہ نے اس لڑکی کے لیے سونے کے زیورات کے چار سیٹ بنوائے تھے۔ جو دو چار دنوں میں بن کر آنے والے تھے۔ اور وہ اس کے لیے ایک بڑا بھگڑنے والا تھا کہ لڑکی کا کہنا تھا کہ بھگڑا وہ لاہور میں خریدے گی۔ اپنے بھائی کے توسط سے۔ وہ شخص رقم کے انتظام میں لگا ہوا تھا۔

وہ لڑکی اس سے پہلے کہ ان زیورات کو لے کر فرار ہوئی۔ میرے قابو میں آگئی تھی۔ یہی اس کی کہانی۔ اس کی کہانی سن کر ہم دونوں ہی سر تھام کر بیٹھ گئے تھے اور وہ مسلسل رونے جاری تھی۔

”واہ! کمال کی لڑکی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا کبھی تہا راجہ جیسے ملازم نہیں کرتا۔“

”بہت کرتا ہے۔“ وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔ ”میں رات رات پھر روتی رہتی ہوں۔ لیکن مجبور ہوں میں۔“

”کیسی بھی کیا مجبوری ہے۔“ تو یہ نے پوچھا۔

”مجبوری یہ ہے کہ میرا بچہ اس کے قبضے میں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا؟“ اب ہم دونوں ہی چونک پڑے تھے۔ ”کیا کوئی اور کہانی بھی ہے۔“

”ہاں۔ اور یہ بہت دردناک کہانی ہے۔ اس سے آپ دونوں کو اعزاز ہو جائے گا کہ عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ اور جب وہ ماں بن جائے تو اس کے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے ہیں۔“

میرے والدین نے اپنی زندگی میں میری شادی ایک بہت اچھے نوجوان سے کر دی تھی۔ امتیاز نام تھا اس کا۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد والدین کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اگر امتیاز نہیں ہوتا تو شاید میں برقی طرح ٹھہر جاتی۔ اس نے میری دل جڑوں کی۔ مجھے سہارا دیا۔ بہت پیار دیا ہے۔

”اور اس پیار کی نشانی ایک بیٹا خرم بہت پیارا۔ میں اپنی یہ کہانی بہت مختصر کر کے بتا رہی ہوں۔ تاکہ آپ دونوں کو میری مجبوری اور یہی کہانی کا اعزاز ہو سکے۔ پتا نہیں میں اپنی قسمت میں کیا لکھا کر آئی تھی۔ شاید کچھ لوگ یہی آئی بد نصیب ہوتے ہیں۔ میرا بھی شاندار ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔“

”میں نے ابھی خاصی تعلیم حاصل کی ہے۔ میرا مطالعہ بھی بہت اچھا ہے۔ اولیٰ ذوق بھی رہتی ہوں۔ لیکن کیا فائدہ۔ آپ دونوں کی نگاہوں میں تو ایک ملوث ہوں نا۔ فرق یہ ہے کہ ملوث نہیں کلاچ کا ڈراما نہیں کرتیں۔ لیکن میں بڑا ڈراما کرتی رہتی ہوں۔“

”خیر تو جب ہمارا بچہ پیدا ہوا تو ہم دونوں ہی بہت خوش تھے۔ اولاد سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن شاید تقدیر کو میری خوشیاں پسند نہیں تھیں۔ اس لیے جب خرم تین سال کا ہوا تو امتیاز ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ کیا رہا تھا میرے پاس۔ کچھ بھی نہیں۔ دوسری طرف امتیاز کے والدین کا روپیہ بھی بہت خراب ہوتا چلا ہوا تھا۔ وہ مجھے نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مجھ سے میرے بچے خرم کو چین کر مجھے گھر سے نکال دینے کا پروگرام بنا رہے تھے جس کا مجھے علم ہو گیا اور میں ایک

رات بہت خاموشی سے اپنے بچے کو لے کر اس گھر سے نکل گئی۔ اب میں کہاں جاتی۔ میرا تو کوئی گھر کا نہیں تھا۔

انتانتا کر اس نے پھر روٹنا شروع کر دیا۔ ہم سب اس کی کہانی دیکھ اور حیرت سے سن رہے تھے۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے یا جھوٹ۔

اس نے پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ”سوائے دور کے رشتے کے ایک ماموں کے اور کوئی بھی نہیں تھا میرا جو میرا ساتھ دیتا۔ بہر حال میں اس گھر سے نکل کر ان ہی کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے بہت بے دلی سے مجھے اپنے گھر کے اندر بلایا تھا۔“ وہ پھر سے رونے لگی ان کی ہزار باتیں سننے پڑ گئی تھیں۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ سسرال کو چھوڑ کر بھاگ آئی ہوں۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تو اس سے کیا ہوا۔ اس گھر میں دوسرے لوگ تو ہیں نا۔ وہ تو نہیں مر گئے۔ ہزار طرح کی باتیں۔ اگر میرے ساتھ یہ مجبوری نہیں ہوتی تو شاید میں ایک بلی بھی وہاں نہیں رہتی۔“ اس نے توقف کیا۔ آنسو پونچھے پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ ”لیکن کیا کرتی۔ ذہین بن کر رہنا پڑا تبہر حال میں نے کس طرح وہاں دن گزارے ہوں گے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ انہوں نے جیل کا رشتہ مجھ سے لگا دیا۔“

”کیا تم جیل کو جانتی تھیں۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! بالکل نہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ ممانی کا بھتیجا تھا۔ دیکھنے میں انتہائی مذہب، ہنر کا لکھا اور سلیٹے کا انسان۔ لیکن انسان کے روپ میں شیطان۔ اندر سے بھڑکیا۔ بھرا نہ ذہنیت رکھنے والا۔ سلاک انسان، جب میری اس سے ملاقات کروائی گئی تو میں نے اسے پسند کر لیا کیونکہ اس کا ظاہر ہی ایسا تھا۔“

”اور تہا راجہ کہاں تھا۔“ تو یہ نے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی تھا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ تو یہ نے میرے خرم کو بھی اپنا لایا تھا۔ وہ اس کے لیے کھلنے والے غیر ملے کر آتا۔“

”بہر حال کچھ دنوں کے بعد میری جیل سے شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد میں جیل کے پاس آکر رہنے لگی۔ مجھے یہ یقین تھا کہ جیل کو بھی خرم کے شخص کی فکر تھی رہتی ہے۔ وہ اکثر اس کے بارے میں باتیں کیا کرتا۔ منصوبے بناتا۔ اس کے لیے یہ کرتا ہے۔ وہ کرتا ہے۔“

”ایک دن اس نے کہا کہ کیوں نہ خرم کو کسی ہاتھ میں داخل کر دیا جائے۔ جہاں اس کی شاندار تربیت بھی

ہوتی رہے گی اور تعلیم بھی حاصل کرتا رہے گا۔“
میں شاید اس کے لیے تیار نہیں ہوتی لیکن اس نے
ایک ایسی بات کہی کہ مجھے مان لینا پڑا۔ اس نے کہا تھا کہ غم
کے دو حیل والے یعنی میری سرال والے غم اور مجھے
پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ کسی بھی دن
موقع پا کر اسے اٹھالے جائیں گے۔“

میں بہت بری طرح خوفزدہ ہوئی تھی۔ غم میرے
لیے سب کچھ تھا۔ اس کو میں کسی بھی حال میں ان لوگوں کے
حوالے نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے جیل کی بات مان
لی اور غم کو ایک ہاسٹل میں داخل کروا دیا۔
”ہم دونوں ہی غم کو ہاسٹل لے کر گئے تھے۔ پھر اس
کے بعد آج تک غم کا پتا نہیں چل سکا۔“ وہ بری طرح
رونے لگی تھی۔

”کیا مطلب! کہاں گیا تمہارا بیٹا۔“ میں نے
پوچھا۔

”میں نہیں جانتی کہ وہ اب کہاں ہے۔ کس ہاسٹل
میں ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ہاسٹل والوں نے بتایا کہ غم کو
اس کا باپ ہاسٹل سے نکال کر لے گیا تھا۔ ظاہر ہے میں نے
جیل کو غم کا باپ ہی ظاہر کیا تھا۔ اسی لیے وہ جب کسی
بھانے سے ہاسٹل سے نکلتے گیا تو وہ لوگ انکار نہیں
کر سکے۔ کیونکہ خود باپ آیا تھا۔“

”تو اب وہ کہاں ہے۔“ تو نے پوچھا۔
”میں نہیں جانتی۔ جب جیل سے پوچھتی ہوں تو وہ
کہتا ہے کہ اسے دوسرے ہاسٹل میں کروا دیا ہے۔ لیکن
ایڈریس نہیں بتاتا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں اگر اس کے
اشاروں پر نہیں چلی تو وہ زندگی بھر غم سے میری ملاقات
نہیں کروائے گا۔ بس یہ ہے میری مجبوری۔ ایک ماں اپنی
اولاد کے لیے کیا نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی عزت تک نیاں کر دیتی
ہے۔ جس طرح میں کر رہی ہوں۔“

ہم دونوں ہی اس کی کہانی سن کر دنگ رہ گئے تھے۔
اگر اس نے خود بیانی نہیں کی تھی تو پھر وہ واقعی مظلوم
تھی۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک
ماں تھی اور ماں کے لیے اس کی اولاد ہی سب کچھ ہوتی ہے۔
”کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں ہوگا اس وقت؟“
میں نے پوچھا۔

”ہم نے محمود آباد میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا
ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”خدا کے لیے میرے بچے کو اس کی قید

سے چھڑا لیں۔“

تو نے نے میری طرف دیکھا۔ ”میرا ایک دوست
پولیس کا ایک بڑا آفیسر ہے۔ اگر کہیں تو اس کی مدد لی
جائے۔“

”بالکل اس میں اور نہیں کرنی چاہیے۔“
”مختصر یہ کہ ہم نے پولیس کی مدد لی اور اس مکان پر
چھاپا مار دیا جہاں جیل تھا۔“

یہ بہت ہی مشہور کیس ثابت ہوا تھا۔ عدالت نے
جیل سے جب ہیلے کے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا تو
اس کم بخت نے نے روبرو فرما انکشاف کیا کہ وہ اسے قتل
کر چکا ہے اور اس کی لاش نہیں چھینک دی تھی۔

خدا کی پناہ! کتنا بے رحم، بیجا تک اور ظالم انسان
تھا۔ درعدوں سے بھی بدتر۔ وہ ایک اولاد کو ڈھال بنا کر اس
کی ماں کو گندگی کی راہ پر چلا تا رہا جبکہ وہ اس اولاد کو پیلے ہی
مار چکا تھا۔

ہیلے کی حالت دیکھ کر اور اس کی کہانی سن کر عدالت کا
ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔ خود جج کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
فاضل جج نے اسی بے رحم شخص کے بارے میں اپنے
فیصلے میں یہ لکھا تھا کہ یہ شخص اس قاتل ہے کہ اسے بار بار
سزائے موت دی جائے۔ لیکن انیسویں صدی کا ایک بار سے زیادہ
کسی کو پھانسی نہیں دے سکتے۔

عدالت نے اسے موت کی سزا سنائی تھی۔
اس وقت تو نے کا کردار قابل تعریف تھا۔ اس نے
عدالت میں بیان دیا کہ وہ زندگی بھر کے لیے اس مظلوم لڑکی
کا سہارا بننے کو تیار ہے۔

لیکن تو نے کی جہت اور اس کا یہ غلوں میں کسی کام نہیں آ سکا۔
عدالت کے فیصلے کے کچھ دنوں کے بعد جیل بھی اپنے
بیٹے سے جا ملی۔ وہ بے چاری تو اس وقت اپنا دل بکڑ کر وہ
گئی تھی جب اسے یہ پتا چلا تھا کہ جیل نے اس کے بیٹے کا
خون کر دیا ہے۔ پھر وہ محنت باپ ہی نہیں ہو سکی۔ ستر سے
جا گئی۔ بالآخر اسے بھی موت آ گئی۔

آخر کچھ لوگ اتنے بد قسمت کیوں ہوتے ہیں۔ ان
کی قسمت میں اتنے دکھ کیوں لکھ دیے جاتے ہیں۔ خدا اپنے
بچے خود ہی جان مکا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ دوسری دنیا میں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ
رہ رہی ہو۔



وارث

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
آداب و نیاز

یہ میری پہلی تحریر ہے۔ دوسروں کی مدد پر تیار ہوتے پڑھتے شوق
ہوا کہ اپنی حالات زندگی بھی قارئین کے سامنے پیش کروں سو ٹوٹ
پھوٹے انداز میں ہی صحیح لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس امید پر ہے
کہ شاید سرگزشت میں جگہ پالے گی۔
زریہ
(لاہور)

میں اسپتال جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی کہ
میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”اس بار بیٹا ہونا چاہیے ورنہ
یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔“ یوں لگا جیسے کسی نے میرے
کانوں میں کھلا ہوا سیرا ڈال دیا ہو۔ لڑکی ہونے پر طے
تو بیٹو ملا کرتے تھے لیکن اتنی بڑی بات میں اس نے بیٹی بار
کہی تھی۔ اس سے پہلے میری تین بیٹیاں تھیں اور چوتھی بار
بیٹی کے لیے اسپتال جا رہی تھی۔ اگر اس بار بھی بیٹی ہوئی تو
کیا واقعی اس گھر کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔



یا اللہ، یہ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا۔ میں چار بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ کس کے سہارے زندگی بسر کروں گی۔ میں نے بے بسی سے اپنے شوہر راشد کی طرف دیکھا لیکن وہ چمکی بے جاں موتی کی طرح سر جھکا کے کھڑے تھے۔ ان میں اپنی ماں کا سامنا کرنے، ان کی بات کا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے بوجھ قدموں سے گھر کی دھیر پارکی اور باہر کھڑی ہوئی کسی کسی میں بیٹھ گئی۔

میری شادی کو دس سال ہو چکے تھے اور اس دوران میں تین بچوں کی ماں میں جگہ تھی۔ پہلی بیٹی آمنہ تو شادی کے ایک سال بعد ہی دنیا میں آئی تھی جبکہ فائزہ اور اعازہ تین تین سال کے وقت کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ راشد کی ماں میری سگی خالہ تھیں اور مجھے بڑے چاؤ سے پیار کر لاتی تھیں۔ راشد ان کے اکلوتے بیٹے تھے جبکہ دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ راشد کی سرکاری جگہ میں معمولی سی پوسٹ پر تھے اور ان کی تنخواہ میں بشکل گزارہ ہوتا تھا تاہم وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے اور انہوں نے کبھی مجھے کسی عروسی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ خالہ کا رویہ بھی شروع میں تو بہت اچھا رہا لیکن پہلی بیٹی کی پیدائش پر ہی ان کا موڈ بگڑ گیا اور انہوں نے اسپتال میں ہی طے دینا شروع کر دیے۔ جیسے ہی نرس نے انہیں بیٹی کی پیدائش کے بارے میں بتایا، وہ بیٹے پر وہ ہنسا رہے ہوئے بولیں، "کتنا ارمان تھا مجھے پوتے کا۔ ساری خوشی خاک میں مل گئی۔"

ای کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی اور وہ تیزی سے بولیں، "ناگہ، چالوں والی باتیں مت کرو۔ لڑکا ہو یا لڑکی، دونوں ہی اللہ کی دین ہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ یہ مرحلہ بغیر دھوئی طے ہو گیا۔"

اس وقت تو میری ساس خاموش ہو گئیں لیکن مگر آنے کے بعد انہوں نے پھر داویلا شروع کر دیا۔ ہر آنے گئے کے سامنے بیٹی روتا روتی رہتیں۔ میری پہلی اولاد کی کوئی خوشی نہیں کی۔ میں نے ہی راشد سے کہہ کر بیٹی کا حقیقہ کر دیا اور عزیز و اقارب میں مٹھائی تقسیم کی۔ اس پر بھی انہوں نے بہت شور مچایا اور بولیں، "اس فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ کچا پیسے سنبھال کر رکھیں تو بیٹی کے جیڑ میں کام آتے۔" میرا دل بہت برا ہوا لیکن راشد نے سمجھا یا کہ ان کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دوں۔ وہ نہ پاں کی کڑوی ضرورت ہیں لیکن دل کی بری نہیں۔ میں وقتی طور پر بھل گئی۔ واقعی مجھے ان کی باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ راشد بیٹی

کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شام کو دفتر سے آنے کے بعد اسے گود میں لے کر کھلا کرتے اور اس کے لیے آنے والی اچھی چیزیں لے کر آتے۔ میری ساس کو یہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہمیشہ یہی کہتیں کہ بیٹیوں سے اتنا لڑاؤ بیکار نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں ایک دن پرانے مگر جانا ہوتا ہے۔ یہ تو تمہارے پاس کسی کی امانت ہے۔

دوسری بار امید سے ہوئی تو ساس صاحبہ نے پہلے دن سے ہی راگ الاٹنا شروع کر دیا۔ ان کی بے وقت کی راتھی سن کر میرے کان یکے اور ایک دن میرا بیٹہ جواب دے گیا۔ ویسے تو وہ دن وشام پوتے کی رات لگاتی رہتی تھیں لیکن اس روز کچھ زیادہ ہی چڑبائی ہو گیا۔ وہابیوں کو میں ڈاکٹر سے معاذ کروا کر واپس آئی تو وہ جیسے میرے انتظار میں ہی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں، "کیا کاڈا کھڑے؟" "سب ٹھیک ہے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"دو تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ سب ٹھیک ہے۔" وہ نکھ کر بولیں۔ "میرا مطلب ہے کچھ بتایا نہیں کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں خالہ" میں چڑ کر بولی۔ "وہ ڈاکٹر نے کوئی تجویز نہیں جو پہلے سے بچے کی جنس کے بارے میں بتا دے۔"

"اسے بی بی" مجھے اتنا بے وقوف مت سمجھو۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ لڑکا لڑاؤ کے ذریعے پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر معلوم بھی ہو جائے تو کیا ہوگا۔ ہم قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتے اور نہ ہی ابھی تک کوئی ایسا طریقہ دریافت ہوا ہے جس سے بچے کی جنس پہلے ہی کا سکتے۔"

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ ہاتھ نہاتے ہوئے بولیں۔ "گتا ہے کہ تمہیں بچے کی آرزو نہیں۔"

"جو چیز میرے اختیار میں نہیں۔ اس کی تمنا کیسے کروں۔ میں تو بس دعا ہی کر سکتی ہوں۔ آپ بھی یہی کیجئے۔ شاید اللہ مہیاں آپ کی سن لیں۔"

وہ دعا کیا کرتیں۔ انہیں تو میں نے کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ بس دن بھر تخت پر بیٹھی پان چائیاں یا دوسروں کی برائیاں کرتی رہتیں۔ ان کا پہلا نشانہ تو میں ہی تھی لیکن راشد نے مجھے منع کر دیا تھا کہ ان کی کسی بات کا

جواب نہ دوں۔ اس لیے میں عموماً خاموش ہی رہا کرتی۔ جب بار کرو موضوع بدل دیتیں لیکن ان کے بولنے میں کی نہیں آتی۔ میں باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہوں۔ ہر نماز کے بعد یہی دعا کرتی کہ اس بار مجھے بیٹا دے دے تاکہ درود روز کی یک یک سے میری جان بچوت جائے۔

گتا تھا کہ تو لیت کی گھڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ دوسری بار بھی میرے یہاں بیٹی ہی پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ ساس صاحبہ کا ڈبیل انتہائی شدید تھا۔ وہ اسپتال میں ہی چلا چلا کر مجھے کوٹے لگیں۔ راشد نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کروایا اور گھر لے گئے لیکن میں جانتی تھی کہ اب وہ خاموش نہیں رہیں گی۔ نہ جانے میری غیر موجودگی میں راشد کو کیا بیٹی پڑ جائے گی لیکن جب راشد انہیں چھوڑ کر واپس آئے تو بالکل تباہ تھے۔ انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھاما اور بولے۔ "سعد، یہ تم ام کی باتوں کو دل پر مت لو۔ انہیں بولنے کا مرض ہے۔ پوتے کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی چڑبائی ہیں۔ اس لیے مایوسی کے عالم میں کچھ زیادہ ہی بول گئیں۔" "ان سے زیادہ مجھے اور آپ کو بچنے کی آرزو ہوگی لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے بس میں تو کچھ بھی نہیں، آپ انہیں یہ بات کیوں نہیں سمجھاتے۔"

"وہ سمجھتا چاہیں نہ" راشد جتے ہوئے بولے۔ "وہ تو تمہیں ہی اس کا ذمہ دار سمجھتی ہیں، خیر تم دل چھو نہ کرو۔ کچھ دن بولیں گی پھر خود ہی چپ ہو جائیں گی۔"

اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آئی تو ساس نے مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ میں نے بھی انہیں چڑانے کے لیے پورے محلے اور خاندان میں مٹھائی پائی اور بڑی دھوم دھام سے بیٹی کا حقیقہ کیا۔ وہ چلائی رہیں کہ ان چوپچوں میں کیوں پیسے ضائع کر رہی ہو۔ پہلے ایک سگی اب دو ہو گئی ہیں۔ ان کے جیڑ کی فکر کرو۔ میں نے اپنے کان بند کر لیے تھے اور گوشت بھری بن کی تھی۔ اب میری پوری توجہ اپنی بچیوں پر تھی اور میں ہر وقت انہی میں کھن رہتی۔ انہیں اچھے سے اچھا کھلاتی۔ اچھا پیر پاتی اور ہر وقت ان کے لاڈ پیار میں لگی رہتی۔ راشد کی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے میں نے ایک کھلی ڈال دی تھی تاکہ بچیوں کے اخراجات پورے کر سکیں۔

تین سال اسی طرح گزر گئے۔ میں ایک بار پھر امید سے تھی۔ اس مرتبہ بھی وہی کچھ ہوا جو پہلے ہوا آیا تھا۔ ساس صاحبہ مجھ سے پوتا مانگ رہی تھیں اور میں مالک بھتی کے

سامنے سر جھکا دیتی۔ کچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی بیٹے اور بیٹی میں فرق محسوس نہیں کیا اور میں اللہ مہیاں سے بیٹے کی دعا کر کے اپنی بیٹیوں کی تدبیر نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ساس صاحبہ کے رویے نے مجھے اپنے رب سے بیٹے کی بجائے مانتے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بار ان کے توجہ بہت خطرناک تھے اور خطرہ تھا کہ اگر اس مرتبہ بھی بیٹی ہوئی تو کبھی میری آرزو مایوسی زخمی میں کوئی بڑا بھونچال نہ آجائے۔

پھر وہی ہوا جس کا ذکر تھا۔ تیسری بیٹی کی پیدائش پر ساس نے حسب معمول داویلا مچایا لیکن اب راشد کے توجہ بھی بدل گئے تھے۔ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اعزاز قرار ہے کہ وہ بیٹی کے پید ہونے پر خوش نہیں اور اسے ایک بوجھ سمجھ رہے ہیں۔ جس طرح پہلے دو بیٹیوں کی پیدائش پر انہوں نے خوشی اور گرم جوش کا اظہار کیا تھا اب وہ مقتود کھائی دے رہی تھی۔ ساس نے تو میرا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ جیسے ہی میں اسپتال سے واپس آئی۔ ان کا روٹا دھونا شروع ہو گیا۔ انہیں صرف یہی فکر تھی کہ راشد تین بیٹیوں کا جیڑ کس طرح تیار کریں گے۔ وہ ساری عمر مت کر کے جو کچھ کام میں گئے، یہ لڑکیاں سب اپنے ساتھ لے کر چلی جائیں گی۔ ان کی تکرار کے ہوتے تو نہ صرف یہ کہ بڑھاپے میں باپ کا سہارا نہ رہے بلکہ ان کی بیویاں بھی جیڑ سے گھر بھر دیتیں۔ انہیں یہ فکر بھی ستائے جا رہی تھی کہ اگر لڑکا نہ ہوا تو راشد کی نسل ان کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔ اس طرح کے کئی نکات وہ اپنی صبح شام کی تقریروں میں بیان کرتیں اور جیڑ کے تیروں سے میرا کچھا چھٹی کرتی رہتیں لیکن میں نے کبھی توجہ نہ دیا تھا کہ وہ چاہے کچھ بھی کہتی رہیں۔ راشد خواہ کتنی ہی بے رحمی کیوں نہ کریں لیکن اپنی بیٹیوں کی پرورش دیکھ بھال اور لاڈ پیار میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گی۔

وہ مسلسل راشد کے کان بھرتی رہتی تھیں۔ ایک دو مرتبہ اس موضوع پر ماں بیٹے میں زور دار جھگڑ بھی ہوئی تھی۔ ایک روز راشد دفتر سے گھر آئے تو وہ حسب معمول بین کے اعزاز میں اللہ مہیاں سے شکوہ کر رہی تھیں۔ راشد کو دیکھتے ہی ان کے بین میں تیزی آئی اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر گڑگڑاتے ہوئے بولیں۔ "اے میرے مالک! ہم غریبوں کی فریاد سن لے۔ تیرے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے۔ اس گھر کو ایک وارث دے دے۔" راشد بہت مجھے ہونے لگ رہے تھے اور میں جانتی تھی کہ اس وقت

انہیں چائے کی شدید طلب ہو رہی ہوگی۔ میں ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ واپس آئی تو ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ تیرہ بیٹے میں کہہ رہے تھے۔

”اماں! اب بس بھی کرو۔ میں تنگ آ گیا ہوں ایک ہی بات سنتے سنتے۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے لیکن تم تو ایسے کبر ہی ہو جیسے لڑکا نہ ہونے میں سارا قصور ہم دونوں کا ہے۔“

”مجھے معلوم تھا کہ تم اپنی بیوی کی طرف داری ضرور کرو گے۔ خدا جانے اس چیل نے کیا محمول کر پلا دیا ہے کہ تمہیں اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“

”اچھا تو پھر آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ اس مسئلے کا کوئی حل ہے آپ کے پاس۔“

”بیٹا! اگر مجھ کوئی سے سوچے تو کوئی حل بھی نکل آئے گا۔“ انہوں نے دو قسمی انداز میں بات کی۔

”میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ راشد انجان ہتھے ہوئے بولے۔

”وقت آنے پر سب کچھ جاؤ گے۔“ ساس صاحبہ نے طعنے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

یہی بیٹی اسکول جانے لگی تھی۔ صبح راشد اسے اپنے ساتھ لے جاتے جبکہ پچھلی کے وقت اسے کمر لانے کی قوت داری میری تھی۔ ایک دن میں اسے اسکول سے لے کر آئی تو

آپا صغیرہ کو ساس صاحبہ کے پاس بیٹھنے دیکھ کر میرا ہاتھ خشکا۔ وہ رشتے کرانے کا کام کرتی تھی۔ اس کی آمد کا متعدد میری

سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ اس کمر میں کوئی ایسا فرد نہ تھا جس کی شادی کا مسئلہ درپیش ہو پھر آپا صغیرہ یہاں کیا لینے آئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ساس صاحبہ سے پوچھا تو وہ بولیں ”پریشان ہے بے چاری۔ آج کل کام دھندا چل نہیں رہا۔ پان چھ لایا تک کے لیے محتاج ہے۔ بہو بیٹا تو

پوچھتے نہیں۔ میں نے دوسروں پر دے دیے۔“

مجھے ایک پرائیوٹ مل گیا۔ انہیں مانجھرنے کے لیے بولی۔ ”دیکھ لیا آپ نے،“ ایسے ہوتے ہیں بیٹے۔ خود پیش

کر رہا ہے اور ماں اپنی ضرورتوں کے لیے در در ہیک ہانگی پھر رہی ہے۔“

”اس کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ اللہ نہ کرے کہ ہمارا بیٹا ایسا ہو۔“

میں ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ دوسرے دن ہی ان کا

بھوت سامنے آ گیا۔ میں بچی کو لے کر اسکول سے گھر آ رہی تھی کہ گلی کے کنارے آپا صغیرہ مل گئی۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”اچھا ہوا تم مل گئیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم سے کس طرح بات کی جائے۔“

”خیر تم تو ہے،“ مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔ ”میں غصہ کر رہی۔“

”بیٹی! اپنا گھر بچانے کی فکر کرو۔ تمہاری ساس

راشد کی دوسری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ انہوں نے اسی لیے مجھے بلایا تھا کہ راشد کے لیے کوئی لڑکی دیکھوں۔ میں

نے ان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا میں گھر بتائی ہوں بگڑتی نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے شوہر

کو قایم رکھو۔ وہ مجھ سے اکٹرا گیا تو یہی مشکل ہو جائے گی۔“

”آپا جی تمہارا“ میں کیا کروں اگر اوپر والے نے میری قسمت میں لڑکیاں لکھ دی ہیں تو اس میں میرا کیا قصہ

ہے۔“

”میں نے بھی یہی بات انہیں سمجھائی تھی لیکن وہ بیکہ

سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انہیں تو بس پوتا چاہیے۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن تم اپنی جگہ

ڈٹی رہو۔ دوسری شادی کرنا بچوں کا مکمل نہیں۔ بھلا کون

تین بیٹیوں کے باپ کو اپنی لڑکی دینا پسند کرے گا۔“

آپا صغیرہ کی باتوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں جانتی

تھی کہ خالہ کے دماغ میں جو بات آ جائے وہ اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ پانی سرے اوپر

ہو جائے مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس روز جیسے ہی راشد گھر آئے میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور بولی۔ ”میں نے

سنا ہے کہ آپ دوسری شادی کر رہے ہیں۔ شوق سے کریں لیکن پہلے مجھے طلاق دینا ہوگی اور بیچاں بھی میں اپنے ساتھ

لی لے جاؤں گی۔“

”کیا اول قول پاک رہی ہو؟ کس نے کہہ دیا کہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔“

”نہیں۔ ابھی ان سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلاوجہ آپا صغیرہ کی شامت آ جائے گی۔“

اس طرح بات آتی گئی ہوگی اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ کم از کم راشد اس سازش میں شریک نہیں ہیں۔ آپا صغیرہ

نے کوئی ایک ماہ بعد مکمل دکھائی۔ وہ اماں کے دیے ہوئے دوسروں پر واپس کرنے آئی تھی۔ خالہ نے جب اسے رشتے

والی بات یاد دلانی تو وہ بولی ”میں نے ایک دو جگہ بات چلائی تھی لیکن کوئی بھی راشد کو اپنی بیٹی دینے پر تیار نہیں ہے۔

دوسرے اس کی آمدنی بھی اتنی زیادہ نہیں کہ وہ بیویوں کا بوجھ برداشت کر سکے۔ اگر کوئی امیر کبیر شخص ہوتا تو شاید

لوگ لالچ میں آ کر رشتہ کر دیتے۔ میرا تو خیال ہے کہ تم راشد کی دوسری شادی کا خیال دل سے نکال دو۔“

”اے بہو! اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔“

میری ساس تنگ کر رہیں۔ ”آخر کیا کی ہے میرے راشد میں؟ تم دیکھنا میں اس کے لیے کسی چاندی دھن ڈھن کر لاتی ہوں۔“

”کوشش کر کے دیکھ لو لیکن کامیابی کی امید کم ہے۔“

آپا صغیرہ نے منہ ہاتھتے ہوئے کہا اور اپنی چادر اٹھا کر چل دی۔

چوتھی بار امید سے ہوئی تو خالہ نے اٹھتے بیٹھے پوتے کی دعا مانگ دینا شروع کر دی۔ میں بھی وضعت میں کران کی

بکواس تھی رشتی۔ راشد سے تنگلو کے بعد مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ساس صاحبہ چاہے کتنا زور لگائیں، وہ راشد کو

دوسری شادی کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک وفد بھی میرے پاس راشد کے سامنے

اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا، اگر آپا صغیرہ نہ بتاتی تو مجھے پتا بھی نہ چلتا کہ ساس صاحبہ کیا سوچ رہی ہیں۔

ظاہر مطمئن ہونے کے باوجود میں امد سے خوف زدہ تھی۔ اگر اس بار بھی لڑکی پیدا ہوئی تو میرا مستقبل کیا

ہوگا۔ راشد کب تک اس صورت حال کو برداشت کریں گے۔ بہر حال وہ ایک مرد تھے اور ماں کی باتوں میں آ کر کوئی بھی

ایسا فیصلہ کر سکتے تھے جو میری تباہی کا سبب بن جاتا۔ چہرے بھی مسلسل پانی کرتا رہے تو اس میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔

راشد تو پھر گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان تھے۔ وہ کب تک حراست کرتے۔ ان کے دل میں بھی یقینا بیٹے کی خواہش مل رہی ہوگی۔ اگر واقعی انہوں نے دوسری شادی کر لی اور مجھے اس گھر سے لٹا پڑا۔ تو ان بچیوں کو لے کر

کہاں جاؤں گی۔ ماں باپ تو پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ بھائی اپنی دنیا میں غمگین تھا۔ اس کے پاس اتنی خدمت بھی نہ تھی کہ کبھی بہن کا حال معلوم کرنے آ جاتا۔ میں خود ہی

اس سے ملنے چلی جاتی تھی۔ بھابھ کا رویہ ایسا تھا کہ شاید وہ ایک دن کے لیے بھی رکتے کو تیار نہ ہوتی۔ ان سب باتوں کو

سوچ کر میرا دماغ خراب ہونے لگا۔ تنگ آ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ آخر وقت تک حالات کا مقابلہ کروں گی اور

قدرت پر بھروسہ بھی خوشی قبول کروں گی۔ راشد نے مجھے اسپتال میں داخل کر لیا اور خود کسی کام

کا بہانہ بنا کر چلے گئے۔ دھچکی میں ابھی کچھ وقت تھا، ایک نوجوان ڈاکٹر نے میرا مہمانہ کیا اور تھوٹیں آئینہ لکچے میں

بولی۔ ”کیا بات ہے۔ تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو۔ بہت کمزور لگ رہی ہو۔ خون کی کمی کی ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے مجھے فور سے دیکھا پھر ملڈ پریشر چیک کرنے کے بعد بولی۔ ”معلوم ہوتا

ہے کہ تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو۔ تمہارے اندر خون کی بہت کمی ہے۔“

اس بار بھی میں خاموش رہی تو وہ بولی ”کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔ اگر ذہن پر کوئی بوجھ ہے تو

اسے اتار چھٹکو۔ تھوڑی دیر کی قوت قریب ہے۔ اس حالت میں تمہیں بالکل ریٹیکس ہونا چاہیے۔“

اس کے لکچے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے چمکتے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پہلی بار اس کے چہرے کی

طرف غور سے دیکھا۔ وہ مجھے دوسری ڈاکٹر سے مختلف نظر آئی۔ خوب صورت اور کم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے

چہرے سے انسان دوستی اور ہمدردی کا تاثر جھلک رہا تھا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ڈاکٹر کیا

میڈیکل سائنس میں ابھی کوئی ایسا علاج دریافت نہیں ہوا جس کے ذریعے ہم اپنی مرضی کے مطابق لڑکا یا لڑکی پیدا کر سکیں۔“

”ایسا احقنا سوال کیوں پوچھ رہی ہو؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں ہر بار بیٹے کی آرزو لیے اسپتال آتی ہوں اور قدرت کی طرف سے مجھے بیٹی کا قرض مل جاتا ہے۔ اب تک

تین بیٹیوں کو جنم دے چکی ہوں۔ اس بار ساس صاحبہ نے اپنی غلطی دے دیا ہے کہ اگر بیٹی ہو تو گھر مت آنا۔ شوہر صاحب بھی کچھ اکٹڑے اکٹڑے سے نظر آ رہے ہیں۔ یہی

تو یہاں ڈال کر چلے گئے۔ اب میں یہ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوں کہ اگر اس مرتبہ بھی جینی ہوئی تو میرا اور میری بچیوں کا مستقبل کیا ہوگا۔

”تمہارے سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہونا وہی ہے جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اللہ مہاں سے ابھی امید رکھنی چاہیے۔ وہ بچے لڑکا ہو یا لڑکی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ عورت کو اتنا حیر بھی نہیں سمجھتا چاہیے۔ میں بھی تو ایک لڑکی ہوں، اگر میں لڑکی نہ ہوتی تو کیا تمہاری ساس اور شوہر کسی مرد ڈاکٹر سے زچہ کر دیتے۔“ یہ کہہ کر اس نے گھڑی دھجی اور بولی۔ ”اوہو، بہت دیر ہو گئی۔ مجھے دوسرے مریضوں کو بھی دیکھنا ہے۔ میں تو ڈی ڈی بعد پھر لڑکوں کی۔“

وہ جانے لگی تو میں نے پوچھا۔ ”کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں۔“

”ضمین۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور لہراتی ہوئی چلی گئی۔ وہ ڈاکٹر مجھے بہت اچھی لگی اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اپنی ایک بچی کو سیل کی تعلیم ضرور دلاؤں گی۔ وہ بچے تو میں ہمیشہ سے ہی لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں تھی لیکن اب میرا عزم اور پختہ ہونا چاہتا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میری ساس اور شوہر ان بچیوں کے ساتھ کبھی بھی روپیہ کیوں نہ دیں، میں ان کے لیے ذرا حال بن جاؤں گی۔ چاہے مجھے سخت محدود ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن اپنی بچیوں کو اچھا کھلاؤں کی، اچھا پیناؤں کی اور انہیں زور تعلیم سے آراستہ کروں گی تاکہ وہ ڈاکٹر ضمین کی طرح معاشرے کے کارآمد فرد بنیں، انہیں کسی قسم کا احساس کمتری نہ ہو۔

ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر ضمین دوبارہ آگئی اور محبت سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں بوسہ دے۔“

”مجھ پر نصیب کا حال کیا پوچھتی ہو۔“

”اگر ایسی باتیں کرو گی تو میں چلی جاؤں گی۔ اللہ نہ کرے تم پر نصیب کیوں ہوئے لگیں۔ جس عورت کی تین بیاری بیاری بچیاں ہوں، اس کی قسمت پر تو ناز کرنا چاہیے۔“

مجھے اس کی چوب ڈبانی پر ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میری بچیاں بہت پیاری ہیں۔ تم تو انہیں دیکھا بھی نہیں۔“

”اس لیے کہ تم خود بہت خوبصورت ہو، یقیناً بچیاں

بھی تم پر ہنسی ہوں گی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں یہ کہہ آئی تھی کہ ایک گھنٹے بعد میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی اور کل کے لیے کہ تمہاری ڈیوٹی رات کسی وقت یا کل صبح تک ہو۔ تم بالکل پریشان مت ہونا۔ جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ خدا کے کاموں میں کوئی غل نہیں دے سکتا۔ تمہاری ساس بہت اچھی لگتی رہیں۔ شوہر کا رویہ خواہ کیا ہو۔ تمہیں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ اپنے لیے اور اپنی بچیوں کے لیے۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر۔“ میں نے بچھے دل سے کہا۔ ”لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے شاید تمہیں یہ نہیں بتایا کہ ساس صاحبہ راشدی کی دوسری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ اگر اس بار بھی لڑکی ہوئی تو شاید وہ اس کام میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔“

”ادھر اس نے ہونٹ کھینچتے ہوئے کہا۔ ”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ویسے تم اگر اسی طرح ڈرتی رہیں تو وہ اپنے بیٹے کی دوسری کیا تیسری اور چوٹی شادی بھی کر دیں گی۔ تم نے سنا نہیں جو ڈر کیا وہ مر گیا۔ خیر تم ڈیوٹی سے فارغ ہو جاؤ۔ پھر میں تمہیں اپنی ایک دوست سے ملواؤں گی۔ وہ ویل ہے اور حالی تو میں سے متعلق مقدمات کی بیرونی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اینا ایس او کے لیے بھی کام کرتی ہے۔ وہ بتائے گی کہ ان حالات میں تمہیں کیا کرنا ہوگا۔“

ڈاکٹر ضمین نے باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی۔ یوں لگے جیسے اللہ مہاں نے میری مدد کے لیے فرشتہ بھیج دیا ہو۔ میں اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کر رہی تھی اور مجھ میں اپنے حق کے لیے لڑنے کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ شام کو راشد لدے پھرتے آئے۔ وہ میرے لیے بہت سارے پھل اور جوس وغیرہ لے کر آئے تھے۔ ان کا رویہ دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ ساس صاحبہ کچھ بھی کتنی رہیں، راشد ان کی باتوں میں آنے والے نہیں ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ڈیوٹی رات میں کسی وقت ہوئی تو وہ پریشان ہو گئے اور بولے ”تمہارے پاس کسی کو ہونا چاہیے۔ میں اماں کو لے کر آتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”انہیں کیوں پریشان کرتے ہیں۔

یہاں ڈاکٹر ہنس اٹھا۔ ”یہ سب ہیں۔ وہ سنبھال لیں گی۔“

”لیک ہے“ میں صبح آؤں گا۔ امید ہے کہ ابھی خبر سننے کو ملے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میں ان کے چلنے پر سوچنے کے لیے اٹھ بیٹھ رہ گئی۔ میں خوب محنت لگائی کہ ابھی خبر

سے ان کی مراد کیا ہے۔ میں بھی شدت سے ایک بیٹے کی خواہش مند تھی لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ صرف دعا ہی کر سکتی تھی لیکن راشد کے لچے سے ایسا لگا کہ وہ بھی اپنی ماں کے انداز میں سوچ رہے ہیں جیسے لڑکا پیدا نہ ہونے میں سارا قصور میرا ہی ہے اور اس بار بھی لڑکی ہوئی تو اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو آنے والے دنوں میں مجھے بدترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

وہ رات انجی اندھ لٹوں میں سوتے جا گئے گزری۔ صبح سو بچے مجھے لیبر روم لے جایا گیا اور ایک گھنٹے بعد نرس نے مجھے چوٹی بیتی ہونے کی خوشخبری سنائی۔ شاید میں واقعی طور پر یہ خبر سننے کے لیے تیار تھی۔ اس لیے میں نے فوری طور پر کوئی بڑا عمل ظاہر نہیں کیا بس خدا سے تو مولود بیتی کی صحت رہنمائی اور اچھے مستقبل کی دعا مانگی۔ اس کے بعد میں نے پھر سکون ہو کر انہیں بند کر لیں۔ مجھے معلوم تھا کہ آنے والا وقت بہت صحن ہوگا اور مجھے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈیوٹی اور جسمانی طور پر اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہیے۔

نرس نے بیتی کو تیار کر کے میرے پیلو میں لٹا دیا۔ وہ میری تینوں ٹیٹوں میں سے زیادہ خوبصورت اور نازک تھی۔ مجھے اس پر بے اختیار پیار آنے لگا۔ اسے دیکھ کر میں محسوس ہوا کہ میری فوج میں ایک اور سپاہی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اسے دیکھ کر میرا عزم اور حوصلہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا اور میں نے اسی وقت تہہ کر لیا کہ حالات خواہ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں، ساس کی بک بک اور شوہر کی بے رخی میں چاہے کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے لیکن میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ اپنی بچیوں کی اچھی پرورش اور بہتر مستقبل کے لیے بڑی سے بڑی محنت اور تکلیف برداشت کر لوں گی لیکن انہیں احساس کمتری کا شکار نہیں ہونے دوں گی۔

راشد اور ڈاکٹر ضمین کی آمد تقریباً ایک ساتھ ہی ہوئی۔ بیتی کو دیکھ کر راشد کا منہ بن گیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے بس خاموشی سے میرے بیٹے کے ساتھ رکھی بیٹھ پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر ضمین بھی آگئی۔ اس نے آتے ہی بیتی کو گود میں اٹھالیا اور چچھاتے ہوئے بولی ”ہاشاء اللہ جانے کا کھوا ہے۔ کاش میں بھی ایسی ہی ہوتی۔“

اس کی گفتگو بیانی پر میں مسکرائی لیکن راشد پھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھ رہے۔ ڈاکٹر ضمین نے ان کی بے رخی کو محسوس کیا اور بولی۔ ”آپ ان کے شوہر ہیں؟“

راشد نے اثبات میں گردن ہلا دی تو وہ بولی۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بیتی کی پیدائش پر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔“

”جی جی، نہیں تو۔“ وہ انکب انکب کر بولے۔ ”کم از کم بیتی کو گود میں تو لیں تاکہ یہ معلوم بھی باپ کی شفقت کے کس سے آشا ہو جائے۔“

راشد نے بولے باولہ خواہش بیتی کو گود میں لے لیا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ ڈاکٹر ضمین نے ان کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بیتی کو لے لیا اور اس کی جگہ پر لٹاتے ہوئے بولی۔ ”دیکھئے مسز راشد! مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا تو حق نہیں لیکن چہرے کے تاثرات سے آپ کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگ سکتی ہوں۔ بہر حال ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی بیٹی کا خیال رکھیں۔ یہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہیں۔ خون کی کمی کی وجہ سے جسمانی نظام متاثر ہو سکتا ہے۔ اس لیے آپ کو ان کی صحت اور غذا کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ان کا ہر پختہ چیک اپ ہوگا اور جب تک ان کی صحت مکمل طور پر بحال نہیں ہو جائی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ یہ کوشش بھی کریں کہ انہیں ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ معمولی سی ٹیشن بھی ان کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔“

راشد نے بیتی سے اس کی باتیں سننے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو بولے ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں ان سب باتوں کا خیال رکھوں گا۔ یہ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”چچا ہوں ڈاکٹر کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ شام کو آؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو داد۔“

”بچیوں کو لینے آئیے۔ میرے بغیر اس اور بیتی ہوں گی۔“

”اچھا۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے تو ڈاکٹر ضمین بولی۔ ”میں نے پہلی ڈوڈو دے دی ہے۔ فی الحال ان کا دماغ درست کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”ڈاکٹر! کیا واقعی میری صحت اتنی خراب ہے کہ مجھے ہر پختہ چیک اپ کے لیے آنا پڑے گا۔“

”اسے نہیں۔ یہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تاکہ تم سے رابطہ میں رہوں۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ بس اپنی خوراک پر توجہ دو۔ پھل اور دودھ کا استعمال شروع کر دو اور ساس کی

باقوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دو۔ میں نے اپنی ویل دوست کو بھی بلا دیا ہے۔ وہ آج بچے ناٹم میں آئے گی۔ تم اپنا مسئلہ تفصیل سے بتاؤ وہ ضرور کوئی نہ کوئی حل تجویز کرے گی۔

عارفہ نے دانی بھی ڈاکٹر غنیمہ کی طرح بہت پیاری، شفیق اور مخلص عورت تھی۔ وہ تقریباً ڈاکٹر غنیمہ کی ہی ہم عمر تھی اور اسی کی طرح غیر شادی شدہ تھی۔ اس نے بڑے سکون اور اطمینان سے میری بات سنی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہمارے معاشرے میں عام مسئلہ ہے۔ ہمارے یہاں لڑکی کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اس معاملے کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے اور اسی کو سزا بھی جگھٹتا ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی پیدائش کو بھانسنے کا مرد دوسری شادی کر لیتے ہیں یا ساری عمر اپنی عورتوں کو طعنے دیتے رہتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنے آپ کو شوہر اور سسرال والوں کے مقابلے میں محکوم، مجبور اور بے بس سمجھتی ہے اور اس میں کچھ تھوڑا سا والدین کا بھی ہے جو ساری عمر اپنی بیٹی کو اطاعت و فرمانبرداری کا سبق پڑھاتے رہتے ہیں اور شادی کے وقت بھی ان کی یہی نصیحت ہوتی ہے کہ سسرال سے تمہارا جتنا زہی لگتا چاہیے۔ یہی سوچ ہماری عورتوں کو برباد کر رہی ہے اور وہ اپنے آپ کو شریک زندگی سمجھنے کی بجائے کینز سمجھنے کی ہیں اور سسرال والوں کی ہر جائز و ناجائز بات ماننے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔“

”آپ جانتی ہیں کہ اگر عورت نا فرمانی کرے تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”بہی خوف تو عورتوں کو لے ڈوبا ہے۔ طلاق دینا یا دوسری شادی کرنا اتنا آسان نہیں۔ دراصل ہمارے یہاں کی عورتوں کو ایسے حقوق کے بارے میں معلوم ہی نہیں۔ اسی لیے وہ مرد کی دھمکیوں سے ڈر جاتی ہیں۔“

”اگر یہی صورت حال میرے ساتھ پیش آتی تو میں کیا کروں گی؟“ میں نے پوچھا۔ ”سنا صاحبہ نے گھر سے چلتے وقت کہا تھا کہ بیٹی پیدا ہو تو یہاں مت آنا۔ آپ ہی بتائیں اگر وہ اپنی بات پر قائم رہیں تو میں کہاں جاؤں گی۔“ ”تمہارے شوہر کیا کہتے ہیں؟“ عارفہ نے پوچھا۔ ”ابھی تک تو ٹھیک ہیں لیکن لگتا ہے کہ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر پائیں گے۔“

”دیری لگد آج ہی الحال سناں کو بھول جاؤ اور بیٹی کو

لے کر قاتمانہ انداز میں گھر جاؤ جیسے کوئی انعام جیت کر آئی ہو۔“

”اگر راشد نے ماں کے بھکائے میں آکر دوسری شادی کا ارادہ کر لیا تو.....؟“

”یہ اتنا آسان نہیں۔ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔“ ”وہ مجھے طلاق بھی دے سکتے ہیں؟“ میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”ہاں۔ اس کا امکان ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”یہ بتاؤ تمہارا امیر کتنا ہے؟“

”ایک لاکھ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بہت خوب اور تمہارے میاں کی خواہ؟“

”وہ ایک سرکاری محکمے میں معمولی سی پوسٹ پر ہیں۔ اس سال انکریشٹ لگنے کے بعد وہیں ہزار ہوئی ہے۔“ ”گزارہ ہو جاتا ہے۔“

میں نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ کچھ سمجھتی ہیں کہ اس مہنگائی کے دور میں یہ پیسے کتنے دن چلتے ہوں گے۔“

”میں تو تم پر فکر ہواؤ جب تک تمہارے شوہر کی کوئی لائبریا یا انعامی باڈ نہ نکھل آئے وہ تمہیں طلاق نہیں دے سکتا۔ تم اپنی جگہ پر مضبوط ہو جاؤ۔ وہ لوگ چاہے کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ڈالیں لیکن تم کسی قیمت پر دوسری شادی کی

”کوئی بات نہیں۔ مگر کے قریب کوئی پی سی او تو ہوگا۔ تم وہاں سے فون کر سکتی ہو۔“ پھر وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”اب میں چلتی ہوں۔ ایک کلاحت کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ تمہیں طلاق ہوگی اور نہ شوہر صاحب دوسری شادی کریں گے۔ تم حراسے سے اپنی بچیوں کے ساتھ رہو اور سناں کی بیٹی کی باتوں سے الجھنا نہ کرو۔“

اس کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ مجھے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ سناں جو چاہیں کرتی رہیں مجھے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ایڑی چٹنی کا زور لگائیں تب بھی میں راشد کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دوں گی۔ وہ کیا کر لیں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ راشد کو مجبور کر کے کہہ مجھے طلاق دے دیں۔ اول تو وہ ایسا نہیں کر سکتے اور اگر انہوں نے تمہیں سے بچیوں کا انتظام کر بھی لیا اور مجھے طلاق دے دی تو کیا ہو۔ دنیا میں سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتیں طلاق یافتہ ہونے کے باوجود زندہ رہتی ہیں۔ میں بھی اپنا کوئی ٹھکانا بنا لوں گی۔ اپنی بچیوں کے بھرتی ہو جانے کی خاطر صحت مند عورتوں کیوں کی لیکن کسی کے دباؤ میں آکر ذات کی زندگی نہیں گزار سکتی!

شام کو جب راشد آئے تو تینوں بیٹیاں بھی ساتھ تھیں۔ سناں صاحبہ نے البتہ آنے کی دھمکی دے کر انہیں کی۔ راشد کے چہرے پر گہری خمیدگی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ کسی الجھن میں مبتلا ہیں۔ وہ کسی کام سے باہر گئے تو بڑی بیٹی نے مجھے بتایا کہ دادی بہت غصے میں ہیں اور خوب چلا رہی ہیں۔ ہمیں بھی کسی مزید اضافہ ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ابو سے صاف کہہ دیا ہے کہ آپ کو ماما کے گھر چھوڑ دیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور بولے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر دادی اور زور سے چلانے لگیں۔ آج کھانا بھی نہیں پکا۔ ہم دن بھر بھوکے پیٹے رہے۔ ابو دفتر سے آئے تو انہوں نے بازار سے کھانا لا لیا۔

میرا دل انداز سے کٹ کر رہ گیا۔ اگر میں نے بیٹی پیدا کر کے کوئی جرم کیا تھا تو اس کی سزا میری بچیوں کو کیوں مل رہی تھی۔ راشد وہاں آئے تو میں نے ان سے کہا کہ وہ ڈاکٹر سے بات کر کے مجھے ڈسچارج کروا دیں میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ بچیاں میرے بغیر وہاں ہی رہ رہی ہیں۔ اس پر وہ بولے۔ ”بھئی تو وقت پر ہی ملے گی لیکن تمہیں پریشان

ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دفتر سے دودن کی چٹائی لے لی ہے۔ میں گھر پرانی بیٹیل کے پاس رہوں گا۔“ اسی دوران ڈاکٹر غنیمہ بھی راولپنڈی پر آگئی۔ وہ میری بیٹیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بولی۔ ”میرے تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں اللہ میاں نے اتنی پیاری پیاری بیٹیاں دی ہیں۔“ پھر اس نے راشد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نے ان بچیوں کی اچھی تربیت کر لی تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔“

راشد کچھ بھینپ سے گئے۔ میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر! مجھے بھئی کب ملے گی؟“

”کمزوری بہت زیادہ ہے۔ تمہیں کم از کم مزید دو دن یہاں رہنا پڑے گا۔“ پھر راشد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہاں سے جانے کے بعد بھی ان کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ جیسا کہ میں پہلے آپ کو بتا چکی ہوں کہ انہیں ہر طرح کے ذہنی اور جسمانی دباؤ سے دور رہنے کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد راشد بولے۔ ”کچھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ یہ ڈاکٹر بار بار تمہارا خیال دیکھتے رہ زور دے رہی ہے اور گھر کا حال تم جانتی ہو۔ وہاں تمہیں کیا آرام مل سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم چند روز کے لیے اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤ۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے حیرانہ لہجے میں کہا۔ ”اُمی زندہ ہوتیں تو شاید چلی جاتی لیکن بھائی کے گھر تو کسی صورت میں بھی نہیں جاؤں گی۔“

ان کے چہرے سے اندرونی جذبات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ وہ شدید ذہنی تکلیف میں مبتلا تھے۔ ان کی ماں نے حکم جاری کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں قدم نہ رکھوں۔ شاید اسی لیے راشد نے مجھے بھائی کے یہاں جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ چند دنوں میں ماں کا خضر کم ہو جائے گا تو وہ مجھے گھر لے جائیں گے لیکن میں اپنی سناں کو ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ میری غیر موجودگی میں راشد کو روٹلا لیں۔

انہیں خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ”آپ میرے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ میں اپنا خیال خود کو سکھاتی ہوں۔“ وہ کچھ دیر بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر بچیوں کو لے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر غنیمہ آئی تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بولی۔ ”تم سناں کی

باقوں کی بالکل پروا مت کرو۔ تمہیں اپنے ہی گھر جانا چاہیے۔ وہ تمہارا گھر ہے۔ وہاں لوگ ہیں۔ وہاں دیکھو کہ کمرے کس کس کا ہیں۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں اور عارفہ تمہاری خبر گیری کرتی رہیں گی۔

”لیکن میں آپ کو لوگوں سے کسی طرح رابطہ کروں گی۔ روز بروز تو بی بی اوجا کروں نہیں کر سکتی۔“ اس کی ضرورت چٹنی نہیں آئے گی۔ میرے پاس تو تم ویسے بھی بیٹھے۔ ایک بار آیا کرو گی اور عارفہ بھی تم سے ملنے کا کوئی طریقہ تلاش کر لے گی۔

دو دن بعد مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ راستے بھر میں سوچتی رہی کہ نہ جانے ساس صاحبہ کا رویہ کیا ہو۔ وہ مجھ سے کس طرح چٹنی آئیں گی۔ مگر چٹنی تو وہاں سناٹا ہے چھایا ہوا تھا۔ تینوں بچیاں ایک کونے میں بھی ہوئی بیٹھی تھیں۔ راشدہ نے مجھے اشارہ کیا اور میں بچپوں کو لے کر سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بی بی نے بتایا کہ دوا دی صبح سے رو رہی ہیں۔ اب تو کمرہ ہی میں کہ مجھے ایسے ہی ہوم چھوڑ آؤ۔ میں اس شخص عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ یہ سن کر ابو کھڑکھڑایا اور وہ عرصے سے ہوتے گھر سے باہر چلے گئے۔

یہ سب سننے کے بعد میرے دل میں ان کی جو قصوڑی بہت عزت تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ مجھے ڈاکٹر فہیمہ اور عارفہ دونوں نے نیکی بات سمجھائی تھی کہ ساس کی کسی بات کا جواب نہ دوں اور محل عاموشی اختیار نہ کر سکوں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایک چپ سوکھ برابر ہے لیکن مجھے لگا کہ یہ فارمولا اس گھر میں نہیں چلے گا۔ میری خاموشی کو کمزوری سمجھ کر ساس صاحبہ شیر ہو سکتی ہیں اور اگر حالات کے نشے میں آکر انہوں نے کوئی بڑا فیصلہ کر لیا تو میرے لیے سنگین مشکلات پیدا ہو جائیں گی لہذا مجھے بھی قصوڑا سا چار حاندہ اعزاز پنانا ہو گا۔

چار پانچ دن تک گھر میں شدید کشیدگی رہی۔ ساس مجھ سے بات کرنے کی روادار بھی نہ تھیں۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ پہلا مہر کہ اس روز ہوا جب مجھے ڈاکٹر فہیمہ کے بتائے ہوئے شیلڈول کے مطابق چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ ساس صاحبہ کو پتا چلا تو انہوں نے بنگام کھڑا کر دیا۔ راشدہ کسی لینے گئے ہوئے تھے۔ میں اپنی فائل اٹھائے ان کے آنے کا انتظار کر رہی تھی کہ ساس صاحبہ کمرے سے برآمد ہوئیں اور ہاتھ پچاتے

ہوئے پر لیں۔ ”اے بی بی“ اب بند کر دیے چھوٹے۔ کچن میرے لیے کچا ہونے پر لگی ہوئی ہو۔ ہم نے بھی سپینے سے چپ کر کے جانا نہیں لگایا۔

”میں اپنی خوشی سے نہیں جاری۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے۔ ہر پختہ چیک اپ ہو گا۔“

”وہ تو انی نہیں کھری کرنے کے لیے ایک سال تک بلائی رہے گی۔ تم کچن اس کی باتوں میں آکر بے وقوف بن رہی ہو۔ کچھ اپنے میاں کا خیال کر لو۔ بے چارہ کو کمرے کے تیل کی طرح صبح سے شام تک جتا رہتا ہے تب بھی کھلی بھرو پے ہاتھ آتے ہیں۔ اوپر سے چار ٹوکڑیاں کا ساتھ۔ ہائے میرے بچے کی قسمت ہی چوٹ لگی۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نہیں لے گی۔“

”کیوں تمہاری رشتے دار لگتے ہیں۔ وہ۔“

”یہی سمجھ لیں۔ وہ میرے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔“

”پھر بھی ٹیلی کا کرایہ اور دوا نہیں۔ ہزار بار وہ سوچا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نہیں جانتی لیکن اگر کوئی چھپیدگی پیدا ہو گئی تو بات ہزاروں میں جاتے گی۔ تب کیا ہو گا؟“

”سن کر وہ خاموش ہو گئیں۔ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ اسی اثنا میں راشدہ جیسی لے کر آگئے اور میں انہیں پڑھاتا ہوا چھوڑ کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔

میں نے ڈاکٹر کو ساری بات بتائی اور کہا کہ ان حالات میں میرے لیے ہر پختہ آنا ممکن نہیں۔ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی اور بولی۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی کھانا تم سے ملنے آ جاؤ کروں۔ اس طرح چیک اپ کے ساتھ تمہارے حالات سے باخبر بھی رہوں گی۔“

”آپ کیوں میرے لیے اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔“

”مکمل بات تو یہ کہ مجھے تم سے بہروری ہو گئی ہے اور دوسری یہ کہ تمہاری ساس عورت ہوتے ہوئے صنفِ نازک کی توجہ نہ کر رہی ہیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ انہیں ایسا سبق سکھایا جائے کہ آج وہ دھڑکی کے پیدا ہونے پر دوا بیانا کریں اور نہ ہی اپنے بیٹے کی دوسری شادی کے بارے میں سوچیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اور عارفہ تم سے رابطہ میں رہیں اور تمہارے گھر والوں کو بھی معلوم ہو جائے

کہ تم لاوارث اور بے سہارا نہیں ہو۔“

”میں کس زمانہ سے آپ دونوں کا شکر یہ ادا کروں۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں اور میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے پرجوش انداز میں کہا۔ میں نے ساس صاحبہ کو بتایا ہے کہ آپ میرے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتی تھیں لیکن میڈم عارفہ کس حیثیت میں میرے گھر آئیں گی؟“

”اسے میں اپنے ساتھ لے کر آؤں گی اور یہی ظاہر کیا جائے کہ ہم تینوں ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھا کرتے تھے۔“

یہ نام نہاد معائنہ ختم ہوا تو ڈاکٹر فہیمہ نے راشدہ کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور کہا کہ اب ہر پختہ آنے کی ضرورت نہیں مینے میں ایک مہرے چیک اپ کا پی ہو گا۔

ایک بار پھر زندگی اسی ڈگر پر چلنے لگی۔ ساس صاحبہ نے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اچھے بھٹے پڑتے کی دوا پائی دیا کرتیں۔ اگر کہیں سے لڑکے کی پیدائش کی خبر آتی تو ان کی آواز کا میں اور اصفاء ہو جاتا۔ وہ آسمان کی طرف منہ کرتیں اور دونوں ہاتھ پھیلا کر فریاد کرتیں ”یا اللہ! مجھ دکھا کی بھی سن لے۔ حیرت خزانے میں کون سی کی آجائے گی اگر تو ہمیں بھی ایک پوتا دے دے۔ کیا اس خاندان کو بھی وارث نصیب نہیں ہو گا۔ کیا میرے بیٹے کی نسل ہمیں ختم ہو جائے گی۔“

ان کی باتیں سن کر مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ ایک دن وہ اسی طرح تین کر رہی تھیں کہ میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا اور بولی ”آپ کی کون سی لاکھوں کروڑوں کی جائیداد ہے جو وارث کے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔“

”اے بی بی! جائیدادیں تو کیا ہوا۔ بیٹے سے باپ کی نسل تو آگے بڑھتی ہے۔“

”ایک بات بتائیے۔ کیا راشدہ کو اپنے دادا کا نام معلوم ہے؟“

”ہاں۔“

”اور پر دادا کا؟“

”وہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔“

”بس تو یہاں آکر نسل ختم ہو گئی۔ یہی کچھ راشدہ کے ساتھ بھی ہو گا۔ ان کے پڑپوتوں کو بھی نہیں معلوم ہو گا کہ ان کا پر دادا کون تھا۔ یہ نسل و نسل سب دھنکولے بازی ہے۔ اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر کریں اور بہتری کی دعا

”لیں۔“

”تم کچھ بھی کہو لیکن مجھے ایک پوتا چاہیے اور اب میں راشدہ سے فیصلہ کن بات کروں گی۔“

”کیسی بات؟“ میں نے چمکتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ اب اسے دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ کیونکہ تم میں تو بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔“

ساس صاحبہ کے خطرناک مزاحم کے بارے میں جان کر ستائے میں آ گئی۔ ویسے تو وہ ایک کوشش پہلے بھی کر چکی تھیں لیکن میرے سامنے نکل کر اس طرح اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بانی سر سے اوجھا ہوتا جا رہا ہے اور مجھے فوری طور پر اس کا کوئی نتیجہ پاب کرنا ہو گا کیونکہ راشدہ ایک کمزور انسان تھے اور وہ ماں کے مقابلے میں زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ بہر حال وہ بھی ایک مردہ ہیں اور ان کے دل میں بیٹے کی آرزو پروان چڑھ رہی ہوگی

Alternative & Integrated medicine

بینی اور قدرتی دوا سے ہر قسم کی بیماریاں سنبھالنے کے لیے

فریڈی کوکس بڑے مرد حضرات

مردوں میں جڑوں میں کی اور کمزوری کو دور کر کے اولاد پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ متھوی دھنکولہ ہے

شادی کوکس

صرف غیر شادی شدہ مردوں کے لئے زائل شدہ توانائی کی بحالی کا مستقل اور مکمل کوکس۔ انڈیا مالڈ کسی قسم کی اور عروہی محسوس نہ ہوگی

ازدواجی کوکس

شادی شدہ حضرات کے لئے بحالی قوت کا فوری اور مستقل علاج۔ کامیاب اور ازدواجی زندگی کے لئے موثر ترین کوکس

ڈاکٹر شریف شایین

03218528001, 03008523456
email: b2b@sharifshayin@gmail.com

پیشہ ورانہ طبی مشورہ
پیشہ ورانہ طبی مشورہ
پیشہ ورانہ طبی مشورہ

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلجھری

تراجلدی پیاریوں کا موش اور بے ضرر علاج

قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اسٹریوئڈس سے آزاد ترین اور ترقی یافتہ ترین علاج



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

ڈاکٹر سید امجد علی ماہر
فون: 3354555 - 2253882 (061)
3300-8568188 سہاگ
2281636 فکس



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

لاہور

ڈاکٹر سید امجد علی ماہر
فون: 4518061-62 (061)
4582803 (0300-8568188)

پشاور

ڈاکٹر سید امجد علی ماہر
فون: 2218215-9 (0521)
3300-8568188 سہاگ

ملتان

ڈاکٹر سید امجد علی ماہر
فون: 4518061-62 (061)
4582803 (0300-8568188)

کراچی

ڈاکٹر سید امجد علی ماہر
فون: 706-706 (021)
021-7012068-9 سہاگ
0300-8568188

نے مجھ سے دوسری شادی کی اجازت مانگی تو مجھے کیا کہنا چاہیے۔

”تمہاری جگہ میں ہوتی تو صاف انکار کر دیتی۔“ عارفہ بولی۔ ”لیکن تمہارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا۔ البتہ تم پہلے کڑی شرائط کا خاکہ کر سکتی ہو۔ مثلاً یہ کہ تم سوکن کے ساتھ نہیں رہو گی۔ وہ تمہیں الگ کمرے کر دیں اور ہر مہینے بچوں کے اخراجات کے لیے دیا کریں جو ان کی نگہا کے نصف کے برابر ہو۔ یہ سننے ہی ان کے غلبے سے ہوا نکل جانے کی اور وہ بھی دوسری شادی کا نام نہیں لیں گے۔“

”اور اگر انہوں نے طلاق کی دھمکی دی تو۔“ ”وہ تمہیں کبھی بھی طلاق نہیں دیں گے کیونکہ وہ ہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ تم پر دباؤ ڈال سکتے ہیں تاکہ تم انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دو۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس دباؤ کا مقابلہ کس طرح کرتی ہو۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ڈٹ جاؤ اور کسی صورت بھی ان کی خواہش پوری نہ ہونے دو۔“

وہ دونوں کچھ دیر بیٹھی میرا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ ان کے آنے سے بڑی ڈھارس ہوئی تھی اور لگ رہا تھا کہ میری حمایت کرنے والا بھی کوئی ہے۔ شام کو رات آئے تو ماس صاف نے یہ رپورٹ بھی انہیں دے دی۔ وہ غصے جمران ہوئے کیونکہ دس سالہ ازدواجی زندگی میں پہلے بھی کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ کمرے میں آئے اور بے چینی کے انداز میں بولے۔ ”تم نے پہلے تو نہیں بتایا کہ ڈاکٹر فہیم اسکول میں تمہاری کلاس فلور ہو چکی ہے۔“

”بس سوچ ہی نہیں ملا اور یہ کوئی ایسی اہم بات بھی نہیں تھی۔“

”اور یہ عارفہ کون ہے؟“ ”اماں نے نہیں بتایا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ ڈاکٹر فہیم سے جب اسے میرے بارے میں علم ہوا تو ملنے چلی آئی۔“

”چھا! ان لوگوں سے میل جول بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ان سے حیثیت میں کم ہے۔“ ”اگر کوئی میرے کمرے آئے گا تو اسے منع تو نہیں کر سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ یقین دلا سکتی ہوں کہ خود ان سے ملنے نہیں چاہوں گی۔“

وہ خاموش ہو گئے کیونکہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا لیکن انداز بتا رہے تھے کہ انہیں ان دونوں کا

اگر زبان سے نہیں کہا تو دل میں ضرور سوچتے ہوں گے کہ کاش ان کا بھی ایک بیٹا ہوتا تو ایسے بھی دوسری شادی کرنے میں ان کا کیا بگڑا تھا۔ نقصان تو میرا ہوتا۔ مجھ پر ایک سوکن آ جاتی اور میری بچیاں باپ کی شفقت و توجہ سے محروم ہو جاتیں۔

میری پریشانی بدھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر فہیم نے کہا تھا کہ وہ چپک اپ کے بہانے مجھ سے ملنے آئے گی لیکن ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ بی بی او سے عارفہ کو فون کر کے اس صوبہ مال سے آگاہ کروں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوسرے روز ڈاکٹر فہیم خود ہی آئی۔ اس کے ساتھ عارفہ بھی تھی۔ میری ساس ان دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئیں کیونکہ آج تک میرا کوئی عزیز رشتہ دار دوست یا کنبی مجھ سے ملنے نہیں آئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر فہیم کا تعارف کر لیا اور کہا کہ یہ دونوں میرے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتی تھیں۔ میری ساس کو شاید یقین نہیں آیا اور وہ چیختے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”اسے بی بی تم نے پہلے تو بھی ان کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی آج تک تم سے ملنے آئی۔“

”اسکول ختم ہونے کے بعد ہمارا آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ وہ تو میں اس بار اسپتال گئی تو ڈاکٹر فہیم سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ہی عارفہ کے بارے میں بتایا۔“

”اچھا تم اپنی سہیلیوں کی خاطر تو اسے کرو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“

ڈاکٹر فہیم نے آہستہ آہستہ سانس نکالا اور میرا معائنہ کرنے لگی پھر اس نے میرا ہاتھ پر پتھر چپکایا اور تھوٹھیں آئینے میں بولی۔ ”کیا بات ہے کوئی ٹیٹن ہے کیا؟ ہاتھ پر پتھر تھوڑا سا زیادہ ہے۔“

”فکڑ ہے کہ تھوڑا سا ہی زیادہ ہے۔ ورنہ میری کتھیاں تو بری طرح سلگ رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی۔“

”بات کیا ہے کچھ بتاؤ تو سکا۔“ عارفہ بے چین ہوتے ہوئے بولی۔

”میں انہیں اپنے کمرے میں لے گئی اور ساس سے ہونے والی پوری مشکو اٹھیں سنادی۔ وہ دونوں چہرے خاموش رہیں پھر عارفہ بولی۔ ”تمہارے شوہر نے تو ابھی ایسی کوئی بات نہیں کی؟“

”نہیں لیکن لگتا ہے کہ وہ زیادہ دیر اپنی ماں کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ اگر انہوں

آغا اچھا نہیں لگا۔ شاید وہ بھی اپنی ماں کی طرح تنہا چاہتے تھے کہ کچھ بچے والا کوئی نہ ہو اور میں اسی طرح ان لوگوں کے رحم و کرم پر پڑی رہوں۔ کچھ لگا جیسے وہ کچھ گناہ دہرے ہیں لیکن بہت کم ہو رہی۔ تنہا ماں کی باتوں میں آکر وہ بھی دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہو سکے۔ مجھ سے تو وہ صاف صاف کہہ چکی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ بچے کو بھی راضی کر لیا ہو۔ سوچا کہ پوچھ لوں لیکن پھر خیال آیا کہ مجھے بات چیت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ان کے دل میں کچھ ہوگا تو وہ خود ہی کہہ دیں گے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے اور گھر کے ماحول میں کچھ تبدیلی نہ آئی۔ ساس تو دینے بھی مجھ سے سیدھے نہ بات ہی نہیں کرتی تھیں لیکن اب راشد کے روتے میں بھی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ اکثر وہ شام کو میرے گھر آتے۔ بات بات پر جھجھکتے۔ پہلے وہ بچپن سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ اکثر انہیں گھمانے پھرانے لے جاتے یا ان کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لایا کرتے لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا بلکہ وہ بچپن کو زار و زاری بات پر جھڑکتے اور ڈانٹتے لگے تھے۔ پہلے وہ ان کی گود میں بیٹھ جاتے۔ ان کے گلے میں باغیں ڈال کر جھولا کرتی تھیں لیکن اب وہ بھی کبھی رہنے لگی تھیں۔ ان کے دل میں عجیب طرح کا ڈر اور خوف بیٹھ گیا تھا۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اور میں نے ایک دن راشد کو آٹے یا آٹے یا آٹے لے لیا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ راشد اخبار پڑھ رہے تھے۔ بڑی بیٹی ہوم ورک کر رہی تھی۔ اسے کچھ پوچھنا تھا۔ باپ کے پاس گئی اور بڑے لاڈ سے بولی۔ ”ابو یہ سوال کچھ میں نہیں آرہا۔ ذرا بتا دیں۔“

راشد نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ”اپنی ماں سے پوچھو۔“

”وہ کام کر رہی ہیں۔“ بچی نے مصحوبیت سے کہا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ دو منٹ سکون سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے بچی سے کافی لی اور زمین پر بیٹھتے ہوئے بولے ”دفع ہو جاؤ۔ خبردار جو مجھے دوبارہ تنگ کیا۔“

بچی رونے لگی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں مکت سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ بچپن سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔ اس نے سوال ہی پوچھا ہے۔ کچھ چیز کی فرمائش تو نہیں کی۔“

”تم سچ میں مت بولو۔“ وہ چلاتے ہوئے بولے۔ ”کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ اپنی اولاد کو تنگ نہ سکوں۔“

”حق سے چین اگر وہ کوئی بد چیز کریں۔ اس وقت تو اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔“

”اچھا۔“ اچھا! میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“

ان کا رویہ خاصا قہین آمیز تھا۔ میں نے بچی کو اشارے سے کمرے میں جانے کو کہا اور راشد کے قریب آکر بولی۔ ”دیکھیں راشد! آپ کا رویہ ہم سب کے لیے وقتی اذیت کا باعث ہے۔ خاص کر بچپن پر اس کا بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ جو کچھ آپ کے دل میں ہے وہ کھل کر کہہ دیں تاکہ بات صاف ہو جائے۔“

”تم سے اب ان کے کچھ نہیں کہا۔“ وہ کرسی پر پہلو بہنے ہوئے بولے۔

”لیکن میں آپ کی زبان سے سنتا چاہتی ہوں۔“

”تو سنو سہ یہ بیگم اماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ مجھے دوسری شادی کر لینی چاہیے۔“

مجھے راشد سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اتنی بڑی بات یوں آسانی سے کہہ دیں گے۔ بلکہ اب تک تو میں اسی خوش چہی میں جلتا تھی کہ دوسری شادی کا شوش میری ساس کے ذہن کی اختراع ہے۔ راشد بھی اس پر تیار نہیں ہوں گے لیکن ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے اپنے قدموں پر رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ دوسری بیوی آپ کو بیٹا دے سکے گی۔“

”بالکل۔“ کوشش کرنے میں کیا ہرت ہے۔ بیٹے کے انتظار میں ساری زندگی ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتا۔“

”تو پھر کر لیں دوسری شادی۔ مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں۔“

”اس کے لیے تمہاری اجازت درکار ہے۔“

”وہ تو میں بھی نہیں دے سکتی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ مجھے اپنی محبت کا ہزارا مشکور نہیں۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو سہیہ۔“ وہ کچھ نرم ہوتے ہوئے بولے۔ ”تمہاری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھ جائے

گی۔“

”مجھے بہلانے کی کوشش مت کریں۔ کیا میں جانتی نہیں کہ دوسری عورت کے آجانے کے بعد چکی اپنی قدر کھو بیٹھی ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور تمہیں اس کی اجازت دینا ہوگی ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

”آپ کا جواں دل چاہے کریں۔ میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔“

یہ کہہ کر میں پھر چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس واقعہ کے بعد گھر کی فضا حیرت انگیز ہو گئی۔ راشد نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی۔ ساس کا رویہ حیرت انگیز ہو گیا۔ وہ دن مجھ سے کوئی بات نہیں اور اب تو انہوں نے باقاعدہ میرے سرے کی دغا بکائی۔ شروع کر دی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ مسئلہ صرف اسی صورت حل ہو سکتا تھا کہ میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ قدامت میں عارفہ کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ کسی کام کا بہانہ کر کے گھر سے نکل کر قریبی بی بی اوسے فون کر کے اسے خود آئے کے لیے کہا۔

وہ دوسرے روز ہی آگئی۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ کہنے لگی۔ ”چلو اچھا ہوا کہ راشد نے اپنے منہ سے یہ بات کہہ دی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے دوسری شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اب یہ اعصاب کی جنگ ہے۔ وہ تم پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہیں گے۔ کبھی منت سماجت کریں گے۔ کبھی زور و زوروتی اور دھمکی سے کام لیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اس دباؤ کا مقابلہ کس طرح کرتی ہو۔ اگر تم اسی طرح ڈرتی رہیں تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اور اگر انہوں نے کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش کی تو میں ان سے منٹ لوں گی۔“

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ جیسے ہی وہاں پہنچ جانے کے لیے باہر نکلے۔ میری ساس نے اس کا راستہ روک لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولیں ”بیٹی! ذرا ایک منٹ کے لیے میری بات سنتی جاؤ۔“

عارفہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس نے اشارے سے مجھے کمرے میں جانے کے لیے کہا اور بولی ”بی بی فرمائیے

آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

ساس صاحبہ نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے راز و داری سے بولیں ”میرے کمرے میں آ جاؤ۔“

کمرے میں جا کر انہوں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور عارفہ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں ”بیٹی! تم سہیہ کی دوست ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ اپنی خدمت سے باز آ جائے۔ میرے بیٹے کو دوسری شادی کی اجازت دے۔ اسی میں ہم سب کا بھلا ہے۔“

”بہت مشکل ہے۔“ عارفہ گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”جب اس نے اپنے شہر کی جنس مانی تو وہ میری کیا سنے گی۔“

”اچھا تو پھر کوئی دوسرا راستہ بناؤ۔ تم تو ذلیل ہو۔ تمہارے پاس کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔“

عارفہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے اسی وقت میری ساس کو بتی گھلانے کا فیصلہ کر لیا اور سختی خیز انداز میں بولی۔ ”ٹھیک ہے، میں سہیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ کل راشد کو لے کر تین بجے میرے دفتر آ جائیں۔ وہاں انہیں ان سے بات ہونے کی لیکن میں شوش کی نہیں لیتے ہوں۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ میری ساس خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل تین بجے آپ دونوں کا انتظار کروں گی۔“ پھر اس نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے ایک کارڈ نکالا اور بولی۔ ”اس پر میرا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ اگر اجازت ہو تو سہیہ سے مل لوں۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ میری ساس کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

عارفہ دوبارہ میرے کمرے میں آئی اور اس نے حیرے لے لے کر ساس سے ہونے والی ساری گفتگو مجھے سنائی پھر بولی۔ ”تم دیکھنا میں ان دونوں کو کیا قاتل شائقی ہوں۔ کل اس ڈرائے کا ڈرائیو میں ہوا جانے کا پھر یہ لوگ بھی دوسری شادی کا نام بھی نہیں لیں گے۔“

مجھے اپنی ساس کی وقتی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ پڑتے کی آرزو نے انہیں حس و ہوش سے اس حد تک بے گانہ کر دیا کہ وہ میری کنبلی کو درمیان میں لے آئیں اور اس سے میری رہاوی کا شور مچا کر رہی ہیں۔



کالا علم

جناب ایڈیٹر صاحب

سلام عرض

ایک لکھنوی کی حیثیت سے یہ میری پہلی کاوش ہے۔ غلطیوں کے لئے

پیشگی معافی، یہ سچ بیتی ہماری ایک جاننے والی کی یہ امداد ہے

دانہ صدیقی

پسند آئے گی

(کراچی)

علیہ چاہی ہمارے خاندان میں اپنی خوش اخلاقی اور
مستطیبت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ میں تو وہ ہمارے گھر کی
ملازمہ تھیں لیکن انہیں ہمارے یہاں کام کرتے ہوئے تھیں۔
سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا ہی ہے اب وہ ہمارے گھر
کے فرد کی طرح ہی تھیں اور گھر والے انہیں چاہی کہتے
تھے وہ میری امی سے لڑکھڑکے تھے سالہ بچہ تھیں سب کی
چاہی تھیں۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ میرے بچا جو عمر میں ان
سے کم ہے کم بھی پندرہ سال بڑے ہوں گے وہ بھی انہیں چاہی

دوسرے دن جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری عارفہ نے مجھے
بعد میں بتائی۔ اس روز راشد دفتر سے جلدی گھر آئے اور
ڈاکٹر کو دکھانے کے بھانے ساس کو ساتھ لے کر چلے گئے۔
عارفہ نے ان دونوں کا پیڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور
بولی۔ ”مبارک ہو، سہ پہر تیار ہوئی ہے۔“

”جی! میری ساس خوشی سے اچھلتے ہوئے بولیں۔ کیا
واقعی وہ تیار ہوئی۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔“

”ہاں وہ مان گئی ہے لیکن اس کی ایک شرط ہے۔“

”ہم اس کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ

بتائیں تو سہی۔“ راشد بے تابی سے بولے۔

”صاف کیجیے، میں جلدی میں غلط کہہ گئی۔ اس نے

ایک نہیں بلکہ دو شرطیں مان کر لی ہیں۔“

”پلیس وہی سہی۔“ راشد بولے۔ ”آپ وہ

شرطیں بتائیں۔“

”پہلی شرط تو یہ کہ وہ آپ کو دوسری شادی کی اجازت

اس وقت دے گی جب آپ اپنے لیے لڑکی تلاش کر لیں گے

اور اس سے آپ کا رشتہ طے پا جائے گا۔“

”فیک ہے، ہمیں منظور ہے۔“ میری ساس جلدی

سے بولیں۔

”گڈ! دوسری شرط ذرا مشکل ہے۔ آپ کو بچے کا ہند

پر لکھ کر دینا ہو گا کہ اگر دوسری بیوی سے بھی آپ کے یہاں

بیٹا نہ ہو تو آپ ایک لڑکی یا خیر کے بغیر اسے طلاق دے

دیں گے۔ پھر آپ تیسری شادی کریں گے اور مرد اور بیوی نہ

ہوئی تو اسے بھی طلاق دینا ہوگی اور لڑکا پیدا ہونے تک یہ

سلسلہ چلا رہے گا چاہے آپ کو دس مرتبہ شادی کرنا

پڑے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ راشد پھرتے ہوئے بولے۔

”شادی کرنا اتنا آسان ہے۔“

”کیوں نہیں۔“ عارفہ بولی۔ ”جب آپ اولاد نہ

کی خاطر دوسری شادی کر سکتے ہیں تو تیسری، چوتھی اور

پانچویں شادی کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں اسکی فضول شرط نہیں مان سکتا۔“

راشد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ”میں پہلے ہی جانتا

تھا کہ آپ سعد سے ملی ہوئی ہیں اور میں محض بے وقوف

بنانے کے لیے بنایا ہے۔“

”ظاہر ہے وہ میری دوست ہے۔ میں اسی کے

فائدے کے بارے میں سوچوں گی۔“ عارفہ بھی اپنی جگہ

سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”آپ کے لیے میرا اعتراض
بے سٹر راشد کہ دوسری شادی کا خیال دل سے نکال دینا
بالفرض سحر سے اجازت دے دی تب بھی آپ اسے
افورڈ نہیں کر سکیں گے۔ یاد رکھیے ایک بچہ کے لیے وہ
مورتیں نہیں رہ سکتیں۔ آپ کی زندگی عذاب بن کر رہ جائے
گی اور آپ سکون کے لیے ترستے رہیں گے۔“

راشد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور گھر
آگئے۔ شاید عارفہ کی بات ان کی سمجھ میں آئی تھی۔ انہوں
نے پھر بھی دوسری شادی کی بات نہیں کی۔ ساس صاحبہ کو بھی
چپ لگ گئی تھی۔ بس ہر وقت آسمان کی طرف نظریں کیے
کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتیں۔ شاید پوسٹ کے لیے ہی دعا مانگی
ہوں گی۔ ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی
روگ انہیں صحت کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ راشد
نے انہیں کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن ان کی حالت بگڑتی چلی
گئی۔

انہی دنوں میں پھر حاملہ ہو گئی۔ جی تو یہ ہے کہ اب
مجھے مزید اولاد کی خواہش نہیں تھی لیکن راشد کے دل میں
ایک بار پھر امید کا دیار روشن ہو گیا۔ وہ باقاعدگی سے پانچ
وقت نماز پڑھتا تھا پڑھتے گئے۔ میں تو خیر شروع سے ہی
نماز کی پابندی لیکن ہجرت کی بات ہے ساس صاحبہ نے
میرے حاملہ ہونے کی خبر سن کر کسی رنڈل کا اظہار نہیں کیا اور
نہی ہمیشہ کی طرح پوسٹ کے بارے میں چڑھائی ہوئی۔
بس دن بھر رخت پر شمع و راز لیتی رہیں کچھ پڑھتی رہتی تھیں
پھر ایک دن وہ پوسٹ کی آمد دیکھ کر اسے دنیا سے رخصت
ہو گئیں۔

ان کے انتقال کے دو ماہ بعد میں نے ایک خوبصورت
سے بچے کو جنم دیا۔ راشد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ان کی
سلطنت کا دار و ستار میں آچکا تھا لیکن وہ ہمیشہ ہی اندر ہی جو
اس کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ اس لیے ایک
انہانے دکھ نہ مجھے گھیر لیا۔ قدرت کے فضلے بھی بڑے
عجیب ہوتے ہیں، کاش یہ لڑکا میری ساس کی زندگی میں
آجاتا تو ان کی دوسری آرزو پوری ہو جاتی۔ اس وقت مجھے
اپنی ساس سے گہری ہمدردی محسوس ہوئی اور میں نے سچے
دل سے ان کی تمام زبانتوں کو بھلا دیا۔ پڑھنے والوں سے
گزراؤں ہے کہ وہ بھی کسی خواہش کو روک نہ سکتا تھا۔ دینے
والی ذات اللہ کی ہے جس اسی سے دعا مانگیں۔

جولائی 2014ء

کہہ کر لے جاتے تھے۔ خاندان میں منگنی کی تقریب ہو یا حقیقہ کی ہر جگہ حلیمہ چائی کی موجودگی ضروری ہوتی تھی اور وہ بھی سارے کام میں خوشی انجام دیتی۔ بایں میں کھنگھنے جانے کی ڈرتے داری ہو یا دکن کی لالوں کو ٹیک سنبھالنے میں دشواری ہو حلیمہ چائی ماتھے پر گل لائے بغیر ایسا ندری سے سارے کام نہ لائے جاتیں۔

حلیمہ چائی کے شوہر نے انہیں بہت دکھ دیے تھے۔ اسی بتاتی تھیں کہ ان کی شادی نہایت کم عمری میں ہی ان کے غریب والدین نے ان سے دو گنا بڑے شخص سے کر دی تھی۔ شادی کے بعد اس کے گھر میں کچھ نہ لگے گاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ جوئے کی لذت میں بھی مبتلا ہے۔ حلیمہ چائی نے اس پر بھی صبر کیا اور لوگوں کے گھروں میں کام کر کے گھر چلائی رہیں۔ ان کا شوہر نہ لگے گاڑی دیتا مگر یہ سارے دکھ درد خاموشی سے برداشت کرتیں۔ کبھی کبھار چھوٹی چنگاری کے مقدسے میں تھانے میں بند ہو جاتا تو یہ بچکے والوں سے احوال نہ کر س کی حشانت کروا تیں۔ وہ بھی دو تین دن تک بیوی کا احسان سہرہ جتا۔ نماز پڑھتا ہے مگر کے کام کا میں بیوی کا ہاتھ ملاتا اور شراب پونے سے دور جتا۔ ان لوگوں حلیمہ چائی ان کی اترا تھی مٹھنیں کہ اپنے حسن سلوک سے وہ اپنے شوہر کو بالآخر رلاو راست پر لے آئی تھیں ان کے خوابوں کا یہ عمل جلد ہی پختا چور ہو جاتا اور ایک رات پھر اس کے ہاتھ میں مٹی شراب کی بوتل آ جاتی اور وہ ان کو اچھڑ کر رکھ دیتا۔

حلیمہ چائی کی دو بیٹیاں بھی تھیں جو اخلاق اور صبر میں بالکل اپنی ماں پر مبنی تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے گرتوں میں بیٹوں اور بیوی کی چادر میں خود کو لپیٹے وہ بھی اپنی ماں کی طرح مگر گھر کام کرتی تھیں۔ حلیمہ چائی نے کوشش کر کے انہیں ایسے بچوں میں لگا دیا تھا جہاں انہوں نے خود ایک عرصہ کام کیا تھا اور مالک دو کر کے کچھ احاد کا رشتہ قائم تھا۔ ہر ماں کی طرح حلیمہ چائی کا بھی خواب تھا کہ ان کی بیٹیاں جلد از جلد اپنے گھروں میں چلی جائیں اور انہیں وہ دکھ نہ اٹھانے پڑیں جو حلیمہ چائی نے جھیلے تھے۔ ان کے شوہر کا آٹھ سال پہلے انتقال ہو چکا تھا لیکن اب بھی وہ اس کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی مسکرت کی دعا میں کرتیں۔ ہم لوگ حیران ہو کر ہولتے۔ ”رہنے بھی دو چائی، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ کون سے سکھ دیتے اس نے جھیں؟ جب تک زندہ رہا چار چوٹ کی مار دیتا تھا۔ مگر کا خیرہ تک تم چائی تھیں، ایسے شخص کی یاد میں کیوں خود کو بھگان

کرتی ہو؟“ لیکن چائی پر ہماری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ ویسے ہی زار و قطار آنسو بہاتے جاتیں۔

ہمارے گھر ان کی چھوٹی بیٹی طاہرہ کام کرنے آتی تھی۔ وہ بھی بالکل اپنی ماں کی طرح سیدھی سادی اور کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ ان ماں بیٹیوں کی سب سے اچھی خوبی یہ تھی کہ دوسری کام کرنے والیوں کے برعکس یہ ہر وقت حالات کا رد مار کر پیسے اور ہمدردیاں بنورنے کے چکر میں نہیں پڑتی تھیں بلکہ جو ان کے مالکان خوشی سے دے دیں رکھ لیتی تھیں اور مزید کی ہوس نہیں کرتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد چائی کی بیٹی بیٹی نیرمہ کا ان کے کسی رشتے دار کے توسط سے رشتہ آیا۔ لڑکا میٹروک پاس تھا اور اپنے باپ اور چچا کے ساتھ مل کر آٹو پارٹس کا کام کرتا تھا۔ جوشید روڈ پر ان کی اپنی دکان بھی جہاں یہ کام خود سنبھالتا تھا۔ رشتہ بہر لحاظ سے موزوں تھا چنانچہ چائی نے صلح مشورے کے بعد رشتہ کے لیے باپ بھرنی۔ شادی کے لیے کچھ تو انہوں نے پہلے سے جوڑ رکھا تھا اور کچھ مدد بچکے والوں نے کردی۔ یوں نیرمہ کی شادی اسن طرے سے انجام پائی۔ نیرمہ کی شادی کے موقع پر چائی خوشی سے پھولے نہیں ماری تھیں، ہمارا بارود پٹا پھیلا کر اوپر والے کا شکر ادا کرتی تھیں اور اپنی بیٹی کے اچھے نصیب کے لیے دعا گو تھیں۔

نیرمہ کی شادی کے بعد طاہرہ پر کام کا بوجھ بڑھ گیا کیونکہ اب وہ نیرمہ کے گھر بھی دیکھ رہی تھی۔ نیرمہ کے شوہر نے شادی کے بعد اسے کام کرنے سے منع کر دیا تھا چنانچہ اب اس کے گھر چائی اور طاہرہ نے آپس میں بانٹ لے تھے۔ ہر چہ معمول کے مطابق چل رہی تھی بس اتنا فرق آیا تھا کہ طاہرہ پہلے ہمارے گھر پہنچ کر کھانے کو آ کر کام نہ لیا کرتی تھی لیکن اب کام کی زیادتی کی وجہ سے اس نے اپنا وقت بڑھا کر دو پہر بارہ بجے کر لیا تھا۔

ایک دن طاہرہ خلاف معمول کام پر نہیں آئی۔ ہم نے اسے طبیعت خرابی پر معمول کیا اور مگر کے کام خود نہ لے۔ اس کے بعد مزید تین دن گزر گئے لیکن طاہرہ نہ کام پر آئی نہ اس کی کوئی اطلاع آئی۔ اب ہمارا گھر مند ہونا لازمی تھا کیونکہ ایک طرف تو مگر کے کام طلب پڑے تھے اور دوسری طرف اس کی جانب سے بغیر اطلاع کی کئی اتنی طویل غیر حاضری بھی تشریف ناک تھی۔ طاہرہ ایک بھی چھوڑا کر اکرام صاحب کے بچکے پر بھی کام کرتی تھی چنانچہ انہوں نے پھولے بھائی کو ان کے بچکے پر بھیجا لیکن وہاں سے بھی سبھی اطلاع آئی کہ

طاہرہ گزشتہ چار دنوں سے کام پر نہیں آئی اور نہ اس کی کوئی اطلاع ہے۔ خیرات انگیز بات یہ تھی کہ حلیمہ چائی بھی طاہرہ کی طرح اچانک غائب ہو گئی تھیں اور ان کا بھی کوئی اتنا پتا نہیں مل رہا تھا۔

آج طاہرہ اور حلیمہ چائی کو غائب ہونے دو سال روز تھا۔ مگر کی خواہشیں تو سچیدگی سے دوسری کام والی رکھنے پر آمادہ ہو گئی تھیں اور ان کا یہ اقدام درست بھی تھا کیونکہ حلیمہ چائی اور ان کی بچیوں کی طرف سے پہلے بھی اتنی خیر ذرتے داری کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔ ہم سب ان کے لیے فکر مند بھی تھے لیکن ان کے گھر جانا بھی ممکن نہ تھا۔ وہ لیاری بسپت کے کواچ میں رہتی تھیں اور شہر کے حالات کے پیش نظر کوئی بھی وہاں جانے کا ریسک لینے کو تیار نہ تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے، میں اور میری تینا زاد بہن ابھی ابھی مگر بھر کے کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تھیں۔ اقوام کی وجہ سے سارے لوگ گھر پر ہی تھے کہ اچانک حلیمہ چائی آن پھیں۔ ایک لمبے میں ساری خواتین ان کے گرد جمع ہو گئیں، ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا۔ شکایتوں کا ایک اہار تھا جو حلیمہ چائی صبر سے سر جھکا کر سن رہی تھیں۔ جب سب نے اپنے دل بچکے کر لیے تو داری کو خیال آیا کہ کسی نے ابھی تک بے چاری سے باتیں تک نہیں پوچھا چنانچہ وادی کے حکم پر سارا مجمع چھٹ گیا اور حلیمہ چائی کو پانی کا گلاس پیش کیا گیا۔ حلیمہ چائی کو کچھ گرجاں گھبراہٹ میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی تھی وہاں ہم سب ان کی اور طاہرہ کی بغیر اطلاع اتنی طویل غیر حاضری کی وجہ جاننے کے لیے بھی جستجوش تھے۔

سب سے پہلا سوال پتی جان کی طرف سے آیا۔ ”کہاں رہی تھیں چائی آپ؟ طاہرہ کا بھی کچھ اتنا پتا نہیں۔ سب خیریت تو ہے ناں؟“

ان کا اتنا پوچھنا تھا کہ حلیمہ چائی منہ پر دو پٹا رکھ کر ہیمک ہیمک کر روئے گئیں۔ یہ بھی ہم لوگوں کے لیے ایک انوکھی بات تھی کیونکہ ان جیسی صابر اور بہادر خاتون نے کڑے سے کڑے وقت کو بھی بیٹے مسکراتے جھیلنا تھا۔ کبھی شکایت کا ایک لفظ اپنی زبان پر نہیں لاتی تھیں۔ حالات سے دلبرداشتہ ہو کر ایک آنسو نہیں بہایا تھا۔ آج وہی ہم سب کے سامنے آنسو کے دری بہا رہی تھیں۔

کچھ دیر رونے کے بعد جب ان کا دل ہلکا ہوا تو بولیں۔ ”کیا بتاؤں چھوٹی دکن، اس طاہرہ نے تو میرا بیٹا حرام کیا ہوا ہے۔ پچھلے روز سے جسم لے لو جو ایک کھیل بھی آؤ

کریں۔ منہ میں گئی ہو۔ خدا کی بے حیا اور بے غیرت اولاد کسی دکن کو بھی نہ دے۔“ وہ پھر زور شور سے آنسو بہانے لگیں۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں حیرت کا یہ دھرا جھکا تھا جو ہم لوگوں کو طاہرہ کے بارے میں ان کے خیالات جان کر لگا۔ طاہرہ بھی ٹیک اور تباہ لڑکی جس کے شفاف کردار کی گواہی ہم لوگ انہیں بند کر کے دے سکتے تھے۔ اس نے آخر ایسا کیا کیا ہوگا جو اس کی ماں یوں ماری کی تصویر بنی دونوں ہاتھ پھیلائے اسے کونے اور بد دعا میں دے رہی تھی۔ ہم بے صبری سے ان کے آنسو دکنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ اپنے ان خیالات کے پس منظر پر کچھ روشنی بھی ڈال سکیں۔

اس کے بعد حلیمہ چائی نے کوئی کچھ نہیں روئے دھوئے اپنی داستان حمل کی جو اپنے طرز کی ایک انوکھی داستان تھی۔ قارئین کی آسانی کے لیے میں یہ قصہ مختصر اپنے الفاظ میں سناتی ہوں۔

اس روز حلیمہ چائی نے کام سے چھٹی کی تھی اور مگر کی جہاز پر چھ مہینے ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آج طاہرہ کو دیکھنے چھ لوگ آنے والے تھے۔ یہ لوگ نیرمہ کے بڑوں میں ہی رہتے تھے اور اسی کی شادی میں طاہرہ انہیں پسند آ سکی تھی۔ ان کا بیٹا دینی میں کسی ٹیکسٹ میں ملازم تھا اور کچھ دنوں بعد گرامی آنے والا تھا۔ اس کے گھر والے چاہ رہے تھے کہ اس مرتبہ وہ آئے تو اس کی شادی کر دی جائے۔ اسی لیے وہ رشتے کے سلسلے میں حلیمہ چائی سے ملنا چاہ رہے تھے۔ ان لوگوں نے نیرمہ سے اس بارے میں بات کی تو اس نے خوشی خوشی اپنی ماں کو آگاہ کر دیا۔ یہاں نیرمہ نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس کی سسرال میں ابھی یہ بات کسی کو نہ پتا چلے جہاں اس کی دو بہن چلی تھیں پہلے سے ہی کسی اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ہر لحاظ سے ایک بہترین رشتہ تھا اور نیرمہ کی گہرائی سے چاہتی تھی کہ اس کی ماں کے سر سے طاہرہ کا بوجھ بھی اتر جائے اور بہن عیاہ کر اس کے بڑوں میں آجائے۔

طاہرہ کا مڈھنا کر گھر پہنچی تو اس نے اسے تیار ہونے کا حکم دیا۔ طاہرہ اپنی فرمانبرداری و رافت کے باعث کسی چن چڑا کے بغیر تیار ہو گئی اور دونوں ماں بیٹی آنکھوں میں ڈھیر دھیر سے سچے سچے مہمانوں کا انتظار کرنے لگیں۔ انتظار کی گھڑیاں جب طویل پکڑنے لگیں تو چائی نے نیرمہ سے فون پر استفسار کیا۔ وہ اپنی سسرال میں منہدی کی دعوت میں شریک تھی اسی لیے وہ بھی ماں کو کبھی بخش جواب نہ دے سکی۔ آخر خدا

خدا کر کے مقررہ وقت سے عین گھنٹے اوپر مہمانوں کی آمد ہوئی تھی۔ علیہ چاہی کہ انہوں نے پہلی ہی دفعہ میں کچھ اچھا تیار نہیں چھوڑا تھا۔ ایک تو وقت سے اتنا اوپر تشریف لائے تھے اوپر سے مرد حضرات یوں گرد میں اکڑائے بیٹھے تھے گویا کسی ریاست کے مہاراجا ہوں۔ خواہن کی باتوں سے بھی یوں گدہ رہتا جیسے لڑکی کا ہاتھ دیکھنے نہیں بلکہ بازار سے من جاہی قیمت پر کوئی چیز خریدنے لگی ہوں، نیز ان کی حرکات و سکنات بھی کافی مشکوک تھی، مگر ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ لڑکے کی بڑی بہن نے تو حد ہی کر دی، باتوں ہی باتوں میں ان کے پیچھے باورچی خانے تک پہنچی آئی اور فریج کھول کر اس کا جائزہ لینے لگی۔

علیہ چاہی کہ تو پہلی ہی نظر میں ان لوگوں کو طاہرہ کے لیے مسترد کر دیا تھا لیکن مگر آئے مہمانوں کی خاطر عادت بھی ضروری تھی اسی لیے اپنی مشترک عادت سے بھجور علیہ چاہی نے خاطر عادت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ناگواری سے دل پر چڑھ کر کہ طاہرہ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا جو پہلے ہی ان کی..... اونچی آواز سے کی جانے والی گفتگو سے پریشان کرے میں بیٹھی تھی۔ طاہرہ کا جائزہ انہوں نے یوں لیا جیسے تصانیف کے کوزہ کرنے سے قبل نظروں سے گزرتا ہے۔ ان کے ساتھ آئے لڑکے کے دونوں بھائی اور بیٹی بھی عجیب نظروں سے مسلط طاہرہ کو غور رہے تھے۔ علیہ چاہی اندر ہی اندر کٹ رہی تھیں، ان کا پس منظر بدل رہا تھا کہ کسی طرح ان لوگوں کو ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیں اور خود کو اور اپنی بیٹی کو ان کی نظروں سے محفوظ کر لیں۔

اوپر لڑکے کی ماں اور بہن طاہرہ کو خود سے چمٹے بیٹھی تھیں اور وہ ان کے بچ یوں چمکتی بیٹھی تھی کہ چاہی کے مسلط اشاروں کے باوجود وہاں سے اٹھ نہیں پارہی تھی۔ وہ دونوں خواتین اسے اپنے ہاتھ سے یوں زبردستی منھائی اور سوسے کھلا رہی جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک یہ مذاپ ان کے سر لڑکے والوں کی صورت مسلط رہا۔ گھڑی نے ساڑھے گیارہ بجائے تو وہ لوگ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور جاتے جاتے بھی دونوں خواتین نے زبردستی طاہرہ کو گھٹے سے لگایا اور ہونے والی بہو کو باطل نظروں سے محفوظ رکھنے والا وظیفہ پڑھ کر دم بھی کیا۔ علیہ چاہی بے بسی سے ساری کارروائی دیکھ رہی تھیں لیکن۔ فی الحال ان کو وہ کتنا ان کے پس میں نہیں تھا۔ ہاں یہ ان کے

پس میں ضرور تھا کہ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس مگر میں نہ دیں اور اس کا تھوڑا وہ ان لوگوں کو دیکھتے ہی کرکلی تھیں۔ مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد دونوں ماں بیٹی دیر تک ان کی باتیں یاد کر کے بہتی رہیں۔ علیہ سے ان کی بات نہ ہو سکی کیونکہ وہ ابھی تک اپنے کمرے نہ لوٹی تھی۔ اس رات علیہ چاہی کو انسانی رویوں کے مختلف سوچے سمجھتے خند بھی دیر سے آئی اس لیے قدرتی طور پر صبح آٹھ بجی دور سے کھلی۔ کام سے انہوں نے تڑپتے روز بھی کھنٹی کی تھی اس لیے کسٹمندی کے باوجود ستر سے کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے طاہرہ کو جانے کے لیے آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر کچھ گھبراہٹ کا وہ کام پر روانہ ہو گئی ہے۔ ہاتھ نہ دھو کر وہ کچن میں بیٹھیں تو طاہرہ کو اندر بڑے پریشانہ کچھ کر چک تھیں۔ طاہرہ دوسرے کھانے فرش پر کھٹے سے آڑھی تری تھی لیکن کچن کی طرف سے انہوں نے غور کیا تو کچھ فرش پر انہیں طاہرہ کا نام لکھا نظر آیا۔ چاہی پانچ بجائیں پاس میں اور کوشش کر کے اختیار وغیرہ بھی پڑھ لیا کرتی تھیں۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی انہوں نے آغوش تک قسیم دلوائی تھی۔ فرش پر طاہرہ کے نام کے ساتھ ایک انجمن نام لکھا دیکھ کر وہ چونک گئیں، نام پڑھنے کے لیے وہ ڈراما آگے ہوئیں تو طاہرہ انہیں دیکھ کر ڈر کر آئی اور جلدی جلدی فرش کو اپنے دوپٹے سے رگڑ کر صاف کرنے لگی لیکن علیہ چاہی کی عقلی نظروں نے وہ نام تیار تیار جرفش پر طاہرہ کے نام کے ساتھ جابجا غور کیا۔ یہ نام تھا مہاجد، جو چاہی کے لیے بالکل اچھا تھا۔ چاہی نے اس نام کے بارے میں طاہرہ سے پوچھا تو وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ اس کی معنی خیر خاموشی نے چاہی کے کان کھڑے کر دیے اور وہ اس سے مہاجد نامی شخص کے بارے میں باز پرس کرنے لگیں مگر طاہرہ نے ان تمام سوالوں کے جواب ایک ہی خاموشی کی شکل میں دیے۔ یہ چاہی کے لیے حیرت پریشانی کی بات تھی۔ بچپن کو مارنے پینے کی وہ قائل نہیں اس لیے فی الحال طاہرہ کو جلدی کام پر روانہ ہونے کی تلقین کر کے وہ خود بھی کام پر روانہ ہو گئیں۔ کام پر بھی سارا دن چاہی اپنے دماغ کے کھوٹے دوڑاتی رہیں لیکن مہاجد نامی کوئی بندہ ان کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ شام کو جب وہ کھنٹی ہاری گھر واپس لوٹیں تو گھر اندر میرے میں ڈوبا ہوا تھا اور دروازہ بھی کھلا پڑا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اسی لیے چھ بے ہی گھنٹوں میں گھبراہٹ اندر چھا جاتا تھا۔ طاہرہ تو روز پانچ بجے تک گھر واپس آجاتی تھی پھر

آج کہاں وہ گئی تھی آج بھی ہوتے ہوئے دل کے ساتھ طرح طرح کے اندیشے کے گھر میں داخل ہو گئیں اور جیسے ہی جی چلائی تو سامنے ہی طاہرہ کو بیٹھا ہوا پا کر اچھل گئیں۔ وہ جو اب تک بے کھد رہی تھیں کہ طاہرہ بیٹھی ہی نہیں ہوئی وہ ان کے سامنے ہی بیٹھی تھی اور اس کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج کام پر بھی نہیں گئی تھی کیونکہ اس نے کل رات والے کپڑے ابھی تک پہنے ہوئے تھے۔ علیہ چاہی کو اسے یوں گھر سے بے نیاز مہاجد دیکھ کر غصہ آیا اور وہ اسے بے تحاشہ منانے لگیں۔ ایک تو بے بسی مہاجد نامی بندے کو سوچ سوچ کر صبح سے ان کا دماغ غالی ہو گیا تھا اوپر سے طاہرہ کی بیٹھی ہوئی حرکتیں انہیں مزے نشوونما میں جھٹکا کر رہی تھیں۔

جب ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو انہوں نے علیہ کو فون کر کے بلوایا کہ شاید ماں کے سامنے تو بارے شرم کے طاہرہ کچھ نہیں بول رہی مگر بہن تو اس کی تکلی ہے ضرور کچھ نہ کچھ اگھو کر چھوڑے گی۔ علیہ ماں کے بلادے پر دوڑی پہلی آئی۔ جب چاہی نے اسے کڑوا شام بیٹھے والے واقعات سامنے تو وہ بھی خوب شرمندہ ہوئی کہ پڑا ہوا دیکھے بھالے بغیر اس نے کیسے ناشائستہ لوگوں کو اپنی بہن کے کمرے کے لیے بھیج دیا تھا اس دوران طاہرہ بالکل معمول کے مطابق بہن کے آنے کی خوشی میں کچن میں مصروف تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ چاہی نے دھمکے لہجے میں جب علیہ کو مہاجد کے قصے سے آگاہ کیا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ وہ اپنی بہن کو ابھی طرح جانتی تھی، اس سے اس قسم کی لغو باتوں کی توقع رکھنا بھی ناممکن تھا لیکن ماں بھی تو جھوٹ نہیں بول رہی تھی، اس کا پریشان چہرہ اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔ علیہ نے انہیں تسلی دی کہ آج رات وہ بیٹھیں رک کر طاہرہ کے دل کو ٹھونکے گی۔ اس نے چاہی کو ایک نیا راستہ دکھایا کہ اگر فرض کریں کوئی مہاجد نامی لڑکا موجود ہے اور اپنی طاہرہ کو پسند ہے تو وہ اپنے میاں راشد سے کہہ کر چھان چیک کر دے گی پھر اگر لڑکا مناسب ہو تو آگے بات چلائیں گے۔

کھانا کھانے کے بعد علیہ چاہی تو کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں لیکن چھوٹے سے لاڈلے کم ڈرامنگ روم سے دونوں بہنوں کی باتوں کی آوازیں رات کے تک آتی رہی تھیں۔ اگلے دن جب علیہ چاہی انہیں تو بہن سے کھنٹی پر آواز دی آ رہی تھیں، وہ بھی کہ طاہرہ کام پر روانہ ہونے سے قبل حسب معمول ناشائستہ کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب علیہ نے ناشتے کے لیے کمرے میں جھانکا تو وہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئیں اور طاہرہ کے بارے میں استفسار کیا۔ جراب میں علیہ نے بتایا کہ رات کو دونوں بیٹیاں ابھی کھنٹی تھیں کہ رات کو سوتی تھیں لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو طاہرہ کو شہد بخار میں جھکا پایا اسی لیے وہ ناشائستہ بننے لکڑی ہو گئی۔ چاہی نے جا کر طاہرہ کو دیکھا تو علیہ کی بات درست ثابت ہوئی۔ طاہرہ واقعی سحر بخار کے زیر اثر بے سندھ پڑی تھی۔ دونوں نے اسے جلدی جلدی ڈیل روٹی کے ٹوٹے کھلا کر روادی۔ علیہ جو واپس جانے والی تھی لیکن کی حالت اور ماں کی پریشانی کا سوچ کر رگڑ گئی۔ چاہی بھی اس روز طاہرہ کی حالت کے پیش نظر کام پر نہیں گئیں۔

طاہرہ کا بخار کوئی شام کے قریب جا کر ٹوٹا تو چاہی نے کچھ کی سانس لی اور نہ انہوں نے تو ساتھ والوں سے بات بھی کرتی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو طاہرہ کو ان کے کمرے میں قریب واقع کینک تک لے جائیں گی لیکن اب اللہ کے کرم سے بخار اتر گیا تھا اور کینک لے جانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد علیہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ رخصت ہو گئی تو گھر میں دونوں ماں بیٹی بھر سے تھکا ہو گئیں۔ دن بھر پریشانی میں وہ علیہ سے مہاجد کے بارے میں پوچھ بھی نہ سکی تھیں۔ بہر حال اب تو وہ جا چکی تھی اس لیے چاہی نے اس گفتگو کو بعد کے لیے اٹھا رکھا۔ طاہرہ کا بخار اب مکمل طور پر اتر گیا تھا اور وہ گہری نیند میں تھی۔ دن بھر کی تھکی پاری چاہی بھی دو صفت کمر سیدی کرنے کو بیٹھیں تو ان کی بھی آنکھ لگی۔

رات کے ایک بجے کامل ہوگا کہ اچانک چاہی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے لیٹ کر طاہرہ کے چنگ کی جانب دیکھا تو اسے خالی پایا، چاہی بھرا کر اسے ہاتھ روم میں دیکھنے گئیں وہ وہاں بھی موجود نہ تھی۔ ایسے میں انہیں دروازے کی طرف سے ہلکے پھٹے پت کی آوازیں آئیں جیسے کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ گھر میں جوان بیٹی کا ساتھ اور شرم کے بگڑے حالات کے پیش نظر چاہی گھر کو اندر سے کالا لگا کر رہی تھیں جس کی چابی ان کے کچے کے نیچے ہوتی تھی۔ انہوں نے صحت کچے کے نیچے ہاتھ پھیرا تو چابی نہ پا کر ان کے چہرہ عین روشن ہو گئے۔ لڑتے ہاتھوں سے جی چلائی تو اپنی آنکھوں پر استغناء آیا۔ دروازے کے پاس طاہرہ کھڑی چابی اور تالے سے اٹھ رہی تھی اندر چھرا ہونے کے باعث وہ چابی کو تالے میں لٹکی سے نہیں لگا پارہی تھی جی کے روشن...

ہوتے ہی وہ اچھل کر پٹلی اور چابی کو اپنے پیچھے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ طلیہ چابی اچھی تک دل کو تھامے اسے ہی گھمبے جاری تھیں۔ جب ان کی چوڑیاں کچھ سنبھلیں تو انہوں نے آگے بڑھ کر آؤ دیکھا نہ تاؤ سمجھی کر ایک پتھر طاہرہ کے گال پر چڑھایا۔

”مخوں اپنے مرحوم باپ کی عزت غلام کرنے کہاں جاری تھی؟ تا کنون یہ وہ غیبت جس سے ٹوراؤں کو چپ چپ کر رہے جاتی ہے۔“ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کو ماری بھی جاری تھیں۔ پہلے تو طاہرہ چپ چاپ بٹی رہی پھر اچانک اس نے فرار پائی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور سخت لہجے میں بولی۔

”اُمی بہت ہو گیا میں دو دنوں سے ایک ہی بات ڈہرا رہی ہوں کہ میں ماجد کے بغیر نہیں رہ سکتی اور آپ ہیں کہ میری بات سنجیدگی سے نہیں لے رہیں۔ آج میں اسی کے پاس جاری تھی، اگر اب بھی آپ کو میری بات پر شک ہے تو تاج کی فٹے دار خود ہوں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ اپنے پیچ پر جا کر لیٹ گئی جبکہ چابی وہیں اپنا سر تھامے بیٹھی رہ گئیں۔ ان کی فرمانبردار اور خاموش حرا جی، جس طرح ان کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی تھی وہ انہیں پکڑا دینے کو کافی تھا۔ اب تو یہ ماجد نامی بندہ ان کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا جو تھانے کیسے طاہرہ کے دل میں ایسا بس گیا تھا کہ طاہرہ نہ صرف اس کی خاطر ایسا سنگین قدم اٹھانے جاری تھی بلکہ اپنی ماں سے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے سخت لہجے میں بات بھی کی تھی۔

چابی کی نیند اڑ چکی تھی جبکہ طاہرہ چادر اوڑھے دنیا دنیاسے بے خبر یوں سو رہی تھی گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ صبح ہوتے ہی چابی نے بے صبری سے نیر کا نمبر ملایا۔ اس نے چابی کی بے وقت کال کو گھبرائے ہوئے انداز میں رد کر دیا اور جب اسے طاہرہ کی کچھلی رات کی حرکت کا علم ہوا تو وہ الجھ کر رہ گئی۔ ”مگر اُمی میں نے طاہرہ کو ماجد کے بارے میں کہہ دیا تھا، اس نے صرف اتنا بتایا کہ وہ اسے اچھا لگتا ہے اور وہ صرف اُمی سے شادی کرے گی۔ جب میں نے اس کی رہائش اور خاندان وغیرہ کے متعلق سوالات کیے تو کہنے لگی، تم لوگ سب جانتے ہو پھر بھی ایمان میں رہے ہو۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس نے تار کر دیا، بس ایک ہی رٹ لگا رہی تھی کہ تم جانو جو کہ مجھے شک کر رہی ہو اس لیے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اس کے بعد راشد کا فون آ گیا تو میں ان سے باتوں میں لگ گئی جبکہ طاہرہ کچھ دیر بعد سوئی اور اس کے بعد کی کہانی تو آپ کو لگتی رہے۔“

چابی اور نیر شدید پریشانی کے عالم میں تھے۔ طاہرہ کچھ بتانے کو تیار نہ تھی اور چابی اپنے آس پڑوس سے لے کر دور قریب کے رشتے داروں اور یہاں تک کہ جنگوں میں بھی کسی ماجد نامی شخص کو نہیں جانتی تھیں۔ اس روز چابی کا سر پر نہیں نہیں کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ ان کے پیچھے طاہرہ رات رات والی حرکت پر دوبارہ نہ عمل کر بیٹھے۔ اس وقت تو ان کے چاک جانے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں لیکن آج اس کے تہہ پر نہ ملے ہوئے تھے۔ وہ اپنے پیچ پر بیٹھی چپ چاپ ماں کو گھر کے کام کرتے دیکھ رہی تھی لیکن ان کی مدد کو نہ آ رہی تھی۔ شام ہوتے ہوئے اس نے چابی کے سر میں دردور دردور کر دیا، اس کی ایک ہی رٹ تھی، ”اُمی میری شادی ماجد سے کروادو، میں اس کے بغیر جیواؤں گی۔“ چابی نے لاکھ بھٹکائیں اس کے منہ سے ماجد کے بارے میں کوئی معلومات نہیں انکوائیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طاہرہ خود بھی ماجد کو لکھنے سے نہیں جانتی تھی مگر اپنی اندر محبت کے ہاتھوں گھر سے بھاگ جانے کو تیار تھی۔ چابی اس بھانے میں بالکل گمن پکڑیں کر رہی تھیں، کام کا ناخاکہ ہو رہا تھا لیکن طاہرہ کی حالت کے پیش نظر اسے کیا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

مزید دو دنوں میں طاہرہ کی حالت کسی مل دن پچھلی کی طرح ہو گئی تھی۔ ہر آہٹ اور ہر دستک پر ”خیر ماجد آ گیا“ کہہ کر بھٹکی کھانا پیتا نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔ کبھی رد کر اور کبھی فیسے سے اپنی شادی ماجد سے کرنے پر اصرار کرنے لگی۔ چابی کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے نیر کو تین دنوں کے لیے اپنے گھر بلوایا وہ اپنے یہاں راشد کے ہمراہ رہنے آ گئی۔ اس سچ نیر کی پڑوسن کا فون بھی آیا جو رشتے سے متعلق چابی کا جواب جاننا چاہ رہی تھیں، چابی نے انہیں حریف مہلت مانگ کر ٹھکرایا۔

اس رات طاہرہ اپنے بھتیگی کی موجودگی کے باوجود ساری شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی اور ایسا دوا دلا گیا کہ خدا کی پناہ۔ غریبوں کی بستی تھی گھر سے گھرنے ہوئے تھے، جلد ہی سارے محلے میں طاہرہ اور ماجد کے معاشرے کے قصے پھیل گئے اور اگلے ہی دن یہ خبر پکے پکے کی زبان پر تھی کہ محلے سے معصوم نظر آنے والی طاہرہ خوں کی پوری ہے۔ چابی گھر سے باہر کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ طاہرہ کو روٹی کی طرح دھتک دیا، پیار سے کھانا یا اپنی مٹا کے واسطے دینے

لیکن اس کی اب بھی وہی خند تھی کہ میری شادی ماجد سے کروا دو ورنہ گھر سے بھاگ جاؤں گی۔“

چابی کی کہانی ہم حیرت سے منہ کھولے سن رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ طاہرہ جیسی اللہ میاں کی گائے محبت کے معاملے میں ہماری کئی ہی بیرونی بات دے سکتی ہے۔ اُمی کو تو یہ سب سن کر بھی طاہرہ کی پاکدامنی پر ڈر اٹھ نہ ہوا اور یوں۔۔۔ کچھ بھی ہو چابی، طاہرہ جیسی نیک بچی سے ایسی کسی بات کی توقع نہ کرنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ ضرور یہ سب اس نامراد ماجد کا کیا دھرا ہے جس نے تمہاری بیٹی کو ورطہ لایا ہے اور اب بیٹھا تھا شاؤ دیکھ رہا ہوگا۔“ اُمی کی بات میں وزن تھا۔ ایسا ممکن تھا کہ ماجد نامی اس شاطر آدمی نے طاہرہ سے پہلے محبت کا ٹھیکل کھیلنا ہو اور اب اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بلیک میل کر رہا ہو یا طاہرہ کو اپنی محبت کے بھونٹے جال میں پھاس کر اسے یہ سب کرنے کی ترغیب دے رہا ہو اور یہ بھی اُمی کے منصوبے کا ایک حصہ ہو کہ گھر والوں کا ذہن ماجد نامی شخص کی طرف الجھا رہے اور وہ کسی دن ان کا کوئی دور کار رشتے دار بن کر ان سے ٹکرا جائے اور معاملات آسانی سے حل ہوتے چلے جائیں۔ فرض ہم سب کے ذہن اس طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے اور ہم وقتاً فوقتاً ان کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ چابی بیٹھیں فکر گھر سب کی خفگیں دیکھ رہی تھیں اور کبھی اشاعت تو کبھی ٹی میں یوں رہا ماتی تھیں جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی اور طاہرہ کی ”غیر حیدر تعلیمات“ کا اعلان کر کے اٹھ گئیں جبکہ ان کے جانے کے بعد رات مجھے تک ہمارے یہاں طاہرہ کا موضوع زیر بحث رہا بلکہ یہ موضوع کئی دنوں تک سب کی دلچسپی کا محور رہا پھر رفتہ رفتہ اس وقت پر بھی وقت کی دھول جیتی گئی اور طاہرہ اور ماجد واقعہ ہمارے ذہن کے کہاں خالوں میں دب گیا۔

طلیہ چابی اور طاہرہ کو کام سے بچتی لیے یہ ساتواں مہینہ ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسری کام والی رکھ لی تھی جس کو پہلے سے ہی مطلع کر دیا گیا تھا کہ جس دن طاہرہ کام پر واپس آئی، اسے یہاں کام چھوڑنا پڑے گا لیکن اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد طاہرہ کا کام پر واپس آنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس روز غصہ کی گرمی تھی، ایسی شدت کی کہ چل رہی تھی کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا اور بے چلکی کی غیر اعلانیہ لڑائی تک نے زندگی مذاہب کی ہوئی تھی۔ وادی کی طبیعت

گرمی سے گھبرا رہی تھی چنانچہ ہم ساری کزنز وادی کے کمرے میں ہی باتیں کر کے ان کا دل بھلا رہی تھیں کہ اچانک کال تل بجی۔ قرظہ قافل میرے نام لگا کہ میں جا کر اسس جھلکتی ہوئی کو میں کیٹ کھولوں۔ میں آنے والے کو دل ہی دل میں کوئی ہوئی کیٹ تک پہنچی لیکن کیٹ کھولنے پر اپنے سامنے طلیہ چابی کو پا کر میری ساری کوفت ہوا ہو گئی اور مجھے اس وقت خوشگوار حیرت کا ایک جھٹکا لگا جب طلیہ چابی کے ہمراہ چادر میں لپی طاہرہ کو کھڑا لایا۔ میں نے فوراً سلام چھڑا اور دونوں کو سیدھے وادی کے کمرے میں لے گئی۔ آن کی آن میں یہ خبر پورے گھر میں پھیل گئی کہ طلیہ چابی طاہرہ کے ساتھ آئی ہیں۔ ساری خواتین ایک مرتبہ پھر ان دونوں کے گروٹھ ہو گئیں۔ طلیہ چابی تو کسی ہی میں بس طاہرہ کا کافی کردار ہو گئی تھی، اس کی آنکھوں کے گرد بڑے بڑے حلقے بھی واضح ہو رہے تھے۔

کچھل دھکے کے برعکس طلیہ چابی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور ایک آسودہ میسر اہٹ ان کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو حال احوال پوچھا جاتا رہا پھر حسب سابق چچی جان سے برداشت نہ ہو سکا۔ ”چابی اب ذرا اس راز سے پردہ اٹھاؤ دو جس نے ہمیں کچھلے سات ماہ سے جکس میں جکڑ کر رکھا ہے۔ طاہرہ تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک نظر آ رہی ہے اور تم بھی کچھل دھکے کے مقابلے مطمئن ہو۔ آخر اس ماجد والے نے کیا کیا کیا؟“

ماجد کا ذکر کرتے ہی طاہرہ نے بے چینی سے پہلو ہلایا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آ گئے۔ چابی کے چہرے پر بھی ایک لمبے کوچھب سے تاثرات پھیلے پھر انہوں نے خود کو فورا ہی سنبھال لیا اور مسکرا کر یوں۔۔۔ بس چھوٹی دلیک، اللہ کی اپنے بندوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ اس کے بندے دوسروں کو کوئی بھی نقصان پہنچاتے ہوئے بے یقول جاتے ہیں کہ ہم سب کی ذمہ داری اس پر والے کے ہاتھ میں ہے اور وہ جب تک نہ چلے کوئی کی کال بھی پکڑیں کر سکتا۔“

چابی کی یہ ذوقی بات ہمارے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ چنانچہ اب کی بار تھا وادی نے سنبھالا جو طلیہ چابی کو دیکھ کر جکس کے بارے اپنی بتاری بھی بھول گئی تھیں۔ ”اُسے کچھ بتاؤ گی بھی کہ کیا ہوا؟ کچھل پار تو تم طاہرہ کو نہ بھڑک رہے کوئے اور بدعا میں دے رہی تھیں پھر یہ کیا کیسے پلٹ گئی؟“ وادی کے پوچھنے پر طلیہ چابی نے آخر کار دھیرے

وطن کے جیلے جوان.....

1914ء میں ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہونے والے افضل محمد کو جنہیں 1943ء میں سولہ پنجاب رجمنٹ میں کمیشن ملا تھا اور اب وہ ایسٹ پاکستان رائلٹ کے کپتی کماڈر کی حیثیت سے شرقی پاکستان میں تعینات تھے۔ انہیں حکم ملا کہ وہ بھارتی فوج کی اس نظریہ کو جس نے انہیں پورے علاقے میں گھس کر اپنے مورچے قائم کر لیے ہیں انہیں جیلے دیکھ لیا جائے۔ 7 اگست کو انہوں نے جیلے قدمی کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں کو گھاسے میں لے لیا۔ بھارتیوں نے گولیاں برسادیں۔ سبھر ٹپیلے کے جسم میں گولیوں کی بھست ہو گئیں مگر انہوں نے دشمن کی پروا کیے بغیر دہائی میم نکالا اور دانتوں سے پکٹ نکال کر اس مورچے پر دے مارا جہاں بھارتی فوجی بیٹھے تھے۔ دشمن گن مع سات دشمن کے اڑ گئے۔ پھر وہ اصر مزے دیکھ کر ایک اور مورچے پر چلا جہاں سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایک دہائی میں اس مورچے پر مارا وہ مورچہ بھی ختم ہو گیا۔ ابھی ان کی نظروں کی چوکی کے کماڈر پر پڑی جوان کے جھانکوں پر فائرنگ کرتا ہوا دوا آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنے اور اسے اڑا کر مار کر زمین پر گر لیا پھر اپنی اپنی ٹوٹی ہوئی کپاچھ میں لے کر اس کے چہرے پر وار کرنے لگے۔ دشمن نے مزے دیکھ کر گولیاں ان کے جسم میں اتار دیں۔ یہی طرح زخمی ہوتے ہوئے بھی وہ اس وقت تک قیادت کرتے رہے جب تک دشمن سے تمام مورچے خالی نہ کر لیے۔ اس بہادری کے سلسلے میں انہیں قومی جانب سے نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔

یہ تیرے پراسرار بندے

25 اکتوبر 1944ء کو راولپنڈی کے گاؤں چڑھان میں پیدا ہونے والے محمد محفوظ نے 1962ء میں پاک آرمی جوائن کی۔ 1971ء کی جنگ شروع ہوئی تو اس وقت لاس ٹانگ محفوظ 15 پنجاب رجمنٹ کی اے کمپنی سے وابستہ تھے جو وادی ہند کی بھارتی فوج میں مقیم تھی۔ 17 اور 18 دسمبر کی درمیانی رات کو یہ کمپنی بھارتی فوجیوں پر قبضہ کرنے کے لیے یوپی لائنس ٹانگ محفوظ کی پلانٹوں نمبر 3 اس سلسلے میں ہر اول دستے کے طور پر سب سے آگے گئی۔ لہذا اسے دشمن کے مورچوں سے گولیوں کی زبردست پوجھاڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ آگے بڑھتے ہوئے جب ان کی مٹی دشمن کی پوزیشن سے کوئی سترہ گز کے فاصلے پر پہنچی تو دشمن نے فائرنگ میں شدت پیدا کر دی۔ پوچھتے ہی دشمن کی توپوں نے بھی گولے برسائے شروع کر دیے پھر وہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ جب دشمن کا گولہ گین ان کی پیش قدمی کو روکا تو انہوں نے توپوں سے جواب دیا اور دشمن کی فوج میں شہید ہو گئے۔ اپنے ساتھی کی ہلکی شین گن اٹھا لی اور دشمن کے مورچے میں گھس گئے۔ ابھی ایک گولی ہاتھ میں تھی اور دشمن گن پھوٹ کر گر گئی۔ وہ نیپے ہو گئے انہوں نے خالی ہاتھ سے دشمن کے ایک سپاہی کا گھٹا پکڑ کر دبا شروع کر دیا۔ دوسرے بھارتیوں نے ان پر سنگینوں سے حملہ کر دیا اور وہ اسی مورچے میں شہید ہو گئے۔ جنگ بندی کے بعد ایک بھارتی آفیسر نے کہا کہ ”ہم نے دیکھا کہ اس جیسا غضبناک آدمی نہیں دیکھا۔ آج بھی اس کا چہرہ یاد آتا ہے تو میں چمک جاتا ہوں۔“ قومی جانب سے انہیں نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔

نیر سے طاہرہ کو چاہی دینے کا کہنے لگا جو نیر نے آخر سے کہا دی۔ چاہی دینے ہی اس نے نیر کو چھوڑا اور تالا کھولنے لگی۔ دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی باہر نکلیں اس نے اسے دیوچ لیا اور واپس کمر کے اندر لے آیا۔ اس دوران اس نے خود کو پھرانے کی دھمکیاں اور کوششوں میں بھری شرت کے بہن تک فوج ڈالے۔ جب طاہرہ کی طرح قابو نہیں آئی تو بڑی مشقوں سے میں نے اور نیر نے مل کر اسے کمر سے ہاتھ دیا۔ اس کا ہاتھ پائی میں نیر بھاری لکھی چھ میں آئی تھیں۔ اس دوران طاہرہ لگا تار ہم سے شین کر رہی تھی کہ اسے مامد کے پاس جانے دیا جائے یا مامد کو یہاں بلالیا جائے۔ پانی اب سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا اور طاہرہ کی بے قراری اب سمجھ سے بالاتر ہو گئی تھی۔ مامد کا کوئی اتنا پاس کے پاس نہیں تھا لیکن وہ اس کے پاس جانے کے لیے یوں بے تابی دکھا رہی تھی جیسے وہ کمر کے سامنے ہی بائیں پھیلائے اس کا شکر تھا کہ وہ۔ چاہی دینے کا کہنے لگا کہ اس کے بعد انہوں نے اپنے کمر کے آس پاس رہنے اور گزرنے والے لڑکوں پر نظر رکھی شروع کر دی۔ کوئی لڑکا اگر ان کے کمر کے سامنے کھڑا بھی ہو جاتا تو یہ اس سے باز پرس کرنے لگتیں۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے سلسلے میں چاہی کی جگہ نفسیاتی جیسا کہ ہم سے چاہی

نیر سے اس راز سے پردہ اٹھا شروع کیا۔ ”اس روز آپ کے کمر سے نکلی تو میرے ذہن میں آپ لوگوں کی کبھی ہوئی باتیں ہی گھر رہی تھیں جنہیں سن کر میں اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ طاہرہ کو ضرور وہ مامد نامی فریاد یا بلیک میل کر رہا تھا اور وہ ہمارے سامنے شرمندگی کے باعث اس کا اقرار نہیں کر پاری تھی۔ اس خیال نے میرے سوچ کے ذریعے کو تھوڑا سا مثبت کر دیا تھا۔ طاہرہ اب میری نظروں میں ظالم کی جگہ مظلوم ہو گئی تھی جس کی ٹیک نامی اس کو ہے مامد کی وجہ سے داؤ پر لگی تھی۔ میں انہی خیالوں میں ذوقی انگریزی جب کمر پہنچی تو ایک نیا ڈراما میرے پیشتر تھا۔ کمر کے اندر سے شور شرابہ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پڑو میں بھی تجسس نظروں سے اپنے کمروں کے دروازوں سے سن سنان کی امید میں جھانک رہی تھیں۔ میں نے لڑتے ہاتھوں سے دروازے پر دھچک دی تو میرے دلدارا شد نے دروازہ کھولا، اس کے بال بھرے ہوئے تھے اور شرت کے بہن ٹوٹے ہوئے تھے۔ اندر سے طاہرہ کے چہرے کی آوازیں آ رہی تھیں جو درد کر مامد کو بلا رہی تھی۔ میں فوراً کمر میں داخل ہوئی۔ سارا کمر الٹا پڑا تھا اور میں میں طاہرہ ایک کمر سے دوسرے کی مدد سے بندھی ہوئی تھی رہی تھی جبکہ نیر سے گلاس کی مدد سے پانی پلانے کی کوشش کر

دیں تھی۔ مجھے ہچکا ہچکا کھڑا دیکھ کر راشد نے بتایا کہ آپ کے جانے کے بعد میں بھی قریب ہی رہنے والے اپنے ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ کمر پر صرف یہ دونوں نہیں تھیں۔ طاہرہ بائیں ٹائل میڈا کر رہی تھی چنانچہ نیر بھی میرے جانے کے بعد کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہی پھر نہانے میں لگی۔ نہانے سے قبل اس نے غصہ کی یہی کہ طاہرہ کی نظر بچا کے کمر کے دروازے پر تالا ڈالا اور چابی اپنے ساتھ ہاتھ روم لے گئی۔ طاہرہ نے جو میدان صاف دیکھا تو اپنے پرگرام پر عملدرآمد کرنے کی فہمی لیکن جب کمر کے دروازے پر تالا کھولا دیکھا تو شے سے پاگل ہو گئی۔ پہلے تو تجسس چلاتی رہی پھر نیر کو کھڑا بھلا کہنے لگی۔ اپنی دیر میں نیر بھی جلدی جلدی تھا کہ باہر کل آئی اور مجھے فوراً کمر واپس آنے کا ایس ایم ایس کر کے طاہرہ کے پاس پہنچی جو اسے دیکھ کر کہہ کر اپنے سے باہر ہو گئی اور مارنے دوڑی۔ نیر نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی تو کسی چیز سے الجھ کر گر گئی۔ طاہرہ اس کے اوپر سوار ہو گئی اور جنوبی اعجاز میں اس کا گھلا پاتے ہوئے چابی کا مطالبہ کرنے لگی۔ اپنی دیر میں میں تیری سے کمر پہنچی چکا تھا اور ان دونوں کی آوازیں صاف سن سکتا تھا۔ میں تیرے

جانب سے نشان حیدر کا اعزاز دیا گیا۔

افرو نہیں کر سکتی تھیں، وہ بے بھی ان دونوں کے بولی مگر چند جانے سے چاہتی کی حق پختی تھی یہ خرق ہوری بھی اور وہ جلد مگر بیٹے روزی کمانے کا کوئی حل بھی تلاش کرنا چاہ رہی تھیں۔ محلے والے بھی چونک اب طاہرہ کا مسئلہ سمجھ گئے تھے اسی لیے اس کے کردار کے بارے میں آڑتی منتی افواہوں نے بھی اب دم توڑ دیا تھا۔ اکثر محلے کی خواتین طاہرہ کی حالت دیکھتے اور چاہتی سے ہمدردی کا اظہار کرنے ان کے گھر آئیں اور اس آڑ میں طاہرہ کی بے قراری کی داستانیں اپنے گھر والوں کو سنا کر مضحکہ اڑاتیں۔ چاہتی ان کی بیٹوں سے واقف تھیں لیکن حالات کے آگے بڑھتے ہی نہیں۔ اس مہر قدرت نے انہیں اولاد کے ذریعے امتحان میں ڈالنا تھا جس پر وہ حسب عادت مہر و شکر سے کام لے رہی تھیں۔

اس بچہ انہیں اپنی پردن کے توسط سے مگر بیٹے بچے کمانے کا موقع بھی مل گیا۔ اس پردن کا میاں بریانی کا قسطا لگاتا تھا، اس کے ساتھ اس نے آلو چھولے بھی رکھنے کا سوچا۔ اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو اسے چاہتی کا خیال آگیا چنانچہ باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ آلو چھولے اسے چاہتی سلائی کریں گی اور اس سے ہونے والی آمدنی کا چالیس فیصد وہ روزانہ کی بنیاد پر باندی سے بانٹا دیا کرے گی۔ اس طرح چاہتی کم از کم بیویوں کی طرف سے کچھ مطمئن ہو گئیں۔ اس دوران فیصد کی پردن کا جواب کے سلسلے میں تین مہر فون آچکا تھا اور چاہتی کے صاف انکار کے باوجود وہ مگر جس کے طاہرہ کے لیے ان کے بیٹے سے بہتر کوئی رشتہ نہیں آسکا اور چاہتی ان کو تنگ کر کے سخت گھراں بخت کی مرگب ہوری ہیں۔ جب وہ چاہتی سے کسی طرح نہ ملیں تو مجبوراً چاہتی نے فیصد کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اپنی پردن سے ہالفا ملاقات کر کے نرم الفاظ میں انہیں چاہتی کا انکار بچا دے۔

ایک حیرت انگیز بات جو چاہتی نے طاہرہ میں نوٹ کی تھی کہ جب بھی فیصد کی پردن کا فون آتا، طاہرہ کے چہرے پر ہچکے بھاری آجاتی لیکن جب وہ ان کا اصرار اور اپنی ماں کا مسلسل انکار سنتی تو بھڑکی جاتی۔ چاہتی نے فیصد کو یہ بات بتائی تو اس نے اسے چاہتی کا دم چاٹا اور سمجھا بھگا کہ ان کو مطمئن کر دیا۔ مگر چند دنوں سے طاہرہ پر عجیب قسم کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ابھی پہلی چٹنی ہوئی کہ کچا کچا گل اٹھتی اور چاہتی کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر پیش کرتی، "امی، میرا ماہجہ مجھے لینے آگیا ہے، اب تو مجھے

اس کے پاس جانے دیں۔" وہ روٹی دھوتی ان کے پیروں میں مگر جاتی۔ اس کے لیے میں اتنا درد ہوتا تھا جیسی اس کے ساتھ آنسو بہانے لگتیں۔ طاہرہ کے رونے دھونے اور چیخ و پکار سے تنگ آس پردن والوں نے چاہتی کو مشورہ دیا کہ اسے خواب آور گولیاں استعمال کروائی جائیں تاکہ وہ اپنے گھروں میں سکون سے رہ سکیں۔ مگر میں کیا نہ کرتیں کے صدقاً چاہتی نے طاہرہ کو ایک گولی دن میں اور ایک رات میں کھلائی شروع کر دی جس کے ذریعہ سوئی راتی اور بالخصوص جاگ بھی رہی ہوئی تو وہاں کے ذریعہ اثر اس کا ذہن مفلوج رہتا۔ چاہتی اس کی حالت پر خون کے آنسو بہتیں مگر اس کے حق میں دعا کرنے کے علاوہ اور کچھ کیا سکتی تھیں۔

ابھی پریشانی میں شب و روز گزر رہے تھے کہ فیصد نے ایک حقیر انگیز اطلاع دی۔ اس کی پردن کا بیٹا آج کل چھٹیوں پر دہلی سے آیا ہوا تھا، یہ وہی لڑکا تھا جس کا رشتہ طاہرہ کے لیے آیا تھا۔ وہ خبر جس نے چاہتی کو حیرت کا ایک شدہ جھٹکا دیا وہ یہ تھی کہ موصوف کا نام "ماجد" تھا۔ یہ وہی نام تھا جس کی بدولت کچھلے عین ماہ سے چاہتی کا گھن سکون برپا ہو کر رہ گیا تھا، ان کی سعادت مند اور ہوشیار بیٹی۔ پورے خاندان اور محلے میں بھگی کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ فیصد نے حیرت بھرا چہرہ پر تعریف آوری چند دنوں پہلے ہی ہو گئی تھی۔ لیکن اسے آج صبح اپنے وید کی زبانی پتا چلا کہ یہ کلک راشن کل کل کام کے سلسلے میں اپنے بیٹے بھائی کے پاس فیصل آباد گیا ہوا تھا اور فیصد نے پردن کی عادات کو دیکھتے ہوئے خود ہی ان سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا اسی لیے انہیں یہ اطلاع اتنی دیر سے ملی۔ فیصد کے بتانے پر چاہتی نے طاہرہ پر پڑنے والے دوروں کا حساب لگایا تو ان کی محسوس دنگ رہ گئی، طاہرہ کو ٹھیک اسی دن سے یہ دورے پڑنے شروع ہوئے تھے جس دن ماہجہ کراچی پہنچا تھا۔

اب آہستہ آہستہ چاہتی پر سارے بھید میاں ہونے لگے تھے، کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ جس دن ماہجہ کے گھر والے ان کے گھر آئے، اس کے اگلے دن سے ہی طاہرہ کے برتاؤ میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ ان لوگوں کا عجیب طرح سے گھبرنا، سارے گھر کا ہاتھ لینا بھر جاتے جاتے طاہرہ پر کچھ پڑھ کر دم کرتا اور صاف انکار کے باوجود فون کر کر کے رشتے کے لیے اصرار کرتا۔ علیحدہ چاہتی اپنا سر قلم کر بیٹھ گئیں۔ آج تک انہوں نے صرف جادوئے اور کالے لہم

کا نام سنا تھا لیکن یہ خیال ان کا دل بٹھائے دے رہا تھا کہ ان کی محسوس میں اس کا شکار ہو گئی ہے۔ اگر وہ طاہرہ کو ان کے سامنے نہ لٹائیں، کوئی بھی بھانہ نہ دیتی تو آج ان کی پولی میں بیٹی اس اذیت سے نہ گزرتی۔ جب چاہتی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو جاننا نہ بچھا کر اپنے رب کے حضور کھڑی ہو گئیں اور گڑ گڑائی میں اپنی بیٹی کی مستحیائی کی دعا مانگتی رہیں۔ دعا مانگ کر چاہتی کا دل کچھ ہلکا ہوا تو انہوں نے معاملے پر غصے دل سے سے سرے سے غور کرنا شروع کیا۔ سوچے سوچے ان کے دماغ میں ایک نیا ذہیدہ خالد کا نام آیا۔ ذہیدہ خالد ان کی دور کی خالہ ہوتی تھیں۔ ضعف اعصری کے باعث وہ دیکھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکی تھیں لیکن اس عمر میں بھی ان کی یادداشت غلبہ کی تھی۔ فیصد کی شادی پر وہ اپنی طبیعت قربانی کے باعث نہ آسکی تھیں۔ وہ شروع ہی سے بھیاڑ چوکھٹ اور روحانی علاج کے ذریعے دوسروں کے کام آتی تھیں۔

چاہتی نے پہلی فرصت میں ان کے گھر فون کیا۔ جوہا ان کے بیٹے نے بتایا کہ کچھلے کچھ دنوں سے ذہیدہ خالد شدیدہ ملین ہیں وہ کل ہی تین دن اسپتال رہ کر آئی ہیں اور... لیال سو رہی ہیں۔ چاہتی کو یہ سن کر کچھ مایوسی ہوئی مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اگلی ہی شام فیصد کی مدد سے سوئی جاگتی کیفیت میں جھلا طاہرہ کو لے کر ذہیدہ خالد کے گھر جا پہنچیں۔ ان کے بیٹے نے جو بتایا تھا اس کے مقابلے میں ذہیدہ خالد کی حالت زیادہ تشویشناک تھی، اگر زندگی صرف آتی جاتی سانسوں کا نام ہے تو وہ زندہ نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اندر زندگی کی کوئی رقی باقی نہ رہی تھی۔ فیصد اور چاہتی ان کی یہ حالت دیکھ کر مایوس ہو گئیں۔ ان کی بہو کو جب چاہتی کی آمد کی وجہ پتا چلی تو اس نے انہیں ذہیدہ خالد کی ایک شاگردہ جیسہ بی بی کا پتا دیا جو اسی محلے میں رہتی تھی۔ بقول اس کے وہ ذہیدہ خالد کی بچی شاگردوں میں سے ہے، خود ذہیدہ خالد بھی اپنے پاس علاج کی غرض سے آئے لوگوں کو اب انہی کے پاس سمجھتی تھیں۔ چاہتی کی ڈھونڈ ہوئی تھی جو جیسے ایک اور کچھ کا سہارا مل گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو ان کل کل کوچوں میں بیٹھنے اپنی دکان چکاتے نام نہاد عاتلوں کے ہاتھوں میں نہیں سونپنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ طاہرہ کو لے کر اس پر پڑھتی تھیں جو ذہیدہ خالد کی بہو نے بتایا تھا۔ ان کے گھر پر لوگوں کی میسر گئی تھی اور لوگ... اپنی باری کے انتظار میں کھنٹوں سے بیٹھے تھے۔ چاہتی

اور فیصد بھی طاہرہ کو لے کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ غرض اس روز کوئی دو گھنٹے طویل عرصہ آ کر نا انتظار کے بعد طاہرہ کا فیصلہ آیا۔ فیصد بی بی نے غور سے چاہتی کی زبانی طاہرہ کی کیفیت سے جڑا ہر واقعہ سنا اور کچھ سوالات بھی کیے۔ اس کے بعد انہوں نے طاہرہ کا ہاتھ قلم کر کچھ دیر مرا قہ کیا اور چاہتی کو یہ اندہ ہٹاک اطلاع دی کہ ان کا شک سونقید درست ہے اور طاہرہ وہی کئی کئی شہیدہ نظر بد کے زیر اثر ہے البتہ انہوں نے چاہتی کو یہ ایمان دلایا کہ طاہرہ ان کے مسئلہ علاج سے انتہا جلد صحت یاب ہو جائے گی اور باہر تادی وہ کردار اس کے ذہن سے صاف ہو جائے گا۔ چاہتی کو بہت عرصے بعد کوئی خوشی کی خبر ملی تھی۔ وہ اور فیصد بھی... خوشی طاہرہ کو لے کر واپس آ گئے۔ اندر ہی جانے کے باعث چاہتی نے اکیلی فیصد کو واپس سہرا لیں نہیں جانے دیا اور رات اپنے پاس ہی روک لیا جو ان کے حق میں اچھا ہی ثابت ہوا کیونکہ اس رات وہ طاہرہ کو گھنٹوں کے باعث خواب آور گولی کھانا بھول گئیں اور نتیجتاً آدھی رات کو طاہرہ نے ان دونوں کو سوتا پا کر باور پائی خانے سے پھری حاصل کر لی اور سینے میں گھس کر لی اس نے ایک خط بھی تحریر کیا تھا جس میں اس نے اپنے اس کل کا ذمہ دار چاہتی کو ٹھہرایا جو اسے ماہجہ کے پاس جانے سے روک رہی تھیں (فیصد کو یہ خط اگلے روز چھپے کے پاس رکھا ملا تھا)

چاہتی رات کو باخود روم جانے کو اٹھیں تو صحن میں کسی چیز سے الجھ کر اس پر جا کر پڑیں۔ چاہتی کے گرنے سے جو شور ہوا تو فیصد بھی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ اس نے جب حق جلائی تو صحن کا منظر دیکھ کر بدحواس ہو کر جو بیٹھی تو پھر بیٹھی ہی چلی گئی۔ غرض پر طاہرہ بے سندھ پڑی تھی اور اس کے اوپر چاہتی گری ہوئی تھیں، ان کی ٹیٹھ پر خون کے دھبے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ وہ خون دراصل طاہرہ کا تھا جو اس کے سینے سے گل رہا تھا اور طاہرہ پر گرنے کی وجہ سے چاہتی کی ٹیٹھ پر بھی لگ گیا۔ پردیوں کے دروازہ بچانے پر فیصد نے گرتے پڑتے دروازہ کھولا۔ اس کے بعد کے معاملات پردیوں نے ہی سنبھالے، ایڈیٹورس مشکواتی کئی اور طاہرہ کو اس میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا۔ چاہتی کو گرنے کی وجہ سے کھٹنے پر ہلکی سی چوٹ آئی تھی جو جگر کرنے سے بہتر ہو گئی البتہ طاہرہ چند دنوں تک اسپتال میں داخل رہی۔ ڈاکٹروں نے تو ایک موقع پر جواب دے دیا تھا مگر یہ شاید چاہتی کے نیک اعمال تھے اور طاہرہ کی مظلومیت کہ

قدرت کو ان پر رحم آگیا اور ظاہرہ جزوی طور پر سمجھنے ہو کر اپنے گھر واپس آئی۔

اپنی بہن کی یہ حالت دیکھ کر نصیر نے غصے سے پھیری اسی وقت اپنی پڑوسن سے دو دو ہاتھ کسے جاری تھی۔ چائیا کے بہت بھانے بھانے پر وہ کچھ قابو نہیں آئی۔ اس دوران نصیر کی ساس بھی ظاہرہ کو دیکھنے اسپتال آئیں اور جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ نصیر نے ان کے علم میں لائے بغیر ان لوگوں کو ظاہرہ کے رشتے کے لیے بھیجا تھا تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بقول ان کے وہ لوگ شروع ہی سے پراسرار حرکتوں میں ملوث تھے اور ان کے گھر میں جانوروں کی ہڈیاں، ٹوٹی ہوئی چٹیلیں اور سور کے پر وغیرہ بھی لٹکے ہوئے ہیں۔ گھر کی اندرونی دیواریں پر بھی انہوں نے عجیب و غریب زبان میں کچھ حروف بھی کندہ کر رکھے ہیں نیز ان کے کتے چلتے والے بھی انہی کی طرح مشکوک کردار کے حامل ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان سے ملنے بارہ بیچے کے بعد ہی آتے ہیں اور ان کے بارے میں سارے محلے کی یہ منتظر رائے تھی کہ یہ لوگ کالا جادو کرنے کرانے والے لوگ ہیں۔ پڑوسی ہونے کے ناتے ٹھوڑی بہت بات چیت نہ کھٹی۔ پڑوسی یہ ارشاد کے ویسے میں بھی بے تعلیق سمجھتی ان لوگوں کو محنت نامہ دیا گیا تھا۔ نصیر بھی شادی ہو کر آئی تھی اور ان کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی چنانچہ اس نے آسانی سے جا رانگل لیا۔ مزید بیوقوفی اس نے اپنی سرسراں میں کسی سے اس کا ذکر نہ کر کے کی یہاں تک کہ راشد بھی رشتے والی بات سے لاعلم تھا۔ اگر نصیر صرف اس سے بھی ذکر کر دیتی تو راشد اسے سختی سے منع کر دیتا اور چائیا کو بھی یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ظاہرہ، ان لوگوں کو بھی اس بات کا علم تھا کہ سختی سرکریوں میں ملوث ہونے کے سبب کوئی شریف والدین سیدھے طریقے سے تو ان کو اپنی بیٹی نہ دیتے اسی لیے انہوں نے فیہ حارستہ اپنا یا اور ظاہرہ ان کے چنگل میں بری طرح پھنس گئی۔

ظاہرہ اب یہ حد نہ گزر رہی تھی کہ ماہد کا نام اب بھی اس کی زبان پر تھا۔ چائیا بے بسی سے ظاہرہ کی یہ حالت دیکھیں اور میرے گھونٹ چٹیں پھر کچھ عرصے بعد اس کی حالت کچھ بہتری ہوئی تو وہ اسے دوبارہ رجیم بی بی کے پاس لے گئیں جنہوں نے آہستہ آہستہ اپنے روحانی علاج کے ذریعے ظاہرہ کو ماہد کے قبضے سے آزاد کر دیا۔ چائیا نے بتایا اس عمل کے دوران ظاہرہ بہت تکلیف سے گزری۔ ایک دن چھوڑ کر وہ خاتون اسے دم کیا ہوا پانی

پلا تھیں جسے بی کر کچھ دیر کو اس کی حالت غیر ہو جاتی تھوڑے سے آتی جس میں انہوں نے اپنی آنکھوں سے ظاہرہ کو اس روز کھلائی جانے والی مشائی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیکھے جو ان ہاں بیٹی نے ظاہرہ کو زبردستی کھلائی تھی۔ جسے بی بی کے مطابق دراصل اس مشائی پر عمل کیا گیا تھا جو ان دونوں خواہش نے چائیا کی نظر بھا کر اسے میں رکھی ہوئی مشائی میں شامل کر دی تھی اور کامیابی سے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے وہی مشائی انہوں نے ظاہرہ کو کھلا دی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جب تک یہ مشائی ظاہرہ کے معدے میں رہتی وہ ماہد کے نام کی مالاجی رانی اور بعد میں چائیا بھجور اپنی بدنام بیٹی کا ہاتھ ان کے بیٹے کے ہاتھ میں دے دیتیں لیکن مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا ہے اور اسی کے کرم سے ظاہرہ اور چائیا ان کے پھیلانے ہوئے جال سے بال بال بچ گئیں۔

ظاہرہ کا علاج اس وقت تک جاری رہا جب تک اس کا معدہ اس عمل کی ہوئی مشائی سے خالی نہیں ہو گیا۔ اس دوران اس کی حالت بھی بہتری کی طرف گامزن تھی اور آہستہ آہستہ ماہد کا بھوت اس کے سر سے اترتا جا رہا تھا۔ آخر کار ظاہرہ پوری طرح سے مستحیاب ہو گئی۔ حیرت انگیز طور پر ظاہرہ کے دل میں ماہد کے لیے جتنی محبت تھی رفتہ رفتہ وہ نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ شاید یہ علاج کا اثر تھا کہ ماہد اب اس کے نزدیک دنیا کی سب سے قابل نفرت شخصیت میں سے ایک تھا۔

چائیا کی زود واکمل ہو چکی تھی۔ کمرے میں موجود ساری خواتین اس حیرت انگیز کہانی کے زیر اثر عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ خود میں بھی ظاہرہ کو دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تو واضح و مفہوم الفاظ میں جادو کرنے اور کرانے والے پر جنت حرام قرار دے دی ہے پھر کیوں اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے اور دین اسلام کا ڈھنڈا دھنڈے والے اس قبیح فعل میں مبتلا ہیں جو سیدھے سیدھے ان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ جادو اور کالے علم کا سہارا لے کر بھی وہ کامیابی کی سیر می پڑھتا چاہتے ہیں اور دنیا کی ہر خوشی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آخر ان نام نہاد مسلمانوں کو دوسروں کی زندگی پر ہاد کر کے اور خود کو دوزخ کا ایندھن بنا کر کیا خوشی ملتی ہے۔ ہے کوئی جواب؟

مہینہ نامہ سرگزشت جولائی 2014



ٹاوان

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم

یہ آج کے دور کا المیہ ہے۔ لوگ ابک چہرے پر کٹتی چہرے سجائے ہوئے ہیں۔ وقار بھی ملمع شدہ چہرے کی وجہ سے ملوین کو پہچان نہ سکتا اور جال میں پھنستا چلا گیا۔ امید ہے یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔

عالم شاہین
(ملتان کینٹ)

وقار و رینک ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا رہش سے اپنے بال سیٹ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دھیمی آواز میں کہتا بھی رہا تھا۔ اس نے براؤن کمر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی رنگت صاف تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور چیشانی کشادہ تھیں۔ قدر بھی دراز تھا۔

وقار کا تعلق حوالہ گمانے سے تھا۔ اس کے والد زمیندار تھے۔ آبائی گاؤں میں زمینیں تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے والد کی مٹان میں کاشن فیکٹری بھی تھی۔ وقار ایف اے پاس تھا۔ ایف اے کرنے کے بعد اس کا دل آگے بڑھنے کو نہیں چاہا تھا اس لیے اس نے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ حوالہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کام بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت دوستوں سے ملنے اور پارٹیوں میں شرکت کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس کی ایک بہن بھی تھی جس کا نام فرحت تھا۔ فرحت اس سے چار سال چھوٹی تھی۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ والد تو اسے بھڑک کے بعد نہیں پڑھانا چاہتے تھے لیکن فرحت کی خدمت اور شوق کی وجہ سے انہوں نے اسے مزید پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اب وہ بی اے کی طالبہ تھی۔

وقار کی امی اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے

خاندان کی لڑکیوں کی تصویریں بھی اسے دکھائی گئیں لیکن وقار نے کسی بھی لڑکی کو پسند نہیں کیا اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرے گا۔

”میں جنہیں بہت جلد متادوں گی۔“ طوفانی نے شرمائے ہوئے امارا میں کہا۔ پھر وقار نے ایک جہز اسٹور سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں اس اور پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ ابھی دو تھوڑی سی دور گئے تھے کہ طوفانی نے وقار سے کہا۔

”وقار کاررو کتا۔“
 ”کیوں؟ کیا ہوا؟“ وہ نے حیرت مگر سچے دل سے پوچھا۔
 ”تم کار رو کو تو کتا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“
 ”طوفانی نے کہا تو وقار نے کار رو کو کے کنارے روک دی۔ جیسے ہی اس نے کار رو کی“ طوفانی نے غلج کی کی تیزی سے
 پر فہم کی چھوٹی سی ایک شیشی نکال کر وہ کہہ پڑے پڑے کہہ گیا،
 ”دوسرے ہی لمحے وقار کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی
 آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھلتا چلا گیا اور پھر اس کا سر سیٹ
 کی پشت سے لگ گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔“

☆.....☆.....☆
 وقار کو ہوش آیا تو اسے اپنا سر پکڑا تا ہوا محسوس ہوا۔ اس
 کا سر دائیں طرف اٹھکا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں
 گزارا پھر جب اس کا شعور جاگا تو اس نے بے اختیار اٹھنے کی
 کوشش مگر کمری سے بندھا ہونے کی وجہ سے وہ صرف گھسسا کر
 رہ گیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہ بے اختیار چونک پڑا۔ وہ
 اس وقت ایک کمرے میں کمری کے ساتھ رہی سے بندھا ہوا
 تھا۔ اس کے سامنے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس آدمی کی عمر
 چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ مٹی موٹھیں اور کھنٹی داڑھی سے
 اس کی شکل خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خون
 کیڑے کی مانند سرخ تھیں۔ اس نے شلوار میں پھنی ہوئی قمی۔ اس
 کے عقب میں دو مرد عارضی ٹائپ تو جہان کھڑے تھے جن کے
 اہموں میں دھج اور تھے۔

”گنگ گنگ کون ہو تم۔۔۔ اور۔۔۔ اور میں کہاں ہوں۔“
 وقار نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”طوبی کہاں ہے؟“

اس آدمی نے وقار کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی بیوی کی جیب سے سیل فون نکالا تو وقار بے اختیار چمک پڑا۔ یہ سیل فون اسی کا تھا۔ اس آدمی نے سیل فون آن کرنے کے بعد کال ملا دی۔

”لو..... اپنے والد سے بات کرو۔“ اس آدمی نے
 حکیمانہ لہجے میں کہا اور سٹیل فن و قمار کے کان سے لگا دیا۔ وقار
 کو دوسری طرف تھیل جانے کی آواز صاف سنائی دے رہی
 تھی۔ پھر کال انڈ کر لی۔

”کیلو۔ کیلو۔۔۔“ دوسری طرف سے وقار کو اپنے والد کی

آوارستانی دی۔

”ایو۔ ایو۔ میں وقار۔ میں کہاں ہوں۔ یہ لوگ کہیں ہیں۔“ وقار نے تیزی سے کہا۔

”وقار چیمبرستان مت ہو۔ ان لوگوں نے مجھ کو ان کے لیے بھرا دیا تھا۔ میں نے ایک کرڈا کر دیا ہے اب یہ جیسمینا جلد ہی صحر چھوڑ جائیں گے۔“ اس کے ابو نے جواب دیا تو وقار فک پڑا۔ پھر اس سے پہلے کہ وقار کوئی بات کرے، اس آدمی نے تل فون ہٹا کر اپنے کان سے لگا لیا۔

”اب سیکھنا اپنے بچے سے بات کر کے سلی ہوگئی ہو گی۔ تمہارا بیٹا شام تک کھڑکی پر جائے گا۔“ اس آدمی نے کہا۔
”اور ہاں، میں تمہیں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں، اگر تم نے لیس کو مٹا دیا تو تمہیں اپنے بچے کی لاش ملے گی۔“

”نہن۔ نہن۔ نہیں۔ نہیں“ میرے بیٹے کو بوجھ مت کہتا۔
 میں پولیس کو نہیں بتاؤں گا۔“ وقار کے ابو نے منت مہرے لیے
 کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس آدمی نے کہا اور پھر سیل فون آف کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”ہمیں تم لوگوں نے اغوا کیا ہے؟“ وقار نے اس آدمی سے پوچھا۔ ”مطوبی کہاں ہے۔ کیا تم نے اس کے گھر والوں سے بھی تادیب لیا ہے؟“

و قاریاں سن کر وہ آدمی بے اختیار رُس پڑا۔
 ”نہیں۔ طوبیٰ ہماری ساسھی ہے۔“

”کیا ا“ وقارِ حیرت سے بولا۔ اس کی آنکھیں حیرت
شدت سے پھلکی چلی گئیں۔ ”کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”مسٹر وقار، ہمارا ایک یلنگ ہے اور ہمارے یلنگ
سے متعدد لڑکیاں ہیں جو موہاٹل فون پر تم جیسے بھولے بھالے

اس لڑکوں سے دوستیاں کر کے انہیں جہاں میں چھٹی

۔ پزلے تاوان وصول کرتے ہیں۔ "اس آدمی نے جواب

جواب: "جس میں شام تک چھوڑ دیا جائے گا۔"

سہو باگل فون پر جس لڑکی سے دوستی ہوئی تھی وہ لڑکی اسے اپنی

لوہی سے شادی کرنے کی حد تک سنجیدہ تھا۔

12014-21-

نہیں انکل نہیں

جناب مدیر اعلیٰ
سلام مسنون

یورپ کو محفوظ ترین اور ترقی کا ضامن علامہ ابراہیم رائے نے
 خیر ہیں کہ وہاں کیسے کیسے درندہ سبقت لوگ چھپے بیٹھے ہیں۔
 پاکستان کی پاک سرزمین پر یورپ کو ترجیح دینے والے اس سچ
 بیانی کو ضرور ملاحظہ کریں

شیخنا احمد

(لا يرد)



جب سارہ کے لیے رضا کا رشہ آیا تو اسے خوشی سے یاد دہریت ہوئی۔

رضا حسن ماموں کے بیٹے تھے۔ خوش خلق مگر بے حد سوز، بڑھاکو، تھوڑا سا اپنے آپ میں ہی رہنے والے۔

امی سے بچا چلا کہ رضا کو کبھی فورنیا کی مشہور یونیورسٹی میں اسکالرشپ مل گیا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے میں تین چار سال لگ جائیں گے۔ اس لیے بچے کو پاپا کے نکاح کر کے وہ سارہ کے بچے وغیرہ بن جائیں گے اور بعد میں اسے بلا لیں

ملتان سہ ماہی 281 جولائی 2014ء

گئے۔ مگر سارہ کو جہاں پہن کر خوش ہوئی کہ امریکا جانے کا موقع مل رہا ہے۔ وہاں ٹھوڑی سی جھجک بھی کر دھانے بھی اشارے، اشارے میں بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ماموں زبردستی تو نہیں کر رہے۔ اس نے سوچا۔

نہیں یہ پریشانی امی نے اپنے بھولیوں میں دور کر دی۔ "حسن بھائی کہہ رہے تھے کہ دھانے خاندان میں صرف سارہ کے لیے ہاں کی ہے۔ اور کسی کے لیے نہیں۔" چلو، یہ بھی مرحلہ مل ہوا۔ شرم بھی آئی اور خوشی بھی۔ کچھ لوگ بھی کہتے ہیں۔ رشتے آسائوں پہ لکھے ہوتے ہیں۔ چٹ مٹھی، چٹ لٹاچ اور پھر وہ ضروری کاغذات لے کر امریکا روانہ ہو گئے۔

سارہ کا بی اسے کا زلزلہ آچکا تھا۔ اب وقت صرف رشتے داروں، سہیلیوں کو ملنے میں گزر رہا تھا۔

رضا بھی کبھی فون کرتے۔ "چھوٹا سا اپارٹمنٹ لے لیا ہے۔ لون کے کر ایک سیکنڈ ہنڈ گاڑی بھی لے لی ہے۔" چھ ماہ گزارنے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ اس کو امریکا جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ خوش اور اداسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچی گئی۔

اپارٹمنٹ پر نقشہ تھا مگر اسٹوڈیو تھا۔ یعنی بالکل بیکاسا۔ سب کچھ ایک ہی کمرے میں ختم۔ شروع میں تو بہت لطف آتا تھا۔ آہستہ آہستہ صاف کرنے، چیزیں سیٹ کرنے میں لیکن بعد میں یوریت شروع ہو گئی۔

مسئلہ یہ تھا کہ رضا عادت سے مجبور، پھر چڑھائی کا پریشر۔ بالکل بھی کسی سے دوستی نہ تھی۔

ان کے اپارٹمنٹ میں دو تین مرتبہ اظہار نظر آئے تھے لیکن یہ وہ وقت تھا جب ملک دولت ہوا تھا۔ کسی اظہار کی دوستی تو کیا اسے دیکھنے کو بھی دل نہ جانتا تھا۔ رضا کے کہنے پر آپ۔ اے کی لاہری بی کی ممبر بنی۔ وہاں دنیا جہان کی کتابیں، رسالے، اخبار اور پھر ہر عمر کے لوگوں کی رونق۔ اسے کافی عرصہ کے بعد لطف آیا کیونکہ کتابیں ہیں اس کی جان تھی۔ اب وہ یوریت کی شکایت نہیں کرتی تھی۔ ایک دن ایک ہم عمر لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ دھیلی دھالی لمبی ٹیڈیا۔

سادہ سی بیٹ اور قمیص۔ نام نہ تھا تو زور بتایا۔ آپس میں بات چیت چلی تو پچھنے کی بہت نہ ہوئی کہ وہ کہاں سے ہے؟

زور بہت ہی دلچسپ شخصیت کی مالک تھی۔ باتیں خوب کرتی۔ ہر موضوع پر پورا غور رکھتی تھی۔

دونوں اچھی دوست بن گئی تھیں۔ سارہ کا دل بھی خوب لگ گیا۔ کچھ مہینوں میں اس کے شوہر کا کاسٹریکٹ ختم ہوا تو وہ ملنے آئی۔ دونوں ہی اداس تھیں۔

اس دن پتا چلا کہ وہ دل کی کسی تکلیف کے لیے تھیں۔ رضا کی تعلیم ختم ہوئی اور ان کو نوکری مل گئی۔ بہت اچھی تو تھی کیونکہ گھر پر کوئی نہ تھا۔ بس کم از کم کھانے لگے۔ وہ اپارٹمنٹ چھوڑ کر انہوں نے ایک بیلڈوم کا ڈرائیو مگر لے لیا۔ سارہ کے بے بی ہونے والا تھا۔ ان کو زیادہ جگہ کی ضرورت تھی۔

زارا بیدار ہوئی تو زندگی میں جیسے بھار آگئی۔ دونوں ہی بہت انجوائے کرتے تھے۔ مگر سوشل لائف تو ابھی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

کبھی کبھی سارہ کو لگتا کہ اس کا اعزاز و رضا کے حلقے میں کتنا بڑا ہے۔ کوئی دوست نہیں، نہ کتنے جانتے تھے نہ کوئی ملے آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ تینوں سیر کے لیے نکل جاتے۔ اور بس۔ پاکستان میں بہن کی شادی کی خبر ملی تو نہ جا سکی۔ ان کے خیال میں شادی پر جانا پیسے کا بڑا بوجھ تھا۔

تین سالوں میں صرف ایک دفعہ گئے جب حسن ماموں کا انتقال ہوا تھا۔

زارا اسکول میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے ایک دو دوست بھی بنائی تھیں۔

سارا کو لگتا تھا کہ وہ ایک مکمل "ہاؤس وائف" بن کر رہ گئی ہے۔ صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، زارا کو اسکول سے لانا لے جانا اور سودا سلف کی خریداری میں ہی الجھ کر رہ گئی تھی۔ اپنے آپ کو بالکل ستوار نہ تھی۔

انہیں امریکا میں رہنے کا تاحرص ہو گیا تھا کہ وہاں کی شہریت کے لیے درخواست دی تو فوراً ہی منکوحہ ہو گئی اور اب دونوں ہی وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

سالہا سال سے اپارٹمنٹ کا کرایہ دے رہے تھے۔ سارہ نے کئی مرتبہ رضا سے کوئی چھوٹا سا گھر خریدنے کا کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ "تمام عمر اس ملک میں گزارنا ہے کیا۔ ایک نہ ایک دن اپنے ملک واپس جانا ہے۔"

یہ بڑی بوری دلیل تھی۔ کیونکہ اس وقت گھروں کی قیمت کا 10% دے کر گھر میں داخل ہو سکتے تھے۔ باقی قسطوں میں، بیچنے کے تاخیر پر آسانی سے گھر بھی جاتا تھا۔

☆☆☆

وہ دن اس کو اچھی طرح سے یاد تھا۔

میر صادق جو نیچے سلطان شہید کا وزیر تھا، مسعود کی چچی لڑائی کے دوران تمام راز انگریزوں کو کھجوا تا رہا۔ انگریزوں نے اپنا فوجی منصوبہ اسی کے مشوروں کی روشنی میں تیار کیا۔ اسی کی راہ پر چل کر پورا جہور ریاست کا دوا ان تھا وہ بھی انگریزوں کے ساتھ سازش میں شریک ہو گیا۔ اس نے خواہ مخواہ حکم کرنے کے بہانے فوج کو تین میدان جنگ سے واپس بلا لیا اور سلطان میدان میں تھا ہو گیا۔ اس کے باوجود سلطان نے شہادت کے جوہر دکھائے۔ اس کے جہاں تک ایک ایک کر کے کٹ رہے تھے مگر وہ بے جگری سے لڑتا رہا اور لڑتے ہوئے ہی جام شہادت نوش کیا۔ اس کی شہادت کے ساتھ ہی برصغیر کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا اور اس وسیع و عریض سرزمین پر بنگالی کے خلاف آواز بلند کرنے والا کوئی نہ رہا۔

میر رضا اور زارا جانے کے لیے تیار ہوئے۔ رضا کو دیر ہو رہی تھی۔ کوئی خاص کلائٹ آنے والا تھا اور مرضی کی قیاس پر نہیں نہ تھی۔ وہ خیمے میں بریف کیس میں اہم کاغذات چھونٹتے ہوئے بولے۔ "تم سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔"

"ہائے ہا۔" زارا نے باپ کو آواز دی۔

"ہائے میری جان۔" انہوں نے سارہ کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

اسے افسوس سے زیادہ غصہ بھی آیا کہ اگر پہلے قیاس کا بتا دیتے تو پرہیز کر دیتی۔ افسوس یہ ہوا کہ ناشتا نہ کر کے گئے۔

ناشتے کے برتن سمیٹ کر کچن میں لے جا رہی تھی کہ ٹیلیفون کا گھنٹی بجی۔

کس کا ہو سکتا ہے ابھی صرف دس بجے تھے۔

"سرخس؟" امریکن لہجے میں کسی نے پوچھا۔

اس کا دل دھڑکا۔ "کی بول رہی ہوں۔"

"ہمیں آپ کو اطلاع دینی تھی کہ سرخس رضا حسن کو ہارٹ ایک ہوا ہے۔ میں ان کا کوئی ایک مائیک جاسٹن بول رہا ہوں۔ ہم ان کو میموریل اسپتال لے کر آتے ہیں۔ وہ اس وقت I.C.U. میں ہیں۔ آپ فوراً پہنچ جائیں۔ آپ کو رات آتا ہے؟"

کوئی تیز خیر بول رہا تھا۔

سارہ کے تن بدن سے جیسے جان نکل گئی۔

"رضا کو ہارٹ ایک؟" اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

"سرخس اپنی آپ حوصلہ بھریں اور فوراً آ جائیں۔ اگر ڈرائیو نہیں ہے تو ٹیکسی چلائیں۔" اب وہ گھبرا گھبرا کر بول رہا تھا۔

"جی اچھا۔ میں پہنچ رہی ہوں۔" وہ ہوش میں آ گئی۔

جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے۔ پرس پکڑا۔ کاپچے ہاتھوں سے دروازہ لاک کیا اور باہر آ گئی۔

اللہ تعالیٰ سے بدستور وہ دعا کر کے رضا کی سلامتی مانگ رہی تھی۔ "میرا تو ان کے علاوہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

طیسی اسپتال کے اندر کی تو ایک امریکن لڑکا پک کر اس کی طرف آیا۔

"سرخس! میں مائیک جاسٹن ہوں۔ میں نے ہی فون کیا تھا۔ جلدی کریں۔"

"رضا کہاں ہیں؟" مارے پریشانی کے اس کے منہ سے بات نکل نہیں رہی تھی۔

"وہ I.C.U. میں ہیں۔ عیسیٰ وہیں چلے ہیں۔"

وہ بھرا گم بھاگ وہیں پہنچے۔

کچھ کوئی ڈاکٹر کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ پریشان پریشان سے۔

"جلدی کیجئے ان کی حالت ٹھیک نہیں۔" کسی نے جیسے اس کو I.C.U. میں دھکیل دیا۔ رضا کو آسکین لگی ہوئی تھی۔ پاس میں میڈیکل جنس کی تاریں ان کے جسم سے اٹھ چکی تھیں۔

"رضا۔ یہ کیا ہو گیا۔" وہ ہلکی سی ہنسی۔

"سارہ۔" میڈیکل سیرجی بات خور سے من لوٹ۔ وہ بالکل تدم آواز میں بول رہے تھے۔

"رضا آپ اچھے ہو جائیں گے۔" آنسو اور الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"غور سے سنو۔ سارہ، میں نے اپنی لائف انشورنس کر رکھی تھی۔ ایک سال ہو گیا ہے۔" ان کی سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ بات بھی مشکل سے سمجھ میں آ رہی تھی۔

"میرے جانے کے بعد وہ تم دونوں کو مل جائے گی۔"

”رضا..... چلیز ایسا نہ کہیں۔ آپ اچھے ہو جائیں گے۔“ چچن جیسے سینے سے نکلنے کو بے تاب تھیں۔

”مائیئر، میری بات سنو۔ یہ پیسے تم دونوں کے کام آئیں گے۔ ذرا کا خیال رکھنا۔“ یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔

مونیز کی لائن بالکل سیدھی ہو گئی۔ اگر زس اس کو آگے بڑھ کر نہ سنبھالتی تو وہ بے ہوش ہو کر دھڑا سے مر گئی ہوتی۔

ہوئی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اتنا جوان، چندان رضا حسن، اچھا شوہر، بہترین باپ۔ ایسا ایک لڑکا چلا جائے گا۔ وہ اس حادثے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔

وہ کوئی زندگی میں شاید کبھی کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ رضا ہر کام خود کرتے تھے۔ اس کو کسی فیصلے میں شامل نہیں کیا۔ کبھی کرنے نہ دیا۔

”اب کیا ہوگا؟“ یہ سوال وہ دن میں کئی مرتبہ دہرا چکی تھی۔ رضا کی لاش کو پاکستان نہیں لے جا سکی۔ کچھ مسلمان بھائیوں نے اسلامک سینٹر سے آکر مدد کر دی تھی۔ وہیں لوگوں قبرستان میں تدفین ہو گئی۔ ذرا ابھی مر جہا کر رہی تھی۔ اس والے پر سے کے لیے آئے تو نایک جانسن نے اسے انشورنس کمپنی سے بات کرنے کو کہا۔ کس بالکل سیدھا سا تھا۔ ایک خط رقم کمیشن کی صورت میں اسے ملے گی۔ اتنی بڑی کمائی میں ایک گریہ آسانی خرید جا سکتا تھا۔

زندگی بھی کچھ کام کیے بغیر گزر رہی تھی۔

کتنی عجیب بات تھی۔ جب ضرورت تھی تو رقم نہ تھی۔ اب رقم تھی تو اس بات کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اب کمر کس کے لیے خریدے نہ تھا۔ کس کے رہنے کے لیے؟

☆☆☆

کسی عزیز کے جانے کے بعد وقت گزرا جنس جاتا بس گزر جاتا ہے۔ دن، رات کے سلسلے چلتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ زندگی جذبات، احساسات سے عاری ہو جاتی تھی۔

وہ پاکستان واپس جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ امی، اما یوں ایک دوسرے کے پیچھے چلے گئے تھے جیسے کوئی ریس لگی ہو۔ حراشادی کے بعد انڈیا واپس چلی گئی تھی۔

رضا کو گزروے چہرہ ہونے لگی تھی کہ جوشن سے غلط آیا۔ انجم کا خط۔ اس کی چچن کی دوست جو کافی عرصے سے شوہر اور بچوں کے ساتھ چچن میں بس رہی تھی۔ اسے رضا کی

وفات کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ملے آ رہی ہے۔ دراصل اسے سان فرانسسکو میں بینک پر جانا تھا۔

سارہ نے یہ خبر ذرا کو ہٹائی۔ وہ خوش ہو گئی۔ دونوں نے مل کر کمر صاف کیا۔ گروسری خریدی۔ کھانے بنائے اور انجم کو آؤٹ پورٹ لینے چلی گئیں۔ دونوں سہیلیاں کافی عرصے کے بعد ملی گئیں۔ گلے لگتے ہی دونوں کے آنسو نکل آئے۔ انجم سارہ کی گلے دار رہی تھی اور رضا کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔

انجم بہت اچھی شخصیت کی مالک تھی۔ دل موہ لینے والی مسکراہٹ اور خوش حرا۔ دونوں تقریباً پوری رات باتیں کرتی رہیں۔

”میں کیا کروں گی انجم؟ مجھے کسی کام کا کوئی تجربہ نہیں۔ کوئی نوکری، بزنس کچھ بھی نہیں۔ زندگی کیسے گزرے گی؟ ابھی ذرا صرف گیارہ برس کی ہے۔ اس کی پر معافی۔ کالج ہو سکتا لائف۔ کیا ہے گا؟“ وہ بار بار کہتی رہی۔

انجم ہمیں ہو کر اس کی باتیں سن رہی۔

انگلے دن ایک چکر ڈرنی لینڈ کا بھی لگایا۔ کافی عرصے کے بعد ذرا ابھی خوش تھی۔ رات ذرا کے سو جانے کے بعد انجم نے کہا۔ ”تم شہر کیوں نہیں چل گئیں۔ اگر پاکستان فی الحال نہیں جانا چاہیں تو کم از کم کسی دوسرے شہر میں جا کر رہو۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ ایک تو تم نے تم دونوں کو بڑا حال کر رکھا ہے۔ دوسرے اس شہر کے ماحول نے۔ یہاں کی فضا میں آلودگی بہت ہے۔ میں کوئی تین سال بعد آتی ہوں اور مجھے الرتھی کی شکایت ہو گئی ہے۔ ٹاک۔ آنکھوں میں جھلکی شروع ہو گئی ہے۔“

”ہاں تم حق کہہ رہی ہو۔ ہوا میں آلودگی دھوئیں کی وجہ سے ہے۔ یہ سب بے تمہاشا کاروں کے دھوکے میں ہے۔ اور ہا ہے۔ لوکل گورنمنٹ کو شش کر دی ہے کہ تدارک ہو سکے۔ مجھے بھی لگی کہ دن ٹاک بند ہونے سے سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے۔“

”تو چلو۔ پھر یہ ملے ہے کہ پرسوں جب میں سان فرانسسکو کے لیے نکلوں تو تم دونوں بھی میرے ساتھ کار میں چلو۔ ہم راستے میں رکتے رکاتے ہو اور اچھی کھلی نو ریڈ کچھ کھیں گے۔ شاہ راستے میں ساحل سمندر اور خوبصورت مقامات ہیں۔“ انجم نے جوش سے کہا۔

دونوں اچھلی سی گئیں۔ زبردست آئیڈیل۔ لمبی

کراچی

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کراچی میں موسم ہر لکھ روٹی کے ہما کا بدلہ ہے۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک ہی عمارت کے کراچی ایک ہی منزل سے دوسری منزل پر چھٹی آ رہی ہے۔ یہاں آپ دیکھیں کہ کراچی میں کرم چلون بینک کرکل جاتا ہے تو کسی کو کس بھی آئے گا۔ اہل کراچی، اللہ اعلم بالصواب۔ ”میں کے موسم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ تو جتنے جتنے تھیں نہ تو وحشت ہونے لگی ہے اور بڑی بڑی عمارتیں اس کو ٹرپ قیامت کی بھائی بن گئی ہیں۔

ہوتا ہے کہ اگر وہ صاف صاف اوڑھ کر سوتے اور کچھ کچھ جھٹکتے ہوتے۔ دوپہر تک لوگنے کے سبب ہلا ہی بالا ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ بعض اوقات تو کمر لگتا ہوتا ہے کہ اردوں کو کراچی کا اصل منظر ہی نہیں آتا۔

(حقیقی امر علی کی ”جھاڑتے“ سے انتخاب)

ڈرائیو۔ ویسے بھی لمبا ویک اینڈ تھا۔ تین چھٹیاں۔

ذرا تو فراتاری میں لگ گئی۔

کار ریوینٹ پر لی گئی تو ٹیبلر نے بتایا کہ چونکہ L.A سے سان فرانسسکو چار سو میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کو راستے میں کسی ہوٹل میں قیام کرنے سے تھکاؤ نہ ہوگی۔

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فون پر ان کے لیے کمرے کی بکنگ کروادی۔ ”وٹلی کی فورنیا میں کئی شہر آتے ہیں جو سمندر سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر ہیں۔ خوبصورت، صاف سحرے، ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ۔ میں نے بکنگ بھی ان میں سے ایک شہر میں کروائی ہے۔“

اس کا شہر یہ ادا کر کے جب گاڑی L.A سے نکالی تو واقعی ایک اور عرصہ دنیا آباد تھی۔ کیمپٹیلوں میل تک پہلے۔ صاف و شفاف تازہ ہوا۔ خوبصورت موسم۔ ہائی وے پر چلتے جاؤ۔ تھکاؤ کا احساس نہ ہو۔ تینوں کو بہت لطف آیا۔

راستے میں کھانا کھایا۔ سہ پہر ہونے کو تھی جب یہ اپنے ہوٹل میں پہنچیں۔ کراچی تک کیا۔ بہترین، صاف، تحراء کافی سستا، اسٹاف بھی مستعد، میزوار۔ شجر نے چابی دیتے ہوئے بتایا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اور بھی خوبصورت چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہیں۔ آپ لوگ وہاں کے Beaches پر ضرور جائیں۔ بہت لطف اندوز ہوں گی۔ اپنا سامان رکھنے کے بعد جب تینوں دس منٹ کے فاصلے پر ایک شہر میں پہنچیں تو ذرا جیسے اس شہر کے شوق میں جتا ہو گئی۔

لیونگ ویک اینڈ کی وجہ سے ساحل لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید کوئی مقامی میبلہ لگا ہوا تھا۔ آؤٹس کرائٹ کا جھولے کھانوں کے اسٹال، میوزک۔ سب کچھ تھا۔ وہ تو گاڑی سے اترنے کے ساتھ ہی اچھڑا کر پانی کی طرف لپکا۔

وہ دونوں سہیلیاں بھی ٹھٹھکی گئیں۔ لوگ بہت فریڈی تھے۔ ساحل کے پاس چھوٹی چھوٹی دکانیں۔ سیپوں سے بنی چیزوں کی، کٹنگ کی، کٹن لائن کی۔ چیزوں کی قیمت مناسب۔ وہاں جا کر تو سارہ بھی اپنے کلم بھول گئی۔

”ماما، میں نے زندگی میں اتنا بھی نہیں enjoy کیا۔“ واپس ہوئی آکر ستر پر لیٹنے ہوئے ذرا لے لیا۔

”اچھی بات ہے میری جان۔ اللہ کرے تم ہمیشہ خوش رہو۔“ سارہ نے خوش ہو کر کہا۔

انگلے دن انجم کو اپنے سینینار کے لیے جانا تھا۔ ان دونوں کا کوئی موڈ نہ تھا۔ لمبی ڈرائیو کا طے یہ پایا کہ وہ بس سے چلی جائے اور یہ لوگ ایک دور روز اس ہوٹل میں قیام کر لیں پھر وہ واپس آکر ان کے ساتھ وقت گزار کر ان کو L.A لے جائے گی۔

☆☆☆

زندگی اس طرح کا ٹرن لے گئی یہ سوچا بھی نہ تھا۔ یہ دو دن جو ان ماس مینی نے اس چھوٹے شہر میں گزارے تو بہت کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہیں گھر بسا، اسی شہر میں باقی زندگی گزارنے کا۔

کافی لوگوں سے بات چیت کی۔ سب نے بتایا کہ یہ شہر نو عمر بچوں کے لیے آئیڈیل ہے۔ اچھے اسکول پارکس سینٹر گھر، شاہنگ سینٹر اور سب سے اچھی بات کہ ماحول بے حد ٹیکس فریڈی۔ ہمارے یہاں کرائم نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ ہم ایک کمیونٹی میں کھلی کی طرح ہیں۔ ایک دوسرے سے جان بچاؤ ہے۔ بڑے شہروں میں تو آپ برابر کے مہاسے کے محقق بھی نہیں جانتے۔ پھر بے پتہ فریڈک، کاروں کا دھواں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ وہ چالیس سال سے یہاں

ہیں۔ A۔ A۔ عی آئے تھے۔ اب سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔

سارہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ چھوٹا موٹا فیصلہ تھا۔ پوری زندگی کا سوال تھا۔ یہاں وہ سب کچھ تھا جس کی اسے اور زارا کو ضرورت تھی۔ بس پوری زندگی تھی۔ بڑا کالج تھا۔ لیکن وہ تو بہت دور کی بات تھی۔ انجمن کے واپس آنے کے بعد اسی ٹاپک پر بات چلی۔ اُس کو بھی یہ بات بہت پسند آئی۔

”لیکن میں یہاں کیا کروں گی؟“ سارہ نے کہا۔

”وہاں کیا کر رہی ہو؟“

”نی الحال تو کچھ نہیں۔“

”مجھے امید ہے کہ تم دونوں انشاء اللہ یہاں آنے سے خوش رہو گی۔“ انجمن نے سیریس ہو کر کہا۔

☆☆☆☆

وہ تینوں ساحل کے پاس آگئیں۔ وہیں ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر کے اندر بیٹھ گئیں۔ نام لکھا تھا۔ ڈی سی سولوں۔ خوبصورت شکل کی دو جوان خاتون تھیں۔ انجمن نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ”میری دوست اور بچی بھی اکیلی نہیں رہیں۔ وہ بھی کسی انجمنی شہر میں۔“

”میں آپ کو ایک بڑی اچھی رائے دیتی ہوں۔ یہاں پر ”پaying guests“ کی چونکہ یہ تقریبی شہر ہے۔ لوگ بھی زیادہ لیا قیام کر کے بعد میں اپنا گھر خریدتے ہیں۔ اس صورت میں مالک مکان اپنے گھر کا ایک پورشن کرایہ پر دے دیتا ہے۔ لیکن فرنیچر سمیت کھانے پینے کا انتظام بھی خود ہی کرتا ہے۔ صفائی، کپڑوں کی دھلائی سب کچھ۔ اس صورت میں کرایہ ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن کرایہ دار کو بہت سہولت ہوجاتی ہے۔“ وہ بتاتے بتاتے رکی۔ ان تینوں کی طرف دیکھا جو ہر دن کوٹھن میں۔ ”آج کل اس کا کافی رواج ہو گیا ہے۔“

”مجھے تو یہ آئیڈیا بہت بھایا ہے۔ اگر تم دونوں یہاں شفٹ ہونا چاہو تو اسی طرح کی Arrangement کرو۔ اچھا سا خوبصورت گھر لو اور اپنا چھوٹا موٹا سامان اٹھا کر بیٹھ آ جاؤ۔ کیوں کیا خیال ہے۔؟“ انجمن نے کہا۔

”ہوں۔ آئیڈیا تو اچھا ہے۔ سچا سچا گھر، پکا پکا کھانا، بجلی پانی کے پلوں سے آزادی۔“ سارہ جیسے اپنے

آپ سے بات کر رہی تھی۔ ”بچی بات تو ہے کہ میرا بی بی اوب سا کیا ہے۔ A۔ A۔ ہے۔ بیچ کر دیکھ لیتے ہیں۔“ زارا خوشی کے مارے بیچ بھی۔ مال کو گئے لگایا۔ ”مما، آئی لو۔۔۔۔۔۔“

اسٹیٹ ایجنٹ ڈی سی نے بہت خوبصورت دو بیڈروم کا پورن ساحل سے تقریباً پانچ منٹ کے فاصلے پر دکھا دیا۔ مالک مکان مسٹر ایڈمز مسز جان ایڈمز تھے۔ لیکن ساتھ کے ہوں گے۔

مسٹر ایڈمز دن گرے بالوں، گہری نیلی آنکھوں اور خوبصورت مسکراہٹ کے مالک۔ ہنسی ہوئی آنکھیں، خوش مزاج۔ جلد ہی فری ہونے والے۔ مسز ایڈمز دن میری چشم لگے۔ ذرا سویرو سیری تھیں۔

ان تینوں کو بہت اچھے لوگ لگے یہ دونوں۔ گھر دکھایا۔ چکن صاف سحر۔ دونوں کمروں میں صاف سحرے بیڈ۔ الماریاں۔ رائٹ ٹیبل اور ٹوٹک روم میں ہلکا پھلکا فرنیچر۔

سارا کا دل تو جیسے خوشی سے پاغ پاغ ہو گیا۔ یہ پورن اوپر تھا۔

”مجھے چھوٹا سا باغ نظر آ رہا تھا۔ خوبصورت پودے پھول سے آراستہ تھا۔ اچلی اچلی۔ موسم ڈھریب۔ کرایہ مناسب لگا۔ اسی وقت ہم اللہ کر کے دیکھنے لگے۔

ڈی سی نے کنٹریکٹ سائن کر دیا۔ ”دونوں میاں بیوی کی کیونٹی میں اچھی شہرت ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ بس بھی بھی سیزن آنے پر یہ پورن کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ ”ویسے سارہ، آپ کہاں جاب کرتی ہیں۔؟“

”میں نے بھی جاب نہیں کی۔ بزنس کا شوق تھا۔“ اس نے ذرا اداسی سے کہا۔

ڈی سی بہت فریڈی لڑکی تھی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا لیا کہ سارہ کو کتابوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ ”میرے پاس ایک کتابوں کی دکان بھی سیل کے لیے کھلی ہی آئی ہے۔ مالک وہ انجمن واپس جا رہی ہے۔ نوکیشن نہایت عمدہ۔ ساحل پر کافی شاپ کے پاس۔“

سارہ اور انجمن نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”یہ کیسی سی۔ یہ کچھ ہے اس شاپ کی۔“ کورل ڈراپ بک شاپ۔ ”بہت کیونٹی سی ہے۔ چھوٹی سی۔ جی پرانی کتابیں۔ بیچے بیک، دس بیس سے لے کر 50 ڈالری

کتاب تک۔ اس کے علاوہ گریٹنگ کارڈز وغیرہ بھی رکھے ہیں۔“ بہت جوش سے ڈی سی نے دکان کی تصویر دکھائی۔ سارہ کا دل تو جیسے دھڑکن بھول گیا۔ شاید اس کے خوابوں کی تعبیر کا وقت آن پہنچا تھا۔

☆☆☆☆

جس دن انجمن واپس ہوئیں سنی سارہ اور زارا کی زندگی ایک نئے ڈھب پر چل پڑی۔ نیا گھر، خوبصورت کتابوں کی شاپ کے ساتھ۔ ”کورل ڈراپ“ کا نام بدل کر ”ZARAS“ رکھا گیا۔ اس تمام مرحلے میں مسٹر ایڈمز دن نے بہت زیادہ مدد کی۔ دکان گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس کا سامان ٹھیک ہی تھا۔ ابھی اس میں اور بھی بہت کچھ رکھا جاسکتا تھا۔

مسٹر ایڈمز دن نے دونوں کو باتوں باتوں میں پہلی شام کھانے میں دروست چکن، فرنیچر، فرائز، بریڈ، سلاؤ وغیرہ تیار کئے۔ گرا کرم سوپ پہلے پکا گیا۔ ان کا اپنا پورن بیچے تھا۔ ویسے اندر سے بھی راست جانا تھا لیکن باہر ہونے سے بہت فائدہ تھا۔

”تم لوگوں کے پاس چاہیں۔ کچھ خود ہی پکانے کو بھی چاہیے تو چکن استعمال کرو۔“ دن نے دونوں وقت نیچے کھانے کے لیے آجاؤ۔ ”میری ایڈمز دن نے مسکرا کر کہا۔ انہیں بھی دونوں بہت پسند آئیں۔

زارا تو خوشی خوشی نیچے آئے اور کچھم رہی تھی۔ مسٹر ایڈمز دن دیکھ کر مسکراتے رہے۔

جس دن ”زارا بک شاپ“ کا افتتاح تھا، سارہ اور زارا بے حد مصروف تھیں۔ ابھی دروازے کھولے نہیں تھے کہ مسٹر ایڈمز دن بے حد خوبصورت لمبا پودا لے کر آئے۔

پودے کو گھونٹ میں رکھا گیا تو کونجا گیا۔ ساتھ میں ایک درجن ڈونٹ doughnuts انہوں نے زارا کو دے دیے۔

”نوبلی لائل ڈونٹ، enjoy کرو، اپنی دکان۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اس کے گال پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ سارہ کو بہت اچھا لگا۔ یہ انجمنی ٹھنسی اس کے ساتھ اس قدر شفقت سے پیش آئے گا وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ دکان کے باہر بہت سے مختلف رنگوں کے خبارے لہرا رہے تھے۔ ”گرینڈ اوپننگ“ لوگ ویسے ہی اندر چلے آئے۔

کچھ دیکھنے کے لیے۔ کچھ خریدنے کے لیے۔ تمام دن اتنی مصروفیات میں گزارا کہ ملی عمر بھی جینے کا موقع نہ ملا۔ لوگ بہت خوش اخلاق اور شگراںک رہے تھے۔

ان دونوں سے کافی کپ شپ کرتے رہے۔ تھوڑی بہت سیل بھی ہو گئی۔

شام تک بے حد تھکاوٹ ہو گئی۔ سنی چاہتا تھا اب ناگھیں پار کر آگئیں۔ بند کر کے ڈیروست کی جائے یا کافی پی جائے۔ اسی وقت مسٹر ایڈمز دن چلے آئے۔ ”کیوں ابھی، کیسا ہاپسلاؤن۔؟“

”بہت اچھا، مسٹر ایڈمز دن۔“ سارہ نے خوشی سے کہا۔ ”بھئی، تم مجھے جان کر سکتی ہو۔ یہ مسٹر ایڈمز دن تو مجھے بہت بوڑھا بوڑھا جانتا کر رکھ دے گا۔“ ایک ذرا دراز قبیلہ انہوں نے لگا دیا۔

”اوکے جان، ٹھیکس۔“ سارہ نے سمجھ گئی سے کہا۔ ”گھر جانے کے لیے تیار ہو؟“ میری نے گرا کرم سوپ تیار کر رکھا ہے اور ہاں فریش چاکلیٹ کیک بھی۔ بھئی ڈیروست لگ ہے میری بیوی بھی۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

وہ دونوں دکان لاک کر کے جان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

”شکر ہے مجھے ذرا نیوٹنس کرنا پڑی۔ تھکاوٹ کافی ہو گئی ہے آج۔ ٹھیکس جان، بہت بہت شکر ہے۔“ بہت سچے دل سے سارہ نے کہا۔

”کوئی بات نہیں بیچے، یہ میری خوشی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆☆

زارا کا اسکول میں داخلہ ہوا تو پہلے دن ہی ایک بچی اس کی دوست بن گئی۔ جولی لارن۔ اس کا باپ ایک امیر آدمی تھا۔ وہ بہت پیاری سی تھی۔ ڈبل ڈول میں گھر سے بیڑی لٹی تھی۔

جولی عام طور پر تو بیتی بچوں کی طرح اپنی اسکول بس میں آتی جاتی تھی لیکن ابھی بھی زارا سے ملنے اپنی مام کے ساتھ بک شاپ پر بھی آ جاتی۔

سارہ کو اس کی مام سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تقریباً اسی کی ہم عمر۔ جیسی کسی فرم میں کام کرتی تھی۔ ابھی فریڈی سی تھی۔ امتحان نزدیک آ رہے تھے۔ موسم بھی بدل رہا تھا۔ اور ہر شام ہی اندر جیرا ہوجاتا تھا۔

بکری بھی دونوں بچیاں زارا کے گھیر بیٹھ کر مطالعہ کرتیں اور بھی وہ اسکول سے سیدھی جولی کے گھر چل جاتی جہاں سے واپس لانے کے لیے سارہ کو تھوڑی دقت ہوتی۔
 ”میں لیتا آؤں گا زارا کو۔“ مسٹر اینڈرسن اس کی پریشانی بھانپ گئے تھے۔ ”میں وہیں پام اسٹریٹ جا رہا ہوں۔ بس زارا کو تھوڑا دینا کہ میں صرف ہارن دوں گا۔ مجھے انتظار نہ کرانے۔“ انہوں نے کہا۔
 سارہ نے سکھ کا سانس لیا۔ دراصل جولی کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اور سارہ دکان چھوڑ کر جانیں سکتی تھی۔ اب ایسا کئی مرتبہ ہوا۔

جان اینڈرسن زارا کا بہت خیال رکھتے۔ بس وہ چاہتے تھے کہ سارہ دکان پر پریشان نہ ہو۔
 ایک دن وہ شام میں کھانا کھا رہی تھی کہ زارا کے چہرے پر کچھ پراسراری مسکراہٹ تھی۔
 ”میرے پاس ایک سر پرانز ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیا سر پرانز بھی؟“
 ”یہ دیکھیں۔“ زارا نے بستر کے پاس قالین پر ایک چھوٹے ڈبیر کی طرف اشارہ کیا۔
 ”کیا ہے؟“

”میرا اپنا ہی کا بچہ۔“ زارا نے جوش میں آکر اس ڈبیر کو ہٹایا تو بے حد خوبصورت، براؤن سفید روئی کے گالے کی طرح لٹی کا بچہ اس کے ہاتھ میں تھا۔
 سارہ حیران رہ گئی۔

”کہاں سے لیا؟“ اس نے ہولے سے بچہ کو چھوا۔ بالکل ریٹم کے گولے کی طرح۔ بلیاں اس کو بھی بہت پسند تھیں۔

”مجھے مسٹر اینڈرسن نے دیا ہے۔ ان کے کسی دوست کی بیٹی نے تمہیں بچہ دینے تھے۔ وہ انہوں نے ہانٹ دینے۔ لیکن یہ سب سے کیوٹ مجھے مل گیا۔“ خوشی خوشی بولی ”اوہ ماں، میں کتنی قد خوش ہوں۔ میرا پتا pet ہے۔ میں اسے sam کہوں گی۔ اچھا نام ہے؟“
 وہ اس قدر خوش تھی کہ سارہ کا دل جان کے لیے تنگ سے بھر گیا۔

”کیوں یعنی کیسا لگا سام جیسی؟“ رات کھانے پر وہ سارہ سے پوچھ رہے تھے۔
 ”بہت خوبصورت! آپ کو پتا ہے کہ یہ زارا کا خواب

تھا کہ اس کا اپنا کوئی پالتو جانور ہو۔ بہت بہت فکر یہ جان۔“
 ”یعنی مجھے اس نے کافی مرتبہ بتایا تھا۔ اس نے میں نے اپنے دوست سے ایک ماہ کی بی بی مانگ لیا تھا۔ اصلی نسل کا ہے۔ یہ بچہ۔ وہ تو شاید بچتا چاہتا تھا۔“
 ”بس اب اس کا خیال رکھنا ہے۔ اسے ٹرین کرنا ہے اور اندر گندہ کی پائل میں پھیلانے دینا۔“ سارہ نے بہت سختی سے میری کے سامنے زارا سے کہا۔ ان کو اپنا گھر صاف تھرا رکھنے کا قہقہہ تھا۔

☆☆☆

سارہ کی دکان چل پڑی تھی۔ کئی مرتبہ تھوڑی دیر اور بیٹھنا پڑ جاتا۔ اس صورت میں زارا گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی اس کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن زارا اب بیوی ہو رہی تھی۔ اس کے جسم میں ہونے والی تبدیلیاں کافی نمایاں تھیں۔

اب وہ ماں سے دکان پر فون کر کے کہہ دیتی کہ وہ پور ہو رہی ہے۔ پڑھائی ختم کر لی ہے۔ سام بھی سو رہا ہے۔ اب میں آپ کو کس کر رہی ہوں۔
 ”بیٹے آپ دکان پر کسی طرح آجائیں تو ہم کھانا آج باہر کھائیں۔“ سارہ نے کہا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ میں مسٹر اینڈرسن سے پوچھتی ہوں۔ اگر وہ مجھے ڈراپ کر دیں۔“ بڑے جوش میں اس نے کہا۔

یہ پہلی مرتبہ اس نے کہا تھا جان مان گئے۔ زیادہ فاصلہ بھی تو نہ تھا۔
 ”بھئی زارا نے خواہش کی ہے تو میں کیسے رو کر مکتا ہوں۔“ انہوں نے ٹیلی فون پر سارہ سے کہا۔

زارا دکان پر پہنچ کر بہت خوش ہوئی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ انہوں نے خود ہی آفر کی کہ وہ ادھر جا رہے ہیں۔ ڈراپ کر دیں گے۔

کچھ دنوں سے سارہ نوٹ کر رہی تھی کہ زارا خاموش خاموش سی رہنے لگی ہے۔ مسٹر اینڈرسن سے بھی زیادہ فنی مذاقی نہیں کر رہی۔ اکڑی اکڑی رہنے لگی ہے۔

سارہ نے پوچھا تو کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ایک مرتبہ اس نے جان کے ساتھ آنے کا ذکر کیا تو فوراً بولی۔
 ”نہیں ماما، میں ٹھیک ہوں۔ میں فون کر کے کیپ بنا لیتی ہوں۔“ اس کے لیے میں ذرا سختی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔

جولی جب بھی ان کے گھر آتی تو کافی دیر بیٹھتی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ خوبصورت آنکھیں۔ گولڈن لمبے بال۔ دراز قد اور مناسب جسم۔ زارا کے مقابلے میں کافی بڑی بیوی۔ حالانکہ عمر میں دونوں کی تقریباً ایک جیسی تھیں۔
 جان اینڈرسن ان دونوں بچیوں کا بہت خیال رکھتے۔ کئی بار اوپر جا کر کچھ کھانے پینے کا پوچھتے۔ کئی آنکس کریم تو بھی پاپ کارن۔ چپس۔ کوک۔

”پلیز آپ تلف نہ کریں۔“ زارا ڈراپے زاری سے کہتی۔ کیوں کہ وہ اکثر دروازہ کھٹکھٹانے بغیر اندر آ جاتے۔ جب کہ دونوں بچیاں بستر پر ناگہم پیا کر کرگپ شپ مار رہی ہوتیں اور غور زار گھبرا جاتیں۔

کئی مرتبہ زارا کا گناہ چاہا۔ ماں سے بات کرے۔ لیکن غور زار گھبرا جاتی تھی کہ وہ اُسے ڈانٹیں گی۔ جان بہت اچھے انسان تھے۔ اس کے دادا کے برابر، بس وہ فریڈلی تھے اور تو کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

سارہ نے دکان پر ایک بلیز کرل رکھ لی تھی۔ جو دکان خود ہی بند کر دیتی تھی۔ اس سے بہت سہارا مل گیا۔ سارہ نے نوٹ کیا تھا کہ میری ذرا خاموش خاموش سی رہنے لگی ہیں۔ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھا رہی تھیں۔ بلکہ کئی مرتبہ غلا میں گھور رہی ہوتیں۔

کچھ دنوں سے ان کے اپنے پردن میں بھی کچھ عجیب سے واقعات ہونے لگے۔ ایک شام وہ میک کے پاس پڑے ہوئے گلاس میں ننگے سے پانی بھرنے لگیں تو گلاس پٹاخ کی آواز سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ حالانکہ ظاہر بالکل ٹھیک تھا۔

ایک رات نیند نہیں آ رہی تھی۔ لیکن میں آئیں کہ اپنے لیے چائے بنا لیں۔ لائٹ آن نہیں کی۔ دیکھا کہ ایک بیانی ان کی طرف پیسے خود بخود ہی چلی آ رہی ہے۔

گھبراہٹ میں ان کی چیخ نکلی گئی۔ چائے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جلدی سے جا کر بستر میں گھس گئیں۔ دروازہ اندر سے لاگ کر دیا۔

جان اینڈرسن کچھ کام کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسی اسکول میں درخواست دے دی جہاں زارا اور جولی پڑھتی تھیں۔ وہ وہاں کنوینینس کی نوکری پر لگ گئے۔ بچوں کے آنے جانے کا خیال رکھنا۔ ان کو حفاظت سے ماں پاپ

کے حوالے کرنا۔ وغیرہ۔
 یو یٹام میں جب وہ پہلی مرتبہ سارہ کے سامنے آئے تو اُسے بہت اچھے لگے۔

”اس عمر میں بھی وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتے ہیں۔ اچھی بات ہے۔“ اس نے میری سے کہا۔
 ”ہاں اچھی بات ہے۔“ انہوں نے جیسے بھڑا کہا۔
 ”ویسے میں اس ملازمت کے حق میں نہیں تھی۔“

”اسے وہ کیوں؟ وہ تو بچوں پر جان دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا زارا اور جولی کو بالکل اپنی بچیوں کی طرح سے سمجھتے ہیں۔“ سارہ نے جوش سے کہا۔
 ”ہاں۔“ میری نے جیسے بات بدلنے کی کوشش کی۔

پچھلے میں بیٹا شت کا فقدان تھا۔

☆☆☆

زارا اور جولی کی کلاس چنگ پر جاری تھی۔ بچیاں بے حد خوش تھیں۔ جان اینڈرسن بچوں کے ساتھ بس میں باقی دو بچروں کے ہمراہ جا رہے تھے۔ بس کو کچھ سات بجے اسکول سے نکلتا تھا۔

شام پانچ بجے وہاں تھی۔ پوری بس بھر کر جاری تھی۔

صبح اچھے سارے بچے اور والدین جوش و خروش سے باتیں کرتے ہوئے۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک ہنگامہ سا تھا۔ بچوں کی کتنی۔ ان کا سامان۔ ان کو بٹھانے کا انتظام۔ سب جان اینڈرسن کا کام تھا۔

زارا اور جولی نے ہم رنگ سوئے مکتا رکھے تھے۔ سروں پر اوٹی ٹوٹیاں۔ بہت پیاری لگ رہی تھیں دونوں۔ کتنیں بھی ساتھ ساتھ تھیں دونوں کی۔

سارہ وہیں کھڑی تھیں اور اس کے شوہر لارن سے باتیں کر رہی تھی۔

”دونوں کی دوستی بے مثال بن گئی ہے۔“ سارہ نے جھکی سے کہا۔

”آپ سمجھتی ہیں۔ جولی بھی زارا کو بہت پسند کرتی ہے۔ دونوں کی طبیعتوں میں ہم آہنگی ہے، ٹھہرا ہے۔ ہم دونوں زارا کو بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔“ مسٹر لارن نے کہا۔

”ٹھیک یو۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔
 پورے سات بجے بس اسکول کے گیٹ سے نکلی تو تمام لوگ گھروں کو جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ سارہ گھر

و فوجی ہذا سے جان کا جسم کا پ رہا تھا۔ دو لوگوں نے ان کو سہارا دے کر اتارا۔ انہیں جان پر بہت ترس بھی آ رہا تھا۔ کمران کی پردہ کی میں ایک نور بھی مرگئی۔ یہ بات قانونی مقدمہ کی حد تک جاسکتی تھی۔ پولیس کیس بھی بن سکتا تھا۔ بے چارے جان ایئر رن۔

سارہ کو بھی جولی کی ناکھائی موت کا بے حد صدمہ تھا۔ اس سے زیادہ اسے زارا کی فکر ہو رہی تھی جس کو قدرت نے سال کے اندر دو بڑے غم دے دیے۔ پہلے باپ کا غم اور اب اپنی سب سے اچھی، پیاری دوست جولی کا غم جسے قبول کرنے میں شاید بہت عرصہ لگ جائے۔

☆☆☆

جب وہ زارا کو اپنی گاڑی کی طرف لاری تھی تو مسلسل جولی کے ماں باپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ پتا چلا کہ ماں اسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ باپ اس کے پاس ہے۔ انہیں دو پہر دو بجے ہی فون کے ذریعے اطلاع دے دی گئی تھی۔ ہمدردی، ترس اور افسوس سے سارہ کا دل بھر گیا۔ انکوئی اولاد تو عمر بھر خواہر و بہن نہ تھی۔ ماں باپ کو بھی نہ بھولنے والا غم دے کر چا چکی تھی۔

زارا کے جسم میں جیسے جان نہ رہی تھی۔ وہ بہت مشکل سے اپنے آپ کو تعینت نہایت کراہی کی طرف آ رہی تھی۔ "میں بہت تھک گئی ہوں مام اور نیند بھی بہت آ رہی ہے۔" وہ تقریباً فونو کی میں کہہ رہی تھی۔

سارہ کو اپنی گاڑی ڈھونڈنے میں تھوڑا سا وقت لگا۔ کیونکہ اب جیسے سارے شہر کی گاڑیاں اس پارکنگ لائٹ میں آ چکی تھیں۔

زارا کو بمشکل سیٹ پر بٹھا کر سیٹ بیلٹ لگائی اور گاڑی اشارت کی تو وہاں سے نکلے نکلے دو موٹر سیکل گھر پہنچی۔ پھر ڈرائیو نے اسے گاڑی پارک کی تو میری ماں پر ہی آ گئیں۔ ان کا چہرہ کسی مردہ کی طرح زرد تھا۔ "زارا کو کھانا لے کر میں میری ذرا دھڑ کر رہی میری۔" وہ سو گئی ہے۔ "بہت آگئی ہے اس نے کہا۔"

دونوں نے ل کر بیٹی کو کھانا اور تقریباً گود میں اٹھائے ہوئے اوپر لے گئیں۔

سارہ نے جلدی سے بیڑ گور اٹھایا اور اسے لٹا دیا۔ وہ جیسے بے ہوش تھی۔ جوتے بھی بعد میں سارہ نے اتارے۔ اسے احتیاط سے سسل اوڑھا کر وہ دروازہ بند کر کے نیچے آئی۔ میری نے اس کے لیے گرم کافی کا کپ تیار رکھا تھا۔

"آپ کو پتا چلا، آج کیا ہو گیا۔؟" سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارہ سے ہاں کہا۔ "میں نے ٹی۔وی پر دیکھا ہے۔" اگلی آواز میں وہ بولیں۔ "آپ کو پتا ہے کہ جو بچی مری ہے وہ کون سی تھی۔؟"

"نہیں۔ یہ پتا چلا ہے کہ ایک بچی پہاڑی سے گر کر ختم ہو گئی۔"

"وہ بچی جولی لارن تھی۔ وہی جولی جو میری زارا کی بیٹ فریڈ تھی۔ یاد ہے وہ یہاں آیا کرتی تھی؟" سارہ نے بتایا۔

"وہ جولی۔۔۔۔۔" میری کی آواز میں حیرت کے ساتھ دکھ تھا۔ "اوہ۔۔۔۔۔ بڑی پیاری بچی تھی وہ۔۔۔۔۔ تو وہ مر گئی۔؟" انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔" وہ مر گئی۔ آپ اندازاً جنس کر سکتیں کہ زارا کا کیا حشر ہے۔ پہلے بے چاری کا باپ اور اب یہ دوست جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔ "سارہ کی آنکھوں میں دکھ سے آنسو آ گئے۔"

"ان بچوں کی عہدداشت تو جان کے پر تھی۔" میری نے جیسے بیڑا کر کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ وہاں اسکول میں تقریباً سب لوگ ہی ان سے بے شمار سوال پوچھ رہے تھے۔"

"انہوں نے کیا کہا؟" میری کی آواز مدھم تھی۔ "انہوں نے بتایا کہ وہ کسی خرگوش کے پیچھے بھاگی تھی۔ انہوں نے بچانے کی بہت کوشش کی مگر جولی کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اسے بچا نہ سکے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔" میری نے ایسے کہا جیسے جان میں جان آگئی ہو۔ "تو وہ بے قصور ہیں۔" انہوں نے بیڑا کر کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔" وہ بے قصور ہیں میری۔ ان کا تو اپنا بھی صدمے سے برا حال تھا۔ بہت ہمدردی سے سارہ نے میری کا ہاتھ تھام کر دبا دیا۔ وہ ریشمیں ہو گئیں۔

☆☆☆

دورات سارہ کے لیے کسی قیامت سے کم تھی۔ جب میری کو گلہ نہایت کہہ کر وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو زارا بیڑا رہی تھی۔

"بیڈ۔۔۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔۔۔ میری دوست کو چھوڑ دیں۔"

سارہ نے ذرا غور سے سنا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ کس کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ سارہ کی کچھ میں نہ آیا۔ اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ گہری نیند میں تھی۔

اس کے بعد بھی تھوڑی تھوڑی دیر میں وہ ایسی ہی بات دہرائی رہی۔ "اس کو بچ نہ کریں۔۔۔۔۔ ورنہ میں بچہ کو بتا دوں گی۔"

یہ آخری بات زارا نے کی اور جیسے بے ہوش ہو گئی۔ سارہ کی تو جان ہی نکل گئی۔ ماتھانیک کیا تو وہ بخار سے پھٹک رہی تھی۔

"یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ کیا بول رہی ہے؟ کیا دیکھا ہے اس نے جو اب نیند کی حالت میں بھی اسے ٹھک کر رہا ہے۔"

وقت دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ڈاکٹر سے ابھی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ خود ہی ہاتھ روم سے تو لیا گیا کہ کے ماتھے پر دکھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ فونو کی اور تھابت سے بچی کا ہاتھ تھا۔

"زارا۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا میری جان؟" اس نے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"مام، میں تھک گئی ہوں۔ مجھے سونے دیں۔ پلیز۔"

وہ بہت ہی تھابت سے بول رہی تھی۔ "تھابت بہت تیز ہے۔ میں آپ کو کچھ کھانے کے لیے لا کر دیتی ہوں۔ بعد میں دوادوں گی۔" وہ اٹھنے لگی۔

لگا کچھ زارا نے اس کا ہاتھ مشوولی سے تھام لیا۔ "مام، آپ کس نہ چاہیے۔ پلیز، مجھے کیا نہ چھوڑنا۔"

اور پھر وہ گہری نیند میں چلی گئی۔ ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اتنا گرم جیسے آگ لگ رہی ہو۔

سات بجے ڈاکٹر ہرٹس سے بات کی۔ انہوں نے فوراً اسے لانے کے لیے کہا۔

بہت محظوظ سے اسے اٹھایا۔ کپڑے قورات سے تبدیل ہی نہ کیے تھے۔ محظوظ سے جوتا پہنا یا اور خاموشی سے نیچے آئی۔ میری اور جان کا بیڈ روم بند تھا۔ وہ بولے سے مین دروازہ کھول کر آئی۔ باہر سے لاک کیا اور گاڑی اشارت کر لی۔ زارا کو کچھ سیٹ پر لٹا دیا کہ آرام کر لے۔

ڈاکٹر ہرٹس بچوں کے ڈاکٹر تھے۔ ٹھیک زیادہ دور نہ تھا۔ حالانکہ نوے پہلے نہ کھولتے تھے لیکن اب انہیں کسی وجہ سے وہ بھی جلدی آ رہے تھے۔ تمام راستہ اس کا ذہن زارا کی بیڑا ہٹ میں الجھا ہوا تھا۔ وہ کس سے درخواست

کر رہی تھی کہ اس کی دوست کو چھوڑ دیں، بعد میں یہ بھی کہا کہ وہ بچہ کو تھادے گی۔ تو کیا اس حادثے کے پیچھے کوئی راز تھا۔ زارا نے کچھ دیکھا تھا جو اس کے تحت الشعور میں اسے ٹھک کر رہا تھا؟

"یا اللہ! میں کیا کروں۔ کس سے بات کروں؟"

اس نے بہت دیر اور فکر سے سوچا۔ جب وہ ٹھیک پہنچی تو ڈاکٹر ہرٹس اپنی نرس کے ہمراہ خود ہی آ گئے۔

"کیا ہو گیا، ہماری پیاری دوست زارا کو۔؟"

انہوں نے بہت عیار سے اسے وہیں بیڈ پر لٹاتے ہوئے کہا۔

"میں بہت پیار ہوں ڈاکٹر۔" زارا نے تھابت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، اب آپ اپنے ڈاکٹر کے پاس آگئی ہیں۔ اب ہم اس پیاری کو یوں چیکوں میں ختم کر دیں گے۔" انہوں نے حراہ انداز میں چٹی بجا کر کہا اور قہرما میٹر احتیاط سے اس کے منہ کے بجائے بٹل میں لگا دیا کیونکہ اس کو فونو کی ابھی بھی بہت تھی۔

103 بخار۔ نرس سے فوراً بخار اتارنے والی دوائی کا انتظام کرنے کو کہا۔ پہلے اسے اچھا سا جوس پلایا پھر دوا دی اور آرام کرنے دیے۔ خود سارہ کو لے کر اپنے آفس میں آ گئے۔ کافی کا گرم کپ اس کے سامنے رکھا۔

"کیا ہوا ہے زارا کو؟" وہ بے حد ٹھیک سے سارہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

سارہ نے قیامت واقعہ بتا دیا۔

"تو لارن کی بیٹی جولی زارا کی دوست تھی؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی، بیٹ فریڈ۔ ہم جب سے اس شہر میں آئے ہیں وہی اس کے ساتھ رہی۔ مگر جب وہ ہمارے گھر پہنچی آئی۔ بہت ڈھین بے حد پیاری اور سلی ہوئی بچی تھی۔" سارہ نے بتایا۔ "مجھے کچھ نہیں لگا تا ڈاکٹر کا تقریباً پوری رات زارا کسی کو اپنی دوست کے قریب آنے سے منع کر رہی تھی۔"

اس نے کہا۔

"کوئی نام نہیں لیا؟" انہوں نے غور سے تمام بات سننے کے بعد کہا۔

"جی نہیں۔ بس یہی کہ میری دوست کو بچ نہ کریں۔"

"اس پھنگ پر بچوں کا سر براہ کون تھا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

”مسٹر جان ایڈرمن جو اتفاق سے ہمارے مالک مکان بھی ہیں۔ بے حد شریف، بچوں کو پیار کرنے والے۔“
 سارہ نے بہت جوش سے کہا۔
 ”ہوں۔“ ڈاکٹر نے سوچ کر کہا۔
 ”ان کے کہنے کے مطابق تو جی کی فرکوش کے بچے بھی اسی تھی اور گرجی۔ ان کے چہرے پر خراشیں بھی تھیں کہ انہوں نے اسے پچانے کی کوشش کی تھیں۔“ سارہ ایک دم رکی۔

”لیکن کیا۔“ ڈاکٹر ہرٹس نے کہا۔
 ”مجھے یاد آیا۔ اسکول میں جب لوگ ان سے سوال پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا تو زارا نے جیسے بڑے لمبے سے کہا تھا۔ یہ بھولے ہیں۔ میں نے اسے مت پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہونے کو کہا تھا۔ کیونکہ مجھے لگا زارا کو دوست کا صدمہ ہے جسے شاید قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں۔“

”جیسے بات بہت سیریس ہے سارہ۔ ابھی تو میں زارا کو دوائی اور انجکشن دے رہا ہوں۔ اس کی کیفیت ذرا بہتر ہو تو دوبارہ لانا۔ میں اس سے کچھ سوال پوچھنا چاہوں گا۔“ وہ بے حد جمیدگی سے بولے۔

وہ زارا کو گھر لے کر آئی۔ مین دروازہ لاک نہ تھا۔ مسٹر ایڈرمن اندر کمری پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ایک دم اچھل سے گئے۔

”تم دونوں کہاں گئے تھے۔ میرا مطلب اتنی صبح۔۔۔؟“ ان کے لہجے میں ایک عجیب خوف اور حسرت تھا۔
 ”وہ میں زارا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی۔ اس نے زارا کی سائیکل کا دروازہ کھولنے سے کہا۔

”لاؤ، میں دو کروں۔“ وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ جیسے زارا کو کسی نے ٹکلی کا شاک دے دیا ہو۔
 ”دور ہیں مجھ سے۔ میرے نزدیک نہ آئیں۔“ وہ جیسے چیختی۔

”کیا ہو گیا ہے زارا۔ جان آپ کو اتارنے میں مدد کرنا چاہتے ہیں۔“ سارہ نے شرمندگی سے کہا۔
 جان کا بھی جیسے رنگ بدل گیا۔ شرمندگی سے پالے۔
 ”چلو کوئی بات نہیں۔ میں ہیپ میں کروں گا۔ آپ اب بڑی ہو گئی ہو اٹل ڈول۔“

”جیسے اٹل ڈول مت کہیں۔“ زارا کے لہجے میں اس قدر نفرت تھی کہ سارہ حیرت زدہ رہ گئی۔ بڑی منگھوں سے اسے اوپر لائی۔ لیٹر پر لٹایا۔

”دروازہ جلدی سے بند کریں مام۔“
 ”کیا بات ہے چٹا، آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کو پتا بھی ہے آپ جان سے حق بدلتی رہی ہے بات کر رہی ہیں۔“ سارہ نے ذرا سردی سے کہا۔ ”وہ اتنے اچھے ہیں۔ میں اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ آپ کی مدد کرنا چاہتے تھے۔“ سارہ نے اس کے بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے اسے کہا۔
 ”وہ اچھے نہیں ہیں۔ مام وہ اچھے نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔

☆☆☆☆
 پوری رات زارا بڑبڑاتی رہی۔ وہ کسی کو اپنی دوست سے دور رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔
 سارہ کا دماغ مافوق ہو رہا تھا۔ وہ جان اور میری سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن زارا کا جان سے نفرت کا اظہار بہت سے سوالوں کو ختم دے رہا تھا۔

اب اُسے بھی خوف آنے لگا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی ضرور جو حادثے والے دن زارا نے دیکھی۔ یہ بہت سیریس بات تھی۔
 کسی شخص پر الزام لگانا اور پھر اسے ثابت نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ پھر بارہ سال کی بچی؟ کیا پتا کبلی کی موت کے صدمے نے ذہن میں کیا کیا ڈال دیا تھا۔ وہ بے حد ڈر رہی تھی۔

سارہ نے دکان جانا شروع کیا ہوا تھا۔ زارا کا بخار تو ٹوٹ گیا تھا لیکن قہقہے ہانی تھی۔ ڈاکٹر ہرٹس نے اسے دوبارہ دکھانے کو کہا تھا۔ اس نے انہیں فون کیا۔
 ”آپوں نے اسی دن کی اپنا کلمت دے دی۔ وہ شاور لینے چلی گئی۔ نہالینے سے طبیعت ذرا بدلتا ہو گئی۔ داکٹر آئی تو دیکھا زارا تھر تھرا کر رہی ہے۔

”کیا ہو گیا۔؟“ وہ گھر آکر اس کی طرف آئی۔
 ”مام۔ وہ میری بیٹی کو مار دیں گے۔ وہ میری سام کو مار دیں گے۔“ وہ پردے کی طرف اشارہ کر کے پاگھوں کی طرح کہہ رہی تھی۔
 ”کون؟“ سارہ نے دیکھا۔

”وہ کہہ رہے تھے کسی کو کچھ نہیں بتانا ورت۔ اور پھر انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ بھر کر کہا۔ تمہاری سام مر جائے گی۔ مام وہ میری سام کو گادیا کر مار دیں گے۔“
 تھر تھرا کر اپنی زارا ماں کے گھٹے سے لگ گئی۔

☆☆☆☆
 سارہ نے دیکھا۔
 ”وہ کہہ رہے تھے کسی کو کچھ نہیں بتانا ورت۔ اور پھر انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ بھر کر کہا۔ تمہاری سام مر جائے گی۔ مام وہ میری سام کو گادیا کر مار دیں گے۔“
 تھر تھرا کر اپنی زارا ماں کے گھٹے سے لگ گئی۔

☆☆☆☆
 سارہ نے دیکھا۔
 ”وہ کہہ رہے تھے کسی کو کچھ نہیں بتانا ورت۔ اور پھر انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ بھر کر کہا۔ تمہاری سام مر جائے گی۔ مام وہ میری سام کو گادیا کر مار دیں گے۔“
 تھر تھرا کر اپنی زارا ماں کے گھٹے سے لگ گئی۔

جب بات طب اسلامی کی چھڑے تو جو نام بے ساختگی سے ذہن میں بار بار آتا ہے وہ ”رحیم الاطباء“ یعنی ابن سینا کا ہے۔ وہ بچپن میں بھی حیرت انگیز کمالات دکھاتے تھے۔ انہوں نے بہت کم عمری میں قرآن حفظ کر لیا۔ کئی فنون خود بخود سیکھ لیے۔ ایک اصول اور تھرا عالم تھے۔ انہوں نے ایسی کتابیں تصنیف کیں جو اسلامی ممالک اور یورپ دونوں جگہ صدیوں تک طب کے بارے میں مستند حوالوں کا کام دیتی رہیں۔ ان کی کتاب ”القانون فی الطب“ طب کے نظریے و عمل میں مددگار مثال اثر کی حامل رہی ہے۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور قرون وسطی کے آخری دور تک دو جلدیں تصانیف میں ممتاز ترین حیثیت کی مالک تھیں۔ اس کی اساس مہدائیں سینا میں دست یاب اعلیٰ علوم پر مبنی تھی اور خاص طور پر اس میں ابن سینا کے اپنے مشاہدات اور انکشافات بھی شامل تھے جو اس نے امر صحت (مثلاً جن کا اطلاق چھ دق پر ہوتا ہے) گردن توڑ بخار (جس کا سب سے پہلے ذکر انہوں نے کیا) اور نفسیاتی عوارض کے مطالعے کے بعد مرتب کیے۔ طب کی بائبل ”القانون“ کا مصنف اور مہر کا موجد یورپ کا ایوی سینا ابوعلی سینا ابن عبد اللہ بن سینا 980ء میں بخارا میں پیدا ہوا۔ 1037ء میں درود قوچ سے فوت ہوا۔
 اقتباس: تحفہ قرأت اسلامی سائنس از ڈاکٹر منیر گزشت

بہت خراب آئی ہے۔ اس کو فوراً کلینک لائیں۔ تم اس صدمہ میں اس کے کچھ کپڑے اپنے کپڑوں کے ساتھ ملا کر ٹیک میں ڈال لینا اور اس طرح لٹکا جیسے ابھر رہی ہو گی ہے۔ تم سمجھتی کی نا؟“ ڈاکٹر ہرٹس نے کہا۔

مارے پریشانی کے سارہ کا براہ راست تھا۔
 ”گھر آؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کیس کی ٹیک پیچنا اب ضروری ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی سب سے اہم کڑی زارا حسن ہے۔“ انہوں نے نرمی اور محبت سے اس کا ہاتھ چھو رہا تھا۔

”بہت بہت شکریہ ڈاکٹر۔“ سارہ نے کاہنی آواز میں کہا۔
 ☆☆☆
 تمام راست سوچوں میں گزر گیا۔
 زارا مین دروازے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی میری نظر آ گئیں۔

”کیا ہوا؟“ انہوں نے ذرا فکر سے پوچھا۔
 ”ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ڈاکٹر ہرٹس نے کافی ٹیسٹ کروائے ہیں رپورٹ آئے گی تو پتا چلے گا۔ اس کا بخار ہی نہیں اتر رہا۔“ سارہ نے کہا۔
 ”اللہ کرے ٹھیک ہو جائے۔ سنو، کھانا تیار ہے، دے دوں؟ میں نے زارا کے لیے چکن کا سوپ بھی بنایا ہے۔“

”بہت شکریہ۔ میں ذرا اس کو سیش کر کے آتی ہوں۔“
 ☆☆☆
 سارہ نے دیکھا۔
 ”وہ کہہ رہے تھے کسی کو کچھ نہیں بتانا ورت۔ اور پھر انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ بھر کر کہا۔ تمہاری سام مر جائے گی۔ مام وہ میری سام کو گادیا کر مار دیں گے۔“
 تھر تھرا کر اپنی زارا ماں کے گھٹے سے لگ گئی۔

☆☆☆☆
 سارہ نے دیکھا۔
 ”وہ کہہ رہے تھے کسی کو کچھ نہیں بتانا ورت۔ اور پھر انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ بھر کر کہا۔ تمہاری سام مر جائے گی۔ مام وہ میری سام کو گادیا کر مار دیں گے۔“
 تھر تھرا کر اپنی زارا ماں کے گھٹے سے لگ گئی۔

اس عرصہ میں جان دروازے سے نکلے نظر آئے تو زارہ کی آنکھوں میں خوف سا آگیا۔ ماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”جلدی چلیں مام، مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔“

☆☆☆

بچے آکر اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ جان اپنے کمرے میں تھے۔ میری باتیں کرتی رہیں۔

وہ اوپر اپنے کمرے میں گئی۔ زارہ اور اپنا تھوڑا تھوڑا سامان بیگ میں ڈال لیا اور دھڑکتے دل سے فون کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے زارہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بستر پر خاموش لیٹی تھی کہ فون بجے۔

”ہی۔۔۔ بول رہی ہوں۔ کیا؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میری ڈاکٹر برش سے بات کروائیے۔“ وہ زارہ اونچا اور جھلر رہی تھی۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ بچے کا فون کسی نے خاموشی سے اٹھالیا ہے۔

ڈاکٹر برش نے حسب وعدہ بہت ٹھہرے ٹھہرے لمحے میں بتایا کہ زارہ کی بلڈ رپورٹ ٹھیک نہیں آئی۔ کچھ دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کا گھر پر بیٹہ کرکٹ کھانے نہیں ہو سکتا۔ سب سے اچھا یہ ہے کہ اس کو لے کر فوراً میرے ٹھکانے آسکتی ہیں؟“

”کیا ہو گیا ہے۔۔۔ زارہ کو ڈاکٹر۔۔۔ میں آپ کو کچھ تو اسے دکھانے چاہتی تھی۔“

”اس وقت میرے پاس کچھ اہم نیشنوں کی رپورٹ نہیں آئی تھی۔ آپ یہ سب باتیں میرے آفس میں بھی آکر کر سکتی ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔“ انہوں نے جیسے ٹھک ہو کر کہا۔

”اچھا ہم آرہے ہیں۔“

”سنیں۔ اس کے کچھ کپڑے ضرور لے آئیں۔ ہو سکتا ہے ایڈمٹ کرنا پڑے۔“ فون بند ہو گیا۔

اس نے جلدی جلدی زارہ کو کھانپا۔

”اب کیوں جاتا ہے؟ وہ مجھے انجکشن دے دیں گے۔ مجھے پتا ہے۔“ اس نے بڑبڑا کر کہا۔

اس کے سامنے جان بوجھ کر تھوڑے سے کپڑے، برش وغیرہ ٹھونے۔ پرس پکڑا۔ بچے آئی۔ میری اور جان وہیں کھڑے تھے۔

”کیا ہوا کہاں جا رہی ہیں؟“ میری نے پوچھا۔

”ڈاکٹر برش نے فون کر کے بلوایا ہے۔ کچھ رپورٹس کی بات کرنی ہے۔ بس اب دعا کرنا کہ زارہ ٹھیک

ہو جائے۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میری نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ جان نے بھی اپنا ہاتھ مجھے ملے میں کیا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اللہ کرے۔“ سارہ نے کہا اور زارہ کا ہاتھ پکڑ کر وہ جلدی جلدی کاری کی طرف لپکی۔ دروازہ کھول کر زارہ کو ساتھ والی سیٹ میں بٹھا کر سیٹ ویلٹ بانٹ دی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

☆☆☆

ڈاکٹر برش جیسے ان کا انتظار ہی کر رہے تھے۔

”بیگ تیس کو دے دو اور میرے ساتھ آ جاؤ۔“

اندر ان کا کوئی پرائیویٹ نہ تھا۔ وہاں دو آدمی بیٹھے تھے۔ جب یہ دونوں اندر داخل ہوئیں تو وہ دونوں احتراماً کھڑے ہو گئے۔

”سارجنٹ شیفرز، ڈاکٹر سبکی یہ سارہ حسن ہیں۔ اور یہ ان کی بیٹی زارہ حسن۔“

دونوں نے سارہ سے ہاتھ ملایا۔ زارہ کو پیار سے اپنے پاس بلالیا۔

”یہ سب کیا ہے ڈاکٹر؟“ سارہ نے حیرت سے پوچھا۔

ڈاکٹر پر چھوٹا سا نیپ دیکھا رہا تھا۔

کچھ ٹوٹ پھوٹ پیڑ تھے جو سارجنٹ شیفرز نے اپنی طرف کر لیے۔

”یہ دونوں میرے بڑے اچھے دوست ہیں زارہ۔ ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ جانتا چاہیے ہیں کہ جس دن آپ لوگ چنگ پر گئے تھے اس دن کیا ہوا تھا؟“ ڈاکٹر برش نے اسے ایک بڑی کینڈی بار دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہی، تو کبھی جی چنگ، زارہ حسن؟“ سارجنٹ نے بہت نرم انداز سے طریقے سے پوچھا۔

”بہت اچھی۔ ہم لوگ بہت enjoy کر رہے

تھے۔ میں اور جولی ساتھ ساتھ تھے۔“ وہ رکی۔ جولی کا نام لیتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ کو پتا ہے آفیسر۔ میری دوست جولی اسی چنگ میں مر گئی۔ میری سب سے اچھی دوست؟“ اس نے اچانک اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے اور سکیں سے رونے لگی۔

سب کے چہرے اتر گئے لیکن انہوں نے اسے رونے دیا۔

کیمپوں تک آئے اور انہوں نے آدھے علاقے کو اپنے مذہب میں شامل کیا۔ باقی آدھے پر آخری دو کس کا قبضہ رہا۔ ان دونوں مذہب کو ٹھکانے والا یوگول قبیلہ تھا جسے دونوں ٹکا نہ بناتے تھے۔ 1390ء میں ترکوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو ان کے حسن سلوک کی وجہ سے یوگول قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ ہم انھیں یوگول کی اولاد ہیں۔

”گویا کلی طور پر تم لوگ یورپی ہو؟“ طارق بٹ نے سوال کیا۔

”جی ہاں اہم پوری طرح یورپی ہیں مگر مسلمان ہیں ناں اسی لیے یورپی میں اپنا نہیں کہتے اور ہم مسلمان ہونے کی سزا صدیوں سے بھگت رہے ہیں۔ 1683ء میں عثمانی فوجیں پہنچا ہوئیں تو مسلمانوں کو تہذیبی مذہب پر مجبور کر دیا گیا اس دور میں مسلمانوں پر جو ظلم ہوئے اسے سن سکو گے؟ تو سنو۔۔۔ کھانا کا حکم تھا کہ ایک بھی مسلمان پورے علاقے میں نہ رہے۔ مسلمانوں کو گھروں سے کھینچ کر نکالا جاتا اور انہیں گھروں کے سامنے ڈھک کیا جاتا۔ گھر کی عورتوں کو یہ سب دیکھنے پر مجبور کیا جاتا۔ اسی دور میں ”کارلووگ“ میں ایک ایڈمپ قائم کیا گیا تھا جس کی مثال شاید ہی کبھی ملے اس کیمپ میں 500 سے زائد عورتوں کو رکھا گیا تھا۔ ان عورتوں کی بیٹی شادی پر دیتے لوہے سے صلیب بنادی گئی تھی تاکہ یہاں سے فرار ہونے والی فوراً گرفتار ہو سکے۔ ان عورتوں کو گھنٹن دن میں ایک بار اپنے ہونے چاہل کھانے کو دیے جاتے وہ بھی اس طرح کہ ایک بڑے سے بڑے چاول اٹھل دیے جاتے پھر ان عورتوں کے ہاتھ پشت پر باندھ کر تب کی طرف ہانک دیا جاتا۔ بھوک سے ہلہلائی عورتیں جا لورہی تھیں طرح منہ ڈال کر کھاتیں۔ سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ ان عورتوں کے جسم پر کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ تو یہ سب یہی تھی کہ وہ رہو۔ ہونے کی وجہ سے فرار نہیں ہوں گی۔ اسے ظلم و ستم کے بعد بھی وہ علاقہ مسلمانوں سے خالی نہ ہو سکا۔ فتح جانے والے مسلمانوں کی اولاد میں چلتی پھرتی رہیں۔ 1974ء میں مل کے یونیا ہرزی گودو تان میں جہاں کی کل آبادی 439800 ہے مسلمان 44 فی صد ہیں جبکہ 31 فی صد سرب اور 17 فی صد کروٹ۔ الگ الگ دیکھا جائے تو مسلمان ہی اکثریت میں ہیں مگر یہ سیاست کے حوالے سے سرب اور کروٹ ملے ہوئے ہیں تاکہ مسلمانوں کا مقابلہ یہ آسانی کر سکیں۔

اقتصاد: دشت آلام میں بحالہ سانچہ یونیا از احمد الیاس انصاری

تھے۔ میں نے اور جولی نے پہاڑی پر چڑھ کر اراہہ کیا۔ وہ مجھ سے آگے تھی اور تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ میں واپس چلی کہ کس آؤ حوکتا دوں کہ ہم لوگ پہاڑ پر ٹریکنگ کرنے جا رہے ہیں۔ بغیر بتائے جانی تو وہ ناراض ہو جاتی تھی کہ اس کیلئے کیوں گئی۔ اب زارہ جیسے سارا سین دیکھ رہی تھی۔

”مجھے تھوڑا سا دقت لگ گیا۔ واپس اس جگہ آئی جہاں پہلے جولی کھڑی تھی۔ لیکن۔۔۔ میں نے دیکھا کہ وہ اکیلے نہ تھی۔ جان اینڈرزن اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ ان کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”ہائیز، میرے نزدیک نہ آئیں۔ مجھے بچ کر رہیں۔“

”میں ہانگوں کی طرح یہ سب دیکھ رہی تھی۔ لیکن مسٹر اینڈرزن نہیں رکے۔ وہ آئے جیسے دبوچنا چاہتے تھے۔ میں جتنی کھڑی رہی۔ میری دوست کو چھوڑ دیں۔“ تقریباً چپختے ہوئے میں نے کہا۔

”انہوں نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ میں کافی فاصلے

”اوہ۔۔۔ ہاں اوس ہوا زارہ مگر ہم نے سنا ہے کہ وہاں کوئی خرگوش آگیا تھا اور وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔“ سارجنٹ نے جان بوجھ کر بات اوجھری چھوڑ دی۔

”نہیں، نہیں آفیسر۔ وہاں کوئی خرگوش نہیں تھا۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”لیکن مسٹر جان اینڈرزن تو۔۔۔؟“

”وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہاں کوئی خرگوش نہیں تھا۔“

وہ رکی۔ شدت جذبات سے اس کا سانس پھول سا گیا۔

”لیکن ان کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے زارہ۔“ سارجنٹ نے کہا۔

”اس لیے کہ وہ۔۔۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔“

اب سب دم سادھے اس کی بات سن رہے تھے۔

”ہم سب کھیل رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا کھا رہے

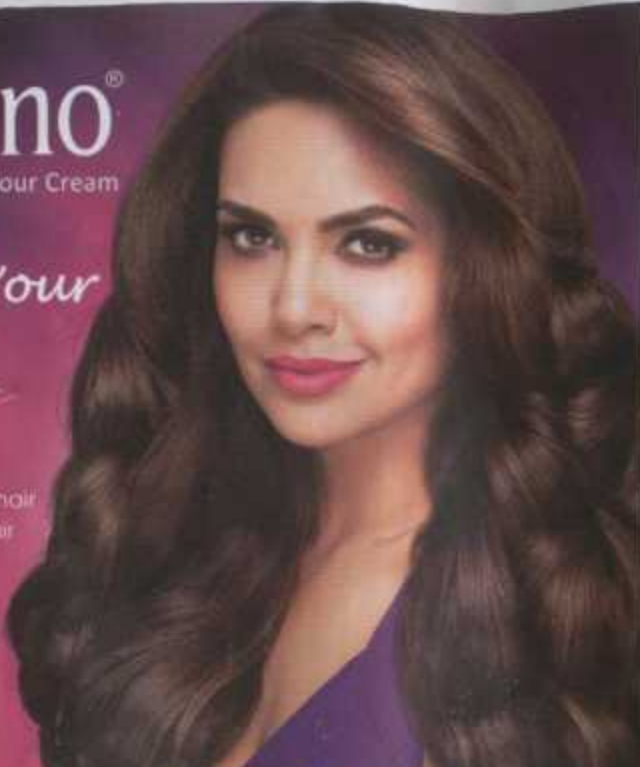
Italiano®

Permanent Hair Colour Cream

Colour Your Life

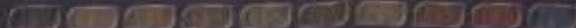
Like Gypsy

- ✓ Gives strength to hair
- ✓ Soft and glossy hair
- ✓ Even coverage
- ✓ No greys



Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner

Available in 10 Different Shades



میں دس بجے وہ دونوں مگر پہنچیں۔
ذرا گھبراہٹ خوف سے۔ اس خیال سے کہ وہ اتنا
عرصہ کسی قاتل کے ساتھ رہی ہیں۔
دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

بہو کا عالم تھا۔ جان اینڈرسن جو ہمیشہ ہالک سا سننے
والی آرام وہ چیخ کر بیٹھے رہتے تھے آج غائب تھے۔ میری
البتہ لیکن میں خاموش بیٹھی تھی۔

دونوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھا۔
"اب کسی طبیعت ہے ذرا؟" خاموش لہجے میں
پوچھا۔

"اب میں بھرتوں مسز اینڈرسن۔" اس نے ذرا
بجائش سے کہا۔

"یہ جان نظر نہیں آرہے؟" سارہ نے اٹیک کر کے
ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"وہ لے گئے ہیں اُسے۔" انتہائی نفرت سے میری
نے کہا۔

"لے گئے ہیں؟ کون کہاں؟" سارہ نے پوچھا۔
"پولیس والے آئے تھے وارنٹ گرفتاری لے کر
جولی لارن کے قتل کیس میں۔ کہتے تھے تفتیش کرنی
ہے۔" لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ الزام ثابت ہونے کے
بعد کسی معافی کا اقرار ہے۔" میری نے بہت عجیب
لہجے میں کہا۔

"جی...؟" سارہ بری طرح چونکی۔
"بہت ہو گیا ہے۔ ہاں بہت ہو چکا ہے۔ بس اور نہیں۔"

چاہنے میری کیا کہنا چاہ رہی تھی۔
سارہ نے ذرا کواٹھا دیا کہ اسے کمرے میں جا کر

ٹی وی لگائے۔ یوں بھی اس کی تیرہ پوری نہ ہوئی تھی۔
وہ اوپر جا کر بستر پر لیٹ گئی۔

"یہ جینی واردات تھی۔ جان ڈینی طور پر کج
روی کا شکار ہے۔ یہ وہاں پورے انٹینس کو گھیر رہی ہے
کہ مخصوص بچوں کو ذرا دھکا کر غلط راستوں پر ڈالا جا رہا

ہے اور اس وہاں کے شکار زیادہ عمر والے ہیں جو رشتوں
کے تقدس کو پامال کر رہے ہیں۔ جان کو پوری سزا ملے

یہ میری خواہش ہے۔ اس کے بغیر میں اکیلی ضرور
ہو جاؤں گی مگر حاشا وہ تو بیچ جائے گا۔" پھر وہ چھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔

پر تھی وہ شاید اس سے پہلے ہی اس پر چھٹ چکے تھے۔
کیونکہ جولی نے اپنے لیے دشمن ان کے گال میں گاڑ دیے
تھے۔ جولی کی چیخ سنی۔ مسز اینڈرسن اُسے دھکا دے چکے
تھے۔ میری دوست۔ میری دوست یہاں کی کھائی میں

کرتی رہی۔ کرتی رہی اور پھر آخر کار۔" ذرا اس سے
زیادہ نہ بولی گئی۔ وہاں میں مار مار کر رونے لگی۔ سب دم
سادھے خاموش بیٹھے تھے کہ کلک کی آواز سنائی دی۔

سارنٹ شیفرڈ شپ دیکھا اور ڈاکٹرن آف کر رہے تھے۔
یہ سب کچھ دیکھ کر ڈھونڈ چکا تھا۔

ڈاکٹر ہرنس نے جینی دبا کر نرس کو بلایا اور خوشگوار لہجے
میں کہا۔

"جینی، ذرا ذرا کا پر گراور ملک ٹھیک آ گیا ہے؟"
"جی ڈاکٹر ما بھی ابھی دے کر گیا ہے۔"

"چلو گئی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ گرنا گرم برگر، فرنیج
فرائز اور چاکلیٹ ملک ٹھیک آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

ذرا نے خوش ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔
"شکر یہ آکر! آپ نے بہت مدد کی ہم دونوں کی۔"

"مسز حسن، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت آپ
کی اس کم عمر بچی نے ہماری کتنی بڑی مدد کی ہے۔ مسز جان

اینڈرسن کے چہرے پر اسکرچ کسی کانٹے دار جھاڑی سے
نہیں لگے تھے۔ جولی لارن کا پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے اور

ڈاکٹر سبکی جو بیٹیاں بیٹھے ہیں، انہوں نے اس میں بڑا حصہ
لیا۔ اس بچی کے ناخنوں میں جان اینڈرسن کی چلد کا گوشت

پسٹا ہوا تھا۔ ذرا اٹھیک کہہ رہی ہے۔ جولی نے اپنے بھاء
کے لیے اپنے ناخن استعمال کیے۔" وہ کھدیر کے لیے رگے

پھر یوں لے۔" ہمیں اس کیس کو کھانسنے میں مشکل آ رہی تھی کہ
اس کا چشم دید گواہ کوئی نہ تھا۔ پولیس جانتی ہے کہ ایسے

ہوشیار، منکار بھروسے کیسے نرنا جائے۔ ذرا سے کوئی لینے
کے لیے یہ سارا ڈراما چاہا ہے۔ اور نہ وہاں رہ کر آپ دونوں

ماں بیٹی کو خطرہ ہو سکتا تھا۔"
"اب آپ دونوں کو کوئی خطرہ نہیں۔" سارنٹ نے

مسکرا کر سارہ سے کہا۔ "آپ کے یہاں کچھ بچے کے ہند ہم
نے پولیس وین بھیج کر اس کو کھانے بلایا ہے۔ وہ سوچ بھی

نہیں سکتا کہ ایک بارہ حیرہ سال کی بچی نے ایسا جوت دے
دیا ہے جس سے وہ ٹبل میں مڑے گا۔"

☆☆☆